فتاویٰ اہلحدیث

از

مجتہد العصر حافظ عبداللہ محدث روپڑی

ادارہ احیاء السنۃ النبویہ
ڈی بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

فتاویٰ اہلحدیث

جلد دوم

از

مجتہد العصر حافظ عبداللہ محدث روپڑی

المتوفیٰ

۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۴ھ ۲۰ اگست سنہ ۱۹۶۴ء

شائع کردہ

ادارہ احیاء السنۃ النبویۃ

ڈی بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

(پاکستان)

اعلام

نام کتاب ——— فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم

ترتیب و تدوین ——— تلمیذ محدث روپڑی محمد صدیق بن عبد العزیز سرگودھا

تاریخ اشاعت ——— یکم جنوری ۱۹۷۴ء

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت مجلّد ——— 26 روپے

پریس ——— الارشاد پرنٹنگ پریس لاہور

کتابت ——— محمد صدیق تسکین رقم

ملنے کا پتہ ——— ادارہ احیاء السنۃ النبویہ ڈی بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

اعتراف

فتاویٰ اہلحدیث کی پہلی جلد شائع ہو کر احباب تک پہنچ چکی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس میں ایسی فروگذاشت ہو گئی ہیں، جس کی اصلاح اور تذکرہ ضروری تھا۔ اسی طرح حضرت محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کے کئی ایسے تلامذہ کے اسماء گرامی درج نہ ہو سکے جن کا تعارف نہایت ضروری تھا۔ ان میں سے حضرت محدث روپڑی کے بھائی مولانا حافظ عبد الرحمٰن اور دوسرے ابو السلیم مولانا محمد یوسف صاحب ناظم دار الحدیث راجووال ضلع ساہیوال ہیں۔ اس تساہل پر مرتب ان سے معذرت خواہ ہے۔

(مرتب)



فہرست مضامین فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فتاویٰ اہل حدیث

جلد دوم

استدراک

فتاویٰ اہل حدیث کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد محدث روپڑیؒ کے کچھ فتاویٰ ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن کا تعلق ان ابواب سے ہے جن کا تذکرہ جلد اوّل میں ہو چکا ہے اس لئے جلد دوم کے شروع ہونے سے پہلے ان کو بیان کیا جاتا ہے۔

وضو کا بیان

ناخن پالش لگا کر وضو کرنا

سوال ۔ کیا عورت ناخن پالش ناخنوں پر لگا کر وضو کر کے نماز پڑھ سکتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ناخن پالش لگا کر وضو کرنے سے وضو نہیں ہوتا۔

جواب ۔ ناخن پالش مہندی کی قسم سے ہے۔ مہندی کا رنگ بھی دو تین دفعہ لگانے سے گاڑھا ہو جاتا ہے جو بالاتفاق جائز ہے۔ ایسا ہی ناخن پالش کو سمجھ لینا چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی یکم ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ

ریشم یا نیلون کی جرابوں پر مسح

سوال ۔ کیا پاؤں کے مسح کے لئے جراب کا غف ہونا ضروری ہے۔ جب مطلب پاؤں کو ننگی اور سردی سے بچانا مقصود ہے تو نائلون یا ریشم کی جراب پر مسح ہو سکتا ہے۔

ایم۔ اے۔ خاں لائل پور

جواب ۔ ریشم کی جراب تو مرد کے لئے ویسے ہی منع ہے رہا جراب کا غف ہونا تو اس کا ثبوت مسح کے معنی سے واضح ہوتا ہے کیونکہ مسح شرع میں یہ ہے کہ پانی اُوپر رہے اندر نہ جائے اور پتلی جراب

میں پانی اندر چلا جائے گا تو مسح نہ ہوا۔ اِس لئے ترمذی میں غف کا ذکر ہے۔

عبداللہ امرتسری از لاہور ۱۹ جولائی ۱۹۶۳ء

تیمّم کا بیان

تیمّم آنحضرتؐ کا فعل ہے یا تعلیم

سوال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم سے کوئی نماز پڑھی ہے یا صرف تعلیم دی ہے۔

مولوی ولی محمد مورخہ یکم رجب ۱۳۵۹ھ

جواب۔ آیت تیمم کے شان نزول میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کا ہار گم ہوگیا۔ اُس کی تلاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ساری فوج جنگل میں رُک گئی۔ نہ وہاں پانی تھا نہ اُس کے پاس پانی تھا۔ خدا نے آیت تیمّم اُتار دی اور بعض روایتوں میں ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہوئے اور تیمم کیا۔ خیر تو آپ کے سوال کا جواب ہوا مگر یہ سوال فضول ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور قرآن مجید میں اس کا ذکر آگیا تو پھر آپ کے کرنے اور نہ کرنے سے سوال کا کیا مطلب؟ اگر بالفرض آپ کے کرنے کا کسی روایت میں ذکر نہ ہو تو کیا قرآن مجید اور آپ کی تعلیم کافی نہیں بلکہ قرآن مجید اور آپ کی تعلیم تو اصل ہے کیونکہ آپ کا فعل خاصہ بھی ہو سکتا ہے۔ پس اس قسم کے سوال سے بچنا چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۷ رجب ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۲ اگست ۱۹۴۰ء

تنگی وقت کی بنا پر تیمم کا جائز ہونا

سوال۔ ایک شخص کو سوتے میں احتلام ہوگیا۔ آنکھ جو کھلی تو دیکھا کہ احتلام ہوگیا ہے اور نماز کا وقت بالکل قریب ہے اگر غسل کرے گا تو نماز قضا ہو جائے گی۔ اب اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ نماز قضا کرے یا غسل کرے یا تیمم کے ساتھ نماز ادا کرے۔ امجد حسین خریداری نمبر ۱۲۶۹

جواب ۔ قرآن مجید میں ہے فَلَمْ تَجِدُ فَامَاءً یعنی پانی نہ پاؤ تو پھر تیمم کا حکم ہے۔ سوال کی صورت میں پانی موجود ہے تو پھر تیمم کس طرح درست ہوگا۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۱۳ جمادی الاول ۱۳۶۰ھ ۱۰ جون ۱۹۴۱ء

غسل کا بیان

غسل کے بغیر قرآن مجید پڑھ سکتا ہے

سوال ۔ غسل جنابت فرض ہے یا واجب یا سنت یا نفل یا مستحب۔
کیا جنابت کی حالت میں سحری کھائی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید اور نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

محمد ظفر اقبال مکان نمبر ۴۹۶ سکیم نمبر ۲ گلی گشت کالونی ملتان

جواب ۔ غسل جنابت ضروری ہے کیونکہ جنبی کی نماز نہیں ہوتی اور نہ قرآن مجید پڑھ سکتا ہے ہاں سحری کھائی جا سکتی ہے (مشکوٰۃ کتاب الطہارت)

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ شوال ۱۳۹۳ھ ۱۶ مارچ ۱۹۶۴ء

ستر کا بیان

بغیر بازو بنین پہن کر نماز پڑھنا

سوال ۔ اگر ایسی بنین پہن کر نماز پڑھی جائے جس کے بازو نہ ہوں تو نماز ہو جائے گی نیز نماز کتنے کپڑوں میں جائز ہے۔؟

جواب ۔ نماز ایک کپڑے میں بھی ہو سکتی ہے۔ اگر کپڑا چھوٹا ہو تو اس کو تہ بند کی صورت میں پہن لے ورنہ گلتی باندھ لے تاکہ کندھے بھی ڈھک جائیں۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

بنیان سے کچھ کندھا ننگا رہتا ہے۔ اس لئے اس میں شبہ ہے ہاں اگر ایسی بنیان ہو کہ اس سے کندھا ڈھکا جائے تو پھر کوئی حرج نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال ماڈل ٹاؤن

کوٹھی نمبر ۱۹ سی لاہور ۲۸ ربیع الآخر ۱۳۸۲ھ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء

ننگے سر نماز

سوال ۔ کیا ننگے سر نماز جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر پر ٹوپی رکھتے یا نہ رکھتے۔ اگر رکھتے تو نماز کے وقت سر سے اُتار کر زمین پر یا جیب میں رکھ کر ننگے سر نماز پڑھتے یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھتے۔ بیّنوا توجروا۔

جواب ۔ سائل نے اپنی منشا کی تعیین نہیں کی۔ اگر اس کی منشا یہ ہے کہ ننگے سر نماز جائز ہے یا نہیں۔ تو اس کے جواز ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ احرام کی حالت میں سب حاجی ننگے سر نماز پڑھتے ہیں۔

بلوغ المرام باب شروط الصلوٰۃ میں ہے۔

ولھما من حدیث ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لَا یُصَلِّی اَحَدُکُمْ فِی الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَیْسَ عَلٰی عَاتِقِہٖ مِنْہُ شَیْءٌ۔

یعنی ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ تمہارا ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ کندھے پر کچھ نہ ہو۔ دیکھئے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی ہے لیکن کندھے کا ڈھکنا ضروری بتلایا ہے۔ سر کا کہیں ذکر نہیں۔

آں حضرتؐ کا عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑا اوڑھ کر نماز پڑھی ہے جس کے پڑھنے کی صورت یہ تھی کہ کپڑے کی دونوں طرفین خلاف طور سے کندھے پر ڈال لیں۔ یعنی اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈال لیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سر پر کچھ نہ تھا۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد

فعل کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول بھی ہے۔ بلوغ المرام میں ہے۔

عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَ الثَّوْبُ وَاسِعًا فَالْتَحِفْ بِہٖ یَعْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ وَفِی الْمُسْلِمِ فَخَالِفْ بَیْنَ طَرَفَیْہِ فَاِنْ کَانَ ضَیِّقًا فَاتَّزِرْ بِہٖ (متفق علیہ)

یعنی جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کپڑا فراخ ہو تو اوڑھ لے یعنی نماز میں اور مسلم کی روایت میں اوڑھنے کا طریق بتایا ہے کہ کپڑے کی دونوں طرفین خلاف طور پر کرے یعنی خلافِ طور سے کندھے پر ڈال لے۔ اگر کپڑا تنگ ہو تو تہ بند باندھ لے۔

دیکھئے اس میں بھی کندھوں کا ذکر ہے۔ اگر سر کا ڈھکنا ضروری ہوتا تو کسی روایت میں اس کا ذکر بھی ہوتا

ایک شبہ اور اُس کا جواب

بعض کہتے ہیں ایک کپڑے میں نماز اُس وقت تھی جب کپڑوں میں تنگی تھی۔ اُس وقت جائز تھی لیکن اُن کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ جابرؓ نے باوجود کپڑا ہونے کے ایک کپڑے میں نماز پڑھ کر یہ مسئلہ بتایا کہ اب بھی جائز ہے۔ بخاری ص۵۱

حضرت عمرؓ کا فیصلہ

منتخب کنز العمال میں ہے۔

عَنِ الْحَسَنِ اَنَّ اُبَیَّ بْنَ کَعْبٍ وَعَبْدَ اللّٰہِ بْنَ مَسْعُوْدٍ اِخْتَلَفَا فِی الصَّلٰوۃِ فِی الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَقَالَ اُبَیٌّ لَا بَأْسَ بِہٖ قَدْ صَلَّی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَالصَّلٰوۃُ فِیْہِ جَائِزَۃٌ قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ اِنَّمَا کَانَ ذَالِکَ اِذَا کَانَ النَّاسُ لَا یَجِدُوْنَ الثِّیَابَ وَاَمَّا اِذَا وَجَدُوْھَا فَالصَّلٰوۃُ فِیْ ثَوْبَیْنِ فَقَامَ عُمَرُ رضؓ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ الْقَوْلُ مَا قَالَ اُبَیٌّ

وَلَمْ يَالُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ (عب، کنز العمال جلد۳ ص۱۳۴)

یعنی ابی رضؓ اور عبداللہ بن مسعود رضؓ کا آپس میں اختلاف ہوا۔ ابی رضؓ نے کہا نماز ایک کپڑے میں جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑے میں پڑھی ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا یہ اُس وقت تھا جب کپڑوں میں تنگی تھی۔ جب کپڑا ملے تو پھر دو ہی کپڑوں میں نماز پڑھنی چاہیئے۔ ان دونوں میں فیصلہ کے لئے حضرت عمر رضؓ منبر پر چڑھے اور فرمایا ابی رضؓ کا قول ٹھیک ہے۔ اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کوئی کمی نہیں کی۔ (تحقیق میں)

پس جب ایک کپڑے میں نماز ثابت ہوگئی جس کے اوڑھنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں طرفین خلافِ طور سے کندھے پر ڈال لے تو ننگے سر نماز ثابت ہوگئی۔

نیز بخاری کے ص۵۲ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا۔

صَلّٰی رَجُلٌ فِیْ اِزَارٍ وَّ رِدَاءٍ فِیْ اِزَارٍ وَّ قَمِیْصٍ فِیْ اِزَارٍ وَّ قَبَاءٍ فِیْ سَرَاوِیْلَ وَ رِدَاءٍ فِیْ سَرَاوِیْلَ وَ قَمِیْصٍ۔

یعنی انسان تہ بند اور چادر میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے نیز تہ بند اور قمیص میں۔ تہ بند اور چوغہ میں۔ پاجامہ اور چادر میں پاجامہ اور قمیص میں۔

کنز العمال جلد ۳ ص۱۴۱ میں یہ روایت ابو ہریرہ سے بحوالہ ابن حبان مرفوع ذکر کی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان تہ بند اور چادر۔ تہ بند او قمیص، تہ بند اور چوغہ، پاجامہ اور قمیص میں نماز پڑھ سکتا ہے۔

اِس سے بھی صاف معلوم ہوا کہ سر ڈھکنا ضروری نہیں نیز ابھی گذرا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑا فراخ ہونے کے وقت کندھے ڈھکنے کا حکم دیا ہے سر ڈھکنے کا حکم نہیں دیا اگر سر کا ڈھکنا ضروری ہوتا تو اس کا بھی کہیں حکم ہوتا۔ ہاں افضل[1] ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے منبر پر بڑے بڑے صحابہ رضؓ کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیا ہے۔

---

[1] یہ یاد رہے کہ افضل کے مقابلہ میں جواز ہے اگر کوئی جواز پر عمل کرے تو اس پر طعن یا اعتراض نہیں ہوسکتا جیسا کہ رات کو تہجد پڑھنا افضل ہے لیکن اگر کوئی نہ پڑھے تو اس پر طعن یا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

اِذَاوَسَّعَ اللّٰہُ فَاَوْسِعُوْا۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ فراخی کرے تم بھی فراخی کرو۔ (بخاری مع فتح الباری)

مشکوٰۃ میں عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی کے قریب روایت ہے نیز عام حالت سلف کی یہی تھی کہ وہ پگڑی اور ٹوپیوں کے ساتھ نماز پڑھتے اور اسی بنا پر حضرت جابرؓ پر ایک کپڑے میں نماز پڑھنے پر اعتراض ہوا۔ اور حسن بصریؒ کے قول سے بھی یہی ظاہر ہے۔

عبداللہ امرتسری ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۵۹ء

پتلون سے قمیص نکالے بغیر نماز پڑھنا

سوال ۔ کیا پتلون میں قمیص نکالے بغیر نماز درست ہے۔ جب کہ کوئی مجبوری نہ ہو۔

جواب ۔ مشکوٰۃ باب السجود میں حدیث ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَعْظُمٍ عَلَی الْجَبْھَۃِ وَالْیَدَیْنِ وَالرُّکْبَتَیْنِ وَاَطْرَافِ الْقَدَمَیْنِ وَلَا نَکْفِتَ الثِّیَابَ وَالشَّعْرَ۔ متفق علیہ

یعنی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں حکم دیا گیا ہوں کہ سات ہڈیوں پر سجدہ کروں۔ ماتھے پر۔ دو ہاتھوں پر۔ دو گھٹنوں پر۔ دو قدموں کے اطراف پر۔ اور یہ بھی حکم دیا گیا ہوں کہ کپڑوں اور بالوں کو بند نہ کروں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قمیص کو بند کر کے پتلون یا پاجامہ اور تہ بند کے اندر دینا یا پگڑی کا شملہ اکٹھا کر کے پگڑی میں دینا یا سجدہ جاتے وقت تہ بند کو اکٹھا کر کے گھٹنوں میں دے دینا تاکہ زمین پر نہ پڑے یہ سب صورتیں منع ہیں۔

اسی طرح داڑھی کے بالوں کو یا عورت کا اپنے جوڑے کو یا مرد کے اپنے پٹوں کو اکٹھا کرنا یہ سب صورتیں ناجائز ہیں۔

سائل نے قمیص کا پتلون کے اندر دینا دریافت کیا ہے اور پتلون کے متعلق کچھ نہیں پوچھا حالانکہ پتلون خود بھی ناجائز اور من تشبہ بقوم فھو منھم میں داخل ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی از لاہور ۲۲ شوال ۱۳۸۳ھ

عورت کا مردانہ لباس پہننا

سوال۔ عورت کو مرد جیسا جوتا پہننا جائز ہے یا نہیں۔ اے۔ای پٹیل ملک افریقہ

جواب۔ خاص مرد کا لباس عورت کو پہننا جائز نہیں۔ اور خاص عورت کا مرد کو جائز نہیں چنانچہ مشکوٰۃ باب الترجل ص۳۸۵ میں حدیث ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ یَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْاَةِ وَالْمَرْاَةَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ (رواہ ابوداؤد)

یعنی ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد پر لعنت کی ہے جو عورت کا پہناوا پہنتا ہے۔ اور عورت پر بھی جو مرد کا پہناوا پہنتی ہے۔

نیز مشکوٰۃ باب مذکور ص۳۷۵ میں ایک اور حدیث ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ

یعنی ابن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ لعنت کرے ان مردوں پر جو عورتوں سے مشابہت کرتے ہیں۔ اور ان عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت کرتی ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ مرد کا مخصوص پہناوا عورت کو اور عورت کا مرد کو جس سے ایک دوسرے سے مشابہت پیدا ہو جائز نہیں پس جوتا بھی جو خاص مرد کا ہے عورت کو جائز نہیں۔ اس کے علاوہ عورت ہر قسم کا جوتا پہن سکتی ہے۔ خواہ سلیپر ہو یا جوتا بیٹھی ایڑی یا کھڑی ایڑی والا ہو خواہ سادہ ہو یا مرصع ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۲۷ رمضان ۱۳۵۳ھ
۴ جنوری ۱۹۳۵ء

عورت کا سفید قمیص یا سفید پاجامہ پہننا

سوال۔ عورت کو سوائے پردہ والی چادر کے سفید پائجامہ یا قمیص پہننا جائز ہے؟

سائل حکیم ابو محمد مدرس مدرسہ ترغیب التوحید صابووال ڈاکخانہ لودھیاں ضلع جالندھر

جواب۔ عورت کو اپنی وضع ایسی نہ بنانی چاہیئے کہ مرد معلوم ہو۔ کیونکہ عورت کو مرد کی مشابہت منع ہے۔ جیسے مرد کو عورت کی مشابہت منع ہے۔ کپڑے کے رنگین یا غیر رنگین کا مرد عورت[*] میں کوئی امتیاز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مرد کو رنگین منع ہوتا حالانکہ مرد کو رنگین منع نہیں صرف خالص سرخ میں اختلاف ہے۔ پس عورت کے پردہ کی چادریں اور دوسرے لباس میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۱۷ شوال ۱۳۵۴ھ

۱۳ جنوری ۱۹۳۶ء

جوتا پہن کر نماز پڑھنا

سوال۔ نماز جوتے کے ساتھ مسجد میں افضل ہے یا بغیر جوتے کے۔

عبدالقیوم ولد اللہ دتہ نمبردار ساکن جمال گڑھ

عرف چھینے والا ڈوگراں ضلع فیروزپور

جواب۔ مشکوٰۃ باب الستر فصل ۲ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

خَالِفُوا الْيَهُودَ فَإِنَّهُمْ لَا يُصَلُّونَ فِي نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ۔

یعنی یہود کی مخالفت کرو کیونکہ وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جوتوں میں نماز ضروری ہے کیونکہ بصیغہ امر فرمایا ہے کہ یہود کی مخالفت کرو۔

نیز مشکوٰۃ میں ہے۔

إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلَا يَضَعْ نَعْلَيْهِ عَنْ يَمِينِهِ وَلَا عَنْ يَسَارِهِ فَتَكُونَ عَنْ يَمِينِ غَيْرِهِ إِلَّا أَنْ لَا يَكُونَ عَلَى يَسَارِهِ أَحَدٌ وَلْيَضَعْهُمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ أَوْ لِيُصَلِّ فِيهِمَا۔

یعنی جب کوئی تمہارا نماز پڑھے تو جوتا دائیں جانب نہ رکھے اور نہ بائیں جانب رکھے کیونکہ دوسرے کی دائیں جانب ہو جائے گا۔ مگر یہ کہ بائیں جانب دوسرا نہ ہو تو پھر اس جانب رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور

---

[*] یہ اس صورت میں ہے کہ پیچھے کوئی آدمی نہ ہو اگر پیچھے کوئی آدمی ہو تو پھر پیچھے رکھنا منع ہے تاکہ جوتا اس کے آگے نہ ہو۔

ایک روایت میں ہے یا جوتہ میں نماز پڑھ لے۔

پہلی حدیث سے اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ جوتا میں نماز ضروری ہے کیونکہ بصیغہ امر یہود کی مخالفت کا امر فرمایا ہے۔ مگر دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ امر جواز اور اباحت کے لئے ہے کیونکہ اس میں ننگے پاؤں اور جوتہ سمیت پڑھنے میں اختیار دے دیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ان دونوں میں کسی کو ترجیح ہے یا نہیں اور کیا یہ دونوں برابر ہیں یا ان سے کوئی افضل بھی ہے۔

میری تحقیق جہاں تک ہے وہ یہی ہے کہ بغیر جوتا کے نماز افضل ہے اور اسی کو ترجیح ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جوتے کے ساتھ نماز کے سنن آداب پوری طرح ادا نہیں ہوتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا عام طریق یہ ہے کہ سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہوتیں۔ اور پہلے التحیات میں ایک پاؤں کھڑا کرتے جس کی انگلیاں قبلہ رُخ ہوتیں اور دوسرا پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتے اور دوسرے التحیات میں دونوں پاؤں ایک طرف نکال کر بیٹھتے اور ظاہر ہے کہ جوتے کے ساتھ یہ سب باتیں مشکل ہیں۔ اس لئے بغیر جوتہ کے نماز افضل اور بہتر ہے۔ اس کے علاوہ مساجد کو صاف رکھنے کا حکم ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھ پر میری اُمت کے اعمال کا ثواب پیش کیا گیا۔ اس میں ایک تنکے کا ثواب بھی تھا جس کو کوئی شخص مسجد سے نکالے۔ ظاہر ہے کہ جوتے کے ساتھ پوری صفائی نہیں۔ خاص کر جب صف پر یا چٹائی پر نماز پڑھی جائے تو پھر جوتہ سمیت صفائی کہاں رہ سکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بغیر جوتے کے نماز افضل ہے۔ ہاں جوتے کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو بُرا نہیں جاننا چاہیئے مگر جوتا سمیت نماز پڑھنے والوں کو بھی چاہیئے کہ صفوں چٹائیوں کو خراب نہ کریں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صفوں چٹائیوں پر جوتا سمیت نماز ثابت نہیں نہ سلف سے ثابت ہے۔

ستر کی تفصیل

سوال ۔ ستر کی تفصیل کیا ہے؟ اور کیا ستر عورت شرط ہے۔

جواب ۔ ستر عورت شرط ہے۔ یعنی ناف سے گھٹنوں تک مرد کے لئے اور عورت

آگے اور پیچھے کا ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پیچھے رکھنے میں چوری کا خطرہ ہے اور آگے کی ممانعت دائیں طرف کی ممانعت سے بطریق اولیٰ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اگلی طرف دائیں طرف سے اشرف ہے اور ایک روایت میں اگلی (باقی صفحہ پر)

کے لئے سارا وجود منہ ہاتھ کے سوا پشت پاؤں تک ڈھانکنا ضروری ہے۔ نیز اگر کپڑا زیادہ ہو تو مرد کے لئے کندھے بھی ڈھانکنا ضروری ہے سر ڈھانکنا ضروری نہیں۔ نماز میں اس طرح بکل مارنا منع ہے کہ ہاتھ باہر نکالنے مشکل ہوں۔ اس طرح کی بکل مارنے کو اشتمال صماء کہتے ہیں۔

پاجامہ کے پائچے چڑھانا۔ آستین چڑھانا۔ کرتہ کا دائرہ اکٹھا کر کے تہ بند کی ڈب میں دینا یا پاجامہ کے نیفے میں دینا۔ تہہ بند کے نیچے لنگوٹی باندھنا۔ عورت کا اپنے جوڑا کو اکٹھا کر کے باندھنا اس قسم کی سب صورتیں منع ہیں۔ اس طرح کپڑے کا لٹکانا بھی منع ہے یعنی کندھوں یا سر پر کپڑا ڈال کر اس کو دو طرف لٹکا ہوا چھوڑ دینا منع ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

مساجد کا بیان

قبلہ کی طرف پاؤں کرنا

سوال ۔ قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانے یا چارپائی کی پائین کرنے کی ممانعت میں کوئی حدیث وارد ہے؟ اگر کوئی شخص عمداً قبلہ کی طرف پاؤں کرے تو کیا وہ از روئے شریعت مجرم ہے۔ ؟

جواب ۔ قبلہ کی طرف پاؤں کرنے کی ممانعت میں صریح حدیث نہیں آئی۔ اس میں تشدد نہ چاہیے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۔ طرف رکھنے سے صراحۃً ممانعت آئی ہے معجم صغیر طبرانی صفحہ ۲۶ میں ہے عن عبدالرحمن بن ابی بکرۃ عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِذَا وَضَعَ اَحَدُکُمْ نَعْلَیْہِ فِی الصَّلٰوۃِ فَلَا یَجْعَلْھُمَا بَیْنَ یَدَیْہِ فَیَاْتَمَّ بِھِمَا وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ فَیَاْتَمَّ بِھِمَا اَخُوْہُ الْمُسْلِمُ وَلٰکِنْ یَجْعَلْھُمَا بَیْنَ رِجْلَیْہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی تمہارا نماز میں جوتا اتارے تو آگے نہ رکھے تا کہ جوتا کی اقتداء لازم نہ آئے اور نہ پیچھے رکھے تا کہ پچھلا بھائی جوتا کی اقتداء نہ کرے اور چاہیئے کہ دونوں پاؤں کے درمیان رکھے۔

مسجد میں اپنی بیوی کا بوسہ یا معانقہ

سوال۔ مسجد میں اپنی منکوحہ کا بوسہ یا اس سے معانقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب۔ صریح نص اس بارہ میں کوئی نہیں البتہ مسجد کے ادب کے خلاف ہے اور آیت کریمہ ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المساجد۔ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ان کاموں سے پرہیز چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

گوردوارہ کو مسجد میں تبدیل کرنا

سوال:۔ ہم ۱۹۴۷ء سے چک ۸۶ ای۔بی ڈاکخانہ قبولہ تحصیل پاکپتن ضلع منٹگمری میں آباد ہیں یہاں پر سکھوں کا گوردوارہ ہے جس کو ہم نے نماز کے لئے استعمال کیا اب ایک شخص نے مسجد کی تعمیر کے لئے زمین دی ہے اور وہاں جمعہ جماعت باقاعدگی سے شروع ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ گوردوارہ کو ہی مسجد رہنے دیا جائے نئی مسجد تعمیر نہ کی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ نئی مسجد تعمیر کرنا چاہیئے یا نہیں۔ نئی مسجد میں ثواب زیادہ ہے یا گوردوارہ کی مسجد میں؟

سائل محمد حسین

جواب:۔ گوردوارہ اگر سمت کعبہ میں ہے اور اس کی صورت مسجد کی شکل میں ڈھالی جاسکتی ہے تو وہ مسجد بن سکتا ہے۔ نئی مسجد کی تعمیر پر جو رقم خرچ ہوگی اور جو زمین زمیندار نے وقف کردی ہے۔ وہ سب کو ملا کر مسجد کی آمدن کا ذریعہ بنالیا جائے۔ سلسلہ حفظ القرآن وغیرہ جاری کردیا جائے اس میں دونوں کام ہوجائیں گے مسجد بھی اور دینی خدمت بھی اور اگر گوردوارہ مسجد کے نام وقف ہوجائے تو پھر نئی مسجد کی تعمیر بہتر ہے۔ اور اگر گوردوارہ وقف نہ ہوسکے تو پہلی صورت پر ہی عمل کیا جائے۔

۹ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ۔ ۱۰ اگست ۱۹۶۳ء

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ قدس اہلحدیث رام گلی نمبر ۵ لاہور

نمازی کے سامنے کسی کتبہ یا تصویر کا ہونا

سوال :۔ ازروئے فقہ حنفی مسجد میں کتبے وغیرہ سامنے دیوار پر آویزاں کرنے جائز ہیں یا نہیں جبکہ وہ مخل ہوں اور کسی قبر یا مزار کی تصویر لٹکانا شرعاً کیسا ہے ؟

جواب :۔ فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ نمازی کے سامنے کوئی شخص بیٹھا ہو اس کا منہ نمازی کی طرف نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ نماز میں خلل واقع ہوتا ہے پس یہی اس بات کی دلیل ہے کہ نمازی کے سامنے کوئی تصویر یا کوئی ایسی شے نہیں ہونی چاہیے جو نماز میں خلل کا باعث ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بیت اللہ کی چھت کی طرف دیکھنا

سوال :۔ زید کہتا ہے کہ بیت اللہ کے اندر داخل ہو کر چھت کی طرف دیکھنا سخت منع ہے عمرو کہتا ہے کہ جائز ہے کیونکہ منع کی کوئی دلیل نہیں ۔ ان دونوں میں سے حق پر کون ہے ۔ ؟

جواب :۔ چھت کی طرف دیکھنے کی ممانعت میں میری نظر میں کوئی روایت نہیں گزری ۔ ہاں یہ روایت آئی ہے کہ بیت اللہ کی طرف دیکھنے والے کے لئے بیس نیکیاں ہیں ۔ اس میں چھت بھی آجاتی ہے کیونکہ بیت اللہ یک لخت تو سارا دکھائی نہیں دیتا اکثر اس کے کسی حصہ کو دیکھے گا ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء

کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ حصہ سایہ میں

سوال :۔ کیا ایسی صورت میں نماز پڑھی جا سکتی ہے کہ بدن کا بعض حصہ دھوپ میں ہو اور بعض حصہ سایہ میں ، زید نے ابوداود کی حدیث کے پیش نظر جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کوئی انسان سایہ میں ہو اور بعد کو وہ سایہ اس سے چلا جائے یعنی اس کے بدن کے کچھ حصہ پر دھوپ ہو اور کچھ حصہ پر سایہ ہو تو وہاں سے اٹھ جائے ۔

دوسری روایت شرح السنۃ میں ہے کہ جب کوئی آدمی سایہ میں ہو اور وہ سایہ اس سے چلا جائے تو وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہو کیونکہ یہ شیطان کی مجلس ہے ۔ حدیث کے اصل الفاظ مشکوٰۃ باب الجلوس والنوم والمشی میں ملاحظہ فرمائیں ۔

اس حدیث کی بناپر جواب دیا کہ جب دوسری جگہ نماز پڑھنے کی موجود ہے تو خواہ مخواہ ایک ناجائز شکل کو اختیار نہ کرنا چاہیے ایسی شکل سے بچنا چاہیئے۔ سارا بدن سایہ میں ہو یا سارے بدن پر دھوپ ہو۔

جواب :۔ زید کا جواب بالکل صحیح ہے جب حدیث آجائے تو پھر مسلمان کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ، رجب ۱۳۷۶ھ ۳ جنوری ۱۹۵۷ء

جان کے خطرہ کے وقت گھر میں نماز پڑھنا

سوال :۔ کسی شخص نے تنگ آکر مسجد میں زمیندار پر حملہ کر دیا۔ اس وجہ سے اب وہ مسجد میں نہیں آتا۔ گھر ہی میں جمعہ وغیرہ کی نماز پڑھ لیتا ہے۔ اس کے لئے زمین پر قبضہ کرنا اور خراج لینا حلال یا حرام ہے اور گھر میں جمعہ اور دیگر نمازیں پڑھنا جائز ہے یا ناجائز ؟

جواب :۔ نمازوں کا گھر میں پڑھنا کسی صورت جائز نہیں۔ خاص کر جمعہ تو اکیلے ہو ہی نہیں سکتا پس دو صورتوں سے ایک صورت ضرور کرے یا نماز با جماعت شرعی حکم کے مطابق پڑھے یا اس جگہ سے ہجرت کرے۔ کیونکہ جہاں احکام الٰہی شرعی حکم کے مطابق نہ ادا ہو سکیں اس جگہ سے ہجرت فرض ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا

یعنی جب فرشتوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کی جانیں قبض کیں تو کہا تم کس دین میں تھے ؟ انہوں نے کہا ہم کمزوری کی وجہ سے دین کا اظہار نہ کر سکے ۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین فراخ نہ تھی۔ اس میں ہجرت کرتے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۸ جمادی الاول ۱۳۸۴ھ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۴ء

مسجد میں گتکا یا نیزہ بازی کھیلنا

سوال :۔ حدیث میں ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجرے کے دروازہ پر کھڑے ہوئے دیکھا اور حبشی برچھیوں سے کھیل رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر سے میرے لئے پردہ کر رہے تھے کہ میں ان کے کھیل کو دیکھوں پیغمبر کے مونڈھوں اور کانوں

کے درمیان سے میری خاطر یہاں تک کھڑے رہے کہ میں خود ہی واپس ہو گئی۔

اِس حدیث کا ذکر کر کے ایک شخص کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کی جس قدر ہتک اور اہانت اِن محدثین نے کی ہے شاید کوئی دشمنی کے پیرایہ میں بھی نہ کرتا کہ عائشہؓ تماشوں کی حریص اور مشتاق تھیں۔ کیا اللہ تعالےٰ کے نبیؐ ایسے بے غیرت ہو سکتے ہیں کہ اپنی بیویوں کو تماشے دکھاتے پھریں جن میں غیر محرم مرد کھیلتے کودتے ہوں۔ یہ حدیث کسی یہودی یا عیسائی کی من گھڑت ہے۔ اِس اعتراض کا جواب دیں۔

محمد اکرم خاں ناظر سٹرک توپخانہ محلہ مندہ گراں

دہلی

جواب ۔ حبشیوں کی نیزہ بازی درحقیقت جنگ کی مشق تھی۔ اِس لئے یہ عبادت میں داخل ہے اور اس کا دیکھنا جائز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسجد میں اس کی اجازت ہوگئی اور غیر محرم کی طرف نظر اُس وقت منع ہے جب غیر محرم کو دیکھنے کا مقصد ہو۔ اگر دیکھنا کسی اور شئی کا مقصود ہو اور بالتبع کسی پر نظر پڑ جائے۔ اور وہ نظر ایک معین پر نہ ٹھہرے تو یہ نظر حرام نہیں ورنہ عورت کو راستہ پر چلنا بھی حرام ہوگا کیونکہ جب راستہ دیکھے گی تو خواہ مخواہ آنے جانے والوں پر نظر پڑے گی۔ اِسی طرح عورتیں مسجدوں میں آتی ہیں گو مردوں پر نظر پڑتی ہے۔ اِسی طرح وعظ کی مجلسوں میں ہوتا ہے۔ سو اس طرح کی نظر مذکورہ بالا حدیث میں ہے۔ کیونکہ مقصود نیزہ بازی کا دیکھنا تھا۔ بالتبع نظر مردوں پر پڑتی تھی جو باعث فتنہ نہیں ہے۔ ممکن ہے اُس وقت پردہ کا حکم نازل نہ ہوا ہو۔ اور حضرت عائشہ کے آگے ستر بن کر کھڑے ہونا صرف احتیاط کے لئے ہو۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

تحیۃ المسجد

سوال :۔ تحیۃ المسجد پڑھنا واجب ہے یا سنت۔ بعض لوگ بوجہ تنگی وقت کے فرض نماز کھڑے ہونے تک کھڑے رہتے ہیں اور بیٹھتے نہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر پڑھے تحیۃ المسجد کے مسجد میں بانتظار صلوٰۃ بیٹھنا درست نہیں یہ کہنا ان کا صحیح ہے یا غلط؟

سائل ابو محمد عبد الجبار خطیب مسجد اہلحدیث رنگون (برما)

جواب :۔ تحیۃ المسجد نہ واجب ہے نہ سنت مؤکدہ ہے بلکہ مستحب ہے۔ مسلم جلد اول صفحہ ۲۴۸ میں

حدیث ہے۔

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ بَیْنَ ظَھْرَانَیِ النَّاسِ قَالَ جَلَسْتُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَامَنَعَکَ اَنْ تَرْکَعَ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ تَجْلِسَ قَالَ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَأَیْتُکَ جَالِسًا وَالنَّاسُ جُلُوْسٌ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا یَجْلِسْ حَتّٰی یَرْکَعَ رَکْعَتَیْنِ۔

بخاری جلد اوّل صـ۶۳ میں قتادہؓ سے اس طرح مروی ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَرْکَعْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ یَجْلِسَ۔ یعنی حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں داخل ہوا۔ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لوگوں کے درمیان بیٹھے تھے میں بھی بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنے سے کس نے روکا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ کو دیکھا اور لوگوں کو بھی بیٹھے دیکھا، تو میں بھی بیٹھ گیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کوئی تمہارا مسجد میں داخل ہو تو پہلے دو رکعت نماز پڑھے اور پھر بیٹھے اور بخاری میں ہے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔

ان ہر دو احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تحیۃ المسجد واجب ہے مگر دوسری احادیث پر نظر کرنے سے اس کا مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ استحباب کی دلیل ملاحظہ ہو۔

دلیل اوّل

حضرت قتادہ کی حدیث پر امام نوویؒ مسلم صـ۲۴۸ میں تحیۃ المسجد کے استحباب پر باب باندھا ہے۔

بخاری جلد ثانی صـ۶۳۶ میں کعبؓ بن مالک کی لمبی حدیث میں ہے کہ جب میری توبہ قبول ہوئی تو میں مسجد میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بیٹھے ہیں۔ اور لوگ بھی آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں میں نے آپؐ کو السّلام علیکم کہا۔ آپ خاموش تھے اور آپ کا چہرہ مبارک چمکتا تھا۔ اور آپ نے مجھ کو میری توبہ قبول ہونے پر مبارکباد اور خوشخبری دی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تحیۃ المسجد ضروری نہیں۔ اگر ضروری ہوتے تو کعب بن مالکؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم

پڑھنے کے لئے ضرور کہتے اور سکوت نہ فرماتے ۔ چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر امام نوویؒ نے مسلم میں تحیۃ المسجد کے استحباب پر باب باندھا ہے جیسا کہ ابن بطالؒ نے کہا ہے کہ ائمۃ الفتوی نے اس باب پر اتفاق کیا ہے کہ صیغہ امر فلیرکع رکعتین استحباب پر محمول ہے اس لئے کہ جلیل القدر صحابی مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے اور نماز نہ پڑھتے ۔

ان دلائل سے ثابت ہو گیا کہ تحیۃ المسجد مستحب ہے ۔ جماعت سے پہلے اگر وقت فراخ ہے تو مرضی پر ہے پڑھے یا نہ ۔ اگر وقت تنگ ہے تو بدرجہ اولیٰ بیٹھ سکتا ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ۔

نوٹ :۔ خطبہ جمعہ میں کوئی شخص آئے تو وہ ضرور دو رکعت پڑھے چنانچہ مسلم میں اس کی تصریح ہے ان کی بابت یہ ذکر نہیں آیا کہ وہ مسجد کا حق (تحیۃ المسجد) ہیں یا کچھ اور ہیں ، اس لئے جس طرح آیا ہے عمل کرنا چاہیے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۔

بارش اور سردی میں مسجد کی بجائے گھر میں نماز پڑھنا

سوال :۔ بخاریؒ بَابُ الرُّخْصَةِ فِي الْمَطَرِ وَالْعِلَّةِ اَنْ يُّصَلِّيَ فِيْ رَحْلِهٖ میں ہے عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ اَذَّنَ بِالصَّلٰوةِ فِيْ لَيْلَةٍ ذَاتِ بَرْدٍ وَرِيْحٍ ثُمَّ قَالَ اَلَا صَلُّوْا فِي الرِّحَالِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْمُرُ الْمُؤَذِّنَ اِذَا كَانَتْ لَيْلَةٌ ذَاتُ بَرْدٍ وَمَطَرٍ يَقُوْلُ اَلَا صَلُّوْا فِي الرِّحَالِ ۔ یعنی نافعؒ سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ نے سردی اور ہوا کی رات میں اذان دی اور اذان میں الاصلوا فی الرحال کہا پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سردی اور بارش کی رات میں مؤذن کو الاصلوا فی الرحال کہنے کا حکم دیتے ۔

اس حدیث پر عمل کرنا خاص ہے یا عام یعنی اس حدیث پر عمل کرنا امرتسر میں جائز ہے بسبب علت مذکورہ پائی جانے یا نہیں ۔

جواب :۔ الاصلوا فی الرحال یا الاصلوا فی بیوتکم بارش یا سخت سردی یا سخت ہوا کے وقت کہنا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ ہے ۔ ہر شہر میں ہر محلہ میں ہر دیہہ میں کہا جانا سنت ہے ۔ امرتسر کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ ہاں امرتسر میں اگر کوئی شخص منع کرے تو پھر واجب ہے کہ اس کو کہا جائے ۔ یہ حدیث تمام

کتب صحاح میں موجود ہے۔

یوسف ابراہیمی مدرس دارالعلوم امرتسر (بتائید محدث روپڑی)

صدقہ فطر سے مسجد کی تعمیر

سوال:۔ کیا مسجد کی تعمیر پر صدقہ فطر صرف ہو سکتا ہے۔ اور غسل خانہ اور وضو کی جگہ تعمیر ہو سکتی ہے؟

نواب دین ولد احمد دین ساکن لدھے والا ورکاں ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ صدقہ غرباء اور مساکین کا حق ہے۔ اور وقف سے امیر غریب سب فائدہ اٹھاتے ہیں اس لئے صدقہ فطر مسجد اور اُس کے غسل خانوں یا وضو والی سبیل پر خرچ نہیں ہو سکتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۴ شوال ۱۳۸۳ھ ۲۸ فروری ۱۹۶۴ء

میدان میں جمعہ پڑھنا

سوال:۔ عید کی نماز تاخیر سے پڑھی گئی۔ عیدگاہ ہی میں جمعہ کا وقت ہو گیا۔ اگر جامع مسجد پہنچ کر جمعہ پڑھیں تو وقت نہیں رہے گا۔ کیا عیدگاہ میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں۔؟

جواب:۔ حدیث میں ہے۔ جعلت لی الارض کلها مسجدا الحدیث۔

اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ جہاں وقت ہو جائے نماز پڑھ لی جائے۔ مسجد میں پہنچنے کی خاطر قضا نہ کی جائے۔ نہ اول وقت ضائع کیا جائے جس میں خدا کی رضا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۸ ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ

گم شدہ اشیا کا مسجد میں اعلان

سوال:۔ ایک مسجد ہے۔ اس میں شہر اور مضافات کی گم شدہ اشیأ کا اعلان کر کے آٹھ آنے وصول کئے جاتے ہیں جو مسجد میں خرچ ہوتے ہیں اس اعلان میں جانوروں۔ گدھوں۔ مرغوں۔ کبوتروں۔ زیورات چارپائی تک کا نام لیا جاتا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ایسے اعلان جائز نہیں۔ اس مسئلہ کا فیصلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں صادر فرمائیں۔

محمد یعقوب قلعہ دیدار سنگھ ۱ جولائی ۱۹۵۹ء

جواب:۔ حدیث میں مسجد کے اندر انشاد ضالہ (گم شدہ جاندار شے کا اعلان) منع آیا ہے۔اس بنا پر مسجد میں یہ اعلان جائز نہیں۔مسجد سے باہر اجازت ہے۔غیر جاندار کا اعلان مسجد میں منع نہیں لیکن بطور اُجرت جائز نہیں کیونکہ یہ بیع کی قسم ہے اور بیع مسجد میں منع ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹

مورخہ ۵ محرم ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۲ جولائی ۱۹۵۹ء

حقہ سگرٹ پی کر مسجد میں جانا

سوال:۔ حقہ سگرٹ پی کر مسجد میں جانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ میرے خیال میں حقہ یا سگرٹ پی کر مسجد میں جانا منع ہے کیونکہ منہ سے بدبو آتی ہے فرشتوں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔چنانچہ پیاز کے متعلق حدیث میں منع آیا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ماڈل ٹاؤن کوٹھی نمبر ۱۱۹ سی بلاک لاہور

۲۸ ربیع الآخر ۱۳۸۲ھ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء

کتاب الصلوٰۃ

تارک نماز کافر ہے یا نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین دربارہ اقوال مندرجہ ذیل۔

قول بکر۔ جو شخص مسلمان کہلانے والا بے نماز ہو اس کی نماز جنازہ ہرگز نہ پڑھنی چاہیئے۔ ترغیب و ترہیب میں ہے۔ لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَا طُھُوْرَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا صَلٰوۃَ لَہٗ اِنَّمَا مَوْضِعُ الصَّلٰوۃِ مِنَ الدِّیْنِ کَمَوْضِعِ الرَّاْسِ مِنَ الْجَسَدِ۔ یعنی جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں، اور جس کی نماز نہیں اُس کا دین نہیں، نماز دین میں ایسی ہے جیسے جثہ میں سر ہے۔نیز فرمایا مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ (مشکوٰۃ) یعنی جس نے دانستہ نماز چھوڑی

پس وہ کافر ہوگیا۔ بنا بریں کافر کی نماز جنازہ کیا ؟ جب کہ یہ تو کافر سے بھی گزر کر منافق ہے جو بظاہر کہتا رہتا ہے مگر پڑھتا نہیں۔ قرآن مجید میں ان جیسے منافقوں کے حق میں ہے۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۔ یعنی ان کا جنازہ مت پڑھو اور دُعا کے لئے ان کی قبر پر بھی مت کھڑے ہو۔ پس از روئے قرآن وحدیث بے نماز ہرگز مسلمان نہیں کہ اس کا جنازہ پڑھا جائے جو شخص کبھی نماز پڑھتا ہو اور کبھی چھوڑ دیتا ہو۔ اُس کا بھی یہی حکم ہے تاوقتیکہ تائب ہوکر پھر ہمیشہ پنجگانہ نماز کا پابند نہ ہوجائے جان بوجھ کر بلا عذر خواہ ایک ہی کوئی نماز چھوڑ دے اُس کا بھی جنازہ نہیں پڑھنا چاہیئے

قول زید

جو شخص کلمہ گو مسلمان ہے اور نماز کا پابند نہیں وہ فاسق فاجر گنہگار تو ضرور ہے لیکن اس پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ نماز کے متعلق صریح انکاری نہ ہو اگر تارک الصلوٰۃ منکر الصلوٰۃ کی طرح کافر خارج از ایمان ہے تو مندرجہ ذیل احادیث کا کیا مطلب ہے۔

لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ لَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ وَلَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ ۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (مشکوٰۃ)

اِن احادیث سے ظاہر ہے کہ سب سے بڑھ کر حضور سے محبّت نہ رکھنے والا زانی۔ چور۔ شرابی۔ بدعہد بددیانت وغیرہ یہ سب بے ایمان ہیں جس کا ایمان نہیں وہ کافر ہے کیا ان کا جنازہ پڑھنا چاہیئے یا نہ۔ اگر نہیں تو بہت اچھا۔ ایسا ہی کیجئے پھر دیکھئے کتنوں کا پڑھا جائے گا۔

اگر ان کا جنازہ پڑھنا صحیح ہے تو پھر تارک الصلوٰۃ کو بھی ایسے گروہ میں شامل کرکے اس کا جنازہ پڑھا جائے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس حکم کی تعمیل ہو کہ اَلصَّلٰوۃُ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا کَانَ اَوْ فَاجِرًا وَّاِنْ عَمِلَ الْکَبَائِرَ۔ (مشکوٰۃ) یعنی نماز جنازہ مسلمان نیک وبد پر پڑھنا واجب ہے۔ اگرچہ کبیرہ گناہ کرنے والا ہو کس قدر افسوس ہے کہ مرتکب کبائر پر تو حضور علیہ السلام جنازہ واجب فرمائیں اور ہم ان کو کافر ٹھہرائیں۔ آخر اس حدیث کی تعمیل بجز اس کے اور کیسے ہوگی ؟ یہ بھی حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (مشکوٰۃ) یعنی نئے مسلمان جس نے بصدقِ دل کلمہ شریف پڑھ لیا ہے خواہ اپنے

گناہوں کی سزا بھگت کر کبھی آخر جنت میں داخل ہوگا پس جو جنت میں داخل ہوگا اس کا کیوں نہ جنازہ پڑھا جائے اگر جنازہ نہ پڑھا جائے تو اس کا نکاح بھی نہ پڑھا جائے نیز اس کا منکرین اسلام کی طرح کا کافر سمجھ لینا انصاف سے بعید ہے حضور نے جو فقد کفر ارشاد فرمایا ہے وہ زجر و توبیخ پر محمول ہے جیسے کسی کو کہا جائے کہ تو بندر ہے گدھا ہے حالانکہ وہ دراصل ایسا نہیں ہوتا۔ ایسا ہی بزرگان دین نے کفر کا لفظ بے نماز کی نسبت ارشاد فرمایا ہے وہ بھی ان معنوں میں ہے نہ کہ عام کفار جیسا۔ اور بے نماز کو منافق بھی کہہ دینا سینہ زوری ہے تاوقتیکہ کوئی صریح علامت منافقت کی نہ پائی جائے۔ بے نماز اپنی غفلت کا مُقر ہوتے ہوئے آخر پریشان ہوتا ہے۔ اور جب کبھی ایمانی امتحان کا موقعہ یا کفر اسلام کا تصادم وقوع میں آتا ہے تو خدا اور رسول کے لئے اپنے مذہب کے لئے مالی امداد اور جان پر کھیل جانے کو معمولی سمجھتا ہے مگر منافق کا معاملہ اس کے خلاف ہے۔ اور آیت شریفہ ولا تصل الاٰیۃ جو ہے وہ ابن ابی منافق کے حق میں ہے اس کو مسلمانوں کے حق میں تصور کرنا فضول بات ہے بلکہ بلحاظ عمومیت کے مسلمانوں کے لئے تو ارشاد ہے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ کہ ان پر نماز جنازہ دعا خیر پڑھی جائے۔ مطلب یہ کہ بے نماز اگرچہ سخت گنہگار ہے تاہم آخر مسلمان ہے بہر حال جنازہ پڑھنا ہی چاہیے کیونکہ الصلوۃ واجبۃ علی کل مسلم برا کان اوفاجرا وان عمل الکبائر۔ حدیث کا یہی تقاضا ہے۔

زید اور بکر کا قول آپ کے سامنے ہے پس آنجناب فیصلہ فرمائیں کہ زید اور بکر دونوں میں سے حق بجانب کون ہے۔ احادیث میں جنازہ پڑھنے کی تصریح ہے یا نہ پڑھنے کی۔ بعض لوگ ایسے ہیں کہ کوئی نماز پڑھ لیتے ہیں اور کوئی چھوڑ دیتے ہیں۔ بعضوں نے سال بھر بلکہ عمر بھر میں ہی دو چار نمازیں پڑھ چھوڑی ہیں۔ بے نماز کی تعریف بھی بیان فرمائیں۔

سائل غلام رسول محلہ تاجپورہ۔ راہوں ضلع جالندھر مورخہ یکم محرم ۱۳۴۸ھ

جواب:۔ اس میں شبہ نہیں کہ الاحادیث یفسر بعضہا بعضا۔ یعنی احادیث آپس میں ایک دوسرے کی تفسیر ہوتی ہیں۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ کسی حدیث کو لے لیا جائے کسی کو چھوڑ دیا جائے اس طرح اس بات میں بھی شبہ نہیں کہ الفاظ کا اصل معنی چھوڑ کر دوسرا معنی کرنا جائز نہیں بلکہ ہر لفظ کو اپنے اصل معنی پر رکھا جائے گا جب تک اس کے چھوڑنے پر قوی دلیل نہ ہو۔ اگر اصل معنی چھوڑنے پر قوی دلیل ہو تو اصل معنی چھوڑ کر کوئی اور مناسب معنی لیا جائے گا۔ ان دونوں اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بکر کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے

جس کی تفصیل یہ ہے کہ بکر نے جو اپنے دعوے کی دلیل پیش کی ہے۔ اُس کو اصل معنی سے پھیرنے والی کوئی آیت وحدیث وغیرہ نہیں۔ اور زید نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں سے بعض کا تو اصل معنی وہ نہیں جو زید نے سمجھا ہے۔ اور بعض کے اصل معنی چھوڑنے پر قوی دلیل موجود ہے۔ مثلاً حدیث لا دین لمن لا عھد لہ الحدیث۔ کا اصل معنی یہ ہے کہ جس کے لئے کسی قسم کا عہد نہ ہو۔ اس کا کوئی دین نہیں جس میں عہد میثاق بھی داخل ہے۔ جو آدم علیہ السّلام کی پشت سے نکال کر لیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جس نے یہ عہد توڑ دیا وہ واقعی کافر ہے۔ اس طرح جو کسی قسم کی امانت کی پرواہ نہ کرے جس میں کتاب اللہ بھی داخل ہے اس کے کافر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ زید نے اس کا اصل معنی چھوڑ کر یہ معنی سمجھا ہے کہ جو ایک آدھ عہد توڑ دے یا ایک آدھ امانت میں خیانت کرے اس کا دین اور کوئی ایمان نہیں حالانکہ لفظ کا یہ اصل معنی نہیں۔ اگر بالفرض یہ معنی ہو تو اس کے چھوڑنے پر قوی دلیل موجود ہے۔ مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ میں ہے۔

العھد الذی بیننا و بینھم الصّلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر۔

یعنی ہمارے اور لوگوں کے درمیان عہد نماز ہے جو نماز کو چھوڑ دے وہ کافر ہے۔

دوسری حدیث میں ہے۔

کان اصحاب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لا یرون شیئًا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصّلوٰۃ۔

یعنی صحابہؓ کسی عمل کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے سوا نماز کے۔

اِن دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ مطلق عہد کے توڑنے سے انسان کافر نہیں ہوتا بلکہ مراد یہ ہے کہ دین کامل نہیں رہتا۔ اِسی طرح حدیث لا یسرق السارق الحدیث کے اصل معنی چھوڑنے پر قوی دلیل موجود ہے۔ مشکوٰۃ کتاب الایمان میں ہے۔

عن ابی ذرؓ قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وعلیہ ثوب ابیض وھو نائم ثم اتیت وقد استیقظ فقال ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علی ذالک دخل الجنۃ قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق الحدیث۔

یعنی جو لا الٰہ الا اللہ پڑھے۔ اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو جائے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خواہ زنا اور چوری کرے اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ زنا، چوری کرنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔

اس لئے مشکوٰۃ الکبائر میں حدیث لایسرق السارق حین یسرق و ھو مومن کے بعد لکھا ہے قال ابوعبداللہ لایکون ھذا مومنا تاما ولایکون لہ نورالایمان ۔ یعنی امام بخاری فرماتے ہیں کہ چوری وغیرہ سے پورا مومن نہیں رہتا ۔ اور ما من عبد قال لا الہ الا اللہ ثم مات علی ذالک دخل الجنۃ کا یہ مطلب نہیں کہ صرف لا الہ الا اللہ ہی کافی ہے بلکہ محمد رسول اللہ بھی ضروری ہے ۔ اس طرح نماز بھی ضروری ہے ۔ چنانچہ محمد رسول اللہ کی بابت دوسری احادیث آئی ہیں ۔ اس طرح نماز کی بابت حدیث العھد الذی بیننا اور کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اُوپر گزری ہیں آئی ہیں ۔ اور ان کے علاوہ اور احادیث بھی آئی ہیں ۔

اور حدیث "الصلوۃ واجبۃ علی کل مسلم" میں بے نماز داخل نہیں کیونکہ اس میں لفظ مسلم موجود ہے جس کے نزدیک بے نماز مسلمان ہے اُس کے سامنے یہ حدیث پیش ہو سکتی ہے ۔ اور جس کے نزدیک کافر ہے اُس کے سامنے یہ حدیث پیش نہیں ہو سکتی ۔ اور اگر اس لفظ کی پرواہ نہ کی جائے صرف وان عمل الکبائر کو دیکھا جائے تو لازم آئے گا کہ مشرک کا جنازہ بھی درست ہو کیونکہ شرک بھی کبائر سے ہے چنانچہ مشکوٰۃ کتاب الکبائر میں شرک کو کبائر میں شمار کیا ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ وان عمل الکبائر عام نہیں نیز اس حدیث میں الصلوۃ واجبۃ علی کل مسلم سے پہلے یہ عبارت ہے ۔ الجھاد واجب علیکم مع کل امیر برا کان او فاجرا وان عمل الکبائر والصلوۃ واجبۃ علیکم خلف کل مسلم برا کان او فاجرا وان عمل الکبائر ۔ یعنی جہاد تم پر ہر امیر کے ساتھ واجب ہے نیک ہو یا بد ۔ خواہ کبیرہ گناہ کرے اور نماز تم پر ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے ۔ نیک ہو یا بد خواہ کبیرہ گناہ کرے ۔

اس عبارت میں کہا ہے کہ ہر امیر کے ساتھ جہاد واجب ہے خواہ کبیرہ گناہ کرے حالانکہ جو امیر بے نماز ہو ۔ اُس کی امامت کو شریعت نے توڑ دیا ہے ۔

چنانچہ مشکوٰۃ کتاب الامارت میں حدیث ہے ۔

لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ لا ما اقاموا فیکم الصلوۃ ۔

یعنی ان کی امارت نہ توڑو جب تک تم میں نماز قائم رکھیں ۔

پس معلوم ہوا کہ ترک نماز صلوا وان عمل الکبائر میں داخل نہیں ۔ نیز اس میں کہا ہے کہ ہر مسلمان کے پیچھے نماز واجب ہے ۔ نیک ہو یا بد خواہ کبیرہ گناہ کرے اس میں اس کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے تو معلوم ہوا کہ وان

عمل الکبائر سے مراد ترک نماز کے علاوہ ہے ـــــــ اور بعض لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں صلّوا علی من قال لا الٰہ الّا اللّٰہ یعنی جو لا الٰہ الّا اللّٰہ کہے اُس کا جنازہ پڑھو حالانکہ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو بلوغ المرام اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ صرف لا الٰہ الّا اللّٰہ کافی نہیں بلکہ محمد رسول اللّٰہ بھی ضروری ہے۔ بس اس طرح نماز بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ابوذرؓ کی حدیث میں ابھی تفصیل گزری ہے ـــــــ رہی حدیث لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ الحدیث سو اس کی بابت عرض ہے کہ محبت دو طرح کی ہے ایک طبعی اور ایک غیر طبعی طبعی چونکہ غیر اختیاری ہے اس لئے انسان اس کا مکلف نہیں ہو سکتا اور یہ حیوانات میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ حیوانات اپنے بچوں سے محبت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی محبت میں اپنی جان تک کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ ہاں غیر طبعی چونکہ اختیاری ہے۔ انسان اس کا مکلف ہے اور معنی اختیاری محبت کے یہ ہیں کہ رسول کے حکم کو سب کے حکم پر مقدم جانے۔ جس کا عقیدہ یہ نہ ہو واقعی وہ کافر ہے۔ رہی عملی حالت سو جیسا جیسا عمل ہوگا ویسا ویسا حکم ہوگا مثلاً کوئی باوجود اس عقیدے کے شرک کرے تو وہ کافر ہوگا اگر نماز نہ پڑھے تو بھی کافر ہوگا ـــــــ اگر زنا یا چوری کا مرتکب ہو تو وہ کافر نہیں ہوگا۔ ہاں اس کو فاسق فاجر کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر رسول سے محبت ہونے کے یہ معنیٰ ہوں کہ رسول کی چھوٹی چھوٹی سنت پر عمل کی کوشش کرتے کرتے اس کی طبیعت پر ایسا اثر ہو گیا کہ گویا رسول کی محبت طبعی محبت کی طرح ہو گئی اور سب محبتوں پر غالب آگئی تو یہ معنیٰ بھی صحیح ہیں مگر یہ بات چونکہ مشق اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے اس لئے نفس ایمان اس پر موقوف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لازم آتا ہے کہ جس کو اتنی مہلت نہ ملے وہ کافر مرے حالانکہ قرآن میں ہے وَ لَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْاٰنَ وَ لَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَ ھُمْ کُفَّارٌ۔ یعنی ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں جو برائی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔ اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہے جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موت سے پہلے توبہ قبول ہے اور انسان مومن ہو سکتا ہے خواہ اس کو اتنی ریاضت اور مشق کی مہلت ملے یا نہ ـــــــ اور حدیث شریف میں تو صاف آگیا ہے، کہ غرغرہ (گھوڑ گھوڑ) پہنچنے تک توبہ قبول ہے۔ پس جب نفس ایمان اس مشق اور ریاضت کے بغیر حاصل ہو سکتا ہے۔ تو اس حدیث میں ایمان سے مراد کمال ایمان ہوگا۔ اور معنی اس حدیث کے یہ ہوں گے کہ جب تک سب سے زیادہ میری محبت نہ ہو۔ انسان کامل ایمان کو نہیں پہنچتا۔ بہر صورت اس حدیث کو ترک نماز کے مسئلہ سے

کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس حدیث کا جو کچھ معنی کیا گیا ہے وہ اس کا اصل معنی ہے یا دوسری آیتوں، حدیثوں کو لحاظ رکھ کر کیا گیا ہے۔ اور زید نے جو من ترك الصلوة متعمدا کی تاویل کی ہے وہ بالکل بے دلیل ہے اور آیت کریمہ وصل علیھم ان صلوتك سكن لھم۔ نمازیوں کے حق میں ہے چنانچہ شروع آیت کا یہ ہے خذ من اموالھم صدقة تطھرھم وتزكيھم بھا وصل علیھم ان صلوتك سكن لھم یعنی ان کے مالوں سے صدقہ لے تاکہ ان کا ظاہر و باطن پاک کرے اور ان کے لئے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے لئے اطمینان ہے۔ بتلائیے بے نماز بھی صدقہ سے پاک ہو سکتا ہے۔ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بے نماز صدقہ لے کر آتے تھے بلکہ یہ تو پکے نمازیوں کا ذکر ہے جو بیچارے اتفاقاً جنگ تبوک سے رہ گئے تھے۔ زید نے معاذ اللہ ان کو بے نماز بنا دیا۔ کیونکہ جو ان کی بابت آیت تھی وہ بے نمازوں پر لگا دی اگرچہ شان نزول پر حکم بند نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ کہیں کی آیت کہیں پڑھ دی جائے اور ضمیریں جس طرف لوٹتی ہیں اس کی سرے ہی سے رعایت ہی نہ رکھی جائے۔ ہاں بکر نے جو آیت پیش کی ہے وہ بے نمازوں پر لگ سکتی ہے کیونکہ بے نماز ایک طرح سے منافق ہے۔ منافق کے معنی درحقیقت کھوٹے کے ہیں۔ یعنی جس کا معاملہ خدا و رسول سے کھرا نہ ہو۔ اور اس سے بڑھ کر کیا کھوٹ ہوگا کہ نماز تک کی پرواہ نہیں جس کی بابت آپ فرماتے ہیں العھد الذی بیننا و بینھم الصلوة فمن ترکھا فقد کفر اور فرماتے ہیں من ترك الصلوة متعمدا فقد کفر اور فرماتے ہیں بین العبد و بین الکفر ترك الصلوة۔ اس قسم کی بہت احادیث ہیں اور صحابہ بھی تارک الصلوٰۃ کو کافر سمجھتے تھے چنانچہ گزر چکا ہے اور زید کا یہ کہنا کہ بے نماز مقر ہوتا ہوا آخر پشیمان ہوتا ہے۔ یہ اقرار اور پشیمانی مصیبت اور وبال کے وقت ہوتی ہے یا ہر وقت اگر مصیبت اور وبال کے وقت ہوتی ہے تو ایسی پشیمانی اور اقرار تو کفار کو بھی ہوتا تھا جیسے قرآن میں ہے۔ دعوا الله مخلصین له الدین۔ یعنی مصیبت کے وقت خاص اللہ کو پکارتے ہیں۔ اور اگر ہر وقت اقرار اور پشیمانی مراد ہے تو یہی منافقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے نماز کو کافر کہیں اور صحابہ رضؓ کافر سمجھیں۔ اور وہ بے پرواہ رہے۔ اور اس کو یہ الفاظ سن کر ذرا سی بھی اس بات کی فکر نہ ہو کہ میں اچھا کلمہ گو ہوں کہ ایسے وعید سن کر بھی تارک نماز ہوں۔ خدا نے سچ فرمایا بئسما یامرکم به ایمانکم ان کنتم مومنین یعنی یہود کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اچھا تمہارا ایمان ہے کہ اس ایمان کی حالت میں تم انبیاء اللہ کو قتل کرتے تھے سو یہی ایمان بے نمازوں کا ہے کہ خدا رسولؐ کے ایسے سخت ارشادات کو ٹھکراتے ہوئے اپنی غفلت کے مقر اور پشیمان ہیں اور تصادم کفر اسلام اور ایمانی

امتحان کے وقوع میں آنے کے وقت جان پر کھیل جانا یہ کفار میں بھی تھا اور ہے رجب ابرہہ بادشاہ یمن نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تھی تو راستہ میں بہت سی قومیں اس کا مقابلہ کر کے جان پر کھیل گئیں۔ یہاں تک کہ آخر وہ بیت اللہ تک پہنچ گیا۔ اور ابابیلوں سے ہلاک ہوا۔ چنانچہ " سورہ الم تر کیف" میں اس کا قصہ مذکور ہے اور اب بھی مرزائی، چکڑالوی، تبروں کے پجاری، خدا اور رسول کو ایک سمجھنے والے پہلے درجہ کے مشرک یہ سب تصادم کے وقت جان پر کھیل جانے کو معمولی سمجھتے ہیں۔ کیا وہ اتنے سے مسلمان ہو گئے تو پس کسی پر کفر کا فتویٰ نہ چاہیئے۔ بلکہ جب ہندو مسلم اتحاد کی لہر چلی تھی تو اس وقت بہت سی اسلام کی باتوں پر ہندو انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے پس یہ سب مسلمان ہوئے اور ان کے جنازے ضروری ہوئے یہ باتیں سب فضول ہیں۔

درحقیقت اسلام ایمان کا معیار وہی ہے جو خدا اور رسول نے مقرر کیا ہے۔ ان باتوں کو خدا اور رسول نے معیار نہیں بنایا۔ پس زید کا ان باتوں کو ذکر کرنا ایسا ہی ہے جیسے عوام کہتے ہیں فلاں بڑا ولی ہے اس سے فلاں کرشمہ صادر ہوا فلاں امر خرق عادت ظاہر ہوا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرشموں اور خرق عادات کو ولایت کا معیار نہیں بنایا بلکہ فرمایا أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ۔ یعنی اولیاء اللہ کو نہ خوف ہوگا اور نہ غم کریں گے وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگاری کرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ولی ہونے کا معیار دو باتیں بتلائی ہیں۔ ایک ایمان دوسری پرہیزگاری یعنی ہر چھوٹے بڑے امر میں شریعت کی پابندی اگر صرف کرشمہ اور خرق عادات معیار ولایت ہوتے تو دجال سے بڑھ کر کوئی ولی نہ ہوتا۔ ہاں ایمان اور پرہیزگاری کے بعد اگر کوئی کرشمہ اور خرق عادات ظاہر ہو تو وہ کرامت ہے جو برحق ہے مگر معیار نہیں۔ اور نہ ہی وہ لازمی امر ہے بلکہ اتفاقیہ کسی سے کسی وقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں اس کو اختیارات ہی مل گئے۔ حالانکہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر سے مصیبت کو دور کرنے پر قادر نہیں۔ جیسے حسنؓ حسینؓ حضرت علیؓ ایسے بزرگان دین پر طرح طرح کی تکلیفیں آئیں۔ یہاں تک کہ دشمنوں کے ہاتھوں سے شہید ہوئے اب لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ اور ان کے لئے اختیارات ثابت کرتے ہیں۔ اس قسم کا دھوکا زید کو لگا ہے کہ معیار کچھ تھا اور سمجھ لیا کچھ۔ اللہ تعالےٰ اصل بات سمجھنے اور راہ راست کی توفیق بخشے۔ آمین۔

تنبیہ ۔ بے نماز کے جنازہ نے بے نمازوں کو بہت دلیر کر دیا ہے۔ اگر آج اصل فتویٰ جاری ہو جائے تو دیکھئے ویران مساجد آباد ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور پھر لوگ مسجدوں میں آتے ہیں یا نہیں؟ کاش تنبیہ کے طور ہی اس

مسئلہ کو برت لیا جائے جیسے قطاع الطریق اور باغی کی بابت امام ابو حنیفہ رحؒ کا قول صاحب سبل السلام نے نقل کیا ہے کہ ان کا جنازہ نہ پڑھنا چاہیے لیکن ملاؤں کے طمع نے دین کو خراب کر دیا۔ اللہ تعالےٰ ان کو قناعت دے اور دیندار بنائے۔ آمین ثم آمین۔

عبداللہ مقیم روڑ ضلع انبالہ ۶ صفر ۱۳۵۲ھ یکم جون ۱۹۳۳ء

بے نماز کا ذبیحہ

سوال:۔ اگر بے نماز کافر و مشرک ہے تو کیا بے نماز کا ذبیحہ مسلمانوں کو کھانا جائز ہے؟

جواب:۔ بے نماز بے شک کافر ہے خواہ ایک نماز کا تارک ہو یا سب نمازوں کا کیونکہ من ترك الصلوة متعمدا فقد كفر عام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر تارک کافر ہے۔ رہا بے نماز کا ذبیحہ کا حکم سو وہ اہل کتاب کے حکم میں ہونے کی وجہ سے درست ہو سکتا ہے خواہ نیک ذبح کرنے والا پاس موجود ہو یا نہ۔ ہاں نیک ہر طرح سے بہتر ہے۔ اور بے نماز جب کافر ہوا تو اس کا کھانا مثل عیسائی کے کھانے کے سمجھ لینا چاہیئے حتی الوسع اس سے پرہیز رکھے۔ عند الضرورۃ کھالے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی مورخہ ۲۷ شعبان ۱۳۵۶ھ

بے نماز سے میل جول

سوال: ایک شخص کا داماد داڑھی منڈاتا ہے اور نماز کبھی پڑھتا ہے کبھی چھوڑ دیتا ہے اور اس کے ماں باپ بالکل بے نماز ہیں۔ ایسے شخص کے ساتھ کیسا میل جول رکھا جائے اور اس شخص کی لڑکی نماز پڑھتی ہے اور اپنے سسرال کے روکنے سے نہیں رُکتی۔ اس لڑکی کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہیے

نور دین بھٹی سکنہ لنگیانہ خورد تحصیل موگا ضلع فیروزپور

جواب:۔ جو کبھی نماز پڑھے اور کبھی نہ پڑھے یا بالکل نماز کا تارک ہو اس کے ساتھ دوستانہ تعلق اور اس کے ساتھ محبت کے طور پر سلوک کرنا یا تحفہ وغیرہ بھیجنا اور ضیافت کرنا بالکل جائز نہیں۔ ہاں عام لین دین جیسے ہندوؤں وغیرہ سے کرتے ہیں۔ ان کی دکانوں سے سودا وغیرہ لیتے ہیں۔ اور ان کی دکانوں پر اشیاء وغیرہ

لہ اگر مسلمان کی دکان نہ ہو تو ہندوؤں سے خام اشیاء (کپڑا غلہ وغیرہ) خرید جا سکتا ہے۔ مٹھائی وغیرہ خریدنا سخت منع ہے حاشیہ

ذو خت کرتے ہیں۔ اس کا کوئی حرج نہیں۔ اور لڑکی جو نماز پڑھتی ہے اُس کے ساتھ اگر الگ سلوک کیا جائے جیسے اس کو کوئی کپڑا بنا دیا جائے یا کوئی اور خاص چیز اُس کو تیار کر کے دی جائے یہ درست ہے۔ کیونکہ بے دین سے نفرت اور دیندار سے محبت رکھنے کا حکم ہے چنانچہ قرآن و حدیث میں یہ مسئلہ بکثرت مذکور ہے

عبداللہ امرتسری روپڑی

بے نماز کا جنازہ

سوال:۔ زید و عمرو دو شخص نمازی و حاجی ہیں۔ زید کا حقیقی بھائی دائمی بے نماز فوت ہو گیا۔ عمرو اُس کے جنازہ پر نہیں گیا۔ زید نے ناراض ہو کر عمرو سے کلام مصافحہ و معانقہ چھوڑ دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شریعت جنازہ نہ پڑھنے والے پر بھی تعزیر لگاتی ہے یا نہیں۔ کیا زید کی ناراضگی حق پر ہے یا باطل پر؟

جواب:۔ عمرو حق پر ہے۔ زید غلطی پر ہے۔ بے نماز کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ۔

یعنی جو شخص دیدہ دانستہ نماز چھوڑ دے وہ کافر ہے۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم اہلحدیث روپڑ ضلع انبالہ ۱۲ محرم ۱۳۵۹ھ یکم مارچ ۱۹۴۲ء

بے نماز مسلمان ہے اُس کے دلائل اور ان کی تردید

سوال:۔ حدیث میں وارد ہے کہ جبریلؑ نے آپ سے سوال کیا یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ۔ یعنی یا رسول اللہ مجھے بتاؤ کہ اسلام کیا شے ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۔ کیونکہ مشرکوں کو حلال و حرام میں تمیز نہیں ہوتی۔ ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی اشیا مشتبہ اور نجس ہوتی ہیں البتہ سخت مجبوری میں کوئی حرج نہیں۔

رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ الخ متفق علیہ
کہ تو گواہی دے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں۔ اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور ماہ رمضان کے روزے رکھ اور بیت اللہ کا حج کر اگر تجھے توفیق ہو۔

دوسری حدیث میں ہے۔ بنی الاسلام علی خمسٍ کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔

ان ہر دو احادیث سے معلوم ہوا کہ ایمان متجزی شے ہے جو پانچ اشیا سے مرکب ہے نہ کلی جس کی وجہ سے ہر ایک کو جدا جدا فرد مانا جائے اور جو شے مرکب ہو اور اس میں کسی جز کی کمی پائی جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کل ہی نہیں۔ ہاں اتنا کہا جائے گا کہ اس میں نقص ہے۔ باقی رہا کہ خدا تعالےٰ نماز کو ہی عین ایمان بتا رہا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شے کا اہتمام بیان کرنا مقصود ہو تو اس کو کل کے اسم سے تعبیر کرتے ہیں یہاں نماز کو اہتمام کی وجہ سے لفظ ایمان سے تعبیر کیا ہے سورہ فاتحہ کو بھی اہتمام کی وجہ سے نماز قرار دیا ہے حالانکہ رکوع سجود بھی سورہ فاتحہ کی طرح فرض ہیں اور جس حدیث میں ہے مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ۔ سو یہ محض تہدید ہے جیسا کہ بخاری و مسلم میں حدیث ہے۔ لیس من رجل ادعی لغیر ابیہ وھو یعلم فقد کفر۔ یعنی جو آدمی اپنے باپ کے غیر کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے اُس نے کفر کیا۔

دوسری حدیث میں ہے سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ۔ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور قتل کرنا کفر ہے۔

تیسری حدیث میں ہے۔ ایما عبد ابق من موالیہ فقد کفر۔ جو عبد اپنے آقا سے دور جائے وہ کافر ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جو کفر حدیث من ترک میں ہے اُس سے مراد کفران نعمت ہے۔ اگر کفر مان بھی لیں تو پھر کفر کے مراتب ہیں جیسا قتالہ کفر والی حدیث اور دوسری حدیث۔ بین الرجل وبین الکفر ترک الصلوٰۃ کی مثال بالکل اسی طرح ہے جس طرح ترمذی کی حدیث میں ہے کہ قَالَ

بخاری و مسلم کی حدیث بحوالہ مشکوٰۃ اس طرح ہے من ادعی الی غیر ابیہ وھو یعلم فالجنۃ علیہ حرام جس حدیث میں فقد کفر کا لفظ ہے وہ اس طرح ہے لاترغبوا عن اٰبائکم فمن رغب عن ابیہ فقد کفر۔

رُکَانَۃُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ فَرْقَ مَا بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْمُشْرِکِیْنَ الْعَمَائِمُ عَلَی الْقَلَانِسِ۔

یعنی آپؐ نے فرمایا ہمارے اور مشرکین کے درمیان اتنا فرق ہے کہ ہم ٹوپیوں پر پگڑی باندھتے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے باقی بے نماز کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ شخص جو نماز کو حقارت کی وجہ سے ترک کرتا ہے وہ تو بالاتفاق جہنم میں رہے گا۔ اور جو شخص تکاسلاً و تساہلاً چھوڑتا ہے۔ اگر خدا چاہے تو اس کو رہائی دے دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔

نیز حدیث میں ہے۔

عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ شَہِدَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاَنَّ عِیْسٰی عَبْدُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقَاھَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ وَالْجَنَّۃَ وَالنَّارَ حَقٌّ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ عَلٰی مَا کَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔ متفق علیہ۔

عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ ہے اور اس کا کلمہ ہے جو اس نے مریمؑ کی طرف القا کیا ہے جنت دوزخ حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہشت میں داخل کرے گا جو بھی عمل کرتا مر جائے۔

حافظ اسحٰق بہاد والوی طالب علم مدرسہ شمسیہ ویرووال

جواب:۔ حدیث "مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ" کو تہدید پر حمل کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں۔

آیت کریمہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ اور حدیث عبادہ بن صامت سے استدلال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک مرزائی، چکڑالوی بلکہ آریہ بھی اس کے تحت آ جاتے ہیں۔ یعنی ان کے خیال میں باوجود کافر ہونے کے ان کی بخشش کی اُمید ہے کیونکہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے۔ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان اللہ حرمھما علی الکفرین۔ یعنی جنت کی نعمتیں کافروں پر حرام

ہیں۔ اور جب مرزائی ۔ چکڑالوی وغیرہ کافر ہیں اور ان پر جنت حرام ہے تو ان کی بخشش کی اُمید کس طرح ہو سکتی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ جو حقارت سے نماز کو چھوڑے وہ بالاتفاق دائم جہنم میں رہے گا اور بعض کے خیال کے مطابق اس کی بخشش کی اُمید ہے تو اتفاق کہاں رہا۔ ہاں اگر آپ کی مراد اہل سنّت کا اتفاق ہو تو درست ہے لیکن آخر بعض کے اس خیال کی تردید میں آپ کوئی دلیل رکھتے ہوں گے تو وہی دلیل نکا سل سے چھوڑنے والے پر لگالیں۔

قرآن مجید میں ہے۔ فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا۔ یعنی جو خدا کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

مفسّرین نے اس کی تعریف میں لکھا ہے کہ شرک سے مراد اس جگہ ریا ہے یعنی دکھاوے کے لئے عمل نہ کرے۔ جب ریاء بھی شرک ہُوئی تو کیا اس پر آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ لگ سکتی ہے۔ اگر کوئی لگانی چاہیئے تو اس کو کیا جواب دیں گے ؟ یہی کہ دوسری آیتیں حدیثیں بھی دیکھی جائیں جن سے ثابت ہے کہ ریاء اگرچہ شرک ہے لیکن اس کی معافی ہو سکتی ہے سو اسی طرح دوسری آیتیں حدیثیں بے نمازی کے کفر کو چاہتی ہیں۔ مشکوٰۃ میں ہے۔

(۱) عن عبادۃ بن الصّامت قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السّمع والطّاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم وفی روایۃ الا ان تروا کفرا بواحًا عندکم من اللہ فیہ برھان۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ باب الامارت الخ ص۳۱۹)

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شرط پر بیعت کی کہ ہم تنگی آسانی خوشی ناخوشی ہر حال میں تابعداری ۔ فرمانبرداری سے ہاتھ نہیں کھینچیں گے۔ اور امارت کے مستحق سے امارت نہیں چھینیں گے اور جہاں ہوں حق کہیں گے۔ اور خدا کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اس شرط پر بیعت کی کہ امارت کے مستحق سے

امارت نہیں چھینیں گے مگر یہ کہ کفر صریح دیکھو جس میں اللہ کی طرف سے تمہارے پاس قطعی دلیل ہو۔

۲۔ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْاَشْجَعِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ شِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ قَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ اِلَّا مَنْ وُلِّيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَاٰهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَا يَاْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ

رواہ مسلم (حوالہ مذکورہ)

عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے بہتر امام وہ ہیں جن سے تم محبت رکھو۔ اور وہ تم سے محبت رکھیں۔ تم ان پر درود پڑھو اور وہ تم پر درود پڑھیں اور تمہارے بُرے امام وہ ہیں جن کو تم برا جانو اور وہ تمہیں بُرا جانیں۔ تم ان کو لعنت کرو اور وہ تمہیں لعنت کریں۔ ہم نے کہا یا رسول! ہم اس وقت ان سے بیعت نہ توڑ دیں؟ فرمایا۔ جب تک تم میں نماز قائم رکھیں۔ نہ جب تک تم میں نماز قائم رکھیں۔ خبردار جو شخص تم پر والی (امیر) بنایا جائے اور اُس کو نافرمانی کرتا دیکھے تو اُس کے نافرمانی کرنے کو بُرا جانے اور اُس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔

۳۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ تَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ فَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ قَالُوْا اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلَّوْا لَا مَا صَلَّوْا اَيْ مَنْ كَرِهَ بِقَلْبِهٖ وَاَنْكَرَ بِقَلْبِهٖ۔ رواہ مسلم (حوالہ مذکورہ)۔

اُم سلمہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم پر امیر ہوں گے جن کی کئی باتیں اچھی ہوں گی کئی بُری۔ جو شخص ان کی برائی کو دل سے بُرا سمجھے وہ بَری ہے اور جو کراہت کرے وہ سلامتی والا ہے جو راضی ہو جائے اور بُرائی میں ان کی موافقت کرے وہ ہلاک ہو گیا۔ صحابہؓ نے کہا کیا ایسے امیروں سے ہم لڑائی نہ کریں؟ فرمایا نہ جب تک نماز پڑھیں۔ نہ جب تک نماز پڑھیں۔ ان تین حدیثوں سے پہلی میں فرمایا ہے۔ امیر خواہ نیک ہوں یا بُرے۔ ہر حال میں ان کی تابعداری کرو۔ ہاں اگر صریح کفر دیکھو

جس پر تمہارے پاس قطعی دلیل ہو تو پھر ان سے بیعت توڑ دو اور ان کا مقابلہ کرو۔ اور دوسری حدیثوں میں فرمایا ایسے امیروں کی تابعداری ہر حال میں ضروری ہے مگر نماز نہ پڑھیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ اور ان سے لڑو۔

نتیجہ صاف ہے کہ نماز صریح کفر ہے جس پر خدا کی طرف سے دلیل قطعی آچکی ہے۔ جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں، ان کے علاوہ اس قسم کی احادیث بہت ہیں جن سے ایک دو اُوپر کے مضمون میں بھی ذکر ہیں، اور بعض مولوی عبد القادر گنگوہی حصاری کے مضمون میں ذکر ہیں جو پرچہ تنظیم کی جلد اوّل کے ۱۷ تا ۱۹ میں درج ہو چکا ہے اور بعض ہمارے مندرجہ جلد ۲ ع ۵ میں مذکور ہیں۔ اور بعض کا محل متفرقات ہیں یہ سب بے نماز کے کفر پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں اور اُوپر کے مضمون میں جو اس کے نظائر پیش کئے ہیں وہ درحقیقت نظائر نہیں۔ کیونکہ ان کی تاویل پر صریح دلائل موجود ہیں۔ پہلی اور تیسری حدیث اپنے بزرگ اور اپنے آقا سے تعلق توڑنے کے بارے میں ہیں پس وہ ایسی ہوئیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی بابت فرمایا۔ میں نے ان کو جہنم میں سب سے زیادہ دیکھا۔ پوچھا گیا۔ کیوں؟ فرمایا کفر کی وجہ سے کہا گیا۔ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ فرمایا خاوندوں کا کفر کرتی ہیں۔ اور احسان کا کفر کرتی ہیں۔ اگر ان سے کسی کے ساتھ عمر بھر نیک سلوک کرتے ہو۔ اور ایک مرتبہ تجھ سے کوئی معمولی تکلیف دیکھ لے تو کہتی ہے۔ میں نے تجھ سے کبھی خیر نہیں دیکھی (مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ خسوف فصل اول) اور حدیث بین الرجل والکفر ترک الصلوٰۃ کو ان فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس کی مثل قرار دینا ڈبل غلطی ہے کیونکہ ثانی الذکر میں لباس کا فرق بتلایا ہے نہ ایمان اور کفر کا۔ اور اول الذکر میں ایمان اور کفر کا فرق بتلانا مقصود ہے۔ اس لئے اس میں رجل کے مقابلہ میں کفر کا ذکر کیا ہے (یعنی ترک نماز سے انسان کفر تک پہنچ جاتا ہے اور آیہ کریمہ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم میں نماز کو ایمان کہنا بھی اس کا مؤید ہے۔ مثلاً فاتحہ کو نماز اسی لئے کہا ہے کہ فاتحہ کے نہ ہونے سے نماز فوت ہو جاتی ہے جیسے رکوع سجدے کے فوت ہونے سے نماز فوت ہو جاتی ہے پس یہی حال نماز کا ہے۔ اس کے نہ ہونے سے ایمان فوت ہو کر کفر آجاتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اجزا ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے نہ ہونے سے کل ہی نہیں رہتا۔ جیسے ستون گر جائے تو چھت ہی نہیں رہتی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ۔ یعنی نماز دین کا ستون ہے۔

رہی دُوسری حدیث جس میں فرمایا " قتالہ کفر" یعنی مسلمان سے لڑائی کفر ہے۔ تو اس میں کفر سے مُراد جاہلیت کی رسم ہے کیونکہ جاہلیت میں آپس میں قتل و قتال بہت تھا۔ دلیل اس پر قرآن پاک کی آیت ہے جو سورہ حجرات کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (الی ان) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔

اگر دو گروہ مومنوں کے آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ کیونکہ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اِس آیت میں آپس میں لڑنے والوں کو مومن فرمایا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ آپس میں لڑنے سے انسان اِسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اِس لئے امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اِس آیت سے خارجیوں کی تردید کی ہے جو کبیرہ گناہ کرنے والے پر کفر کا فتویٰ دیتے ہیں ملاحظہ ہو بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیۃ صہ۹ مع فتح الباری)

لڑنے والوں پر مسلم کا اطلاق

اور اس کی تائید بخاری کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی بابت فرمایا۔

اِنَّ ابْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (مشکوٰۃ باب مناقب اھل البیت فصل اوّل)

میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اُمید ہے خدا تعالےٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے۔

اِس حدیث کی پیشگوئی ۴۱ھ میں پوری ہوئی۔ اِن دونوں جماعتوں سے مراد حضرت حسنؓ اور معاویہؓ کی جماعت ہے۔ اِس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ جب شہید ہوگئے تو اہلِ کوفہ نے حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر معاویہ رضؓ سے لڑائی کے ارادے پر بیعت کی۔ چالیس ہزار کی فوج جنہوں نے حضرت علی کے ہاتھ پر موت کی شرط کرتے ہوئے بیعت کی تھی وہ سب حضرت حسنؓ کے ساتھ شامل ہوگئے۔ لیکن حضرت حسن رضؓ کی طبیعت صلح پسند تھی۔ فتنہ سے طبعاً متنفر تھے۔ آخر دنیا اور حکومت کو خیرباد کہہ کر عزلت نشین ہوگئے۔ اور

معاویہؓ سے صلح کرلی۔ آپ کی جماعت میں بعض تیز طبیعت بھی تھے۔ انہوں نے جوش بھرے لہجہ میں کہا سَوَّدْتَ وجوہ المومنین۔ ”تو نے مومنوں کے چہرے سیاہ کر دیئے۔ یعنی معاویہ سے صلح کرکے ہمیں ذلیل اور رسوا کر دیا اور ہماری آبرو خاک میں ملا دی۔ تیری اس صلح سے ہم اپنے ارادوں سے ناکام ہو گئے۔ حضرت حسنؓ نے اس کا جواب ایسا پُر درد اور مخلصانہ اور نصیحت آموز دیا جس سے سخت دل موم ہو کر آنکھوں میں آنسو آ گئے فرمایا ”اِخْتَرْتُ الْعَارَ عَلَی النَّارِ“ میں نے عار کو آگ پر پسند کیا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اِذَا الْتَقَی المسلمان بِسَیْفَیْہِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِی النَّارِ۔

جب دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں ملتے ہیں تو قاتل مقتول دونوں جہنمی ہیں۔

اس قسم کی احادیث سے میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ میری وجہ سے مسلمان آپس میں لڑیں تو ایسا نہ ہو کہ ان کے خون میری گردن میں ہوں اور میں جہنم کا ایندھن ہوں۔ اس آگ کے برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں جس کی بابت سرورِ کائنات فرماتے ہیں۔ اس کی گرمی دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ ہے اس لئے میں نے دنیا کی عار کو اس آگ پر ترجیح دی ہے۔ نیز صلح کے وقت بالبدیہہ حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ اما بعد

یَا اَیُّھَا النَّاسُ فَاِنَّ اللّٰہَ قَدْ ھَدَاکُمْ بِاَوَّلِنَا وَحَقَنَ دِمَائَکُمْ بِاٰخِرِنَا وَاِنَّ لِھٰذَا الْاَمْرِ مُدَّۃً وَالدُّنْیَا دُوَلٌ وَاِنَّ اللّٰہَ قَالَ لِنَبِیِّہٖ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّہٗ فِتْنَۃٌ لَّکُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۔ (تاریخ ابن جریر جلد ۶ صفحہ ۹۳)

اے لوگو! خدا نے ہمارے اول (محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے ساتھ تمہیں گمراہی سے نکالا اور ہمارے آخر کے ساتھ (جس کا میں بھی ایک فرد ہوں) تمہارے خونوں کو روکا اور یہ حکومت چند روزہ ہے۔ اور یہ دنیا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلی جانے والی ہے اور خدا نے اپنے نبیؐ کو فرمایا ہے شاید کہ یہ دنیا کی ڈھیل اور مہلت تمہارے لئے ایک آزمائش ہے اور تھوڑے عرصہ کا متاع اور فائدہ ہو۔

دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں بھی اپنا اتنا خوف عطا فرمائے جو ہمارے اور خدا کی نافرمانی کے درمیان حائل ہو جائے اور ہمارے اختلافات و نزاعات کی وسیع خلیج کو پاٹ کر محبت اور مودت کا راستہ صاف کر دے تاکہ جماعت منظم ہو کر ید اللہ علی الجماعۃ کی مصداق ہو جائے اور اپنی شان کے شایاں کوئی کام کر سکے جس میں اس کی بہبودی اور فلاح دارین ہو۔ آمین۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

بے نماز کی تعریف

سوال :۔ بے نماز کس کو کہتے ہیں۔ کیا بے نماز ہمیشہ تارک الصلوٰۃ کو کہا جاتا ہے یا جو چند یوم نماز پڑھے پھر چھوڑ دے یا جو صرف جمعہ اور نماز پڑھے باقی نمازیں نہ پڑھے۔ ایسے لوگوں پر نماز جنازہ ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی امام یا عالم نماز جنازہ نہ پڑھے تو اس کا یہ عمل شرعی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اگر بے نماز پر نماز جنازہ نہ پڑھنے کی صورت میں شرارتی افراد مسجد کے نام سے کوئی عمارت الگ بنالیں تو اس مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے کیا وہ مسجد ضرار تو نہیں ؟

جواب :۔ جن دنوں میں کوئی نماز پڑھے۔ ان دنوں میں مرجائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے ورنہ نہیں۔ کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور جو بے نماز کا جنازہ نہ پڑھے وہ عین حق پر ہے اور اس وجہ سے جو مسجد بنائی جائے وہ مسجد ضرار ہے کیونکہ اس کی بنیاد حق پر نہیں بلکہ تفریق اور ضرر کے لئے ہے۔

عبداللہ امرتسری ۸ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ ۱۸ مئی ۱۹۴۰ء

بے نماز اور اُس کی اولاد کا حکم

سوال :۔ بے نماز کا جنازہ پڑھنا کیسا ہے۔ اور بے نماز کی اولاد کا کیا حکم ہے۔ کیا انہیں ھم من اٰبائھم کے تحت کر دیا جائے۔؟

جواب :۔ بے نماز کا جنازہ نہ پڑھنا چاہئے جس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ بے نماز کافر ہے اور کافر کی نماز جنازہ نہیں ہوتی۔

دوم۔ بے نمازوں کو تنبیہ ہو جائے گی۔ جیسے خودکشی کرنے والے پر اور مقروض پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ نہیں پڑھی حالانکہ خودکشی اور قرض سے ترک نماز بڑا گناہ ہے۔ بس اس کی وجہ سے بطریق اولیٰ نماز جنازہ ترک ہونی چاہیئے۔ رہا بے نماز کی اولاد کا مسئلہ تو اس کے متعلق ظاہراً حکم حدیث ھم من اٰبائھم۔ وہ اپنے باپوں سے ہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ نماز جنازہ نہ پڑھے کیونکہ کافروں کی اولاد ظاہری احکام میں ماں باپ ہی کے تابع ہوتی ہیں لیکن حدیث ھم من اٰبائھم میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق تقدیر کے مسئلہ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جیسے کفار جہنمی ہیں۔ ان کی اولاد کی بابت بھی تقدیر میں فیصلہ ہو

چکا ہے کہ وہ جہنمی ہے۔ دوم یہ کہ وہ جہنمی نہیں بلکہ ظاہری احکام شرعی کفن دفن نماز جنازہ نہ ہونے ہیں وہ کفار کے حکم میں ہے۔ اِس طرح جنگ میں اتفاقیہ مارے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ نیز وہ غنیمت کے مال میں آکر غلام لونڈیاں ہوجاتے ہیں۔ غرض اس قسم کے احکام میں وہ کافر سمجھے جاتے ہیں آخرت میں خواہ وہ جنتی ہوجائیں

اگر دوسرا احتمال لیں تو بے نماز کا جنازہ نہ پڑھنا چاہیئے۔ اگر پہلا احتمال لیں تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کی طرح جہنمی ہیں۔

دُوسرا یہ کہ آخر نکالے جائیں گے

چنانچہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہیں۔ اگر پہلی صورت لیں تو بے نماز کی اولاد کا جنازہ نہ پڑھنا چاہیئے۔ اگر دوسری صُورت لیں تو پڑھنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

ممکن ہے کہا جائے کہ جب بے نماز کافر ہے تو اس کا حکم باقی کفار کی اولاد کی طرح ہونا چاہیے۔ خواہ حدیث ھم من اباٗھم۔ تقدیر کے مسئلہ سے متعلق ہو یا احکام ظاہری سے جواب اس کا یہ ہے کہ ہندو یا عیسائی وغیرہ کے کفر سے کوئی انکار کرے تو وہ کافر ہوجاتا ہے۔ بے نماز کے کفر سے انکار کرنے والا کافر نہیں کیونکہ اس کے کفر میں سلف کے زمانہ سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے۔ گویا بے نماز کے کفر کا ثبوت ظنی ہے اور باقی کفار کے کفر کا ثبوت قطعی ہے اور ظاہر ہے کہ دُوسرے شخص کو محض تابع ہونے کی وجہ سے کافر کہنا ذرا مشکل ہے لیکن قطعی کفر کے متعلق چونکہ اجماع ہے کہ اولاد تابع ہو کر ظاہری احکام کے لحاظ سے کافر کہلاتی ہے اور ظنی کفر کی بابت اجماع ثابت نہیں۔ اِس لئے بے نماز کی اولاد اور باقی کفار کی اولاد میں فرق کی گنجائش ہے۔

پس اگر حدیث ھم من اباٗھم۔ ظاہری احکام سے متعلق ہو تو بے نماز کی اولاد کو اس کے تحت لا کر کہا جاسکتا ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں۔ ورنہ محض تابع سمجھ کر کافر کہنا اور نماز جنازہ کی نفی کرنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں بے نماز کی تنبیہ کے لئے اس کی اولاد پر نماز جنازہ ترک کر دی جائے تو اس کی گنجائش ہر صورت میں ہے خواہ حدیث ھم من اباٗھم ظاہری احکام سے متعلق ہو یا نہ ہو۔

تنبیہ

اِس تحقیق سے ایک اور مسئلہ بھی محقق ہوگیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر بے نماز کے نکاح میں نمازی عورت ہو تو ان کی اولاد حرام کی ہونی چاہیئے کیونکہ بے نماز کافر ہے اور کافر کے نکاح میں مسلمہ نہیں رہ سکتی تو ایسا ہوگیا جیسے کسی نے بے نکاحی عورت رکھی ہو مگر چونکہ بے نماز کا کفر ظنی ہے اس لئے اس کی اولاد کو ولد الحرام کہنے میں ذرا احتیاط

چاہیئے۔ ہاں خطرے کا مقام بڑا ہے کیونکہ کفر خواہ ظنی ہو بڑے خطرے والی شی ہے کہ کہیں ایسے مرد عورت کا تعلق حرام ہو کر اولاد بھی حرام کی نہ ہو جائے خدا اس سے بچائے اور بے نمازوں کو نماز پڑھنے کی توفیق دے۔ تاکہ ان کی اولاد ولد الحرام کے خطرہ میں نہ پڑے۔ آمین

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۸ شوال ۱۳۶۹ھ ۱۵ اپریل ۱۹۶۰ء

بے نماز کے گھر سے کھانے کا حکم

سوال :۔ بے نماز کے گھر سے کھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب :۔ بے نماز کی بابت صحیح یہی ہے کہ بالکل کافر ہے۔ پس اس کے ساتھ کافروں کا سا سلوک چاہیئے۔ اور کفار کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ ان کے برتن بھی دھو کر برتے۔ ہاں مجبوری کی حالت میں اُن کے کھانے کا کوئی حرج نہیں۔ اور جن کے نزدیک بے نماز کافر نہیں۔ اُن کے نزدیک فاجر و فاسق ہوتے ہیں کوئی شبہ نہیں۔ پس قابل نفرت ضرور ہے۔ اور جو لوگ ایسے فاجر و فاسقوں سے نفرت نہیں کرتے ان کا ایمان خطرہ میں ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

طعن کی وجہ سے نماز چھوڑنا

سوال :۔ چونکہ آج کل حاجی اور نمازی اکثر مطعون ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی نمازی خدانخواستہ نماز وغیرہ چھوڑ دے تو کچھ سزا کا مستحق ہوگا؟

جواب :۔ نماز کا تارک کافر ہے۔

حدیث میں ہے۔ من ترك الصلوٰة متعمدا فقد كفر۔ (ترغیب ترہیب ص۹۵)

یعنی جو دیدہ دانستہ نماز ترک کر دے وہ علانیہ کافر ہے۔

جس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں اور جب کافر ہوا تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ ۲۹ مارچ ۱۹۳۵ء

بے نماز کے کافر تحقیقی ہونے پر بعض شبہات اور ان کا جواب

سوال :۔ اکثر اہل حدیث تارک الصلوٰۃ کو کافر اور خارج عن الاسلام کہتے ہیں۔ اور آیات و احادیث میں سے دلائل بیان کرتے ہیں مگر مندرجہ ذیل احادیث کا ان لوگوں کے پاس کیا جواب ہے جو بے نماز کو کافر کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ احادیث عدم کفر حقیقی و عدم خارج از اسلام پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں اور وہ یہ احادیث ہیں :۔

پہلی حدیث[1] :۔ عَنِ ابْنِ مُحَيْرِيزٍ اَنَّ رَجُلاً مِنْ بَنِيْ كِنَانَةَ يُدْعٰى اَلْمُخْدَجِيَّ سَمِعَ رَجُلاً بِالشَّامِ يُكْنٰى اَبَا مُحَمَّدٍ يَقُوْلُ اِنَّ الْوِتْرَ وَاجِبٌ قَالَ الْمُخْدَجِيُّ فَرُحْتُ اِلٰى عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ عُبَادَةُ كَذَبَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَمْسُ صَلَوَاتٍ كَتَبَهُنَّ اللّٰهُ عَلَى الْعِبَادِ فَمَنْ جَاءَ بِهِنَّ لَمْ يُضَيِّعْ مِنْهُنَّ شَيْئًا اِسْتِخْفَافًا بِحَقِّهِنَّ كَانَ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا اَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَمَنْ لَّمْ يَاْتِ بِهِنَّ فَلَيْسَ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدٌ اِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَاءَ اَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ ۔

یعنی ابن محیریز سے روایت ہے کہ ایک شخص بنی کنانہ سے جس کو مخدجی کہا جاتا ہے اس نے ایک شخص سے سنا جس کی کنیت ابو محمد ہے وہ کہتا ہے کہ وتر واجب ہے۔ مخدجی نے کہا کہ میں عبادہ بن صامت کے پاس گیا۔ اس کو خبر دی عبادہ نے کہا وہ جھوٹا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بندوں پر پانچ نمازیں لکھی ہیں۔ اگر وتر واجب ہو تو چھ ہو جائیں گی) پس جس نے ان کو ادا کیا۔ اور ان کے حق کو ہلکا سمجھ کر ان سے کچھ ضائع نہ کیا تو اللہ تعالےٰ پر عہد ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے اور جس نے ان کو اس طرح سے ادا نہ کیا اُس کی بابت اللہ تعالےٰ کے پاس کوئی عہد نہیں۔ اگر چاہے اس کو عذاب دے اگر چاہے جنت میں داخل کر دے۔

دوسری حدیث[2] :۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ثَلَاثَةُ دَوَاوِيْنَ لَا يَعْبَاُ اللّٰهُ بِهٖ شَيْئًا وَدِيْوَانٌ لَا يَتْرُكُ اللّٰهُ مِنْهُ شَيْئًا

---

[1] یہ حدیث موطا امام مالک۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ دارمی میں ہے۔

[2] یہ حدیث مسند احمد میں ہے۔

وَدِیْوَانٌ لَا یَغْفِرُہُ اللّٰہُ فَاَمَّا الدِّیْوَانُ الَّذِیْ لَا یَغْفِرُہُ اللّٰہُ شَیْئًا فَالشِّرْکُ بِاللّٰہِ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ وَاَمَّا الدِّیْوَانُ الَّذِیْ لَا یَعْبَأُ اللّٰہُ بِہٖ شَیْئًا فَظُلْمُ الْعَبْدِ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ رَبِّہٖ مِنْ صَوْمِ یَوْمٍ تَرَکَہٗ اَوْصَلٰوۃٍ تَرَکَہَا فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَغْفِرُ ذَالِکَ وَیَتَجَاوَزُ اِنْ شَاءَ وَاَمَّا الدِّیْوَانُ الَّذِیْ لَا یَتْرُکُ اللّٰہُ مِنْہُ شَیْئًا فَظُلْمُ الْعِبَادِ بَعْضِہِمْ بَعْضًا الْقِصَاصُ لَا مُحَالَۃَ۔

یعنی عائشہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ کے ہاں تین دفتر ہیں ایک دفتر کی خدا کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ ایک دفتر سے خدا کچھ نہیں چھوڑے گا۔ اور ایک دفتر خدا معاف نہیں کریگا جس کو وہ معاف نہیں کریگا وہ شرک کا دفتر ہے (چنانچہ) ارشاد ہے جو شرک کرے خدا نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے جس دفتر کی خدا پرواہ نہیں کرتا وہ ان گناہوں کا دفتر ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہیں۔ جیسے کسی نے روزہ چھوڑ دیا یا کوئی نماز چھوڑ دی۔ اگر خدا چاہے تو معاف کر دے گا۔ اور جس دفتر سے خدا کچھ نہیں چھوڑے گا وہ حق العباد کا دفتر ہے۔ بندوں نے جو ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے اُس کا بدلہ دلایا جائے گا کسی صورت اُس کی معافی نہیں ہو سکتی۔

ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۱۱۳ میں سند رجہ ذیل حدیث ہے جو مذکورہ حدیث کی تائید کرتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلظُّلْمُ ثَلَاثَۃٌ فَظُلْمٌ لَا یَغْفِرُہُ اللّٰہُ وَظُلْمٌ یَغْفِرُہُ اللّٰہُ وَظُلْمٌ لَا یَتْرُکُ اللّٰہُ مِنْہُ شَیْئًا فَاَمَّا الظُّلْمُ الَّذِیْ لَا یَغْفِرُہُ اللّٰہُ فَالشِّرْکُ وَقَالَ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ وَاَمَّا الظُّلْمُ الَّذِیْ یَغْفِرُہُ اللّٰہُ فَظُلْمُ الْعِبَادِ لِاَنْفُسِہِمْ فِیْمَا بَیْنَہُمْ وَبَیْنَ رَبِّہِمْ وَاَمَّا الظُّلْمُ الَّذِیْ لَا یَتْرُکُہٗ فَظُلْمُ الْعِبَادِ بَعْضُہُمْ بَعْضًا حَتّٰی یَدِیْنَ لِبَعْضِہِمْ مِنْ بَعْضِہِمْ۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ظلم خدا معاف نہیں کرے گا۔ اور ایک ظلم (اگر خدا چاہے تو) معاف کرے گا۔ اور ایک ظلم سے خدا کچھ نہیں چھوڑے گا۔ جو ظلم خدا معاف نہیں کرے گا وہ شرک ہے۔ خدا فرماتا ہے شرک بہت بڑا ظلم ہے جو ظلم خدا چاہے تو معاف کر دے گا وہ بندوں کے اپنی جانوں پر ظلم ہیں جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہیں۔ اور جو ظلم خدا نہیں چھوڑے گا وہ بندوں کے آپس میں ظلم ہیں وہ نہیں چھوڑیگا یہاں تک

کہ ایک دوسرے سے بدلہ دلائے گا۔

خط کشیدہ عبارت سے حقوق اللہ بھی مراد ہیں کہ جن کا تعلق براہ راست خدا تعالےٰ اور بندہ سے ہے اور حقوق اللہ سے جو حق قابلِ مغفرت نہیں ہے اس کو جدا بیان کر دیا ہے۔ پس اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں کچھ فرق نہیں مگر یہی کہ بندگان اور خدا تعالےٰ کے درمیان جو حقوق ہیں وہ قابل معافی ہیں ان کو تمثیل سے سمجھا دیا ہے اور اس میں اشارت سے کام لیا ہے۔ مآل دونوں کا ایک ہی ہے۔ پس یہ دونوں احادیث صریح ہیں کہ ترک الصلوٰۃ بھی دیگر کبائر کی طرح ایک کبیرہ گناہ ہے اور کبائر کے لئے اہل سنّت کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی مشیّت پر موقوف ہے اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو ابتدا ہی سے بخش کر جنّت میں داخل کرے جیساکہ بکثرت آیات و احادیث سے اہل سنّت اس عقیدہ کو ثابت کرتے ہیں۔ منجملہ ان کے حدیث عبادہ بن صامت ہے جو مشکوٰۃ کتاب الایمان اور بخاری کتاب الایمان میں ہے۔ اس طرح یہ حدیث عبادہؓ اور حدیث عائشہ رضؓ تارک الصلوٰۃ کے لئے بھی ایسا ہی ثابت کرتی ہیں۔

الغرض جو لوگ تارک الصلوٰۃ کے کفر کے قائل ہیں۔ ان ہر دو احادیث کا صحیح کیا جواب دیتے ہیں۔

(مولوی سراج الدین از جودھپور)

جواب :۔ آپ نے تین حدیثیں پیش کی ہیں۔ اخیر کی دو ایک ہی مضمون کی ہیں۔ اور پہلی الگ ہے۔ اس حدیث میں لفظ یا ت بھن محل استدلال ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ اوّل یہ کہ نفس نماز ادا نہ کرے دوم یہ کہ کامل علی وجہ المطلوب شرعًا ادا نہ کرے۔ جب دو احتمال پیدا ہوئے تو ایک کی تعیین ضروری ہے ورنہ استدلال باطل ہے۔

ہم اس حدیث میں احتمال ثانی کو معین کرتے ہیں کہ مراد اس سے یہ ہے کہ کامل علی وجہ المطلوب شرعًا ادا نہ کرے اور نوافل سے اس کا تدارک بھی نہ ہو سکے تب وہ مشیّت ایزدی میں ہے۔ ہم اپنی توجیہ کے لئے انہی عبادہؓ کی دوسری حدیث پیش کرتے ہیں کیونکہ قاعدہ ہے۔ الاحادیث یفسر بعضہا بعضا۔

عَنْ عُبَادَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَھُنَّ اللّٰہُ تَعَالٰی مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْءَھُنَّ وَصَلَّاھُنَّ لِوَقْتِھِنَّ وَاَتَمَّ رُکُوْعَھُنَّ وَسُجُوْدَھُنَّ وَخُشُوْعَھُنَّ کَانَ لَہٗ عَلَی اللّٰہِ عَھْدٌ اَنْ یَّغْفِرَ لَہٗ وَمَنْ لَّمْ یَفْعَلْ فَلَیْسَ لَہٗ عَلَی اللّٰہِ عَھْدٌ اِنْ شَاءَ غَفَرَ لَہٗ وَاِنْ شَاءَ عَذَّبَہٗ ۔ (ابوداؤد)

یعنی عبادہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پانچ نمازیں اللہ تعالےٰ نے فرض کی ہیں جو شخص اچھا وضو کرے اور ان کو وقت پر پڑھے اور رکوع وسجود پورا کرے اور خشوع بھی پورا کرے اس کے لئے اللہ تعالےٰ کے نزدیک عہد ہے کہ اس کو بخشے گا اور جس نے ایسا نہ کیا اس کے لئے اللہ تعالےٰ کے نزدیک عہد نہیں خواہ بخشے خواہ عذاب کرے۔

یہ حدیث عبادہ کی پہلی حدیث کی تفسیر ہے کہ کامل نماز ادا نہ کرے تو مشیت الٰہی میں ہے۔ اگر احتمال اول لیا جائے تو عبادہؓ کی اس حدیث کے جس میں فقد خرج عن الملۃ وارد ہے۔ خلاف ہوگا اور علاوہ اس کے ان حدیثوں کے بھی خلاف ہوگا جن میں بے نماز کے کافر ہونے کی تصریح ہے اور تاویل کی گنجائش نہیں۔ ہاں اس حدیث کی تفسیر کے لئے ایک اور حدیث بھی ملا لیجئے تاکہ مطلب بالکل صاف ہو جائے۔

ابن ماجہ صـ۱۰۲ باب ماجاء فی فرض الصلوٰۃ الخمس والمحافظہ علیھا میں ان ہی عبادہؓ سے یوں مروی ہے۔

قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ عَلٰی عِبَادِهٖ فَمَنْ جَاءَ بِهِنَّ لَمْ يَنْتَقِصْ مِنْهُنَّ شَيْئًا استخفافا بحقهن فانّ الله جاعل له يوم القيامة عهدًا اَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَمَنْ جَاءَ بِهِنَّ قَدِ انْتَقَصَ مِنْهُنَّ شَيْئًا استخفافا بحقهنّ لم يكن له عِنْدَ اللّٰهِ عهد اِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهٗ۔

یعنی عبادہؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ نے فرمایا خدا نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں جس نے ان کو ادا کیا اور سستی سے ان میں کچھ کمی نہ کی تو اللہ پر اس کے لئے عہد ہے کہ اُس کو جنت میں داخل کرے۔ اور جس نے ان کو ادا کیا اور سستی سے ان میں نقص ڈال دیا تو اس کے لئے اللہ پر کوئی عہد نہیں خواہ اس کو عذاب دے خواہ بخشے۔

ابن ماجہ کے اسی صفحہ میں ایک حدیث قدسی وارد ہے۔

جس کے الفاظ یہ ہیں۔

وَعَهِدْتُّ عِنْدِيْ عَهْدًا اَنَّهٗ مَنْ حَافَظَ عَلَيْهِنَّ لِوَقْتِهِنَّ اَدْخَلْتُهُ الْجَنَّةَ

وَمَنْ لَمْ يُحَافِظْ عَلَيْهِنَّ فَلَا عَهْدَ لَهٗ عِنْدِیْ۔
یعنی اللہ تعالےٰ نے فرمایا جو ان نمازوں کے وقت پر محافظت کرے اُس کے لئے بخشش کا عہد ہے۔
جو وقت پر محافظت نہ کرے اُس کے لئے بخشش کا عہد نہیں "
ترغیب ترہیب ص۸۱ باب الصّلوٰۃ فی اَوَّلِ وَقْتِهَا میں کعب بن عجرہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمْ يقول مَنْ صَلَّى الصلوٰة لِوَقْتِهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا وَلَمْ يضيعها استخفافا بحقها فله علی عهد ان ادخله الجنة ومن لم يصلها وقتها ولم يحافظ عليها وضيعها استخفافا بحقها فلا عهد له علی ان شئت عذبته وان شئت غفرت له۔ رواه الطبرانی فی الكبير والاوسط واحمد بنحوه۔

یعنی "خدا تعالےٰ فرماتا ہے جو نماز وقت پر ادا کرے اور اُس کی محافظت کرے اور سستی سے اُس کو ضائع نہ کرے اُس کے لئے میرے ذمے عہد ہے کہ میں اُس کو جنّت میں داخل کروں۔ اور جو وقت پر نہ پڑھے نہ اُس پر محافظت کرے اور سستی سے اُس کو ضائع کرے اُس کے لئے میرے ذمے کوئی عہد نہیں۔ خواہ میں اُس کو عذاب دوں خواہ بخش دوں "
ترغیب ترہیب کے اسی مقام پر ایک اور حدیث قدسی ہے جس کے راوی عبد اللہ بن مسعودؓ ہیں اُس کے الفاظ یہ ہیں :۔

وعزتی وجلالی لا يصليها احد لوقتها الا ادخلته الجنة ومن صلاها لغير وقتها ان شئت رحمته وان شئت عذبته۔ رواه الطبرانی فی الكبير اسناده حسن انشاء اللہ تعالٰی۔

یعنی " مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم، کوئی نماز کو وقت پر نہیں پڑھے گا مگر اس کو جنّت میں داخل کروں گا، اور جو بے وقت پڑھے اُس کو خواہ رحم کروں یا عذاب دُوں "۔ روایت کیا اس کو طبرانیؒ کبیر میں اس کے اسناد حسن ہیں "
الغرض اس حدیث عبادہؓ سے مطلقاً نماز چھوڑنے پر مشیت مغفرت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اُس شخص

کے لئے ہے جو نماز کو وقت پر اچھی طرح ادا نہ کرے۔ اور اس میں قصور کرے۔ اگر بالفرض دوسری احادیث عبادہ رضہ کی اس پہلی حدیث کی تفسیر نہ کرتیں تو بھی عبادہ رضہ کی پہلی حدیث میں دو احتمال بے نماز کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے مانع تھے۔ کیوں؟ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور جب ثانی احتمال دوسری احادیث سے متعین ہو گیا تو اب بطریق اولیٰ استدلال صحیح نہ ہو گا۔

دوسری اور تیسری حدیث کا جواب

پہلی حدیث میں لفظ لم یات بھن ہے اور دوسری تیسری حدیث میں لفظ ترک ہے اور ظاہر ہے کہ حاصل مطلب ان دونوں لفظوں کا ایک ہی ہے کیونکہ لم یات بھن کا مطلب بھی نہ پڑھنا ہے اور ترک کے معنی بھی نہ پڑھنا ہے۔ پس جیسے لم یات بھن میں دو احتمال تھے۔ ایک مطلقاً نہ پڑھنا۔ ایک پوری طرح وقت پر محافظت کے ساتھ نہ پڑھنا۔ اسی طرح ترک میں بھی یہی دو احتمال ہیں ایک مطلقاً چھوڑ دینا ایک پوری محافظت چھوڑ دینا۔ اور اوپر ابھی ذکر ہوا ہے کہ دو احتمال کی صورت میں بے نماز کے مسلمان ثابت کرنے پر استدلال صحیح نہیں۔ کیوں؟ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

اس کے علاوہ جیسے عبادہ رضہ کی حدیث میں دوسری احادیث سے ثانی احتمال متعین تھا ان دو حدیثوں میں بھی ثانی احتمال معین ہے۔ ابن ماجہ میں انس رضؓ سے روایت ہے۔

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ بَیْنَ الْعَبْدِ وَالشِّرْكِ اِلَّا تَرْكُ الصَّلٰوۃِ فَاِذَا تَرَكَھَا فَقَدْ اَشْرَكَ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندے اور شرک کے درمیان نماز چھوڑ دینے کا فرق ہے جب نماز چھوڑ دے گا تو مشرک ہو جائے گا۔

اور بریدہ رضؓ سے روایت ہے۔

قَالَ سَمِعْتُ رَسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول العھد الذی بیننا وبینھم الصّلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر ۔ رواہ الاربعۃ

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا مشرکین اور ہمارے درمیان جو کچھ عہد ہے وہ نماز ہے جو نماز ترک کر دے وہ کافر ہے۔

اِس قسم کی بعض اور احادیث بھی ہیں۔ اِن سے مطلع صاف ہو گیا کیونکہ جب ترک نماز شرک یا کفر ہوا تو یہ اس دفتر سے ہوا جو خدا معاف نہیں کرے گا۔

ایک اور حدیث اور اُس کا جواب

آپ کی پیش کردہ احادیث کا جواب تو ہو چکا اب ہم اپنی طرف سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں اور اُس کا جواب دیتے ہیں۔ مستدرک حاکم میں ہے۔

قال حذیفة یَنْدَرِسُ الْاِسْلَامُ کَمَا یَنْدَرِسُ الثَّوْبُ الْخَارِقُ حَتّٰی یَصِیْرَ مَا یَدْرُوْنَ صَلٰوۃً وَلَا صِیَامًا وَلَا نُسُکًا غَیْرَ اَنَّ الرَّجُلَ وَالْعَجُوْزَ یَقُوْلُوْنَ قَدْ اَدْرَکْنَا النَّاسَ وَهُمْ یَقُوْلُوْنَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالَ صِلَةُ بْنُ زُهَرَ وَمَا یُغْنِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یَا حُذَیْفَةُ وَهُمْ لَا یَدْرُوْنَ صَلٰوۃً وَلَا صِیَامًا وَلَا نُسُکًا قَالَ حُذَیْفَةُ یَا صِلَةُ یُنْجُوْنَ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ هذا حدیث صحیح علی شرط مسلم ولم یخرجاہ (مستدرک جلد ۴ ص۵۰۵)

یعنی "حذیفہ رضؓ نے کہا اسلام مٹ جائے گا جیسے پُرانا کپڑا مٹ جاتا ہے یہانتک کہ اسلام کی حالت یہ ہو گی کہ نہ لوگ نماز جانیں گے نہ روزہ نہ قربانی۔ ہاں اتنا ہو گا کہ پُرانے مرد و عورت کہیں گے کہ ہم نے لوگوں کو لا الٰہ اِلّا اللہ پڑھتے پایا۔ حذیفہ رضؓ کے شاگرد صلہ بن زمر نے کہا اے حذیفہ جب وہ نماز روزہ اور قربانی نہیں جانیں گے تو لا الٰہ الا اللہ ان کو کیا فائدہ دے گا؟ حذیفہ رضؓ نے کہا اے صلہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ آگ سے نجات پائیں گے۔"

یہ حدیث مستدرک حاکم میں دو جگہ ہے۔ ایک صفحہ محوّلہ پر اور ایک جگہ چند صفحات اس سے پہلے۔ امام ذہبیؒ نے تلخیص مستدرک حاکم میں اس پر کوئی کلام نہیں کی تو گویا حاکم کے صحیح کہنے کو برقرار رکھا جس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ کے بغیر صرف لا الٰہ الا اللہ سے بھی نجات ہو سکتی ہے اور جب صرف لا الٰہ الا اللہ سے بھی نجات ہو سکتی ہے تو مسلمان ہونے کے لئے صرف لا الٰہ الا اللہ کافی ہوا کیونکہ کافر کے لئے نجات نہیں۔

اِس حدیث کا جواب یہ ہے کہ نماز ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے فرض ہوئی۔ اس سے پہلے لا الٰہ الا اللہ

کافی تھا۔ اسی طرح جب ایسا وقت آجائے کہ علم بالکل اٹھ جائے اور احکام اسلام کا پتہ ہی نہ رہے۔ صرف پرانے لوگوں اور عمر رسیدہ کو لا الہ الا اللہ کی بابت اتنا معلوم ہو کسی زمانے میں لوگ یہ کلمہ پڑھتے تھے تو ایسی حالت میں بے شک لا الہ الا اللہ کافی ہوگا۔ اور ایسی حالت یہی سمجھا جائے گا کہ نماز ان پر فرض ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ فرضیت حکم کے علم کے بعد ہوتی ہے۔ پس یہ ایسا ہوگیا جیسے نماز فرض ہونے سے پہلے لا الہ الا اللہ کافی تھا۔ اور اس کی تائید حدیث کے آخری ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ آگ سے نجات پائیں گے۔ اور مشکوٰۃ باب الرکوع میں روایت ہے ایک شخص کو حذیفہ نے دیکھا کہ رکوع وسجود پورا نہیں کرتا تو فرمایا۔

لَوْ مُتَّ مُتَّ علی غیر الفطرۃ الّتی فطر اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم

رواہ البخاری۔

یعنی اگر تو اس حالت پر مرجاتا تو غیر فطرت پر مرتا جس پر خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔

جب رکوع وسجود پورا نہ کرنے والا حذیفہ کے نزدیک غیر فطرت پر مرتا ہے تو جو بالکل نماز نہ پڑھے وہ ناجی کس طرح ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف لا الہ الا اللہ کو کافی سمجھنا اسی بنا پر ہے کہ بوجہ علم نہ ہونے کے وہ ایسے ہوگئے۔ جیسے نماز ان پر فرض ہی نہ تھی جیسے ہجرت سے پہلے فرض نہ تھی۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۲۲ محرم ۱۳۵۴ھ - ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء

بے نماز کی جنازہ میں شرکت

سوال:۔ جنازہ کیساتھ بے نماز کو شامل ہونا کیوں منع ہے؟ سائل فتح دین

جواب:۔ بے نماز کو جنازہ میں شامل ہونے سے ممانعت نہیں بلکہ بے نماز کے جنازہ میں شامل ہونے سے ممانعت ہے۔ ہاں بے نماز چونکہ کافر ہے اس لئے اُس کا جنازہ میں شریک ہونا کچھ مفید نہیں

عبداللہ امرتسری روپڑ ۷ محرم ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ مارچ ۱۹۳۸ء

بے نماز اور عیسائی میں فرق

سوال :۔ ایک شخص مسلمان ہے لیکن وہ نماز نہیں پڑھتا یا وہ کبھی نماز پڑھتا ہے کبھی چھوڑ دیتا ہے ۔ یہ مسلمان عیسائی سے اچھا ہے یا عیسائی بے نماز مسلمان سے اچھا ہے ۔ بے نماز کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے کا کیا حکم ہے ۔

جواب : بے نماز کے متعلق اختلاف ہے کہ کافر ہے یا نہیں ۔ صحیح یہی ہے کہ کافر ہے ۔ رہا بے نماز اور عیسائی میں فرق ۔ سو اتنا ہو سکتا ہے کہ عیسائی خنزیر کھاتا ہے ۔ مردار سے پرہیز نہیں کرتا ۔ اسی طرح جنابت سے غسل نہیں کرتا ۔ اس قسم کی بہت سی اشیاء ہیں ۔ جن میں بے نماز عیسائی سے ممتاز ہے ۔ اس بنا پر بے نماز کو عیسائی سے پرہیز کرنا چاہیئے ۔ رہا وہ شخص جو کبھی نماز پڑھتا ہے اور کبھی نہیں پڑھتا ۔ سو اس کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ کچھ مدت لگاتار پڑھتا ہے اور کچھ مدت لگاتار چھوڑ دیتا ہے اس کا حکم پڑھنے کے دنوں میں نمازی کا ہے اور ترک کے دنوں میں تارک کا ہے ۔ دوسرا یہ کہ کوئی نماز کسی وقت پڑھ لی ۔ کوئی نماز چھوڑ دی وہ بے نمازی ہے ۔ کیونکہ جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اس کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ اگلی نماز بھی پڑھوں گا ۔ گویا کہ وہ پڑھنے کے وقت تارک ہے ۔ اس لئے یہ بے نمازی ہے ۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جو نماز اس نے پڑھی ہے اس کے بعد دوسری نماز کا وقت آنے سے پہلے مر جائے تو یہ نمازی شمار ہوگا اور اس کا جنازہ پڑھ لیا جائے ۔ اور اگر دوسری نماز کا وقت آگیا اور باوجود پڑھ سکنے کے نہیں پڑھی تو پھر وہ بے نماز شمار ہوگا لیکن یہ احتمال نماز جنازہ کی گنجائش کے لئے ہے ورنہ اس کے ساتھ کھانے پینے میں غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ پرہیز کیا جائے ۔ کیونکہ زندہ کے لئے تنبیہ مناسب ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے اور مردہ کے لئے شفقت مناسب ہے کیونکہ اس کا عمل منقطع ہو چکا ہے

عبداللہ امرتسری روپڑی ماڈل ٹاؤن کوٹھی نمبر ۱۹ اسی لاہور ۹ شوال ۱۳۷۸ھ

صبح اور شام صرف دو نماز پڑھنا

سوال :۔ ایک مولوی صاحب نے مسئلہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اس نے آکر کہا کہ میں صبح اور عشا کی نماز ادا کروں گا اگر منظور ہو تو اسلام لاتا ہوں ۔ آپ نے اس کو دو نماز پڑھنے کی اجازت دے دی ۔ یہ حدیث کہاں ہے ۔ محمد طاہر ولد مولوی صدر دین سفیر مدرسہ غزنویہ

جواب :۔ یہ حدیث بالکل جھوٹ ہے کسی کتاب میں نہیں ہے ۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ

اوقات نماز

پنج وقتی نماز کے اوقات

سوال: حدیث کی رو سے پانچ وقتی نماز کے اوقات کیا کیا ہیں؟

جواب: ظہر کا وقت آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر ایک مثل (ہر شے کا سایہ اس کے برابر ہو جانے) تک ہے۔ دوپہر کا سایہ مثل میں داخل نہیں۔ عصر کا وقت ایک مثل پوری ہونے کے بعد جب تک سورج زرد نہ ہو۔ دھوپ زرد ہونے کے بعد جو نماز پڑھے گا اُس کی نماز ناقص ہوگی۔

مغرب کا وقت آفتاب غروب ہونے سے سرخی غروب ہونے تک ہے۔ اور عشاء کا وقت سرخی غروب ہونے کے بعد آدھی رات تک ہے۔ فجر کا وقت پوہ پھٹنے سے طلوعِ آفتاب تک ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

سونا اور بھولنا

سوال: سو کر یا بھول کر نماز رہ جائے تو کب پڑھے؟

جواب: جو شخص سو جائے یا بھول جائے جب جاگے یا یاد آئے وہی اُس کا وقت ہے۔ خواہ طلوعِ غروب کا وقت ہو۔ اور جس شخص سے کسی عذر کی بنا پر نماز فجر یا عصر مؤخر ہو گئی اور طلوع یا غروب سے پہلے اُس نے ایک رکعت پالی تو اُس کی ساری نماز وقت پر ادا ہوئی وہ اپنی نماز پوری پڑھے۔

دو نمازوں کو جمع کرنا

سوال: کیا ظہر و عصر اور مغرب عشا کو ایک دُوسرے کے وقت میں جمع کر کے پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب: بیماری، سفر، بارش یا اس قسم کا کوئی اور معقول عذر ہو تو جمع جائز ہے۔ جمع دو طرح کی ہے پچھلی نماز کو پہلی کے وقت میں پڑھنا جمع تقدیم ہے اور پہلی کو پچھلی نماز کے وقت میں پڑھنا جمع تاخیر ہے۔ سفر میں دونوں طرح کی جمع درست ہے۔ جب ظہر یا مغرب کا وقت ہو جائے اور اس وقت کوچ کرنے کا ارادہ ہو تو عصر کو ظہر کے ساتھ اور عشا کو مغرب کے ساتھ جمع کر سکتا ہے۔ اور اگر ظہر یا مغرب کا وقت ابھی نہیں ہوا۔ اور کوچ کا ارادہ ہو گیا تو ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ جمع کر سکتا ہے۔ سفر کے سوا کسی اور عذر کے

لئے جمع کے متعلق اس طرح کی تفصیل نہیں آئی۔ اس لئے بہتر ہے کہ سفر کے سوا جمع تقدیم نہ کرے کیونکہ پہلی نماز وقت سے پہلے اس پر واجب ہی نہیں ہوتی تو پہلے ادا کرنے کی کیا ضرورت؟ جب وقت ہوگا اس وقت ادا کرنے کی طاقت ہو تو ادا کرے ورنہ جب طاقت ہو اُس وقت ادا کرے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۵ محرم ۱۳۷۹ھ یکم اگست ۱۹۵۹ء

مکروہ اوقات

سوال:۔ وہ کونسے اوقات ہیں جن میں نماز پڑھنی مکروہ ہے؟

جواب:۔ دوپہر کے وقت جمعہ کے دن کے سوا اور نماز فجر کے بعد آفتاب بلند ہونے تک اور نماز عصر کے بعد آفتاب غروب ہونے تک سب جگہ نماز منع ہے ہاں مکہ میں ہر وقت درست ہے اور سببی نماز جو کسی سبب سے رہ جائے وہ بھی ہر وقت درست ہے۔ جیسے فجر کی سنتیں جماعت میں شامل ہونے کی وجہ سے رہ جائیں تو جماعت سے فراغت کے بعد پڑھ لے۔ اس طرح پو پھٹنے کے بعد نماز فجر سے پہلے سُنت فجر کے سوا کوئی نماز نہیں مگر سببی نماز جائز ہے مثلاً وتر رہ گئے ہوں تو پڑھ لے اسی طرح فرض نمازوں کی قضا کا حکم ہے

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۵ محرم ۱۳۷۹ھ

مکروہ اوقات میں حاجی گھر آئے تو ان اوقات میں نفل پڑھے

سوال:۔ سنت ہے کہ حاجی لوگ واپس آئیں تو اپنے گھر میں داخل ہونے سے قبل دو نفل پڑھ کر آئیں۔ اگر حاجی ایسے وقت اپنے گاؤں میں پہنچیں کہ اس میں نماز پڑھنی منع ہو تو نفل کیسے ادا کرے۔؟

جواب۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ سببی نماز ایسے وقت میں بھی جائز ہے جس میں نماز پڑھنی منع ہے مثلاً عصر کے بعد مسجد میں آئے تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے، وضو کرے تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کا سبب وضو ہے اور تحیۃ المسجد کا سبب مسجد میں داخل ہونا ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ کوئی نماز جائز نہیں کیونکہ ممانعت عام ہے اس میں سببی غیر سببی سب نماز داخل ہوگی۔ خلاصہ جواب یہ ہے کہ دلیل دونوں طرف ہے۔ اگر حاجی ایسے وقت میں نفل پڑھ لے تو حرج نہیں نہ پڑھے تو بھی مضائقہ نہیں مگر یہ ضرور کرے کہ سیدھا گھر نہ جائے مسجد میں یا کسی اور جگہ بیٹھ جائے لوگ ملاقات کر لیں اور دعا کرا لیں تاکہ اس حدیث پر عمل ہو جائے کہ حاجی کی دعا گھر میں داخل

ہونے سے پہلے مستحب ہے۔ اگر شام تھوڑا ہو تو غروب آفتاب کے بعد نماز مغرب پڑھ کر گھر جائے تاکہ مغرب کی نماز ان
لاول کے قائمقام ہو جائے جو حاجی نے بطور تحیۃ المسجد پڑھنے تھے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۴ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ

عصر کی نماز کا وقت

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں عصر کی نماز اس وقت پڑھی جاتی ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کی مانند ہو یا اس سے کچھ زیادہ ہو کیا ایسے وقت میں نماز ہو جاتی ہے؟ ملک یوسف عزیز لائل پور

جواب:۔ باب المواقیت میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
اَمَّنِیْ جِبْرَئِیْلُ عِنْدَ الْبَیْتِ مَرَّتَیْنِ فَصَلّٰی بِیَ الظُّھْرَ حِیْنَ زَالَتِ الشَّمْسُ وَ کَانَ قَدْرَ الشِّرَاکِ وَصَلّٰی بِیَ الْعَصْرَ حِیْنَ صَارَ ظِلُّ کُلِّ شَیْءٍ مِثْلَہٗ۔

یعنی جبرئیل علیہ السلام نے میری امامت کرائی۔ پس نماز ظہر پڑھائی۔ جب زوال ہوا اور سایہ تسمہ قدر ہو گیا۔ اور پھر عصر پڑھائی جب کہ ہر شئے کا سایہ اس کے مثل ہو گیا۔

اس حدیث میں زوال کا ذکر ہے اور زوال میں دوپہر کا سایہ داخل نہیں۔ پس جب دوپہر کا سایہ نکال کر ایک مثل ہو جائے تو عصر پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اذان وقت سے پہلے جائز نہیں جب وقت پر ہوئی تو دو چار رکعت قدر انتظار بھی چاہیئے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر سے پہلے دو چار رکعت پڑھتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ جبرئیل علیہ السلام نے شروع وقت بتانے کی خاطر جلد نماز پڑھائی۔ چنانچہ دوسرے روز آخر وقت پڑھائی تاکہ اخیر وقت کا بھی پتہ لگ جائے۔ پھر فرمایا ان دونوں کے درمیان وقت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام نے جس وقت نماز پڑھائی ہے۔ اس وقت سے ذرا ہٹ کر پڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گرمیوں میں ظہر کی نماز تین قدم سے پانچ قدم تک پڑھتے۔ اور سردیوں میں پانچ قدم سے سات قدم تک۔ سردیوں گرمیوں میں دو قدم کا فرق بتلا رہا ہے کہ زوال یعنی سورج ڈھلنے کا سایہ تین قدم ہونے پر نماز پڑھتے تھے حالانکہ سردیوں میں اتنی تاخیر کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف اسی خاطر تاخیر ہوتی تھی کہ اذان کے بعد کچھ انتظار کرنی چاہیئے۔ ایک حدیث میں ہے اتنی انتظار چاہیئے کہ کھانے پینے والا کھانے پینے سے فارغ ہو جائے اور ٹٹی والا ٹٹی کی حاجت سے فارغ ہو جائے۔ شرح بلوغ المرام میں لکھا ہے اگرچہ اس حدیث میں ضعف ہے لیکن اذان کی غرض اس کی

مفید ہے کیونکہ اذان کی غرض یہی ہے کہ لوگ سن کر پہنچ جائیں۔ نیز بخاری میں حدیث ہے۔

بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلٰوةٌ ثَلَاثًا لِمَنْ شَاءَ (بخاری ص۸۷)

یعنی ہر اذان اور اقامت کے درمیان جو چاہے نماز پڑھ سکتا ہے

اگر اذان اور اقامت کے درمیان وقفہ نہ کیا جائے۔ تو جو نفل پڑھنا چاہے نہیں پڑھ سکے گا ہاں مغرب میں دو نفلوں سے زیادہ وقفہ نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کا وقت تنگ ہے۔ دوسری نمازوں میں اتنی افراتفری کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

عصر کی نماز میں ظہر کی نیت کرے یا عصر کی

سوال:۔ اگر کسی کی ظہر قضا ہو جائے تو عصر کی نماز میں ظہر کی نیت کرے یا عصر کی؟

جواب:۔ اگر امام عصر پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے ظہر کی نیت بھی کر سکتا ہے اور عصر کی بھی۔ اگر ظہر کی نیت کرے تو عصر بعد میں پڑھے اور اگر عصر کی نیت کرے تو ظہر بعد میں پڑھے ترتیب کا اس وقت خیال نہ کرنا چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ ۲۹ ستمبر ۱۹۶۱ء

فجر کی نماز کا وقت

سوال:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کس وقت ادا کیا کرتے تھے اور یہ بھی بتائیں کہ اس وقت گھڑی کا کیا ٹائم ہونا چاہیے اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ سردی اور گرمی ہر دو موسموں میں فجر کی نماز کا وقت کیا ہے؟

جواب، نماز فجر کا وقت بالاتفاق پو پھٹنے سے طلوع آفتاب تک ہے۔ افضلیت میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں روشنی کر کے پڑھنا بہتر ہے۔ بعض کہتے ہیں اندھیرے میں بہتر ہے۔ پہلے ہم فریقین کے دلائل لکھتے ہیں پھر راجح مذہب بتائیں گے۔ انشاء اللہ

حدیث ۱:۔ عَنْ عَائِشَةَ رض قَالَتْ كُنَّا نِسَاءُ الْمُؤْمِنَاتِ يَشْهَدْنَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الْفَجْرِ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوطِهِنَّ ثُمَّ يَنْقَلِبْنَ

اِلٰی بُیُوْتِهِنَّ حِیْنَ یَقْضِیْنَ الصَّلٰوۃَ لَا یَعْرِفُهُنَّ اَحَدٌ مِنَ الْغَلَسِ۔ رواہ الجماعۃ وللبخاری وَلَا یَعْرِفُ بَعْضُهُنَّ بَعْضًا (منتقی باب وقت صلوۃ الفجر)

عائشہؓ سے روایت ہے کہ مومن عورتیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے ساتھ فجر کی نمازیں اپنی بڑی چادروں میں لپٹی ہوئی شامل ہوتیں پھر نماز سے فارغ ہوکر گھروں کو لوٹ جاتیں۔ اندھیرے کی وجہ سے ان کو کوئی نہیں پہچانتا تھا۔

حدیث ع۲:۔ عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰی صَلٰوۃَ الصُّبْحِ مَرَّۃً بِغَلَسٍ ثُمَّ صَلّٰی مَرَّۃً اُخْرٰی فَاَسْفَرَ بِهَا ثُمَّ کَانَتْ صَلٰوتُهٗ بَعْدَ ذٰلِكَ التغلیس حَتّٰی مَاتَ لَمْ یَعُدْ اِلٰی اَنْ یُّسْفِرَ رواہ ابوداؤد (حوالہ مذکورہ)

ابومسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فجر کی نماز ایک مرتبہ اندھیرے میں پڑھی اور ایک مرتبہ روشن کرکے پڑھی پھر وفات تک اندھیرے میں پڑھتے رہے روشن کرکے کبھی نہیں پڑھی

حدیث ع۳:۔ عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ تَسَحَّرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قُمْنَا اِلَی الصَّلٰوۃِ قُلْتُ کَمْ کَانَ مِقْدَارُ مَا بَیْنَهُمَا قَالَ قَدْرُ خَمْسِیْنَ اٰیَةً۔ متفق علیہ (حوالہ مذکورہ)

زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ سحری کھائی پھر نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ انسؓ کہتے ہیں میں نے زید سے پوچھا کہ سحری میں اور نماز میں کتنا فاصلہ تھا فرمایا پچاس آیتوں قدر۔

حدیث ع۴:۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰی صَلٰوۃً لِغَیْرِ مِیْقَاتِهَا اِلَّا صَلٰوتَیْنِ جَمَعَ بَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِجَمْعٍ وَصَلَّی الْفَجْرَ یَوْمَئِذٍ قَبْلَ مِیْقَاتِهَا متفق علیہ وَلِمُسْلِمٍ قَبْلَ وَقْتِهَا بِغَلَسٍ وَلِاَحْمَدَ وَالْبُخَارِیِّ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ یَزِیْدَ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَدِمْنَا جَمْعًا فَصَلَّی الصَّلٰوتَیْنِ کُلَّ صَلٰوۃٍ وَحْدَهَا بِاَذَانٍ وَاِقَامَةٍ وَتَعَشّٰی بَیْنَهُمَا ثُمَّ صَلَّی حِیْنَ طَلَعَ الْفَجْرُ قَائِلٌ یَقُوْلُ طَلَعَ الْفَجْرُ وَقَائِلٌ یَقُوْلُ

لَمْ يُطَلِّعْ ثُمَّ قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ هَاتَيْنِ الصَّلٰوتَيْنِ حُوِّلَتَا عَنْ وَقْتِهِمَا فِي هٰذَا الْمَكَانِ الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ وَلَا يَقْدَمُ النَّاسُ جَمْعًا حَتّٰى يَعْتَمُوا وَصَلٰوةُ الْفَجْرِ هٰذِهِ السَّاعَةَ (حوالہ مذکورہ)

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ نے کوئی نماز بے وقت پڑھی مگر دو نمازیں۔ مزدلفہ میں مغرب اور عشا کو جمع کیا اور اُس دن فجر کی نماز اپنے وقت سے پہلے پڑھی روایت کیا اس کو بخاری نے۔ اور مسلم میں یہ لفظ ہیں اپنے وقت سے پہلے اندھیرے میں پڑھی۔ اور احمد اور بخاری میں ہے عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں میں عبداللہ بن مسعود کے ساتھ نکلا پس ہم مزدلفہ میں آئے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے مغرب اور عشاء الگ الگ اذان اور اقامت کے ساتھ پڑھیں۔ اور دونوں کے درمیان کھانا کھایا۔ پھر فجر کی نماز پو پھٹتے ہی پڑھی۔ کوئی کہتا پو پھٹ گئی ہے۔ کوئی کہتا نہیں پھٹی۔ پھر کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دو نمازیں مزدلفہ میں اپنے وقت سے ہٹائی گئی ہیں ایک مغرب دوسری عشاء۔ لوگ مزدلفہ میں اندھیرا کرکے (عشا کے وقت) آئیں (اور مغرب کو عشا کے ساتھ جمع کریں) دوسری فجر کی نماز اس وقت (پڑھی جائے جس طرح صبح اچھی طرح روشن نہ ہوئی ہو۔ کوئی کہے صبح ہوگئی اور کوئی کہے نہیں ہوئی)

حدیث ۵:۔ عَنْ أَبِي الرَّبِيعِ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فَقُلْتُ إِنِّي أُصَلِّي مَعَكَ ثُمَّ أَلْتَفِتُ فَلَا أَرٰى وَجْهَ جَلِيسِي ثُمَّ أَرٰى أَحْيَانًا تُسْفِرُ فَقَالَ كَذَالِكَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي وَأَحْبَبْتُ أَنْ أُصَلِّيَهَا كَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيهَا۔ رواہ احمد (حوالہ مذکورہ)

ابوالربیع کہتے ہیں میں عبداللہ بن عمر کے ساتھ تھا میں نے کہا میں کبھی آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر ادھر اُدھر جھانکتا ہوں تو ساتھی کا چہرہ نہیں دیکھتا۔ پھر کبھی دیکھتا ہوں کہ آپ روشن کرکے پڑھتے ہیں فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پڑھتے دیکھا۔ اس لئے میں دوست رکھتا ہوں کہ اسی طرح پڑھوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا

حدیث ۶:۔ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ بَعَثَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْيَمَنِ قَالَ يَا مُعَاذُ إِذَا كَانَ فِي الشِّتَاءِ فَغَلِّسْ بِالْفَجْرِ وَأَطِلِ

الْقِرَاءَةَ قَدْرَ مَا يُطِيْقُ النَّاسُ وَلَا تُمِلَّهُمْ وَإِذَا كَانَ الصَّيْفُ فَاسْفِرْ بِالْفَجْرِ فَإِنَّ اللَّيْلَ قَصِيْرٌ وَالنَّاسُ يَنَامُوْنَ فَأَمْهِلْهُمْ حَتّٰى يُدْرِكُوْا رواه الحسين بن مسعود البغوی فی شرح السنة واخرجه بقی بن مخلد فی مسنده المصنف۔ (حوالہ مذکورہ)

معاذ بن جبل کہتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا فرمایا اے معاذ جب سردی ہو تو فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھ اور قرأت لوگوں کی طاقت کے مطابق لمبی کر اور ان کو سست نہ کر اور جب گرمی ہو تو فجر کو روشن کر کیونکہ رات چھوٹی ہے اور لوگ سو جاتے ہیں۔ پس ان کو ذرا ڈھیل دے تاکہ وہ نماز پالیں۔

حدیث ۷ :۔ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَسْفِرُوْا بِالْفَجْرِ فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِلْأَجْرِ رواه الخمسة وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح (حوالہ مذکورہ)

رافع بن خدیج کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبح کو روشن کرو کیونکہ یہ اجر بہت بڑا ہے

حدیث ۸ :۔ أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ وَإِسْحَاقُ وَغَيْرُهُمَا بِلَفْظِ ثَوِّبْ بِصَلٰوةِ الصُّبْحِ يَا بِلَالُ حِيْنَ يُبْصِرُ الْقَوْمُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِمْ مِنَ الْإِسْفَارِ۔

(نیل الاوطار جلد اوّل ص۳۱۹)

ابن ابی شیبہ اور اسحاق وغیرہ نے اپنی کتب میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال کو فرمایا صبح کی اقامت اُس وقت کہہ جب روشنی کی وجہ سے قوم اپنے تیروں کے گرنے کی جگہ دیکھ لیتی ہے۔

حدیث ۹ :۔ ابی برزہ اسلمی سے روایت ہے وَكَانَ يَنْفَتِلُ إِلَى صَلٰوةِ الْغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهُ وَيَقْرَأُ بِالسِّتِّيْنَ إِلَى الْمِائَةِ۔

(مشکوٰۃ باب تعجیل الصلوٰۃ)

یعنی صبح کی نماز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت فارغ ہوتے کہ انسان اپنے پاس بیٹھنے والوں کو پہچان سکے۔

حدیث ۱۰:۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عاملوں کی طرف لکھا:۔

والصبح والنجوم بادیۃ مشتبکۃ (مشکوٰۃ باب المواقیت)

یعنی صبح کی نماز ایسے وقت پڑھو کہ ستارے روشن اور ملے ہوئے ہوں۔

حدیث ۔ ان دس حدیثوں سے نمبر اول کی حدیث میں ذکر ہے کہ فجر کی نماز سے فراغت کے وقت عورتوں کو کوئی دوسرا پہچان نہیں سکتا تھا۔ یا آپس میں ایک دوسری کو نہیں پہچان سکتی تھیں۔ پہچان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ مرد ہیں یا عورتیں۔ دوسری یہ کہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون کونسی عورت ہے خدیجہ ہے یا زینب ہے۔ داودی نے پہلی صورت اختیار کی ہے۔ نووی بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں دوسری صورت کمزور ہے۔ کیونکہ وہ بڑی چادروں میں لپٹی ہوئی شامل ہوتیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے اُن کی پہچان نہیں ہوتی تھی کیونکہ بڑی چادر میں لپٹی ہوئی عورت تو دن کو بھی نہیں پہچانی جاتی کہ یہ کون ہے حافظ ابن حجر فتح الباری میں کہتے ہیں نووی کا یہ کہنا ٹھیک نہیں کیونکہ ہر ایک عورت کی چال ڈھال ڈیل ڈول عموماً الگ ہوتی ہے تو جو واقف ہوتا ہے وہ دن میں یا روشنی میں پہچان سکتا ہے کہ یہ فلاں عورت ہے ہاں اندھیرے میں مشکل ہے تو گویا حافظ ابن حجر کے نزدیک دوسری صورت بھی صحیح ہے بلکہ راجح ہے کیونکہ حدیث میں لفظ یعرف ہے جو معرفت اور عرفان سے ہے جس کے معنی پہچان کے ہیں۔ اس کا تعلق جزئی یعنی معین شے سے ہوتا ہے کلی یعنی عام شے سے نہیں ہوتا مثلاً یوں کہا جاتا ہے کہ عرفتہ ھو زید ام عمرو ”میں نے پہچان لیا کہ زید ہے یا عمرو ہے۔ یوں نہیں کہا جاتا عرفتہ اھو الانسان ام فرس۔ میں نے پہچان لیا کہ انسان ہے یا گھوڑا ہے۔ کیونکہ انسان ایک عام شے ہے۔ زید عمرو۔ بکر وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے اسی طرح گھوڑا عام شے ہے ہزاروں گھوڑوں کو شامل ہے۔ ہاں علم کا استعمال معین شے کی طرح عام شے میں بھی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے علمت اھو انسان ام فرس میں نے جان لیا کہ انسان ہے یا گھوڑا ہے۔ پس اس بنا پر حدیث میں علم کا لفظ ہونا چاہئے تھا یعنی یوں کہا جاتا ہے۔ لا یعلمھن احد۔ یعنی ان کو کوئی نہیں جانتا تھا کہ مرد ہیں یا عورتیں ہیں کیونکہ مرد۔ عورت کا لفظ انسان گھوڑے کی طرح عام ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری مع تشریح جز ۳ صفحہ ۳۲۳ باب الفجر

اس کے علاوہ حدیث میں یہ لفظ ہے کہ عورتیں آپس میں ایک دوسری کو نہیں پہچانتی تھیں“ یہ بھی دوسری صورت کا موید ہے پہلی صورت اس میں ٹھیک نہیں بنتی کیونکہ عورتیں آپس میں قریب اور

اکٹھی ہونے کی وجہ سے مرد عورت کی تمیز کر سکتی ہیں۔ خیر پہلی صورت ہو یا دوسری۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندھیرے میں پڑھتے۔

حدیث ۲:۔ دوسری حدیث میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ روشنی میں پڑھی پھر وفات تک اندھیرے میں پڑھتے رہے۔

حدیث ۳:۔ تیسری حدیث میں سحری اور نماز فجر کے درمیان پچاس آیتوں کا فاصلہ تبلایا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے روشنی نہیں کرتے تھے بلکہ اندھیرے میں پڑھتے تھے۔

حدیث ۴۔ چوتھی حدیث میں ذکر ہے کہ مزدلفہ میں فجر کی نماز وقت سے پہلے پڑھی۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ وقت سے پہلے پڑھنے کا یہ مطلب ہو نہیں سکتا کہ پو پھٹنے سے پہلے پڑھ لی بلکہ یہ مطلب ہے کہ اگرچہ پو پھٹنے کے بعد پڑھی ہے لیکن جس وقت ہمیشہ پڑھتے تھے اس وقت سے پہلے پڑھی۔ پس معلوم ہوا کہ ہمیشہ ذرا دیر کرکے ذرا روشن کرکے پڑھتے۔

حدیث ۵:۔ پانچویں حدیث سے ثابت ہوتا ہے کبھی اندھیرے میں پڑھتے کبھی روشنی میں۔

حدیث ۶:۔ چھٹی حدیث میں گرمی سردی کا فرق تبلایا ہے۔ یعنی سردیوں میں اندھیرا کرکے پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے گرمیوں میں روشنی میں۔

حدیث ۷، ۸:۔ ساتویں اور آٹھویں میں روشن کرکے پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے۔

حدیث ۹:۔ نویں میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہوتے تو انسان اپنے پاس والے کو پہچان سکتا تھا تو گویا نماز اندھیرے میں پڑھ لیتے

حدیث ۱۰۔ دسویں حدیث میں ذکر ہے کہ ستارے روشن اور ملے ہوئے ہوں تو نماز پڑھو۔ یہ اندھیرے کا وقت ہے پس اس سے بھی اندھیرے میں پڑھنا ثابت ہوا۔ جو لوگ روشنی میں افضل کہتے ہیں وہ پہلی دوسری تیسری نویں دسویں سے استدلال کرتے ہیں۔

نیل الاوطار جلد اول ص۳۱۹ میں دوسرے مذہب کے قائل مندرجہ ذیل لوگ تبلائے ہیں۔

اہلبیت۔ امام مالک۔ امام شافعی۔ امام احمد۔ امام اسحاق۔ امام ابو ثور۔ امام اوزاعی امام داؤد بن علی۔ امام ابو جعفر طبری۔

پھر کہا ہے۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ عبداللہ بن زبیرؓ۔ انسؓ۔ ابو موسیٰؓ۔ ابو ہریرہؓ سے بھی یہی

مروی ہے اور بحوالہ حازمی لکھا ہے۔ حضرت ابوبکر ابوبکر صدیقؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اہل حجاز کا بھی یہی قول ہے۔ پہلے مذہب کے قائل مندرجہ ذیل لوگ ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے شاگرد۔ امام ثوریؒ۔ امام حسن بن حیؒ اکثر اہل عراق پھر کہا حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعود سے دو روایتیں ہیں۔ ایک میں پہلے مذہب کے ساتھ ہیں۔ ایک میں دوسرے مذہب کے ساتھ ہیں جو دوسرے مذہب کے قائل ہیں یعنی اندھیرے میں افضل کہتے ہیں۔ وہ حدیث نمبر ۴ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مزدلفہ میں نماز ایسے وقت پڑھی کہ کوئی کہتا صبح ہوگئی کوئی کہتا نہیں ہوئی۔ چنانچہ اسی حدیث میں تشریح ہے اور ہمیشہ ایسے وقت پڑھتے کہ کسی کو شک نہیں رہتا یعنی صبح واضح ہو جاتی۔ اور نمبر ے کی حدیث کا بھی یہی جواب دیتے ہیں کہ روشن کر کے پڑھو یعنی صبح اچھی طرح واضح ہو جائے شک نہ رہے۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ امام اسحاقؒ سے ترمذی میں یہی مطلب نقل کیا ہے ملاحظہ ہو ترمذی باب وقت الصلوٰۃ الفجر ص۲۱، نمبر ۸ کی حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ خاص واقعہ ہے شاید کوئی ضرورت ہوگئی ہو۔ اس لئے بلال کو کہا ذرا ٹھہر کر اقامت کہہ اور ایسا اتفاق کئی دفعہ ہو جاتا ہے کہ نماز آگے پیچھے پڑھی جاتی ہے۔ خاص کر جب حد جواز میں ہو تو معمولی سے عذر کے لئے آگے پیچھے ہوسکتی ہے اعتبار عام حالت کا ہے اس لئے اصول میں لکھا ہے وقائع الاعیان لا یحتج بہا علی العموم (نیل الاوطار جلد ۳ ص۱۰) یعنی خاص واقعہ سے استدلال صحیح نہیں، اور اس سے نمبر ۵ کی حدیث کا مطلب بھی واضح ہوگیا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عارضہ سے روشنی میں پڑھی ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کو عارضہ کا علم نہیں ہوا۔ اس لئے وہ دونوں طرح عمل کرتے۔ اس کے علاوہ نمبر ۵ کی حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ روشنی میں نماز پڑھتے بلکہ نماز تو اندھیرے میں ہی پڑھتے لیکن کبھی فراغت تک اتنی روشنی نہ ہوتی کہ پاس بیٹھنے والے کا منہ نظر آئے۔ بعض دفعہ پڑھتے پڑھتے اتنی روشنی ہو جاتی چنانچہ حدیث عدہ میں جملہ فلا ادی وجہ جلیسی (میں اپنے پاس بیٹھنے والے کا چہرہ نہیں دیکھتا) سے یہ مطلب بخوبی واضح ہو جاتا ہے نیز اس حدیث میں ابوالربیع راوی ہے۔ دارقطنی نے اس کو مجہول کہا ہے (نیل الاوطار جلد اول ص۳۲) پس حدیث ضعیف ہوئی۔ رہی نمبر ۴ کی حدیث سو اس کی بابت امام شوکانی کہتے ہیں کہ ابو مسعود انصاری کی حدیث (جو نمبر ۲ میں گذر چکی ہے اس) میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات تک نماز اندھیرے میں پڑھتے رہے اور معاذ والی حدیث (وفات سے قریباً دو سال) پہلے ہے کیونکہ معاذ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یمن بھیجا ہے جب مکہ فتح ہوا۔ جیسے ابن عبدالبر نے استیعاب میں لکھا ہے

اور مکہ شمہ میں فتح ہوا ہے اور اعتبار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر کام کا ہوتا ہے یعنی جب آپ کی دو باتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہو تو آخیری بات پر عمل کیا جاتا ہے۔ پس نماز فجر کا اندھیرے میں پڑھنا راجح ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی وجہ ہو سکتی ہے وہ یہ کہ ہند میں عرب کی نسبت زیادہ گرمی ہے۔ اور راتیں زیادہ چھوٹی ہیں تو ایسے ملکوں میں سردیوں کی نسبت گرمیوں میں بیس پچیس منٹ انتظار کرلی جائے یعنی ایسے ملکوں میں سردیوں میں دھاری واضح ہوتے ہی سنتیں پڑھ کر نماز پر کھڑا ہو جائے اور گرمیوں میں اس کو اور روشن کرے لیکن ایسا نہ ہو کہ زیادہ دن چڑھا دے جس سے اس دھاری کا نام ونشان نہ رہے۔ اس طرح سے سب احادیث میں آپس میں موافقت ہو جاتی ہے اور کسی قسم کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

موافقت کی اور صورتیں اور علما کی آراء

۱۔ امام طحاویؒ جو حنفیہ کے بڑے بزرگ ہیں وہ سب احادیث میں یوں موافقت کرتے ہیں کہ نماز اندھیرے میں شروع کی جائے اور قرأت اتنی لمبی کی جائے کہ ختم تک روشنی ہو جائے لیکن امام شوکانی نیل الاوطار جلد اول صد ۳۱۹ میں کہتے ہیں کہ ویسے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ہمیشہ قرأت لمبی پڑھتے تھے۔ اگر زیادہ لمبی صورتیں پڑھتے (جیسے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فجر کی نماز میں سورہ بقرہ پڑھی جب فارغ ہوئے تو کہا گیا قریب تھا کہ سورج نکل آئے۔ فرمایا

لو طلعت لم تجدنا غافلین ۔ یعنی اگر آفتاب نکل آتا تو ہمیں غافل نہ پاتا

یعنی سوئے ہوئے پر آفتاب کا نکلنا نقصان ہے۔ اگر اس طرح لمبی سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پڑھتے) تو ہمیشہ بہت روشنی پھیلنے کے بعد فراغت ہوتی۔ اور یہ حضرت عائشہ کی حدیث (جو نمبر اول میں گذر چکی ہے) کے خلاف ہے کیونکہ اس میں یہ ہے کہ فراغت کے وقت عورتوں کو کوئی نہیں پہچان سکتا تھا (انتہی مع تشریح) اور نمبر ۹ کی بھی حدیث کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہے کہ فراغت کے وقت اپنے پاس والے کی پہچان ہو سکتی گویا روشنی ابھی تک پھیلی نہیں تھی۔ ہاں اگر امام طحاوی کی مراد روشنی سے روشنی کا پھیلنا نہ ہو بلکہ اتنی روشنی ہو کہ جس سے پاس والے کا چہرا پہچانا جا سکے، تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔

۲۔ بعض کہتے ہیں روشنی میں پڑھنے کا حکم چاندنی راتوں میں ہے کیونکہ چاندنی راتوں میں پَو اچھی طرح معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے حکم دیا ذرا روشن کر کے پڑھو تاکہ پَو میں کسی قسم کا شک شبہ نہ رہے۔ یہ صورت موافقت کی

اچھی ہے۔ اور اس سے سب احادیث میں موافقت ہوجاتی ہے۔ لیکن نمبر ۶ کی حدیث رہ جاتی ہے سو اس کا جواب آخر وہی ہوگا جو ہم نے دیا ہے یا امام شوکانی نے دیا ہے یعنی یا تو یوں کہا جائے کہ رسول اللہ کی اخیری بات پر عمل کیا جاتا ہے اور اندھیرے میں پڑھنا اخیری بات ہے کیونکہ وفات تک اس پر عمل رہا ہے یا یوں کہا جائے جو ملک عرب سے زیادہ گرم ہیں اور ان کی راتیں چھوٹی ہیں تو وہاں یہ حکم ہے کہ پو پھٹنے کے بعد بیس پچیس منٹ انتظار کر لی جائے تاکہ لوگ شامل ہوجائیں۔

۴۔ امام خطابی کہتے ہیں ہوسکتا ہے کہ جب ان کو حکم ہوا کہ نماز جلدی پڑھیں یعنی وقت میں دیر نہ کریں تو انہوں نے صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیان نماز پڑھنی شروع کردی۔ اس پر حکم ہوا اسفروا بالفجر الحدیث یعنی فجر کو روشن کرو۔ صبح صادق کے بعد پڑھو۔ کیونکہ اس میں اجر بہت بڑا ہے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب

صبح صادق کے پہلے نماز ہوتی ہی نہیں تو یہ کیوں فرمایا کہ اس میں اجر بہت بڑا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ جو نماز تم پہلے پڑھتے ہو وہ نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ پہلی نماز ان کی صحیح نہ تھی لیکن ان کو اجر ملا کیوں کہ یہ اُن کی اجتہادی غلطی میں ایک اجر ہے پس فرمایا صبح صادق کے بعد نماز پڑھو کیونکہ یہ اجر میں بہت بڑا ہے یعنی پہلی نماز سے۔

اِس صورت سے بھی سب حدیثوں میں موافقت ہوجاتی ہے لیکن نمبر ۶ اور نمبر ۸ کی باقی رہ جاتی ہیں سو ان کا جواب وہی ہوگا جو گذر چکا ہے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب

روشنی میں پڑھنے کی حدیثیں قولی ہیں۔ اور اندھیرے میں پڑھنے کی فعلی۔ اور تعارض کے وقت قول فعل پر مقدم ہوتا ہے۔ کیونکہ فعل میں خاصہ وغیرہ ہونے کا احتمال ہے تو روشنی کی احادیث مقدم ہونی چاہئیں۔ اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں خاصہ وغیرہ ہونے کا احتمال نہیں کیونکہ آپ کے ساتھ صحابہ بھی شامل تھے دوسرا جواب یہ کہ نمبر ۴ کی حدیث قولی ہے اس میں سردیوں میں اندھیرے میں پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے۔ تیسرا جواب یہ کہ قولی مقدم اُس وقت ہوتی ہے جب موافقت نہ ہوسکے یہاں ہم نے موافقت کردی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

اندھیرے میں نماز پڑھنی افضل ہے۔ اور جن حدیثوں میں روشن کرنے کا ذکر ہے اُن سے پوہ کا واضح کرنا مراد ہے اور نمبر ۴ کی حدیث عرب سے زیادہ گرم ملکوں کے لئے ہے یا وہ پہلے ہے اور نمبر ۵ کی حدیث عذر پر محمول ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۵ رجب سنہ ۱۳۵۱ھ - ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء

نمازیوں کی خاطر درمیانہ وقت نماز پڑھنا

سوال :۔ مسجد ٹاہلی والی جینیوٹ اہل حدیث کی مسجد ہے۔ اس مسجد میں ہمیشہ درمیانہ وقت میں نماز ہوتی رہتی ہے۔ اب عرصہ سات آٹھ ماہ سے دو تین نمازیوں نے اپنی جماعتیں علیحدہ شروع کر دی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اول وقت میں اپنی جماعت کرائیں گے کیونکہ افضل ہے۔ اس بات پر نمازیوں کی جماعت میں بہت فساد برپا ہو گیا ہے اب سوال یہ ہے کہ وہ دو تین نمازی جو پہلے جماعت قائم کرتے ہیں۔ اگر وہ پوری جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں بہتر ہے یا اکیلی جماعت قائم کر کے فساد سے بچے رہنا بہتر ہے۔

جواب :۔ مشکوٰۃ میں ہے :۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ مَكَثْنَا ذَاتَ لَيْلَةٍ نَنْتَظِرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ فَخَرَجَ عَلَيْنَا حِيْنَ ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ اَوْ بَعْدَهٗ فَلَا نَدْرِيْ اَشَيْءٌ شَغَلَهٗ فِيْ اَهْلِهٖ اَوْ غَيْرُ ذَالِكَ فَقَالَ حِيْنَ خَرَجَ اِنَّكُمْ تَنْتَظِرُوْنَ صَلٰوةً مَا يَنْتَظِرُهَا اَهْلُ دِيْنٍ غَيْرُكُمْ وَلَوْلَا اَنْ يَّثْقُلَ عَلٰى اُمَّتِيْ لَصَلَّيْتُ بِهِمْ هٰذِهِ السَّاعَةَ ثُمَّ اَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ صَلّٰى

(رواہ مسلم مشکوٰۃ باب تعجیل الصّلوٰۃ فصل ۳)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم نے انتظار کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز عشا کے لئے تہائی رات تک یا زیادہ گزر گئی۔ آپ نکلے معلوم نہیں کہ آپ کس کام میں مشغول تھے یا ویسے ہی نہیں نکلے پس فرمایا تم ایک ایسی نماز کی انتظار میں ہو کہ تمہارے سوا کوئی اہل دین اس کی انتظار نہیں کرتے اگر میری اُمت پر بوجھ نہ ہوتا تو میں اسی وقت اُن کو نماز پڑھاتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وقت میں نمازیوں کی رعایت ضروری ہے۔ نماز عشا میں تہائی رات گزرنے پر پڑھنی افضل ہے مگر آپ نمازیوں کی رعایت سے اس وقت نہیں پڑھاتے تھے بس اسی طرح ان نمازیوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ جو اول وقت کو افضل کہتے ہیں وہ بھی نمازیوں کی خاطر درمیان وقت میں پڑھ سکتے ہیں خاص کر جب اتفاق سے ایسی نعمت عظمیٰ بھی حاصل ہو تو پھر ضرور نمازیوں کی رعایت چاہیئے تاکہ سب کے ملنے سے جماعت بڑی ہو اور ثواب زیادہ ہو۔

جن احادیث میں یمیتون الصّلوٰۃ (جو امام نماز کو ضائع کردیں تم ان سے الگ اپنے وقت پر پڑھ لو) آیا ہے۔ ان میں اول وقت سے تاخیر مراد نہیں بلکہ ان میں مطلق وقت کا ذکر ہے، چنانچہ مشکوٰۃ کے اسی باب میں ہے یمیتون الصلوٰۃ اویوخرون عن وقتہا۔ پس جو شخص نماز کا وقت ضائع کر دے اور ایسے مکروہ وقت میں پڑھے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے تلك صلوۃ المنافق تو اس صورت میں الگ پڑھ سکتا ہے پھر ان احادیث میں الگ جماعت کرنے کا کہیں ذکر نہیں کیونکہ جماعت سے نماز پڑھنے کی اصل غرض اتفاق و اتحاد ہے۔ الگ جماعت کرنے سے وہ فوت ہوتی ہے بلکہ پہلے سے بھی نزاع اور اختلاف بڑھتا ہے تو پھر الگ جماعت قائم کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

نیز حدیث میں ہے لا یومن الرّجل الرّجل فی سلطانہ۔ یعنی کوئی شخص دوسرے کے اختیار والی جگہ میں امامت نہ کرے۔

مذکورہ بالا صورت میں اصل امام مسجد امامت کا اختیار رکھتا ہے جو مقررہ امام کے علاوہ اس سے پہلے جماعت کراتے ہیں ان کی جماعت اس حدیث کے بالکل خلاف ہے پس بجائے اس کے کہ ان کو اس جماعت کا ثواب ہو اُلٹا عذاب کا خطرہ ہے۔ عبداللہ امرتسری از روپڑ

۲۰ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ - ۲۸ جون ۱۹۴۰ء

عشا کی قضا ئی کب دے؟

سوال :۔ رات کو ایک آدمی تھکاوٹ کی کثرت سے سو جاتا ہے تو پھر وہ عشا کی قضا شدہ نماز کب پڑھے۔ کیا قضا نماز پڑھے یا پوری نماز پڑھے؟

محمد عبداللہ بی اے سیکنڈ ماسٹر ڈی بی سکول جلال آبادی غربی ضلع فیروزپور ۱۳؍۱۹۳۰؍۱

جواب:۔ عشاکی نماز سے پہلے سونا حدیث میں منع آیا ہے لیکن اتفاقیہ کہیں سوجائے تو جب جاگ آئے نماز پڑھ لے۔ حدیث شریف میں اسی طرح آیا ہے ملاحظہ ہو مشکوٰۃ وغیرہ۔ نماز پوری پڑھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضا ان سب کی فجر کی نماز ایک مرتبہ سوتے میں رہ گئی تھی تو سورج نکلنے کے بعد با جماعت پوری نماز پڑھی یعنی سنتیں بھی ساتھ ادا کیں۔ (ملاحظہ ہو فصل رابع مشکوٰۃ)

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ ۲۶ شوال ۱۳۵۶ھ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء

نماز پڑھتے پڑھتے دوسری نماز کا وقت آنا

سوال:۔ نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے اگر نماز شروع کر دی جائے یا نماز کے ممنوع اوقات میں اس سے پہلے نماز شروع کر دی جائے اور پھر دوسرا غیر ممنوع وقت شروع ہو جائے تو اس وقت کیا کرنا چاہیئے۔

جواب:۔ حدیث میں ہے:۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الْفَجْرُ فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ (متفق علیہ)

جو شخص طلوع شمس سے پہلے صبح کی ایک رکعت پالے اس نے صبح کی نماز پالی اور جو عصر کی ایک رکعت غروب آفتاب سے پہلے پالے اس نے مغرب کی نماز پالی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص وقت ختم ہونے سے پہلے ایک رکعت پالے وہ بقیہ نماز پڑھ لے اور جماعت کھڑی ہونے کے وقت پہلی نماز کے اخیری رکعت کے رکوع میں جا چکا ہو تو پوری کرے ورنہ توڑ کر جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے۔ کیونکہ حدیث میں ہے۔

اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا التی اقیمت لہا۔

یعنی جب اقامت ہو جائے تو پھر کوئی نماز نہیں مگر وہی جس کی اقامت ہوئی ہے۔

اس حدیث سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ اس حدیث میں اقامت کے بعد نماز کی نفی کی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ نماز کا اقل درجہ ایک ہے جیسے وتر ایک ہی رکعت ہے اور بعض صورتوں میں صلوٰۃ خوف بھی ایک رکعت ہے۔ ایک رکعت سے کم کو نماز نہیں کہتے پس ایک رکعت سے کم پڑھ سکتا ہے جس کی

صورت یہ ہے کہ اخیر رکعت کے رکوع میں جاچکا ہو تو پوری کرے ورنہ توڑ دے۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ اقامت کے بعد الگ کوئی نماز نہ ہونی چاہیئے خواہ فرض ہو یا نفل بلکہ امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔

نیّت:۔ رہی یہ بات کہ نیت کونسی نماز کی کرے۔ مثلاً عصر کی نماز ہو رہی ہے اور اس کی ظہر باقی ہے تو کیا امام کے ساتھ شامل ہو کر ظہر کی نیت کرے یا عصر کی ؟

عصر کی نیت کرنے کی دلیل اس حدیث کے ظاہر الفاظ ہیں کہ اقامت کے بعد وہی نماز ہے جس کی اقامت ہوئی ہے پس عصر کی نیّت کرنی چاہیئے نیز اگر اتفاقیہ امام کو نماز میں دیر ہوگئی اور اس نے اخیر وقت میں نماز پڑھائی تو اس صورت میں اگر یہ ظہر کی نیّت کرے تو اس کی دو نمازیں ظہر و عصر قضا ہوں گی۔ ظہر اس لئے کہ وہ اپنے وقت پر نہیں پڑھی گئی بلکہ عصر کے وقت پڑھی گئی ہے اور عصر اس لئے کہ امام کے پڑھاتے پڑھاتے عصر کا وقت بھی ختم ہو گیا تو وہ بھی قضا ہوگئی۔ اگر امام کے ساتھ عصر کی نیت کرے تو عصر اپنے وقت پر ادا ہوگئی۔ صرف ظہر قضا رہی۔ نیز اگر عشاء کی اقامت ہو تو مغرب کی نماز کی نیت کرنے میں خلل واقع ہوگا وہ اس طرح کہ امام کے ساتھ چوتھی رکعت پڑھے تو مغرب کی چار ہو جائیں گی۔ اگر تیسری پڑھ کر بیٹھا رہے اور جب امام چوتھی پڑھ کر سلام پھیرے تو اس صورت میں سلام سے پہلے درمیان میں امام کی مخالفت لازم آئے گی جو سوا مجبوری کے ٹھیک نہیں۔

ظہر کی یا مغرب کی نیّت کرنے کی دلیل یہ ہے کہ عصر اور فجر کی نماز کے بعد وقت مکروہ ہے مگر امام کے ساتھ عصر کی نیّت کرے تو ظہر مکروہ وقت میں پڑھنی پڑے گی۔ اگر دیر کرے تو خطرہ ہے موت واقعہ ہونے سے کہیں فرض ہی ذمے نہ رہ جائے۔ نیز اگر ظہر کی نیت کرے یا مغرب کی نیت کرے تو اس میں ترتیب محفوظ رہتی ہے اگر عصر یا عشاء کی نیت کرے اور ظہر عصر کے بعد اور مغرب عشاء کے بعد پڑھے تو پہلی نماز پیچھے ہو جائے گی۔ اور پچھلی پہلے۔ حالانکہ پہلی پہلے فرض ہے اور پچھلی پیچھے۔ اگر بالفرض پچھلی نماز پڑھتے مر جائے تو پہلی کا گناہ اس کے ذمہ رہا اور اگر پہلی پڑھ کر مر جائے تو پچھلی کے بدلے اس کو مواخذہ نہیں کیونکہ اس کا وقت اکثر باقی ہوتا ہے۔

غرض دونوں طرف کچھ کچھ دلائل ہیں اس لئے اختیار ہے کہ پہلی کی نیت کرے یا پچھلی کی۔

نوٹ:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عصر یا فجر کے بعد فرضی نماز کی قضا نہ دینی چاہیے۔ کیونکہ ان وقتوں میں نماز منع ہے۔ مگر یہ ان لوگوں کی غلطی ہے کیونکہ مکروہ وقتوں میں قضا منع نہیں ہے۔ ظہر کی سنّتوں کی قضا عصر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت [1] ہے۔ اور فجر کی سنّتیں رہ جائیں تو وہ بھی فجر کی نماز کے بعد پڑھنی ثابت

[1] حاشیہ صفحہ پر

ہیں۔ چنانچہ ہم نے رسالہ "امتیازی مسائل" میں اس کی تفصیل کی ہے تو فرضوں کی قضا بطریق اولیٰ جائز ہوگی۔ کیونکہ ان کا معاملہ اہم ہے نیز خدانخواستہ دیر کرنے کی صورت میں مرگیا تو فرض ذمہ رہ گئے یہ کتنے بڑے خطرہ کا مقام ہے اس لئے فرضوں کی قضا میں بہت جلدی کرنی چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۳ شعبان ۱۳۸۰ھ ۱۰ فروری ۱۹۶۱ء

معتکف کا نماز فجر یا نماز عصر کے بعد سنّت یا نفل پڑھنا

سوال:۔ کیا معتکف نماز فجر کے بعد تا طلوع آفتاب اور اسی طرح بعد عصر تا مغرب سنتیں یا نفل ادا کر سکتا ہے؟

سراج الدین وزیرآبادی

جواب:۔ ان دونوں وقتوں میں نماز منع ہے۔ معتکف اور غیر معتکف اس میں برابر ہیں لیکن سببی نماز میں اختلاف ہے کہ جائز ہے یا نہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس پر زور دیا ہے کہ سببی نماز جائز ہے جیسے تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضوء وغیرہ اور ممانعت صرف غیر سببی سے ہے یعنی جس کا کوئی سبب نہ ہو جیسے عام نفل۔ نماز استخارہ اور نماز حاجت بھی سببی میں داخل[1] ہے کیونکہ سببی سے مراد جو فی الفور ہوتی ہے البتہ فجر کی سنتوں کے متعلق ابوداؤد وغیرہ میں خاص حدیث آئی ہے کہ نماز فجر کے بعد اور طلوع آفتاب سے قبل درست ہیں۔

عبداللہ امرتسری ۲۹ رمضان ۱۳۸۳ھ

سرکاری ڈیوٹی کی وجہ سے نمازوں کے جمع کرنے کا مسئلہ

سوال: زید محکمہ پولیس میں ملازم ہے اسے کئی گھنٹے ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔ دوران ڈیوٹی ظہر و عصر یا مغرب عشاء کا وقت آتا ہے۔ زید نمازوں کو اپنے وقت پر ادا کرتا ہے تو حاکم اعلیٰ ڈیوٹی خالی دیکھ کر اسے جرمانہ کردیتا ہے اور سزا بھی دیتا ہے جس وجہ سے زید سخت تنگ ہے حاکم اعلیٰ معزولی کی دھمکی بھی دیتا ہے زید روزی کی پریشانی کی وجہ سے معزولیت کو گوارا بھی نہیں کرسکتا۔ سوال یہ ہے کہ ایسی مصیبت میں زید

حاشیہ [1]۔ اگر نماز استخارہ اور نماز حاجت کا وقت تنگ ہو جیسے سفر کرنے کے وقت فی الفور استخارہ کرنا ہو یا ایسے فوری طور پر نماز حاجت پڑھنی ہو تو اس صورت میں یہ سببی نماز میں داخل ہوسکتی ہے۔

جمع تقدیم یا تاخیر کر سکتا ہے؟

علی حسین خان کانسٹیبل اراکین تنظیم کلکتہ

جواب:۔ زید ڈیوٹی پر جائے اور مصلی کا انتظام کرے اور وہیں نماز پڑھ لیا کرے جمع نہ کرے ہمیشہ ڈیوٹی کے وقت ترک جماعت بھی ٹھیک نہیں جب آفیسر کی طرف سے زیادہ خطرہ ہو ورنہ کسی قریبی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھے کیونکہ جماعت کے بارہ میں سخت تاکید آئی ہے۔ اگر کسی دوسرے کانسٹیبل کو جو نماز نہیں پڑھتا اپنی ڈیوٹی پر اس کو مقرر کرکے نماز پڑھ لیا کرے تو یہ سب سے بہتر صورت ہے۔ خواہ اس کی ڈیوٹی میں اتنا وقت اس کو دے دیا جائے یا کسی طرح اس کو خوش کر لیا جائے بہرصورت نماز با جماعت ادا کریں۔ واللہ الموفق

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۴ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ ۔ ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء

بلوغ کے بعد جو نمازیں نہیں پڑھی گئیں ان کے اعادہ کا مسئلہ

سوال:۔ جو نمازیں بلوغت کے بعد بوجہ سستی یا بے پرواہی کے رہ گئی ہیں۔ اب جب کہ وہ پکا نمازی بن گیا ہے تو کیا گذشتہ نمازیں پڑھی جائیں تو کس طرح اور کس وقت؟

جواب:۔ بلوغ کے بعد اگر نمازیں تھوڑی ہوں جو آسانی سے ادا سکتی ہوں تو ادا کر لی جائیں اگر زیادہ مدت کی ہوں جن کو ادا کرنا مشکل ہو تو یہی کافی ہے حیض والی کو نماز اسی لئے معاف ہے کہ عموماً ہر ماہ میں حیض آتا ہے اگر ہر مہینہ میں حیض کی نمازوں کو دہرائے تو مشکل ہے اس لئے شرع نے معافی دی ہے پس اس سے تارک نماز کا حکم سمجھ لیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ ۔ ۹ جنوری ۱۹۴۰ء

گورنمنٹ یا محکمہ سے چوری چھپے نماز

سوال:۔ ریلوے ملازمان کو نوکری پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں نوکری پر مسلمان ملازم آفیسروں سے چوری نماز ادا کرتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ ریلوے ملازمان نماز پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں بلکہ اسٹیشنوں پر کئی مسجد کے لئے

جگہ بھی تجویز کر لیتے ہیں، اور اگر بالفرض نماز نہ پڑھی جائے یا وقت پر نہ پڑھ سکے تو ایسی ملازمت ہی درست نہیں

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء

تہجد کی نماز عشاء کے بعد پڑھنا

سوال :۔ اگر کوئی شخص عشاء کی نماز ساڑھے نو بجے ختم کرے اس کے بعد ہی تہجد یعنی صلوۃ اللیل بھی پڑھ لے تو اس کی تہجد ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ عشاء کے بعد بھی نماز تہجد پڑھی ہے لیکن ہمیشہ نہیں پڑھی اس لئے کبھی کبھی پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ ۲۴ر جون ۱۹۶۰ء

نماز میں تاخیر کرنے والے کے ساتھ نماز

سوال :۔ لوگ صبح کی نماز اذان کے آدھ گھنٹہ بعد پڑھتے ہیں تو پھر ہم پہلے نماز ادا کر لیا کریں یا جماعت کے ساتھ؟

جواب :۔ اگر زیادہ دن چڑھے پڑھتے ہوں تو پہلے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں چنانچہ حدیث میں نماز تاخیر سے پڑھنے والوں کی بابت آیا ہے کہ تم ان سے پہلے پڑھ لیا کرو۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۵ رجب ۱۳۵۳ھ - ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۴ء

پو پھٹنے کے بعد تحیۃ المسجد

سوال :۔ صبح کے وقت تحیۃ المسجد پڑھے یا نہ؟

عبداللہ کھیپانوالی ڈاکخانہ مکتسر ضلع فیروزپور ۲۷ رمضان ۱۳۵۴ھ

جواب :۔ بلوغ المرام باب المواقیت میں ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا صَلٰوةَ بَعْدَ الْفَجْرِ اِلَّا سَجْدَتَيْنِ اخرجه الخمسة الا النسائی وفی روایة عبدالرزاق لَا صَلٰوةَ

بَعْدَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ اِلَّا رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ وَ مِثْلُهٗ لِلدَّارَقُطْنِیِّ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ (مٹ)

یعنی ابن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پَو پھٹنے کے بعد کوئی نماز نہیں مگر دو رکعت فجر یعنی سنّتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پَو پھٹنے کے بعد تحیۃ المسجد درست نہیں جیسے طلوع و غروب آفتاب کے وقت نماز درست نہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ ۔ ۱۳ر مارچ ۱۹۳۶ء

سورج نکلنے کے بعد فجر کی سنّتیں

سوال:۔ اقامت سے پہلے صبح کی دو سنّتیں نہ پڑھی جائیں تو وہ سورج نکلنے کے بعد ادا ہو سکتی ہیں۔ میری سمجھ اس مسئلہ پر یہ ہے کہ اگر جماعت ہو رہی ہو تو ترکِ سنّت کر کے فرضوں کی اقتدا کرے اور اگر صبح کا وقت ہو تو بعد فرض ادا کرے۔ چنانچہ مدّت تک اس مسئلہ پر عمل رہا۔ چند یوم ہوئے ایک حنفی بھائی نے ابن ماجہ کی حسب ذیل حدیث پیش کی۔

حدثنا عبدالرحمٰن بن ابراهیم انّ النّبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم نام عن رکعتی الفجر فقضاهما بعد ما طلعت الشمس۔

میرے پاس ابن ماجہ کی شرح قلمی کفایۃ الحاجہ شرح ابن ماجہ موجود تھی اس کو دیکھا تو اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔

رجال اسناده ثقات الا ان مروان بن معاویة الفزاری کان یدلس وقد عنعنه نعم احتج به الشیخان۔

جواب:۔ تدلیس کہتے ہیں۔ اپنے ملاقاتی سے ایسے لفظ کے ساتھ روایت کرے جس سے سماع کا وہم ہو۔ اور حقیقت میں سنا نہ ہو مثلاً عن فلان کہے یا قال فلاں کہے ایسے راوی کو مدلس کہتے ہیں۔ مروان بن معاویہ مدلس ہے جس کی روایت عن کے ساتھ کرنے کی صورت میں بالکل ضعیف ہوتی ہے۔ ہاں اگر سماع کی تصریح کرے تو پھر صحیح ہو جائے گی مگر یہاں عن کے ساتھ روایت کی ہے۔ رہا بخاری اور مسلم کا اس کی روایت کرنا تو وہ سماع کی تصریح کی صورت میں ہے یا مؤید کی صورت میں۔

اس کے علاوہ اس راوی میں ایک اور عیب بھی ہے وہ یہ کہ اپنے استادوں کے مشہور نام بدل کر غیر مشہور

ذکر کر دیتا ہے جس سے بعض دفعہ ضعیف کو ثقہ سمجھ لیا جاتا ہے یا ضعیف کے ضعف پر پردہ پڑ جاتا ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے بہت سے طرق ہیں چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے طبقات المدلسین کے صـ۱۳ و صـ۱۲ میں اس کا ذکر کیا ہے اور ایسے راوی کی روایت بغیر تحقیق کے نہیں لی جا سکتی۔ اور اس روایت کی حقیقت کا کچھ علم نہیں اس لئے یہ قابل استدلال نہیں۔

اس کے علاوہ اس کے مقابلہ میں حسن حدیث موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فجر کی سنتیں رہ جائیں تو فرضوں کے بعد پڑھ لی جائیں تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ امتیازی مسائل ملاحظہ ہو۔

عبد اللہ امرتسری روپڑی ۲۸ شعبان ۱۳۸۵ھ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۹ء

اقامت ہونے پر فجر کی سنتوں کا وقت

سوال:۔ ایک آدمی فجر کی نماز کے وقت وضو کر رہا تھا۔ اتنے میں جماعت کھڑی ہو گئی۔ اب یہ آدمی کیا کرے سنت ادا کرے یا جماعت میں شامل ہو جائے۔

امجد حسین۔ محمد یوسف۔ نئی دہلی

جواب:۔ فرضوں کے بعد سنتوں کے لئے طلوع آفتاب کی انتظار ثابت نہیں۔ ہاں فرضوں کے بعد سنتیں ثابت ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ ایک شخص نے فرضوں کے بعد اسی وقت سنتیں پڑھیں۔ آپ نے فرمایا کیا اکٹھی دو نمازیں پڑھتا ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے پہلے سنتیں نہیں پڑھیں۔ فرمایا فَلَا اِذًا پس اس وقت کوئی حرج نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرضوں کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنا جائز ہیں۔

امام شوکانی رحمہ نیل الاوطار جلد ۲ صـ۲۶ میں اس کی تائید میں لکھتے ہیں:۔

واخرجه ابن حزم فی المحلی من روایة الحسن بن ذکوان عن عطاء بن ابی رباح عَنْ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ رَأَى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يُصَلِّي بَعْدَ الْغَدَاةِ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ لَمْ اَكُنْ صَلَّيْتُ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَصَلَّيْتُهُمَا الْاٰنَ فَلَمْ يَقُلْ لَهٗ شَيْئًا قَالَ الْعِرَاقِيُّ وَاِسْنَادُهٗ حَسَنٌ۔

یعنی ابن حزمؒ نے محلی میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو فجر کے بعد سنتیں

پڑھتے دیکھا۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے سنتیں فجر کی نہیں پڑھی تھیں اب پڑھی ہیں۔ آپ نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ اس حدیث کی اسناد اچھی ہے

یہ حدیث دلیل ہے کہ فجر کی سنتیں فرضوں کے بعد پڑھنی درست ہیں۔ اور نماز سے پہلے اقامت کے بعد سوائے اس نماز کے جس کی اقامت ہوئی ہے۔ دوسری نماز منع ہے چنانچہ حدیث میں ہے فلا صلوۃ الا المکتوبۃ اور ایک روایت میں ہے الا التی اقیمت (منتقی باب النہی عن التطوع بعد الاقامۃ) یعنی اقامت کے بعد وہی نماز ہے جس کی اقامت ہوئی ہے۔

جو لوگ اقامت کے بعد سنتوں کے جواز پر بیہقی کی یہ روایت پیش کرتے ہیں اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَلَا صَلٰوۃَ اِلَّا الْمَکْتُوْبَۃُ اِلَّا رَکْعَتَیِ الصُّبْحِ۔ یعنی اقامت کے بعد صرف وہی نماز فرض ہے جس کی اقامت ہوئی ہے مگر دو سنتیں فجر کی۔

یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ یہ روایت قابلِ استدلال نہیں بیہقی خود اس کی بابت لکھتے ہیں۔ ھذہ الزیادۃ لَا اَصْلَ لَھَا (یعنی یہ لفظ (مگر دو سنتیں فجر کی) بے اصل ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اس کی اسناد میں دو راوی حجاج بن نصر اور عباد بن کثیر ضعیف ہیں (نیل الاوطار)

علاوہ اس کے بعض روایتوں میں فجر کی سنتوں کی ممانعت آئی ہے چنانچہ اس حدیث فلا صلوۃ الا المکتوبۃ۔ میں ابن عدی نے یہ الفاظ روایت کئے ہیں۔ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَا رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ قَالَ وَلَا رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ اخرجہ ابن عدی فی ترجمۃ یحیی بن نصر بن حاجب واسنادہ حسن عون الباری شرح بخاری جلد ۲ صہ ۳۱۵۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ کیا اقامت کے بعد فجر کی سنتیں بھی نہ پڑھے۔ فرمایا فجر کی سنتیں بھی نہ پڑھے اور اس کی اسناد اچھی ہے۔

دیکھیئے اس روایت میں فجر کی سنتوں کا نام لے کر منع کر دیا ہے اس سے واضح تر دلیل کیا ہوگی۔ پھر اس کی اسناد بھی اچھی ہے اور نیل الاوطار جلد ۲ صہ ۳۳ میں بھی یہ (نام لے کر فجر کی سنتیں منع کرنے کی روایت) ذکر کی ہے مگر حوالہ بیہقی کا دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت دونوں کتابوں (ابن عدی اور بیہقی) میں ہے مگر نیل الاوطار میں بیہقی کی اسناد کے متعلق لکھا ہے۔

وفی اسنادہ مسلم بن خالد الزنجی وھو متکلم فیہ وقد وثقہ ابن حبان واحتج فی صحیحہ

یعنی اس کی اسناد میں مسلم بن خالد زنجی ہے۔ اس میں کچھ کلام ہے لیکن ابن حبان نے اس کو ثقہ کہا ہے اور اپنی کتاب صحیح میں اس کی اسناد کو قابل استدلال سمجھا ہے۔ بہر صورت یہ روایت بیہقی والی مذکورہ بالا روایت "مگر دو سنتیں فجر کی" سے راجح ہے۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ اقامت کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنی منع ہیں۔ اگر رہ جائیں تو فرضوں کے بعد پڑھے

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۰ء

عشاء سے پہلے سونا اور بارہ بجے جاگنا

سوال:۔ ایک شخص شام کی نماز پڑھ کر بستر پر سو جاتا ہے اور نیند سے وہ مغلوب ہو جاتا ہے۔ اگر وہ رات کو بارہ بجے کے بعد جاگے تو نماز عشاء کی پڑھے جائز ہے یا نہیں؟

خدا بخش از راجہ سانسی تحصیل اجنالہ ضلع امرتسر

جواب:۔ حدیث میں ہے:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا

(مشکوٰۃ باب تعجیل الصلوٰۃ)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء سے پہلے سونا اور عشاء کے بعد باتیں کرنا برا جانتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دیدہ دانستہ عشاء سے پہلے سونا درست نہیں۔ اگرچہ عشاء کی نماز کا وقت نصف رات تک ہے لیکن عشاء سے پہلے سونے سے منع فرمایا تاکہ کہیں نیند کے غلبہ میں نماز نہ رہ جائے یا جماعت نہ فوت ہو جائے بلکہ اگر پاس جگانے والا موجود ہو تو بھی نہ سوئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام ممانعت فرمائی ہے تاکہ سونے کی عادت نہ پڑ جائے۔ ہاں کہیں اتفاقیہ نیند کا غلبہ ہو کر سو گیا تو پھر جب جاگے فوراً نماز پڑھے خواہ رات کے بارہ بجے کا وقت ہو یا کوئی اور وقت ہو۔

حدیث میں ہے:۔

إِذَا نَسِيَ أَحَدُكُمْ صَلٰوةً أَوْ نَامَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا۔

(مشکوٰۃ باب تعجیل الصلوٰۃ ص۵۲)

یعنی جب ایک تمہارا نماز بھول جائے یا سو جائے تو جب یاد آئے یا جاگے اس وقت پڑھ لے۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ ۱۶ جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۴ء

بارش میں دو نمازوں کا جمع کرنا

سوال:۔ بحالت بارش وغیرہ دو نمازیں جمع کرکے پڑھنا کتاب وسنت سے ثابت ہے یا نہیں؟ حدیث مسلم وترمذی جس میں بلا عذر جمع بین الصلوتین ثابت ہے وہ پیش نہ کریں کیونکہ اس کے متعلق امام ترمذیؒ نے بیان کیا ہے کہ یہ حدیث علماء دین کی معمول بہ نہیں ہے۔ اگرچہ بسند صحیح ہے مگر عدم تعامل اہل علم اس کو کمزور کرتا ہے۔ از عطاء اللہ شاہ

جواب:۔ آپ نے مسلم اور ترمذی کی حدیث میں بلا عذر جمع کرنے کا لفظ بتایا ہے حالانکہ اس میں بلا عذر کا لفظ نہیں ہے بلکہ غیر خوف ولا مطر ہے اور مسلم کی ایک روایت میں غیر خوف ولا سفر ہے دوسرے آپ نے علماء دین کے معمول بہ نہ ہونے کا مطلب الٹ سمجھا ہے۔ اس سے دو باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خوف بغیر بارش اور بغیر سفر کے نمازیں جمع کیں۔

دوسری یہ کہ خوف بارش سفر یہ تینوں عذر شرع میں معتبر ہیں۔ کیونکہ اگر معتبر نہ ہوتے تو ان کی نفی کا کچھ معنی نہیں پہلی بات کا مطلب عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ بلا عذر جمع کیں۔ اور اسی سے آپ کو دھوکا لگا ہے کہ لفظ بلا عذر کو آپ حدیث کا لفظ سمجھ گئے۔ ورنہ حدیث میں یہ لفظ نہیں۔ اسی (بلا عذر) سمجھنے کی بناء پر امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث پر کسی کا عمل نہیں۔ گویا یہ منسوخ[1] ہے اگر یہ مطلب نہ لیں بلکہ یہ مطلب لیں کہ راوی نے صرف تین عذروں کی نفی کی ہے۔ شاید ان کے علاوہ کوئی بیماری وغیرہ کا عذر ہو تو پھر یہ حدیث متروک العمل نہیں۔ کیونکہ بیماری کے عذر سے بعض تابعین اور امام اسحٰقؒ جمع کے قائل ہیں۔ چنانچہ اسی حدیث کے ماتحت امام ترمذیؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ رہی دوسری بات تو اس کے لحاظ سے بھی حدیث متروک العمل نہیں۔ چنانچہ امام ترمذیؒ اس حدیث کے ماتحت فرماتے ہیں۔

---

[1] اس کا ناسخ یہ حدیث ہے جس کے راوی ابن عباسؓ ہیں من جمع بین الصلوتین من غیر عذر فقد اتی بابا من ابواب الکبائر۔ یعنی جو بغیر عذر معتبر کے جمع کرے وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں سے ایک دروازہ کو آیا۔ یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر عمل سے اس کو تقویت ہوگئی کیونکہ بلا عذر جمع کرنے کا سلفؒ سے کوئی بھی قائل نہیں اگر قائل ہوتا تو امام ترمذیؒ بغیر خوف بغیر بارش وغیرہ کے جمع کرنے کی حدیث کو متروک العمل نہ کہتے۔

قال بعض اهل العلم یجمع بین الصلوٰتین فی المطر وبہ یقول الشافعی واحمد واسحٰق ولم یر الشافعی للمریض ان یجمع بین الصلوٰتین۔

(ترمذی باب ماجاء فی الجمع بین الصلوٰتین)

یعنی بارش میں بعض اہل علم کہتے ہیں کہ نماز جمع کی جائے اور امام شافعیؒ امام احمدؒ امام اسحٰقؒ اس کے قائل ہیں۔ اور امام شافعیؒ مریض کو جمع کی اجازتؒ نہیں دیتے۔

جب بارش میں بعض اہل علم اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ جمع کے قائل ہیں تو دوسری بات کے لحاظ سے یہ حدیث قابل عمل ہے۔ اور بارش کے وقت جمع کرنے پر استدلال اس سے صحیح ہے۔ اس کے علاوہ اور دلائل بھی ہیں۔ نیل الاوطار میں ہے۔

ولمالك فی الموطا عن نافع ان ابن عمر اِذَا جَمَعَ الْاُمَرَاءُ بَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ فِی الْمَطَرِ جَمَعَ مَعَهُمْ وَلِلْاَثْرَمِ فِی سُنَنِهٖ عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَنَّهٗ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ اِذَا كَانَ یَوْمُ مَطَرٍ اَنْ یَجْمَعَ بَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ (نیل الاوطار جلد۳ صفحہ ۹۳)

یعنی مؤطا امام مالکؒ میں نافعؒ سے روایت ہے کہ جب امیر مغرب۔ عشاء جمع کرتے تو ابن عمرؓ بھی ان کے ساتھ جمع کرتے اور ابی سلمہ بن عبدالرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ بارش کے دن مغرب اور عشاء کے درمیان جمع کرنا سنّت ہے۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۲۱ ذیقعد ۱۳۵۳ھ

جمع تقدیم و جمع تاخیر

سوال:۔ ایک مولوی صاحب بڑے دعوے سے کہتے ہیں کہ عصر کے وقت ظہر کو اور عشاء کے وقت مغرب کو جمع کر کے پڑھنا ثابت نہیں۔ جمع تقدیم اور جمع تاخیر کا وہ یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ ظہر کو آخر وقت اور عصر کو اول وقت میں جمع کیا جائے تو ان میں سے ایک یعنی پہلی نماز کو جمع تاخیر کہتے ہیں اور دوسری نماز جو پہلی کے ساتھ جمع کی جائے وہ جمع تقدیم ہے۔ اس کے علاوہ پہلی نماز کو دوسری کے وقت میں جمع کر کے

ؒ ترجیح اسی کو ہے کہ بیمار کے لئے دو نمازوں کا جمع کرنا درست ہے۔

پڑھنا ناجائز ہے کیا یہ مطلب صحیح ہے۔

محمد عالم اسلامیہ پارک لاہور

جواب:۔ نیل الاوطار مصری جلد ۳ صفحہ ۲۲۵ باب جواز الجمع) فی السفر فی وقت احدھما و قال اسنادہ صحیح بلفظ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ فِيْ سَفَرٍ وَزَالَتِ الشَّمْسُ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيْعًا - یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں ہوتے اور سورج ڈھل جاتا تو ظہر اور عصر اکٹھی پڑھ لیتے۔

نیل الاوطار کے اسی صفحہ پر ہے

عَنْ جَابِرٍ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ وَفِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا وَكَانَ ذَالِكَ بَعْدَ الزَّوَالِ -

پھر اذان دی اور اقامت کہی پھر ظہر پڑھی پھر تکبیر کہی پس عصر پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ نہیں پڑھا اور یہ زوال کے بعد تھا۔

ان دونوں حدیثوں سے جمع تقدیم حقیقی کا ثبوت واضح ہے۔

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهُ اسْتُغِيْثَ عَلٰى بَعْضِ اَهْلِهِ فَجَدَّ بِهِ السَّيْرُ فَاَخَّرَ الْمَغْرِبَ حَتّٰى غَابَ الشَّفَقُ ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ اَخْبَرَهُمْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَفْعَلُ ذَالِكَ اِذَا جَدَّ بِهِ السَّيْرُ رواہ الترمذی بھذا اللفظ صححہ منتقی مع نیل الاوطار صفحہ ۲۳)

یعنی ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ان کو اپنے بعض اہل کے متعلق سفر میں اسمنت بیماری کی خبر ملی۔ پس تیز چلے اور نماز مغرب کو موخر کر دیا یہاں تک کہ سرخی غائب ہوگئی پھر (سواری سے) اترے۔ پس دونوں نمازوں (مغرب عشاء) کو جمع کیا اور (نماز سے فارغ ہوکر) فرمایا کہ جب جلدی ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کیا کرتے تھے۔

اس کو امام ترمذیؒ نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔

مسلم میں ہے:۔

كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّجْمَعَ بَيْنَ الصَّلٰوتَيْنِ فِي السَّفَرِ يُؤَخِّرُ الظُّهْرَ حَتّٰى يَدْخُلَ اَوَّلُ وَقْتِ

اَلْعَصْرِ ثُمَّ یَجْمَعُ بَیْنَهُمَا (منتقی مع نیل الاوطار ص۲۲۶)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا ارادہ کرتے ظہر کو موخر کر دیتے یہانتک کہ عصر کا اول وقت ہو جاتا پھر دونوں (ظہر اور عصر) کو جمع کرتے۔

ان دونوں حدیثوں سے جمع تاخیر حقیقی ثابت ہو گئی۔

نیز نیل الاوطار کے ص۲۲۵ پر ہے۔

فی حدیث معاذ بن جبل فی الموطا بلفظ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَخَّرَ الصَّلٰوۃَ فِیْ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ خَرَجَ فَصَلَّی الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِیْعًا ثُمَّ دَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّی الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ جَمِیْعًا قَالَ الشَّافِعِیُّ فِی الْاُمِّ قَوْلُهٗ ثُمَّ خَرَجَ لَا یَکُوْنُ اِلَّا وَهُوَ نَازِلٌ فَلِلْمُسَافِرِ اَنْ یَّجْمَعَ نَازِلًا وَّمُسَافِرًا وَقَالَ ابن عبد البر هٰذَا اَوْضَحُ دَلِیْلٍ فِی الرَّدِّ عَلٰی مَنْ قَالَ لَا یَجْمَعُ اِلَّا مَنْ جَدَّ بِهِ السَّیْرُ وَهُوَ قَاطِعٌ لِلْاِلْتِبَاسِ

یعنی معاذ بن جبل کی حدیث موطا میں ان الفاظ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں نماز کو موخر کیا۔ نکلے پس ظہر اور عصر اکٹھی پڑھیں پھر داخل ہوئے پھر نکلے پس مغرب اور عشا اکٹھی پڑھیں۔

امام شافعیؒ کتاب "الام" میں فرماتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے پھر نکلے یہ دلیل ہے کہ آپ اُترے ہوئے تھے پس مسافر کے لئے دونوں صورتوں میں جائز ہے خواہ اُترا ہوا ہو یا چل رہا ہو۔

اور امام ابن عبد البرؒ کہتے ہیں۔

یہ اس شخص کے رد کے لئے واضح دلیل ہے کہ جو کہتا ہے کہ صرف چلتا ہوا مسافر جمع کرے (منہ انتاشوا)

اس حدیث سے بالکل ہی شک رفع ہو گیا۔

نوٹ:۔ جمع تقدیم اور جمع تاخیر کی جو تعریف سوال میں مذکور ہے یہ آج تک کسی امام نے نہیں کی یہ درحقیقت جمع نہیں کیونکہ ہر نماز اپنے وقت میں پڑھی گئی ہے یہ صرف صورتا جمع ہے۔ جمع تقدیم تاخیر یہ ہے کہ پہلی کو دوسری کے وقت میں پڑھا جائے۔

عبد اللہ امرتسری روپڑی

۱۴ شعبان ۱۳۸۲ھ ۔ ۱۱ جنوری ۱۹۶۳ء

عشاء کے بعد کس کو باتیں کرنے کی اجازت ہے اور کس کو نہیں

سوال :۔ ترمذی میں ہے لَا سَمَرَ اِلَّا لِمُصَلٍّ اَوْ مُسَافِرٍ یعنی نمازی اور مسافر کو باتیں کرنے کی اجازت ہے اِس سے کونسا نمازی مراد ہے جو بعد نمازِ عشاء گفتگو کر سکتا ہے۔

جواب :۔ اس حدیث لا سمر الا لمصل[1] میں نماز سے مراد عشاء کی نماز ہے یعنی عشاء کی نماز کے انتظار میں بیٹھا ہو تو باتوں کی اجازت ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ نماز عشاء دیر میں پڑھی جاتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ عشاء کے بعد بات چیت منع ہے تو عشاء کے معمول وقت کے بعد بھی یہی حکم ہوگا۔ اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کی انتظار میں ہو تو بات چیت منع نہیں تاکہ مطلب کی گفتگو بھی ہو جائے اور نیند بھی رکی رہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ نماز سے مُراد عشاء کے بعد چار نفل ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سونے سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو منتقیٰ وغیرہ اور وتر وغیرہ بھی مُراد ہو سکتے ہیں۔

فوت شدہ نماز عصر پڑھنے کا وقت

سوال :۔ اگر عصر کی نماز رہ جائے تو کس وقت ادا کی جائے شام کے ساتھ یا اگلے روز عصر کے ساتھ۔

جواب :۔ اگر عصر کی نماز بھول سے یا نیند سے رہ جائے تو حدیث میں آیا ہے کہ جب جاگے یا یاد آئے وہی اُس کا وقت ہے خواہ وہ غروب وطلوع کا وقت ہی ہو۔ ہاں اگر سُستی سے نماز رہی ہو تو اس کے پڑھنے میں بھی جلدی کرے کیونکہ سُستی ہی کی وجہ سے وہ پہلے ہی مُجرم ہو چکا ہے۔ اب زیادہ دیر سے جُرم میں اضافہ ہی ہوگا۔ لہٰذا جلدی پڑھے اور آئندہ کے لئے توبہ کرے۔

عبداللہ امرتسری

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ عن خیثمة عن رجل من قومه عن عبدالله قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا سمر بعد الصلوٰة یعنی عشاء الاخرة الا لاحد رجلین مصل او مسافر۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عشاء مراد لینا ٹھیک نہیں مگر کہا جائے بعد الصلوٰۃ میں حذف مضاف ہے۔ یعنی بعد وقت یعنی المعتاد لها فافهم۔

(مسند احمد جلد اول ص ۳۷۹)

میّت کی طرف سے نماز کی قضائی

سوال :- میت کی طرف سے نمازوں کی قضائی دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب :- میت کی طرف سے قضا نماز کی ادائیگی تو قرآن وحدیث سے ثابت نہیں بلکہ مرنے کے وقت اگر نماز کا تارک تھا تو کافر مرا اور کافر کا جنازہ بھی درست نہیں۔ چہ جائیکہ اس کی نمازوں کی قضا دی جائے ہاں اگر اتفاقیہ کوئی نماز عذر سے رہ گئی ہو تو اُس کے متعلق اس کے لئے دعا مغفرت کی جائے۔ اور اُس کی طرف سے حج قربانی، صدقہ خیرات کیا جائے تاکہ اُس کو ثواب پہنچے اور اُس کے ذمہ جو بوجھ ہو اُتر جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۷ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ

قضا شدہ نمازوں میں ترتیب یا بلا ترتیب ادا کرنے کا مسئلہ

سوال :- جو نمازیں قضا ہوجائیں ان کو ترتیب سے ادا کرنا چاہیئے یا بلا ترتیب ادا کی جائیں۔

جواب :- اس مسئلہ میں بظاہر تین اہم باتیں ٹکرا رہی ہیں۔

پہلی بات یہ حدیث ہے فَلَا صَلٰوۃَ اِلَّا الَّتِیْ اُقِیْمَتْ لَھَا۔ یعنی جب اقامت ہو تو اس نماز کے سوا کوئی نماز نہیں جس کی اقامت ہوئی۔

دوسری بات ترتیب نمازوں کا مسئلہ ہے۔ جمہور کہتے ہیں، ترتیب ضروری ہے۔ بعض کہتے ہیں ضروری نہیں جمہور کی دلیل یہ ہے کہ ترمذی۔ نسائی۔ مؤطا میں ہے کہ جنگ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں رہ گئی تھیں۔ بخاری مسلم میں کم نمازوں کا ذکر ہے۔ عشا کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ترتیب سے پڑھا۔ پہلے ظہر پڑھی پھر عصر پھر مغرب پھر عشاء اور آپ نے عام طور پر فرمایا ہے صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ۔ یعنی نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا دیکھتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب سے پڑھنی ضروری ہیں۔

ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

واحتج الجمہور بقول النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم من نام عن صلوٰۃ او نسیہا فلیصلہا اذا ذکرہا لا کفارۃ لہا الا ذالک وفی لفظ فان ذالک وقتہا (جلد اول فتاوی ابن تیمیہ)

یعنی جمہور کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سو جائے یا بھول جائے تو جب یاد آئے پڑھ لے یہی اس کا کفّارہ ہے۔ اور ایک روایت میں ہے یہی اس کا وقت ہے۔
جب یاد آنے کے وقت پڑھنے کا حکم ہوا۔ اور یہی اس کا وقت ہوا تو اب دوسری نماز سے اس کو مؤخر کرنا جس کی اب اقامت ہوئی ہے ٹھیک نہ ہوا۔

مؤطا امام مالکؒ باب العمل فی جامع الصلوٰۃ ص۲۴ میں ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ مَنْ نَسِیَ صَلٰوۃً فَلَمْ یَذْکُرْھَا اِلَّا وَھُوَ مَعَ الْاِمَامِ فَاِذَا سَلَّمَ الْاِمَامُ فَلْیُصَلِّ الصَّلٰوۃَ الَّتِیْ نَسِیَ ثُمَّ لِیُصَلِّ بَعْدَھَا الْاُخْرٰی

یعنی ابن عمرؓ فرماتے ہیں جو شخص نماز بھول جائے اس کو یاد نہیں آئی یہاں تک کہ دوسری نماز امام کے ساتھ پڑھنے لگ گیا تو جب امام سلام پھیرے پہلے بھولی ہوئی نماز پڑھے پھر دوسری پڑھے۔

تیسری بات

یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِہٖ۔ یعنی امام کی تابعداری ضروری ہے جو امام کرے کرے وہ کرنا چاہیئے۔

اس حدیث کی رُو سے امام عشاء کی نماز پڑھتا ہو تو اس کے ساتھ مغرب کی نماز کس طرح پڑھے۔ اگر تین پر سلام پھیرے تو امام کی مخالفت لازم آتی ہے۔ اگر چار پڑھے تو مغرب نہیں بنتی۔ اگر تین فرضوں کی نیّت کرے اور ایک نفل کی نیّت کرے تو یہ بھی ایک انوکھی سی بات ہے کیونکہ وتر کے سوا ایک نفل کا کہیں ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی فرض اور نفل کی اکٹھی نیّت آئی ہے۔ اگر ٹھہرا رہے یہاں تک کہ امام رکعت پڑھ لے تو یہ سب سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ اذان سن کر ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ فوراً نماز کے لئے آنا ضروری ہے۔ یہ اقامت سُن کر شامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر فجر کی نماز رہ گئی ہو اور وہ ظہر کے ساتھ پڑھنی چاہتا ہو تو اس کو بھی یہی مشکل ہو گی ہاں امام ایک یا دو رکعت پڑھ چکا ہو اور اس کے بعد یہ آیا ہو تو اس صورت میں یہ مشکل نہیں لیکن کھٹکا سے یہ بھی خالی نہیں کیونکہ جب امام کی اقتداء میں یہ داخل ہو گیا تو امام کی ساری نماز اس نے اپنے ذمہ کر لی۔ اس لئے مسافر

ف دارقطنی باب الرجل یذکر صلوٰۃ وھو فی اخری ص۱۶۱ میں اس روایت کو مرفوع بھی ذکر کیا ہے لیکن کہا ہے کہ مرفوع وہم ہے۔ ۱۲

مقیم امام کے پیچھے پوری پڑھتا ہے۔ چنانچہ تلخیص میں مسند امام احمد کی روایت ہے۔ ابن عباسؓ سے سوال ہوا کہ مسافر مقیم کے پیچھے پوری نماز کیوں پڑھتا ہے؟ فرمایا سُنَّۃُ اَبِی الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ یعنی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اس کا اصل نسائی و مسلم میں بھی ہے۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں روایتوں کا آپس میں بہت تعارض ہے تو اب اس تعارض کو اٹھانے کی کوئی صورت سوچنی چاہیئے۔

رفع تعارض

امام ابوحنیفہؒ نے تو صرف ترتیب کے مسئلہ کو لیا ہے وہ فرماتے ہیں۔ جماعت خواہ ملے یا نہ ترتیب کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً صبح کی نماز اس وقت یاد آئی جب خطبہ سے فارغ ہو کر جمعہ کی نماز پڑھانے لگا تو وہ فجر کی نماز پڑھے خواہ جمعہ[1] فوت ہو جائے۔ ملاحظہ ہو شامی جلد اول باب ادراك الفریضة ص۵۲۵ وباب قضاء الفوائت ص۵۳۶ وفتاوی ابن تیمیہ رح جلد اول ص۱۲۹۔ لیکن اس صورت میں حدیث فلا صلوٰۃ الا التی اقیمت لھا پر عمل بالکل ترک ہو جاتا ہے اس لئے یہ ٹھیک نہیں۔ جمعہ کے مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رح کے شاگرد امام محمدؒ بھی اپنے استاد کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں پہلے جمعہ پڑھے پھر صبح کی نماز پڑھے چنانچہ شامی کے صفحہ مذکورہ میں تصریح کی ہے۔ باقی دو صورتیں اور ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں ٹھیک ہیں ان سے جس پر چاہے عمل کرے۔

ایک صورت

ایک یہ کہ پہلے وہ نماز پڑھ لے جس کی اقامت ہوئی ہے اس کے بعد وہ نماز پڑھے جو قضا ہوگئی۔

ترتیب والی احادیث کا جواب

یہ ہے کہ حدیث لا صلوٰۃ الا التی اقیمت لھا سے معلوم ہوا کہ جب اقامت ہو جائے تو ترتیب قائم رکھنی ضروری نہیں ہاں اور وقتوں میں ترتیب سے پڑھے۔ اور عبداللہ بن عمرؓ کی روایت جو موطا کے حوالہ سے گذری ہے۔ وہ عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے حدیث فلا صلوٰۃ الا التی اقیمت لھا کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

دوسری صورت

یہ ہے کہ امام کے ساتھ شامل ہو جائے اور قضا نماز کی نیت کرلے اس کے بعد اکیلا دوسری نماز پڑھ لے جس کی اقامت ہوئی۔ رہا فجر کی نماز کو نماز ظہر کے ساتھ پڑھنا سو اس کا ایک طریق تو یہی ہے کہ جتنی رکعتیں زائد ہیں۔ ان کی نفل کی نیت کرے مثلاً فجر ظہر کے ساتھ پڑھے تو

---

[1] یعنی جمعہ کی جگہ پھر ظہر پڑھے۔

دو نفلوں کی نیت کرے اور اگر مغرب عشاء کے ساتھ پڑھے تو ایک نفل کی نیت کرے۔ اگرچہ ایک نفل وتر کے سوا نہیں آیا لیکن جماعت کی خاطر جائز ہے۔ دیکھئے تین نفل بھی وتر کے سوا نہیں آئے لیکن کوئی شخص مغرب اکیلا پڑھ چکا ہو پھر مغرب کی جماعت پالے تو ملنا پڑے گا یا مغرب کی جماعت ہو چکی۔ اس کے بعد اکیلا آئے تو جو شخص نماز جماعت کے ساتھ پڑھ چکا ہے وہ اس کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے۔ رہی فرض نفل کی اکٹھی نیت تو یہ بھی جماعت کی خاطر ہے۔ جیسے امام پانچ رکعت پڑھ لے تو امام پر سجدہ سہو پڑ گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ پانچویں رکعت اور سجدہ سہو مل کر بمنزلہ دو رکعت کے ہو کر نفل ہو جائیں گے لیکن مقتدی کو بھی سجدہ سہو کرنا پڑتا ہے تو یہ جماعت کو قائم رکھنے کی خاطر ہے ورنہ مقتدی کو کیا ضرورت ہے۔

دُوسرا طریق یہ ہے کہ صبح کی نماز ظہر کے ساتھ پڑھے تو دو پر سلام پھیر کر امام سے الگ ہو جائے اگر مغرب عشاء کے ساتھ پڑھے تو تین پڑھ کر الگ ہو جائے جیسے صلوٰۃ خوف میں مقتدی ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ کر دشمن کے سامنے چلے جاتے ہیں۔ اور امام دُوسری رکعت دوسرے مقتدیوں کو پڑھا دیتا ہے۔ گویا یہ سب تغیر و تبدل جماعت کی خاطر ہے۔ ایسے مسائل میں تشدد نہ چاہیئے کیونکہ یہ اختلاف حادث نہیں۔ اور دلائل ملتے جلتے ہیں۔

اختیارات ابن تیمیہؒ صفحہ ۷۰ میں ہے۔

اصح الطریقین لاصحاب احمد انہ یصح ائتمام القاضی بالمودی ولا بالعکس ولا یخرج عن ذالک ائتمام المفترض بالمتنفل ولو اختلفا اوکانت صلوۃ الماموم اقل وھو اختیار ابی البرکات وغیرہ۔

یعنی زیادہ صحیح طریق اصحاب احمد کے نزدیک یہ ہے کہ قضا دینے والا ادا کرنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے۔ اور فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کی اقتداء کرے یہ بھی اس میں داخل ہے خواہ نمازیں ان کی تعداد رکعت میں کم و بیش ہوں بلکہ مقتدی کی نماز کم ہو تو بھی کوئی حرج نہیں (جیسے امام عشاء پڑھے اور مقتدی اس کے ساتھ مغرب کی نیت کرے) اور ابو البرکات وغیرہ کے نزدیک یہی مختار ہے۔

فتاویٰ ابن تیمیہ جلد اوّل صفحہ ۱۱۱ میں ہے۔

مسئلہ فی من وجد جماعۃ یصلون الظھر فاراد ان یقضی معھم الصبح فلما قام الامام للرکعۃ الثالثۃ فارقہ بالسلام فھل تصح ھذہ الصلوۃ وعلی ای مذھب

تصح۔

الجواب:۔ هذه الصلوٰة لا تصح فی مذهب ابی حنیفة ومالك واحمد فی احدی الروایتین عنه وتصح فی مذهب الشافعی واحمد فی الروایة الاخری۔

یعنی جو شخص فجر کی نماز ظہر پڑھنے والے امام کے ساتھ پڑھے۔ جب امام تیسری رکعت کے لئے اُٹھے یہ سلام پھیر کر الگ ہو جائے یہ نماز صحیح ہو گی یا نہ؟ اگر صحیح ہو گی تو کس کے نزدیک؟

جواب اس کا یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رح اور امام مالک کے نزدیک صحیح نہیں۔ اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت اس طرح آئی ہے۔ اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک یہ نماز صحیح ہو گی۔ اور امام شافعیؒ کے مذہب میں بھی یہ نماز صحیح ہے۔

فتاویٰ ابن تیمیہ جلد اول ص۱۱۵ میں ہے:۔

مسئله فی امام قام الی الخامسة فسبح به فلم یلتفت لقولهم وظن انه لم یسه فهل یقومون معه ام لا۔

الجواب۔ ان قاموا معه جاهلین لم تبطل صلوٰتهم لکن مع العلم لا ینبغی لهم ان یتابعوه بل ینتظروه حتی یسلم بهم او یسلموا قبله والانتظار احسن واللّٰه اعلم۔

امام پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوا کسی نے پیچھے سے سبحان اللہ کہا۔ امام نے اُس کا خیال نہ کیا کیونکہ اُس کے دل میں تھا کہ میں بھولا نہیں۔ کیا اس صورت میں مقتدی امام کے ساتھ کھڑے ہوں یا نہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مسئلہ کی ناواقفی کی وجہ سے کھڑے ہو جائیں تو ان کی نماز باطل نہیں ہو گی۔ لیکن دیدہ دانستہ کھڑے ہونا لائق نہیں بلکہ امام کی انتظار میں بیٹھے رہیں۔ جب امام پانچویں رکعت پڑھ لے تو اس کے ساتھ سلام پھیریں یا اس سے پہلے جب وہ پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو سلام پھیر لیں یعنی سلام پھیر کر امام سے الگ ہو جائیں لیکن امام کی انتظار بہتر ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ یکم رجب ۱۳۵۱ھ۔

یکم نومبر ۱۹۳۲ء

فجر کی اذان وقت سے پہلے کہنا

سوال :۔ فجر کی اذان جلدی کہی گئی ہو یا شبہ میں کہی جائے تو اس کا کیا حکم ہے ؟

جواب :۔ فجر کی اذان شبہ میں ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ، نماز شبہ میں نہ ہونی چاہیئے۔

موطا امام مالک میں ہے :۔

لم تزل الصبح ینادی بھا قبل الفجر فاما غیرھا من الصلوات فانا لم نرھا ینادی بھا الا بعد ان یحل وقتھا۔

یعنی تعامل اس پر چلا آیا ہے کہ فجر کی اذان پوہ پھٹنے سے پہلے ہوتی رہی ہے۔ اس کے سوا اور کسی نماز کی اذان کا وقت پہلے ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ مگر رمضان میں فجر کی اذان پوہ پھٹنے سے پہلے نہ دینی چاہیئے۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۵ رجب ۱۳۵۱ھ ۔ ۱۵ نومبر ۱۹۳۲ء

تہجد اور سحری کی اذان

سوال :۔ فجر سے پہلے اذان درست ہے یا نہیں ۔ وہ اذان سحری کی یا تہجد کی کہلا سکتی ہے یا نہیں ۔ کیا کوئی شخص غیر رمضان میں سحری کی اذان دے سکتا ہے ؟

جواب :۔ عن ابن عمر وعائشۃ رض قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان بلالا یوذن بلیل فکلوا واشربوا ____ حتی ینادی ابن ام مکتوم وکان رجلا اعمٰی لا ینادی حتی یقال لہ اصبحت اصبحت متفق علیہ وفی اخرہ ادراج۔

یعنی ابن عمر رض اور عائشہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بلال رات کو اذان دیتا ہے پس سحری کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دے اور ابن ام مکتوم نابینا آدمی تھا۔ یہاں تک کہ کہا جاتا صبح ہو گئی صبح ہو گئی اور اخیر کلام (وکان رجلا اعمی) اخیر تک راوی کا قول ہے۔

اس حدیث پر سبل السلام میں لکھا ہے۔

وفيه شرعية الاذان قبل الفجر لا لما شرع الاذان فان الاذان كما سلف للاعلام بدخول الوقت ولدعاء السامعين لحضور الصلوٰة وهذا الاذان الذی قبل الفجر قد اخبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بوجه شرعيته بقوله ليوقظ نائمكم ويرجع قائمكم رواه الجماعة الا الترمذی والقائم هو الذی يصلی صلوٰة الليل ورجوعه عوده الی نومه اوقعوده عن صلوته اذا سمع الاذان فليس للاعلام بدخول وقت ولا لحضور الصلوٰة فذكر الاختلاف فی المسئلة والاستدلال للمانع وللمجيز لا يلتفت اليه من همه العمل بما ثبت (سبل السلام جلد ۱ ص ۸۲)

اس میں فجر سے پہلے اذان دینے کا ثبوت ہے مگر یہ اذان اس خاطر نہیں جو اذان کی اصل غرض ہے کیونکہ اصل غرض اذان کے وقت نماز کا اعلان اور سامعین کو حضور نماز کی دعوت ہے اور اس اذان کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ سوئے ہوئے کو جگانے کی خاطر اور قائم کو لوٹانے کی خاطر ہے اس کو ترمذی کے سوا باقی جماعت نے روایت کیا ہے۔ اور قائم سے مراد جو رات کو نماز پڑھتا ہے اور اس کو لوٹانے سے مراد یہ ہے کہ وہ سو جائے یا نماز سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے جبکہ اذان سُنے۔ پس یہ اذان نہ وقت نماز کی اطلاع کے لئے ہے اور نہ حضور نماز کی خاطر ہے پس اس مسئلہ میں جواز عدم جواز کے جھگڑے میں اور مانع اور مجوز کے استدلال کی بحث میں وہ شخص نہیں پڑ سکتا جس کا مقصد ثابت شدہ شے پر عمل ہے۔

اس بیان سے ایک تو سحری کی اذان ثابت ہوئی۔ دوم یہ معلوم ہوا کہ اس اذان کی غرض وہ نہیں جو عام اذان کی ہے بلکہ یہ اس خاطر ہے کہ رات کو نماز پڑھنے والا ذرا آرام لے کر نماز فجر کے لئے تیار ہو جائے۔ دوم سویا ہوا اٹھ کر نماز کی تیاری کر سکے کیونکہ اکثر انسان رات کی نیند سے اٹھتا ہے تو اس کو کئی طرح کی حاجتیں ہوتی ہیں، پہلے نیند کی سستی میں اٹھتے اٹھتے اتنی دیر لگ جاتی ہے۔ پھر اکثر پاخانہ پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ اور کبھی غسل وغیرہ کی بھی حاجت ہوتی ہے اور صبح کے وضو کے لئے بھی کچھ وقت زیادہ چاہیے کیونکہ منہ ناک وغیرہ میں لمبی نیند سے جو مواد جمع ہو جاتا ہے، مسواک وغیرہ سے اس کی صفائی اور اندر سے اس کا اخراج ان کاموں کے لئے کافی وقت چاہیے۔ اس لئے سحری کی اذان مقرر کی گئی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ محض رمضان کے لئے نہیں

بلکہ بارہ ماہ کے لئے ہے بلکہ رمضان سے دوسرے مہینوں میں زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ رمضان میں کھانے پکانے کے لئے لوگ پہلے سے جاگے ہوئے ہوتے ہیں۔ برخلاف غیر رمضان کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ تم کو بلال کی اذان کھانے پینے سے نہ روکے۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ یہ رمضان ہی میں ہے بلکہ اس فرمان کی یہ وجہ ہے کہ رمضان میں اشتباہ کا ڈر تھا کہ کہیں لوگ پہلی اذان سے ہی کھانے پینے سے نہ رک جائیں۔ اس لئے آپ نے اس اشتباہ کو دور فرمایا۔

اسی بنا پر حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں فرماتے ہیں۔

وادعی ابن القطان ان ذالک کان فی رمضان خاصۃ وفیہ نظر

(فتح الباری جزء ۳ صفحہ ۲۴۶)

یعنی ابن القطان نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ اذان رمضان سے مخصوص ہے۔ مگر ابن القطان کے اس دعویٰ میں کلام ہے۔

نیل الاوطار میں ہے:۔

وقد اختلف فی اذان بلال بلیل ھل کان فی رمضان فقط ام فی جمیع الاوقات فادعی ابن القطان الاول قال الحافظ وفیہ نظر (نیل الاوطار جلد اول صفحہ ۳۲۹)

بلال کی اذان جو رات میں ہوتی تھی اس میں اختلاف ہے کہ خاص رمضان میں تھی یا تمام اوقات میں ابن القطان نے اول کا دعویٰ کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس دعویٰ میں کلام ہے۔

اس تفسیر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں اذانوں میں کچھ زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ اگر پہلی اذان بہت پہلے ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں پر اس اشتباہ کا خطرہ نہ ہوتا کہ یہ فجر کی اذان ہے۔ اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اشتباہ کے اٹھانے کی خاطر یہ کہنا پڑتا کہ بلال کی اذان تمہیں کھانے پینے سے نہ روکے کیونکہ فاصلہ زیادہ ہونے سے خود ہی سمجھ جاتے تھے کہ رات باقی ہے۔ علاوہ ازیں بعض روایتوں میں تصریح آگئی ہے کہ فاصلہ بہت تھوڑا ہوتا تھا۔

فتح الباری میں بحوالہ نسائی وطحاوی حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔

ولم یکن بینھما الا ان ینزل ھذا ویصعد ھذا (فتح الباری جزء ۳ صفحہ ۲۴۶)

یعنی دونوں اذانوں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ تھا کہ اذان کی جگہ سے ایک اترتا اور دوسرا اذان دینے

کے لئے چڑھ جاتا۔ اور بخاری کتاب الصیام میں یہ بھی روایت ہے کہ وہاں حضرت عائشہ رضہ کے شاگرد قاسم کی طرف اس کی نسبت ہے لیکن نسائی اور طحاوی کی روایت سے معلوم ہوگیا کہ قاسم نے اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ حضرت عائشہؓ سے سن کر کہا ہے۔ اسی پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

فمعنیٰ قوله فی روایة البخاری قال القاسم ای فی روایته عن عائشة

(فتح الباری جزء ۲ صفحہ ۳۴۷)

یعنی قال القاسم کا معنی بخاری کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت کر کے کہا ہے نہ کہ اپنی طرف سے۔

پس جب ثابت ہوگیا کہ فاصلہ بہت تھوڑا تھا تو جو لوگ اس کو تہجد کی اذان سمجھتے ہیں یا تہائی رات باقی رہنے کے وقت یا اس سے بھی پہلے دیتے ہیں وہ ڈبل غلطی کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تہجد پڑھنے والے کو فارغ کرنے کے لئے ہے تاکہ وہ ذرا آرام لے کر نماز فجر کے لئے تیار ہو جائے۔ چنانچہ حدیث کا لفظ لیرجع قائمکم اسی کی طرف اشارہ ہے اور اسی تھوڑے فاصلہ کی وجہ سے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ فجر کی نماز کے لئے الگ اذان نہ دی جائے اور اسی پر اکتفا کی جائے تو درست ہے۔ اور اسی کے متعلق ایک حدیث میں ہے۔ فتح الباری میں ہے۔ حدیث زیاد بن الحارث عند ابی داؤد یدل علی الاکتفاء فانه فیه انه اذن قبل الفجر بامر النبی صلی الله علیه وسلم وانه استاذنه فی الاقامة فمنعه الی ان طلع الفجر فامره فاقام (فتح الباری جزء ۲ صفحہ ۳۴۶) زیاد بن الحارثؓ کی حدیث اذان قبل الفجر کے کافی ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے زیاد بن الحارث نے اذان دی اور اس نے اجازت مانگی۔ آپ نے اس کو روک دیا۔ یہانتک کہ پو پھٹ گئی پس اس کو اقامت کا امر فرمایا پس اس نے اقامت کہی۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ اذان پو پھٹنے سے پہلے دی اور اسی پر کفایت کی دوبارہ اذان نہیں دلائی لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے

فی اسناده ضعف وایضا فهی واقعة عین وکانت فی سفر (فتح الباری جزء ۲ صفحہ ۳۴۶)

اس حدیث کی اسناد میں ضعف ہے نیز یہ خاص واقعہ ہے جو سفر میں ہوا ہے۔

اور اصول کا قاعدہ ہے کہ خاص واقعہ سے عام استدلال صحیح نہیں کیونکہ خاص واقعہ میں کئی احتمال ہوتے

ہیں۔ جو مانع استدلال ہیں۔ مالکیہ شافعیہ کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ واقعہ خاص ہے مگر اس میں کوئی ایسا احتمال نہیں جو مانع استدلال ہو۔ رہا ضعفِ اسناد تو یہ مسلّم ہے مگر عمل اہلِ مدینہ اس کے موافق ہے اور عمل سلف اہلِ مدینہ امام مالکؒ وغیرہ کے نزدیک مستقل حجت ہے اور تقویت تو مستقل حجت نہ ہونے کی صورت میں بھی ہو جاتی ہے۔ مگر ایسے بڑے اماموں کے نزدیک مستقل حجت ہونے سے اور زیادہ تقویت ہو گئی پس ضعف اسناد سے اس حدیث میں جو کمی آ گئی تھی وہ اس عمل سے رفع ہو گئی۔ ہاں دو اعتراض اس پر ڈبل پڑ سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر پہلی اذان کافی ہو سکتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو اذان کیوں دلاتے۔ جن سے ایک بلال دیتے اور دوسری عمرو بن ام مکتوم رضؓ۔

دوسرا اعتراض یہ کہ ابوداؤد وغیرہ میں حدیث ہے کہ بلالؓ نے فجر کی اذان ایک مرتبہ غلطی سے پہلے دیدی تو آپ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ اعلان کر دے اَلَا اِنَّ الْعَبْدَ نَامَ۔ خبردار بندہ سو گیا یعنی نیند میں صبح کا پتہ نہیں لگا یا بندہ سونے لگا ہے اس اذان کو معتبر نہ سمجھا جائے۔ اگر قبل الفجر اذان معتبر ہوتی تو اس اعلان کی کیا ضرورت تھی؟ اور اس حدیث کے متعلق اگرچہ حفاظ حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ غلط ہے صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ ان کے موذن سے یہ غلطی ہو گئی تھی جس کے متعلق حضرت عمرؓ نے اعلان مذکور کا حکم دیا تھا۔ لیکن اگر حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ کا واقعہ سمجھ لیا جائے تو پھر عمل اہلِ مدینہ وغیرہ حدیث زیاد بن الحارث کے موافق کہاں رہا۔ علاوہ اس کے حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں اس کو کئی سندوں سے ذکر کیا ہے جو بعض بعض کو تقویت دیتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرفوع کی بھی کچھ اصل ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری جز ۳ صفحہ ۳۴۶) بہرصورت یہ اعتراض بھی ڈبل ہے۔

ان دونوں اعتراضوں کا جواب یہ ہے کہ دوسری اذان صرف رمضان میں دلائی جاتی تھی تاکہ عام طور پر پتہ لگ جائے کہ اب کھانا پینا بند ہے۔ گویا رمضان کا زیادہ اہتمام ہونے کی وجہ سے دوسری اذان کی ضرورت پڑتی اور اسی بنا پر آپ نے فرمایا کہ جب تک عمرو بن اُم مکتوم رضؓ اذان نہ دے کھانے پینے سے بند نہ ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری اذان غیر رمضان میں بھی ہوتی ہو مگر پہلی پر اکتفا بھی درست ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔ جیسے حدیث زیاد بن الحارث رضؓ اور عمل سلف اہلِ مدینہ وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت عمرؓ کے واقعہ کا یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ پہلی اذان موذن نے بہت پہلے دے دی ہو۔ اور ابھی رات کافی باقی ہو۔ اس لئے اعلان مذکور کی ضرورت پڑی ہو۔

غرض اس قسم کے جوابات مالکیہ اور شافعیہ کی طرف سے دیئے جاتے ہیں مگر باوجود اس کے احتیاط اختلاف

سے نکل جانے میں ہے وہ یہ کہ پہلی اذان اگر دی جائے تو اس پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ جیسے جمعہ کی دوسری اذان ضروری دی جاتی ہے خواہ پہلی دی جائے یا نہ اس طرح یہاں بھی دوسری اذان ہونی چاہیئے۔ رہی پہلی اذان تو وہ اگر ہو جائے بہتر ہے اگر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ سلف نے اس کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی ضروری شے نہیں۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلی اذان الفاظ اذان میں نہیں تھی بلکہ ویسے اعلان تھا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اذان کا حقیقی معنی شرعاً انہی الفاظ کے ساتھ اعلان ہے پس یہی مراد ہوگا۔ دوم اگر اذان کے الفاظ نہ ہوتے تو بلال کی اذان سے اشتباہ کا خطرہ نہیں ہو سکتا تھا حالانکہ حدیث سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشتباہ کا خطرہ ہوا۔ اور اسی بنا پر فرمایا کہ بلال رات کو اذان دیتا ہے پس کھاؤ پیو یہاں تک کہ ابن اُم مکتوم اذان دے۔ پس اذان پہلے اگر دی جائے تو مسنون الفاظ سے دینی چاہیئے اپنی طرف سے کوئی بدعت نہ کرنی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ کہیں فائدہ کی جگہ نقصان ہو جائے۔ خدا محفوظ رکھے۔ آمین

عبداللہ امرتسری روپڑی، ۳۰ ستمبر ۱۹۴۱ء، ۲ شعبان ۱۳۶۰ھ

نمازِ عصر کا اوّل وقت

سوال :- نمازِ عصر کا اول وقت کتنے بجے ہوتا ہے۔ بخاری میں حدیث ہے کہ ابوامامہ رضہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھ کر حضرت انس کے پاس مسجد نبوی میں آئے تو حضرت انس نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ نے سوال کیا کہ یہ کونسی نماز پڑھی ہے۔ حضرت انس نے جواب دیا کہ یہ عصر کی نماز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم اس وقت پڑھا کرتے تھے۔ ابوامامہ نے کہا کہ میں نے تو ظہر کی نماز پڑھی ہے حضرت انس نے کہا عصر کی نماز اُس وقت ہوتی تھی کہ ازواج مطہرات کے حجروں میں دھوپ ہوتی تھی صحابہ فرماتے ہیں کہ عصر کی نماز کے بعد ہم اونٹ ذبح کرتے تقسیم کرتے اور پکا کر نماز مغرب سے پہلے کھا لیتے۔ نماز عصر ادا کر کے عوالی میں جاتے تو سورج متغیر نہ ہوتا تھا۔ بعض عوالی کی مسافت چار کوس ہوتی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عصر کی نماز کتنے بجے پڑھنی چاہیئے۔ نیز سایہ اصلی نکالنے کا طریقہ کیا ہے۔ ؟

ابراہیم روپڑی ۱۲-۳-۱۹۵۲

جواب :- عرب خط استواء کے نیچے آباد ہیں۔ اس لئے ان کا عصر کے بعد کا وقت ہم سے زیادہ ہے مثل کا حساب سب ملکوں کے لئے برابر ہے یہ ایسا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرق مغرب کے درمیان قبلہ ہے حالانکہ ہمارا قبلہ مغرب میں ہے۔ نیز فرمایا پاخانہ پیشاب کے وقت مشرق مغرب کو منہ کرو

حالانکہ ہم مغرب میں منہ نہیں کر سکتے۔ سو ایسے ہی عصر کے وقت کے بیان میں حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا ذکر یا اونٹ کے ذبح کا ذکر یا عصر پڑھ کر عوالی کی طرف لوٹنے کو سمجھ لینا چاہیئے۔ جامع صورت مثل ہے۔ دوپہر کا سایہ نکال کر جب مثل ہو جائے تو عصر کا وقت شروع ہو گیا اور اصل سایہ نکالنے کا طریقہ آسان ہے کہ سورج نکلنے سے غروب ہونے تک جتنا وقت ہے اُس کو نصف کر دیا جائے پس جو نصف کے وقت سایہ ہوگا وہ اصلی سایہ ہے۔ اور یہ ہر موسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ نومبر دسمبر کا حساب آج کل لگانا غلطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ وقت شروع ہوتے ہی کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ نمازیوں کو اجتماع کے لئے کچھ مہلت دیتے تھے۔ چنانچہ ابوداؤد میں صحیح حدیث ہے کہ آپ گرمیوں میں ظہر تین قدم سے پانچ قدم تک سایہ میں پڑھتے اور سردیوں میں پانچ قدم سے سات قدم تک۔ اور یہی اوّل وقت پڑھنے کا معنی ہے جو آپؐ نے عمل سے بتایا ہے اور امامت جبرئیل کی حدیث میں اور دو دن نماز پڑھا کر آپ نے ایک شخص کو اوقات تبلائے۔ اِن دونوں حدیثوں میں تصریح ہے کہ والوقت بین ھذین الوقتین او کما قال۔ یعنی ابتداء انتہا بتا کر فرمایا کہ وقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ پس سب حدیثوں کو ملا کر عمل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ الاحادیث یفسر بعضھا بعضا۔ یعنی یہ اصولی مسئلہ ہے کہ احادیث ایک دوسری کی تفسیر ہوتی ہیں۔ پس اسی طریق سے عمل چاہیئے۔ اِس بنا پر ہم آج کل کی ظہر کی اذان پونے ایک بجے دیتے ہیں۔ اور ایک بجے جماعت کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور عصر کی اذان پونے چار بجے اور جماعت پورے چار بجے فقط۔

عبداللہ امرتسری روپڑی کوٹھی نمبر ۱۱۹ سی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور

۶ رجب ۱۳۷۶ھ ۔ ۱۹ مارچ ۱۹۵۷ء

سفر میں دو نمازوں کا جمع کرنا

سوال :- سفر میں دو نمازوں کے جمع کرنے کی کیا صورت ہے؟

محمد عبداللہ بی۔ اے جلال آباد غربی ضلع فیروزپور

جواب :- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں دو نمازیں اس طرح جمع کرتے کہ اگر سورج ڈھلا ہوا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر و عصر دونوں کو ظہر کے وقت میں پڑھ لیتے پھر کوچ کرتے اور اگر سورج ڈھلا نہ ہوتا تو ظہر کو عصر کے ساتھ ملا کر عصر کے وقت میں پڑھتے۔ مگر یہ جمع اس صورت میں ہے کہ وقت پر نماز پڑھنے کا موقعہ راستہ میں مشکل ہو۔ ریل پر سوار ہو یا کشتی میں سوار ہو تو ہر نماز اپنے اپنے وقت پہ پڑھ سکتا ہے اِس حالت میں جمع نہ کرنی چاہیئے

اور جمع کی صورت میں سنتیں معاف ہیں۔ مغرب کی اور فجر کی سنتیں حدیث میں آیا ہے پڑھنی چاہئیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۶ شوال ۱۳۵۹ھ

اذان کا بیان

کیا ایک اذان دو مرتبہ کہنا جائز ہے؟

سوال :۔ صبح کی اذان لاؤڈ سپیکر پر کہنے کا خیال تھا لیکن وہ چل نہ سکا۔ اور اذان بغیر لاؤڈ سپیکر کے کہدی گئی۔ چند منٹ بعد لاؤڈ سپیکر درست ہوگیا تو دوبارہ وہی اذان لاؤڈ سپیکر پر کہی گئی تاکہ آواز دور تک پہنچ جائے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس طرح دوبارہ اذان کہنے کا ثبوت نہیں۔ اس مسئلہ کی تحقیق فرمائی جائے

جواب :۔ اگر پہلے ہمیشہ اذان لاؤڈ سپیکر پر کہی جاتی ہے تو پھر صورت مسئولہ میں دوبارہ لاؤڈ سپیکر پر کہی جاسکتی ہے کیونکہ جو اذان لاؤڈ سپیکر کے بغیر کہی گئی ہے اُس کی آواز وہاں تک نہیں پہنچی جہاں تک پہلے لاؤڈ سپیکر کے ساتھ پہنچا کرتی تھی۔ پس وہ اس انتظار میں ہوں گے کہ اذان ہوگی تو سحری بند کریں گے یا فجر کی سنّت پڑھیں گے اور نماز فجر کو جائیں گے۔ جب اذان دوبارہ نہ ہوئی تو اُن کو دھوکا لگے گا۔ کیونکہ پہلی اذان اُنہوں نے سنی ہی نہیں۔ اور دھوکے کا دور کرنا شرعاً ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان فجر کے وقت سے پہلے کہدی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو حکم دیا کہ یہ اعلان کر دے الا ان العبد قد نام۔ خبردار تحقیق بندہ سو گیا ہے یعنی ابھی فجر نہیں ہوئی۔ میں سونے لگا ہوں یا نیند کی وجہ سے اذان غلطی سے پہلے کہی گئی ہے پس یہاں بھی یہی صورت ہے کہ لوگوں کو دھوکا لگے گا۔ اس لئے دوبارہ کہنی چاہیے۔ اور اگر پہلے اذان لاؤڈ سپیکر پر کہی نہیں جاتی تو پھر کسی کو دھوکا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے دوبارہ اذان کہنے کی ضرورت نہیں۔ پہلی اذان ہی کافی ہے

عبداللہ امرتسری روپڑی

دوہری اذان اور اکہری اقامت

سوال : ایک شخص نے درج ذیل الفاظ کے ساتھ تکبیر کہی۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ اشہدان محمد رسول اللہ۔ حی علی الصلوۃ
حی علی الفلاح۔ قد قامت الصلوۃ۔ قد قامت الصلوۃ۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔
یہ تکبیر سن کر لوگوں نے شور مچادیا کہ یہ تکبیر ناقص اور غلط ہے۔ دوہری تکبیر کہنی چاہیئے۔ آپ اس مسئلہ کو حل فرما کر
ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث میں شائع فرمادیں تاکہ حقیقت واضح ہوجائے۔

محمد صدیق ٹیچر ہائی سکول سندیلیانوالی براستہ پیر محل ضلع لائل پور

جواب:۔ آپ کے ساتھی نے جو اقامت (تکبیر) اکہری کہی وہ بخاری اور مسلم شریف میں ہے۔ چنانچہ مشکوۃ باب الاذان فصل اول میں ہے۔

عن انس قال ذکروا النار والناقوس فذکروا الیھود والنصاریٰ فامر بلال ان یشفع الاذان وان یوتر الاقامۃ قال اسمعیل فذکرتہ لایوب فقال الا الاقامۃ (متفق علیہ)۔

یعنی حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے آگ اور ناقوس کا ذکر کیا پس انہوں نے کہا کہ یہ یہود و نصاریٰ کا کام ہے پس بلال کو حکم دیا گیا کہ اذان دوہری کہیں اور اقامت (تکبیر) اکہری کہیں۔ اسمٰعیل (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کا ذکر ایوب کے پاس کیا تو اس نے کہا۔ الا الاقامۃ یعنی قد قامت الصلوۃ کا لفظ دو مرتبہ ہے۔

اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اذان کا حکم آنے سے پہلے صحابہ کرام نے آگ اور ناقوس (وہ لکڑی جو بجائی جاتی ہے) کا ذکر کیا ہے کہ کسی اونچی جگہ آگ جلا کر یا ناقوس بجا کر لوگوں کو اطلاع دی جائے کہ وہ نماز کے لئے آ جائیں۔ پھر انہوں نے یہود و نصاریٰ کا ذکر کیا کہ آگ یہود جلاتے ہیں۔ اور ناقوس نصاریٰ بجاتے ہیں ان کی مشابہت ہمارے لئے جائز نہیں۔ اِس کے بعد اذان کا حکم آگیا تو بلال کو حکم دیا گیا کہ اذان دوہری اور اقامت اکہری کہیں مگر اقامت میں قد قامت الصلوۃ کا لفظ دو مرتبہ ہے۔ اِس کے سوا باقی تکبیر اکہری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اذان کی نسبت اکہری ہے۔ اِس لئے اقامت کے شروع میں اللہ اکبر کا لفظ چار مرتبہ کی بجائے دو مرتبہ ہے۔ اور آخر میں اللہ اکبر اللہ اکبر اذان کے موافق ہے۔ یہ اکہر الیعنی ایک مرتبہ نہیں ہوگا۔

دُوسری حدیث مشکوۃ کے اسی باب فصل ثانی میں حدیث ہے۔

عن ابن عمر قال کان الاذان علی عھد رسول اللہ مرتین مرتین والاقامۃ مرۃ مرۃ غیر انہ کان یقول قد قامت الصلوۃ قد قامت الصلوۃ۔

رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی)

یعنی عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اذان دو دو مرتبہ اور تکبیر ایک مرتبہ تھی مگر قد قامت الصلوٰۃ کا لفظ دو مرتبہ۔ اس کو ابوداؤد۔ نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے یہ دونوں حدیثیں جو پانچ کتابوں (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ دارمی) کے حوالہ سے ذکر ہوئیں۔ اکہری تکبیر کی دلیل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر کتب میں بھی روایات ہیں۔ اور دوہری تکبیر کی حدیث بخاری و مسلم میں نہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے۔ جو مشکوۃ کے اسی باب میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابی محذورۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم علمه الاذان تسع عشرۃ کلمة والاقامة سبع عشرۃ کلمة رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی والدارمی وابن ماجة۔

حضرت ابومحذورہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان کے انیس کلمے سکھائے۔ اور اقامت کے سترہ کلمے سکھائے۔

اور اذان کے انیس کلموں کی تشریح ابومحذورہ کی ہی روایت سے مسلم شریف میں یوں موجود ہے۔

عن ابی محذورۃ قال القی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التاذین بنفسه فقال قل اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اشهد ان لا الہ الا اللہ۔ اشهد ان لا الہ الا اللہ۔ اشهد ان محمد رسول اللہ۔ اشهد ان محمد رسول اللہ ثم تعود فتقول اشهد ان لا الہ الا اللہ۔ اشهد ان لا الہ الا اللہ۔ اشهد ان محمد رسول اللہ۔ اشهد ان محمد رسول اللہ حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح حی علی الفلاح۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ (رواہ مسلم)

ابومحذورہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفس نفیس مجھے اذان سکھائی۔ پس فرمایا اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر (چار مرتبہ) اشهد ان لا الہ الا اللہ (دو مرتبہ) اشهد ان محمد رسول اللہ (دو مرتبہ) دوبارہ پھر لوٹ کر تشہد کے کلمات کہے دو دو مرتبہ۔ حی علی الصلوٰۃ دو مرتبہ۔ حی علی الفلاح دو مرتبہ۔ اللہ اکبر۔ دو مرتبہ۔ لا الہ الا اللہ۔ ایک مرتبہ۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اذان کے انیس کلمے ترجیع کے ساتھ پورے ہوتے ہیں (یعنی کلمہ شہادت اور رسالت لوٹا کر پھر دو دفعہ کہا جائے اور آواز پہلی دفعہ آہستہ ہو اور دوسری دفعہ بلند ہو۔

دوسری حدیث میں اس کی زیادہ وضاحت ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

وعنه قال قلت یارسول الله علمنی سنة الاذان قال فمسح مقدم راسه قال تقول الله اکبر۔ الله اکبر۔ الله اکبر۔ الله اکبر ترفع بها صوتك ثم تقول اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان لا اله الا الله اشهد ان محمد رسول الله اشهد ان محمد رسول الله تخفض بها صوتك ثم ترفع صوتك بالشهادة اشهد ان لا اله الا الله۔ اشهد ان لا اله الا الله۔ اشهد ان محمد رسول الله۔ اشهد ان محمد رسول الله حی علی الصلوة۔ حی علی الصلوة۔ حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح فان کان صلوة الصبح قلت الصلوة خیر من النوم۔ الصلوة خیر من النوم۔ الله اکبر۔ الله اکبر۔ لا اله الا الله۔ رواه ابوداؤد)

ابومحذورہؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے اذان کا طریقہ سکھائیے ابومحذورہؓ فرماتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا الله اکبر۔ الله اکبر الله اکبر۔ الله اکبر (چار دفعہ) بلند آواز سے کہو۔ پھر اشهد ان لا اله الا الله۔ اشهد ان لا اله الا الله۔ دو مرتبہ اشهد ان محمد رسول الله۔ اشهد ان محمد رسول الله دو مرتبہ ان دونوں کلموں کے ساتھ آواز کو پست کرو۔ پھر شہادت کے ساتھ اپنی آواز کو بلند کرو۔ اور کہو اشهد ان لا اله الا الله۔ اشهد ان لا اله الا الله۔ دو مرتبہ۔ اشهد ان محمد رسول الله اشهد ان محمد رسول الله۔ دو مرتبہ۔ حی علی الصّلوة۔ حی علی الصّلوة۔ دو مرتبہ۔ حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح۔ دو مرتبہ۔ اور اگر صبح کی نماز ہو تو اس میں کہو۔ الصلوة خیر من النوم۔ دو مرتبہ۔ الله اکبر۔ الله اکبر۔ دو مرتبہ۔ لا اله الا الله۔ ایک مرتبہ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا۔

اس حدیث سے اذان کے انیس کلمات کی وضاحت ہو گئی۔ اور کہنے کا طریقہ بھی بتلا دیا۔ حنفیہ کی حالت کیسی عجیب ہے۔ وہ ابی محذورہ رضؓ کی حدیث سے اقامت کے سترہ کلمات تو مانتے ہیں۔ لیکن انیس کلمات اذان کے نہیں مانتے اور اکہری تکبیر کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بخاری مسلم میں ہے۔ اور دوہری تکبیر بخاری مسلم میں نہیں۔ دوسری کتابوں میں ہے۔ ساری اُمت اس پر متفق ہے کہ بخاری مسلم کی احادیث مقدم

ہیں۔ لیکن کس قدر تعجب ہے کہ بخاری مسلم حدیث کا انکار اور غیر بخاری مسلم کا اقرار کیا جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر ملاحظہ فرمائیے کہ حنفیہ ابی محذورہ رضؓ کی حدیث کا ایک حصہ یعنی اقامت (تکبیر) کے سترہ کلمات مانتے ہیں۔ اور اسی حدیث میں اذان کے انیس کلمات ہیں اُن کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت بلال رضؓ کی حدیث کا ایک حصہ (اذان) مانتے ہیں لیکن اسی حدیث کے دوسرے حصے یعنی اکہری تکبیر کو نہیں مانتے۔ یہ لوگ الیسا ابت کرتے ہیں۔ ہم نے ایک مستقل کتاب آمین رفع الیدین لکھی ہے۔ اس میں یہ مسئلہ بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ تقلید کے دائرہ میں قرآن وحدیث پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ کیونکہ جب امام کا قول خلافِ حدیث آجاتا ہے تو وہاں تقلید رہے گی یا قرآن وحدیث۔

نوٹ:۔ جن لوگوں نے اکہری اقامت پر اعتراض کیا ہے۔ ان کو زیادہ تسکین کے لئے شاہ جیلانی کی کتاب غنیۃ الطالبین سے اکہری اقامت کا ثبوت پیش خدمت ہے۔

شاہ جیلانی رح کی اصل عبارت حسب ذیل ہے۔

ثم یقیم فیقول اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ اشہد ان محمد رسول اللہ۔ حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ

پھر اقامت کہے پس کہے آخر تک۔ (غنیۃ الطالبین صد مطبوعہ مطبع صدیقی)

شیخ جیلانی رحؒ نے تکبیر اکہری لکھی ہے۔ اگر یہ تکبیر غلط اور ناقص ہے اور اس سے نماز ناقص ہوتی ہے، تو حضرت شاہ جیلانی رح اور اُن کی نماز کے متعلق کیا حکم ہوگا؟

جو لوگ حضرت شاہ جیلانی سے محبت وعقیدت کی حد سے زیادہ دعوے کرتے ہیں کیا وہ اس پر غور کریں گے؟ اللہ تعالےٰ ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

(حافظ عبداللہ امرتسری روپڑی)

جُمعہ کی پہلی اذان کا شرعی کیا حکم ہے

سوال:۔ جمعہ کی نماز کے لئے دو اذانیں کہی جاتی ہیں۔ پہلی اذان کا شرعی کیا حکم ہے؟

جواب:۔ حدیث میں صحابہؓ کی بابت آیا ہے۔

ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما راٰہ المسلمون قبیحا فھو

عنداللہ قبیح۔

یعنی جس شے کو مسلمان حسن دیکھیں وہ حسن ہے جس کو بری سمجھیں وہ بری ہے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ نے جس کام کو اچھا سمجھا وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہے۔ اور پہلی اذان حضرت عثمان کی جاری کی ہوئی ہے۔ اور اُن کی حیات میں اور بعد میں اس پر عمل درآمد رہا۔

فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۹۳ میں ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ اذان سب شہروں میں جاری ہو گئی۔ صرف فاکہانی نے اتنا ذکر کیا ہے کہ مکہ میں حجاج نے جاری کی ہے۔ اور بصرہ میں زیاد نے۔ پھر صاحب فتح الباری لکھتے ہیں مجھے خبر پہنچی ہے کہ ادنیٰ اہل مغرب اُس وقت ایک ہی اذان دیتے ہیں۔ اور عبداللہ بن عمر سے صاحب فتح الباری نے بدعت ہونا نقل کیا ہے۔ پھر کہا ہے عبداللہ بن عمر کے قول میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ بدعت کہنے سے ان کا مقصود انکار ہو یعنی یہ اذان درست نہیں۔ دوسرا یہ کہ انکار مقصود نہ ہو بلکہ یہ مقصود ہو کہ حضورؐ کے زمانہ میں نہ تھی۔ جیسے مروجہ طریق تراویح کو حضرت عمرؓ نے بدعت کہا ہے۔ حالانکہ شرعاً وہ سنّت ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ما راٰہ المسلمون حسنا حدیث کے تحت عثمانی اذان درست ہے۔ کیونکہ اس وقت قریباً سب شہروں میں جاری ہو گئی ہے الاماشاءاللہ اگرچہ مدینہ میں اسکی ابتداء ہیت کے وقت ہوئی ہے مگر سب شہروں میں پھیلنا اس کا دلالت کرتا ہے کہ آخر لوگوں کی کمی بیشی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ پس ثابت ہوا کہ اب بھی یہ اذان درست ہے خواہ کم ہوں یا زیادہ۔ ہاں ضروری نہیں اگر کوئی نہ دینی چاہے تو نہ دے۔ مگر دینے والے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اور بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ بلند جگہ بازار میں دینی چاہیے۔ کیونکہ حضرت عثمان نے ایسی جگہ دی تھی تو یہ ٹھیک نہیں۔ اذان سے مقصود اعلام ہے۔ یعنی لوگوں کو بذریعہ توحید اعلان ہے۔ اس میں بازار یا کسی جگہ کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں۔ مدینہ شریف میں بازار مسجد کے ساتھ تھا اس میں حضرت عثمان نے موزوں جگہ پر دلوادی۔ اِس طرح ہر شہر کی جامع مسجد میں موزوں جگہ دیکھ لینی چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

جمعہ کی دُوسری اذان کس جگہ کہی جائے

سوال:۔ کیا خطبہ جمعہ کی اذان خطیب کے سامنے کہنی چاہیئے؟

جواب:۔ اذان سے مقصود اعلان ہے۔ خواہ اذان پہلی ہو یا خطبہ کی۔ پس جو جگہ اعلان کے زیادہ مناسب ہے وہاں ہونی چاہیئے۔ اگر امام کے سامنے موزوں جگہ ہو تو سامنے دی جائے ورنہ کوئی اور موزوں جگہ دیکھ

لی جائے خواہ مسجد کے اندر ہو یا باہر، اور خواہ دائیں طرف ہو یا بائیں طرف مسجد نبوی میں سامنے موزوں جگہ تھی اس لئے سامنے ہوتی تھی۔ جگہ کی تعیین کو اذان میں داخل کرنا اذان کی منشاء کے خلاف ہے۔ اسی طرح کوئی کہنے والا کہہ دے گا کہ تم نے امام کے سامنے ہونے کی شرط کی ہے ہم یہ شرط کرتے ہیں کہ مسجد کے دروازے پر ہو۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضؓ اور عمر رضؓ کے زمانہ میں مسجد کے دروازے پر ہوتی تھی اگر مسجد کا دروازہ سامنے نہ ہو تو اس صورت میں مشکل پڑے گی۔ ایک اور اُٹھے گا اور کہے گا کہ منارے پر ہونی چاہئے کیونکہ امام مالک سے روایت ہے انه فی زمنه صلی اللہ علیه وسلم لم یکن بین یدیه بل علی المنار، تا۔ آپ کے زمانے میں اذان آپ کے سامنے نہ تھی بلکہ منارہ پر تھی۔ امام مالک کی مراد سامنے سے نفی کرنے سے یہ ہے کہ مسجد کے اندر نہ تھی جو عام طور پر نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اور نہ دوسری روایتوں میں سامنے ہونے کی تصریح ہے تو حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کا دروازہ سامنے تھا اور وہیں منار تھا۔ اس پر اذان ہوتی تھی تو اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اذان کے لئے یہ تینوں شرائط ضروری ہیں، سامنے بھی ہو۔ دروازہ پر بھی ہو۔ اور منارہ پر بھی ہو۔ ایک اور اُٹھے گا۔ اور وہ اس سے بھی زیادہ تنگی کرتا ہوا کہدے گا کہ ان باتوں کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منبر سے جتنے فاصلہ پر اذان ہوتی تھی اتنے ہی فاصلہ پر اب بھی ہونی چاہیئے۔ مثلاً منبر ایسی جگہ بچھایا جائے کہ فاصلہ اس سے کم وبیش نہ ہو۔ بلکہ کوئی منار کی بلندی کے اندازہ کی بھی پابندی کرنے لگ جائے گا۔ غرض اس طرح سے خصوصیتیں پیدا کرنی شروع کر دیں تو احکام میں بہت تنگی ہو جائے گی بلکہ ان پر عمل کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر حکم کے حسب حال کوئی خصوصیت ہو۔ اذان سے مقصود جب اعلان ہے تو خصوصیت جگہ کی کس طرح سمجھ لی جائے۔ ہاں مسجد کے متعلقات میں ہونی ضروری ہے تاکہ لوگ اس طرف آئیں۔ اور اونچی جگہ بھی اس کے حسب حال ہے۔ کیونکہ آواز دور جاتی ہے۔ اسی بناء پر امام ابن الحاج مالکی رح مدخل میں لکھتے ہیں۔

ان السنة فی اذان الجمعة اذا صعد الامام علی المنبر ان یکون المؤذن علی المنار۔

یعنی مسنون طریقہ اذان جمعہ میں یہ ہے کہ جب امام منبر پر چڑھے تو موذن منار پر ہو۔

اس عبارت میں دو خصوصیتیں ذکر کی ہیں۔ ایک منار پر ہونا۔ ایک امام کے منبر پر چڑھنے کے وقت ہونا اس طرح موذن کا بلند آواز ہونا یا خوش آواز ہونا وغیرہ۔

اِس قسم کی تمام خصوصیات اذان کے حسبِ حال ہیں نہ اگرچہ واجبات نہیں مگر کسی نہ کسی طریق سے اذان کے لئے مفید شے ہے۔ لیکن امام کے سامنے ہونا اور دروازہ پر ہونا یا دائیں بائیں ہونا یا اتنے فاصلہ پر ہونا یا اندر ہونا یہ تو کوئی ایسی اشیا نہیں جو اذان کے حسب حال ہوں۔ تو پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ شرع میں معتبر ہیں۔ دیکھئے حج خاص کر مواضع سے تعلّق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں ہوتا ہی یہ ہے کہ کسی جگہ گزرنا اور کسی جگہ ٹھہرنا اور کسی جگہ دوڑنا کسی جگہ چکر کاٹنا۔ کسی جگہ کچھ پڑھنا وغیرہ۔ اس میں اپنے وطن کو واپسی کے وقت محصبؔ وغیرہ کے نزول میں صحابہ کا اختلاف ہے تو اذان وغیرہ جس کو جگہ سے تعلق نہیں کس طرح فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اندر ہے یا باہر۔ آگے ہے یا دائیں بائیں وغیرہ لِبا اوقات عمارت کی رو سے ایک جگہ موزوں ہوتی ہے۔ دوسری جگہ میں دوسری پس صرف مسجد نبویؐ کے سامنے ہونے سے یہ مراد لینا کہ سب جگہ ایسا ہی چاہیے ڈبل غلطی ہے اور اسرارِ حکمِ شرعیہ سے کوسوں دُور ہے۔

(عبداللہ امرتسری روپڑی)

جمعہ کی دو اذان پر تعاقب اور اُس کا جواب

سوال:۔ جمعہ کے دن دو اذان کہنی جائز ہے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ دو اذان کہنے سے جمعہ باطل ہو جاتا ہے۔ (سائل دوست محمد منڈل)

جواب:۔ حدیث میں صحابہ رضؓ کی بابت آیا ہے۔

ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما راٰہ المسلمون قبیحا فھو عند اللہ قبیح۔

یعنی جس شے کو مسلمان حسن دیکھیں وہ حسن ہے اور جس کو بُرا سمجھیں وہ بری ہے۔

یہ حدیث پُوری تفصیل کے ساتھ ہمارے رسالہ ردّ بدعات ص۴۲ میں درج ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ صحابہؓ

لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت منی کے پاس مقام محصب جس کو ابطح وغیرہ بھی کہتے ہیں میں اُترے تھے بحضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور کو مدینہ کی طرف لوٹنے میں آسانی تھی اس لئے اُترے تھے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں۔ اس میں اترنا سنّت ہے۔ (مشکوٰۃ باب خطبہ یوم النحر)

نے جس کام کو اچھا سمجھا وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہے ۔ اور پہلی اذان حضرت عثمان کی جاری کی ہوئی ہے اور اُن کی حیات میں اور بعد اس پر عملدرآمد رہا۔ اور فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۹۳ میں ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ اذان سب شہروں میں جاری ہو گئی۔ صرف فاکہانی نے اتنا ذکر کیا ہے کہ مکہ میں حجاج نے جاری کی ہے ۔ اور بصرہ میں زیاد نے ۔ پھر صاحب فتح الباری لکھتے ہیں مجھے خبر پہنچی ہے کہ ادنیٰ اہل مغرب اس وقت ایک ہی اذان دیتے ہیں ۔ اور عبداللہ بن عمرؓ سے صاحب فتح الباری نے بدعت ہونا نقل کیا ہے ۔ پھر کہا ہے ۔ عبداللہ بن عمرؓ کے قول میں دو احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ بدعت کہنے سے اُن کا مقصود انکار ہو یعنی یہ اذان درست نہیں ۔

دُوسرا یہ کہ انکار مقصُود نہ ہو بلکہ یہ مقصود ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ نہ تھی جیسے مروجہ طریق تراویح کو حضرت عمرؓ نے بدعت کہا ہے حالانکہ شرعًا وہ سنت ہیں ۔

خلاصہ یہ کہ مارآہ المسلمون حسنا حدیث کے ماتحت عثمانی اذان درست ہے ۔ کیونکہ اس وقت قریبًا سب شہروں میں جاری ہو گئی ہے ۔ الّا ماشاء اللہ۔ اگرچہ ابتداء اس کی لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تھی مگر سب شہروں میں اس کا پھیلنا دلالت کرتا ہے کہ آخر لوگوں کی کمی بیشی ضروری نہیں سمجھی گئی ۔ پس ثابت ہوا کہ اب بھی یہ اذان درست ہے ۔ خواہ کم ہوں یا زیادہ ۔ ہاں ضروری نہیں ۔ اگر کوئی نہ دینی چاہے نہ دے ۔ مگر دینے والے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ۔ اور بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ بلند جگہ بازار میں دینی چاہیئے ۔ کیونکہ حضرت عثمان نے ایسی جگہ بھی دلائی تھی تو یہ ٹھیک نہیں ۔ اذان سے مقصود اعلام ہے ۔ یعنی لوگوں کو بذریعہ توحید اعلان ہے ۔ اس میں بازار یا کسی جگہ کی خصوصیت کو کوئی دخل نہیں ۔ مدینہ شریف میں بازار مسجد کے ساتھ تھا ۔ اِس میں حضرت عثمان رضؓ نے موزوں جگہ پر دلوا دی ۔ اِس طرح ہر شہر کی جامع مسجد میں موزوں جگہ دیکھ لینی چاہیئے ۔

مولانا محمد جوناگڑھی نے اس اذان کو بدعت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :۔

کہ حضورؐ کا زمانہ اور آپ کے بعد کے دو خلیفوں کے زمانہ میں تو اس دوسری اذان کا وجود ہی نہ تھا ۔ ہاں حضرت عثمان کے زمانہ میں ایجاد ہوئی جو وقت معلوم کرانے کے لئے زورا میں بازار کی بلند جگہ کہلوائی جاتی تھی نہ کہ مسجد میں ۔ پس ہمارے زمانہ میں مسجد میں جو دو اذانیں جمعہ کے لئے ہوتی ہیں ۔ صریح بدعت ہے ۔ کسی طرح جائز نہیں ۔ واللہ اعلم ۔

(مدرسہ محمدیہ دہلی)

تعاقب ۔ میں بدعت نہیں کہہ سکتا ۔ کیونکہ اذان سے مقصود اعلان ہے ۔ خصوصیت موضع کا ذکر جدا

جائے شرع میں معتبر ہے یا نہیں۔ خاص کر جو مواضع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اپنے وطن کو واپسی کے وقت محصب وغیرہ کے نزول میں صحابہ کا اختلاف ہے تو اذان وغیرہ جس کو موضع سے تعلق نہیں کس طرح فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اندر رہے یا باہر۔ بسا اوقات مخصوص اوقات کی رو سے ایک جگہ میں ایک جگہ موزوں ہوتی ہے۔ دوسری جگہ میں دوسری۔ اس لئے بدعت کی جرأت ذرا مشکل ہے۔

اگر کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مسجد نبوی میں بہت لوگ ہو گئے تھے۔ اس لئے دوسری اذان دلوائی تھی۔ اب لوگ تھوڑے ہوں تو بھی دلوا دیتے ہیں۔ پس یہ بدعت ہوئی۔

جواب اس کا یہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں عام شہروں میں جاری ہو گئی اور اس پر صحابہؓ نے انکار نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ مدینہ میں اس کی ابتداء اگرچہ بہتات کے وقت ہوئی ہے مگر پھر یہ شرط نہیں رہی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ساتویں سال سنہ ہجری کے عمرۃ القضاء کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ جیسے بیت اللہ کا طواف کرنے کے وقت پہلے تین پھیرے زور دار طاقت کے ساتھ چلیں۔ اور باقی چار پھیرے درمیانی چال چلیں۔ اور یہ حکم اس لئے دیا کہ کافروں کو اپنی قوت دکھائیں کیونکہ کافروں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مدینہ کے بخار نے ان لوگوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اب یہ وجہ نہیں رہی۔ لیکن حکم باقی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اذان کی ابتداء بھی بے شک بہتات کی وجہ سے ہوئی لیکن پھر بھی بہتات کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس اب قلت و کثرت دونوں صورتوں میں درست ہے۔ اگر ناجائز ہوتی تو دوسرے شہروں میں عام طور پر جاری ہونے پر صحابہ انکار کرتے۔ مگر انہوں نے انکار نہیں کیا۔ اور صحابہ کی بابت حدیث "ماراہ المسلمون حسنا" میں ہے کہ جس کام کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اچھا ہے اور جس کو برا سمجھیں وہ برا ہے۔ پس صحابہؓ نے دوسری اذان پر انکار نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے نزدیک اچھی ہے۔ اور بعض جو عبداللہ بن عمرؓ سے بدعت ہونا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد انکار نہیں بلکہ یہ ایسا ہے جیسے حضرت عمرؓ نے تراویح کو بدعت کہا ہے۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ مورخہ ۱۵ شعبان ۱۳۵۲ھ

اذان تولد کی اجرت

سوال :۔ تولد کے وقت جو اذان کہی جاتی ہے اس پر اجرت کیسی ہے۔

جواب :۔ نکاح یا اذان تولد پر اجرت یہ سلسلہ کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کیونکہ نکاح کے ایجاب و

قبول ہیں جو ہر شخص کرا سکتا ہے۔ خطبہ اور تین آیتیں کسی کو یاد نہ ہوں تو دیکھ کر پڑھ لی جائیں۔ اگر دیکھ کر بھی پڑھنے والا نہ ملے تو ایجاب وقبول ہی کافی ہے۔ اِس طرح اذان کے کلمات عموماً یاد ہی ہوتے ہیں۔ اِس لئے اس قسم کی اُجرت کے سلسلے اہل اسلام کو جاری نہ کرنے چاہئیں جو خواہ مخواہ زائد خرچ کا موجب ہوں۔ شریعت ایسی فضول رسوں کی روک تھام کے لئے ہے۔ اجراء کے لئے نہیں۔ اِس لئے خیر قرون میں ان باتوں کا نام ونشان نہیں پایا جاتا حالانکہ نکاح۔ جنازہ تولد کا سلسلہ قدیم سے ہے۔

صرف اذان یا امامت پر یا تراویح پر لینا جیسے آج کل عام رواج ہو گیا ہے یہ بالکل درست نہیں کیونکہ یہ اشیاء انسان کو اپنے کاروبار سے مانع نہیں، خاص کر جب ہر شخص کو حکم ہے کہ نماز باجماعت پڑھے تو اکثر وقت معین پر وہ مسجد میں ضرور حاضر ہوگا۔ اور اذان میں یا امامت میں یا تراویح وغیرہ میں بھی ایک وقت کی حاضری ہے۔ پس ان پر اُجرت کسی صورت درست نہیں خاص کر جب حدیث میں ممانعت بھی وارد ہو۔

منتقیٰ باب النهی عن اخذ الاجرة علی الاذان میں ہے۔

عن عثمان بن ابی العاص قال اٰخر ما عهد الی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اتخذ موذنا لا یاخذ علی اذانه اجرا رواه الخمسة۔

یعنی عثمان ابن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وصیت مجھے یہ کی ہے کہ میں ایسے شخص کو موذن مقرر نہ کروں جو اذان پر اُجرت لے۔

نیل الاوطار میں امام شوکانی رح اس پر لکھتے ہیں:۔

الحدیث صححه الحاکم وقال ابن المنذر ثبت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لعثمان بن ابی العاص واتخذ موذنا لا یاخذ علی اذانه اجرا واخرج ابن حبان عن یحیی البکالی قال سمعت رجلا قال لابن عمر انی احبك فی الله فقال له ابن عمر انی لا بغضك فی الله فقال سبحان الله احبك فی الله وتبغضنی فی الله قال نعم انك تسأل علی اذانك اجرا وروی عن ابن مسعود انه قال اربع لا یوخذ علیهن اجرا الاذان وقرأة القران والمقاسم والقضاء ذکره ابن سید الناس فی شرح الترمذی وروی ابن ابی شیبة عن الضحاك انه کره ان یاخذ الموذن علی اذانه جعلا ویقول ان اعطی بغیر مسئلة فلا باس وروی الضا

عن معاویۃ بن قرۃ انہ کان یقال لا یوذن لک الا محتسب (الی ان قال) وقال ابن العربی الصحیح جواز اخذ الاجرۃ علی الاذان والصلوٰۃ والقضاء وجمیع الاعمال الدینیۃ فان الخلیفۃ یاخذ علی ھذا کلہ وفی کل واحد منہا یاخذ النائب اجرۃ کما یاخذ المستنیب والاصل فی ذالک قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ترکت بعد نفقۃ نسائی ومؤنۃ عاملی فھو صدقۃ انتھی فقاس المؤذن علی العامل وھو قیاس فی مصادمۃ النص وفتیا ابن عمر التی مرت لم یخالفھا احد من الصحابۃ کما صرح بذالک الیعمری وقد عقد ابن حبان ترجمۃ علی الرخصۃ فی ذالک واخرج عن ابی محذورۃ انہ قال فالقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاذان فاذنت ثم اعطانی حین قضیت صرۃ فیھا من فضۃ واخرجہ ایضا النسائی۔ قال الیعمری ولا دلیل فیہ لوجھین الاول۔ ان قصۃ ابی محذورۃ اول ما اسلم لانہ اعطاہ حین علمہ الاذان وذالک قبل عثمان بن ابی العاص فحدیث عثمان متاخر۔ الثانی انھا واقعۃ یتطرق الیھا الاحتمال واقرب الاحتمالات ان یکون من باب التالیف لحداثۃ عھدہ بالاسلام کما اعطی حینئذ غیرہ من المولفۃ قلوبھم ووقائع الاحوال اذا تطرق الیھا الاحتمال سلبھا الاستدلال لما یبقی فیھا من الاجمال انتھی وانت خبیر بان ھذا الحدیث لا یرد علی من قال ان الاجرۃ انما تحرم اذا کانت مشروطۃ لا اذا اعطیھا بغیر مسئلۃ والجمع بین الحدیثین بمثل ھذا احسن۔

(نیل الاوطار جلد اول ص۳۵۷)

یعنی "اذان پر اُجرت منع کی حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ اور ابن المنذر نے کہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے عثمان ابن ابی العاصؓ کو فرمایا۔ ایسا موذن مقرر کر جو اذان پر اُجرت نہ لے۔ اور ابن حبان نے یحییٰ بکالی سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے ایک شخص کو ابن عمرؓ سے یہ کہتے سنا کہ میں آپ کو خدا کے لئے دوست رکھتا ہوں۔ ابن عمرؓ نے فرمایا میں خدا کے لئے تجھے بُرا جانتا ہوں۔ اُس شخص نے کہا سبحان اللہ! میں آپ کو خدا کے لئے دوست رکھتا ہوں اور آپ خدا

کے لئے بُرا جانتے ہیں۔ فرمایا۔ ہاں تو اذان پر اُجرت مانگتا ہے۔ اور ابن مسعود سے روایت ہے فرمایا چار اشیاء میں اُجرت درست نہیں۔ اذان۔ قراۃ القرآن۔ مالِ غنیمت وغیرہ کی تقسیم۔ قضا۔ ابن سید الناس نے شرح ترمذی میں اس کو ذکر کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے ضحاکؒ سے روایت کیا ہے کہ اذان پر مزدوری لینی بری ہے۔ اور کہتے تھے کہ بغیر سوال کے کچھ مل جائے تو کوئی ڈر نہیں۔ اور معاویہ بن قرّہ سے روایت کیا ہے کہ ثواب کی نیت سے اذان دینے والا موذن مقرر کر دوسرا نہ کر۔ ابن العربی نے کہا صحیح یہ ہے کہ اذان نماز قضا اور دیگر تمام اعمال دینیہ پر اُجرت جائز ہے کیونکہ خلیفہ ان تمام پر اُجرت لیتا ہے۔ اور ان سے ہر ایک پر نائب بھی اُجرت لیتا ہے۔ جیسے نائب بنانے والا (خلیفہ) لیتا ہے۔ اور اصل دلیل اس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ میں نے اپنی بیویوں کے نفقہ اور اپنے عاملوں کے خرچ کے بعد جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔ ابن العربی نے موذن کو عامل پر قیاس کیا ہے۔ حالانکہ یہ قیاس نص کے مقابلہ میں ہے۔ اور ابن عمر کے فتویٰ کے بھی خلاف ہے۔ جو اوپر گذر چکا ہے۔ اس فتویٰ میں ابن عمرؓ کا صحابہ میں کوئی مخالف نہیں چنانچہ یعمری نے اس کی تصریح کی ہے (نیز یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ عامل تو اپنے عمل کے ساتھ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ برخلاف موذن کے۔ نیز موذن اگر اذان کے لئے نہ آئے تو نماز باجماعت کے لئے اس کو آنا پڑے گا تو دس منٹ پہلے آکر اذان بھی دے سکتا ہے۔ پس اُجرت لینے کے لئے کچھ معنی نہیں) اور ابن حبان نے اذان پر اُجرت لینے کے جواز میں باب باندھا ہے اور دلیل اس پر ابو محذورہؓ کی حدیث لائے ہیں۔

ابو محذورہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اذان سکھائی۔ پس میں نے اذان کہی۔ جب میں نے اذان پوری کی تو آپ نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں کچھ چاندی تھی۔ اور اس حدیث کو نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ یعمری کہتے ہیں ابن حبان کا اس حدیث سے استدلال کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو محذورہ رض کو تھیلی دینا عثمان بن ابی العاص کے مسلمان ہونے سے پہلے ہے۔ پھر آپؐ نے منع کر دیا۔ نیز یہ ایک خاص واقعہ ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ تھیلی اذان کی اُجرت دی بلکہ قریبِ احتمال یہ ہے کہ جیسے اور نو مسلموں کو تالیف قلوب کے لئے دیا۔ اسی طرح ابو محذورہؓ کو بھی دیا کیونکہ یہ اس وقت نئے مسلمان ہوئے تھے۔ ایسے خاص واقعات سے استدلال صحیح نہیں ہوتا۔ یعمری نے اتنا کہا ہے لیکن میں (شوکانی کہتا ہوں) عثمان ابن ابی العاص کی حدیث

اس شخص کی تردید نہیں کرتی جو کہتا ہے کہ اذان پر اُجرت مقرر کر کے لینی حرام ہے۔ اگر سوال کے بغیر کوئی دے دے تو جائز ہے۔ اسی صورت میں اگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابومحذورہؓ کو تھیلی اذان پر دی ہو تو بھی عثمان بن ابی العاصؓ کی حدیث سے کوئی مخالفت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ ابومحذورہؓ نے سوال نہیں کیا۔ اور یہ موافقت کی اچھی صورت ہے۔"

جب اذان کی بابت اتنی تنگی ہے تو امامت تو ایک بڑا عمل ہے اس پر تنخواہ لینی یا کسی شے کا سوال کس طرح درست ہوگا۔ اسی طرح تراویح میں قرآن سنانے پر لینا یا کچھ سوال کرنا یہ بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ آج کل حافظانِ قرآن اس بیماری میں بہت مبتلا ہیں۔ ماہِ رمضان جو خیر و برکت کا مہینہ ہے جس میں خدا کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ جو انسان کو گناہ سے اس طرح پاک کر دیتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ اس کو تھوڑے سے پیسوں کی طمع میں ضائع کر دیتے ہیں، اس کے ثواب سے محروم رہتے ہیں بلکہ وعید کے مستحق ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس ماہ کو اپنی آمد کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اس کی خاطر دُور دراز سفر کرتے ہیں اور ایسی مسجدیں تلاش کرتے پھرتے ہیں جن میں زیادہ امداد کی اُمید ہو بلکہ بعض اسی طمع میں دو دو تین مسجدوں میں تراویح پڑھاتے ہیں، ایک مسجد میں جلدی جلدی پڑھا کر دوسری مسجد میں پہنچتے ہیں تاکہ دونوں مسجدوں والے امداد کریں اور پیسے اچھے بن جائیں۔ انا للہ

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهٗ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَعْنِيْ رِيْحَهَا۔ رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ (مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ۲ ص۲۶)

جو شخص علم دین صرف اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعے کسی دنیوی فائدے کو پہنچے تو اس کا جنت میں داخل ہونا تو کجا) وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔"

دیکھئے کیسی سخت وعید ہے لیکن یہ لوگ پھر بھی پرواہ نہیں کرتے۔ نہ دینے والوں کو خیال آتا ہے کہ حافظوں کو دینا اور اُن کا قرآن سُننا اس سے فائدہ کیا؟ وقت بھی ضائع اور پیسے بھی برباد۔ انا للہ۔

قیام اللیل میں ہے۔ عبداللہ بن معقل تابعی نے رمضان میں لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب عید الفطر کا دن ہوا تو عبید اللہ بن زیاد نے ان کو پانسو۵۰۰ درہم بھیجے۔ انہوں نے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ ہم کتاب اللہ پر اُجرت نہیں لیتے اور مصعب نے عبداللہ بن معقل بن مقرن کو رمضان میں جامع مسجد میں امامت کا حکم دیا۔ جب

چاند چڑھا تو پانسو درہم ان کی خدمت میں ارسال کئے۔ انہوں نے واپس کر دیئے اور کہا کہ میں قرآن پر اُجرت نہیں لیتا اور مالک بن دینار کہتے ہیں میں ایک شخص کے پاس سے گذرا جس کو میں پہچانتا تھا اور اس کے ساتھ سپاہی تھے اور اُس کو ہتھکڑی لگی تھی۔ لوگوں سے سوال کرتا تھا۔ میں نے کہا تجھے کیا ہوا؟ کہا فلاں عامل نے مجھے تراویح پر مقرر کیا جب ماہِ رمضان ختم ہوا تو اُس نے میرے ساتھ سلوک کیا۔ جب وہ عامل معزول ہو گیا تو جو کچھ اُس نے دیا تھا۔ اُس کا ذکر اُس کے حساب کے رجسٹروں میں پایا گیا۔ اس کی وجہ سے گرفتار ہوں۔ اور اُس کو پورا کرنے کے لئے سوال کر رہا ہوں۔ مالک بن دینار کہتے ہیں تو گوشت میں چوری ہوئی روٹی (یعنی اعلیٰ کھانے) کھاتا رہا ہو گا۔ کہا ہاں! میں اُس عامل کے ساتھ گوشت میں چوری ہوئی روٹی کھاتا رہا ہوں۔ کہا اس سے اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔"

اور حسن بصریؒ سے سوال کیا گیا کہ اُجرت پر نماز پڑھانے کا کیا حکم ہے؟ فرمایا نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ مقتدیوں کی۔ اور ابن مبارکؒ فرماتے ہیں۔ اُجرت پر نماز پڑھانے کو میں بُرا سمجھتا ہوں۔ اور اس بات کا ڈر ہے کہ ان (امام مقتدی سب) پر نماز کا لوٹانا واجب ہو۔ اور امام احمد سے سوال کیا گیا کہ ایک امام لوگوں کو کہے کہ میں اتنے درہموں پر تمہیں رمضان میں نماز پڑھاؤں گا تو اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا ایسے امام سے خدا پناہ میں رکھے۔ اس کے پیچھے کون نماز پڑھے گا" (قیام الیل باب الاجر علی الامامۃ فی رمضان صد ۱۰۳)

چونکہ اس بیماری میں زیادہ تر ہمارے حنفی بھائی مبتلا ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس محل میں علماء دیوبند کا فتویٰ درج کریں شاید کسی کو خدا ہدایت کر دے تو ہمارا بھی بھلا ہو جائے۔

۲۹ شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ میں دیوبند سے رمضان المبارک کے متعلق "مفید و معتبر مسائل" کے عنوان سے ایک اشتہار شائع ہوا تھا جس میں حنفی مذہب کے بہت سے مسائل تھے ان میں سے ایک یہ مسئلہ بھی تھا کہ روپیہ کی طمع میں یا اُجرت مقرر کر کے سنانے والے حفاظ کا کیا حکم ہے۔؟

لکھا ہے:۔

"جو حافظ روپیہ کی طمع میں قرآن مجید سُناتا ہے اس سے وہ امام بہتر ہے جو الم ترکیف سے پڑھائے۔ اگر اُجرت مقرر کر کے قرآن مجید سنایا جائے تو نہ امام کو ثواب ہو گا نہ مقتدیوں کو۔ اس قدر جلد پڑھنا کہ حروف کٹ جائیں سخت گناہ ہے۔" انتہیٰ

تنبیہ:۔ شرط کر کے یا مقرر کر کے لینا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ ہے کہ صراحۃً شرط کرے۔ دوم یہ کہ صراحۃً کچھ نہ کہے مگر نہ دینے کی صورت میں ناراض ہو جائے یا شکایت کرے گویا یہ ناراضگی یا شکایت ایسی ہے

جیسے پہلے کہدیا کہ میری کچھ خدمت کرنی ہوگی ۔ یا میں احسان لوں گا ۔ چنانچہ اکثر واعظوں اور ماہِ رمضان میں حافظانِ قرآن کی یہی حالت ہے ۔

اللھمّ اجعل اعمالنا کلھا صالحۃ واجعلھا لوجھک خالصۃ ولا تجعل لاحدٍ فیھا شیئاً ۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ

اذان کے وقت السّلام علیکم کا جواب

سوال :۔ اذان یا خطبہ کے وقت السّلام علیکم کہنا جائز ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ خطبہ میں السلام علیکم کہہ دے تو کوئی حرج نہیں ۔ کیونکہ اس کے جواب سے خطبہ کا سماع فوت نہیں ہوتا ۔ پھر اشارہ بھی جواب ہوسکتا ہے ۔ رہا اذان کے وقت السّلام علیکم تو اس کے جواب میں بھی کوئی شبہ نہیں کیونکہ اذان کے جواب کا ذکر آیا ہے ۔ اذان کے سماع میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ موذن کھینچ کر الف کا کہتا ہے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۴ صفر ۱۳۵۶ھ ۔ ۱۶ اپریل ۱۹۳۷ء

ترجیع اذان کونسی نمازوں کے ساتھ مخصوص ہے

سوال :۔ ترجیع اذان نماز کے کون کون سے وقتوں کے لئے ثابت ہے ۔ اور ترجیع اذان ہو تو اقامت اکہری چاہیے یا دوہری ؟

میاں محمد عالم ٹھیکیدار ۲۱ پونچھ روڈ لاہور

جواب :۔ ترجیع اذان حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ۔ جو ابوداؤد وغیرہ میں ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو مکہ میں فتح مکّہ کے بعد موذّن مقرر کیا تھا ۔ اور ان کو دوہری اذان سکھائی تھی ۔ اور تکبیر بھی دوہری حضرت بلال رضا اکہری اذان مدینہ میں دیا کرتے تھے اور تکبیر اکہری کہتے تھے ۔ اہل حدیث کے ہاں معمول طرح کی اذان اور دونوں طرح کی تکبیر درست ہے ۔ اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ اذان دوہری ہو تو تکبیر بھی دوہری ہو بلکہ اذان دوہری کے ساتھ تکبیر اکہری اور اذان اکہری کے ساتھ تکبیر دوہری جائز ہے ۔ صرف حنفیہ یہ پابندی کرتے ہیں کہ اذان اکہری اور تکبیر دوہری ہونی چاہیے حالانکہ حدیث میں یہ پابندی نہیں آئی ۔

عبداللہ امرتسری ماڈل ٹاؤن لاہور

اذان کے بعد دُعا کے لئے ہاتھ اٹھانا

سوال :۔ مولانا امرتسری رحمہ اللہ سے کسی سائل نے دریافت کیا کہ اذان کے بعد دُعا ہاتھ اُٹھا کر مانگنی جائز ہے یا نہیں ؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت میاں صاحب مرحوم دہلوی نے دو ضعیف روایتوں کے اعتبار پر بعد از نماز ہاتھ اٹھا کر دُعا کو ناجائز لکھا ہے (اہل حدیث ۹ دسمبر ۱۹۳۲ء)

جواب :۔ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے مولانا امرتسری کے اس جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ دوسرے پرچہ میں فرماتے ہیں جواب ناقص رہ گیا۔ اس طرح اس دعا کو قیاس کر لیجئے ورنہ ہاتھ اٹھانے کا ثبوت میرے ناقص علم میں نہیں کہ اذان کے بعد کی دُعا کو نماز کے بعد کی دعا پر قیاس کرنا کس حکم اور علت کی بنا پر ہے نہ تو جائز کہا۔ اور نہ ناجائز کہا بیچ ہی میں چھوڑ گئے۔ حالانکہ صرف یہ کہہ دینا ہی کافی تھا کہ اس کا ثبوت میرے علم میں نہیں یا عموم حدیث سے استدلال کر کے جواز کے قائل ہو جاتے کہ دعا ہاتھ اُٹھا کر کی جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۳ء

بے وضو اذان

سوال :۔ وضو کے بغیر اذان کہنا جائز ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ بے وضو اذان اگرچہ منع نہیں مگر بہتر یہی ہے کہ اذان باوضو کہی جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۵ محرم ۱۳۶۹ھ

سترہ کا بیان

سترہ کی تعریف

سوال :۔ سترہ کسے کہتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل بیان فرمائیں۔

جواب :۔ سُترہ وہ شے ہے جو نمازی نماز کے وقت اپنے آگے کھڑی کرتا ہے تاکہ کسی کے آگے

سے گزرنے سے نماز میں خلل[1] واقع نہ ہو۔ اس کا اندازہ کم از کم ایک ہاتھ قدر ہے خواہ سوٹی ہو یا کوئی اور شے۔ کوئی شے نہ ملے تو ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ خط ہی کھینچے۔ نمازی کو چاہیے کہ وہ سترہ کے قریب کھڑا ہو۔ نیز سترہ عین ناک کی سیدھ پر نہ ہو بلکہ ذرا سا کنارے (آنکھوں کی سیدھ پر) ہونا چاہیے۔ نماز خواہ مسجد میں پڑھے یا جنگل میں سامنے کوئی چیز سامنے ضرور کرے۔ مسجد میں ستون وغیرہ کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ جو شخص سترہ کے اندر سے گذرنا چاہے تو اسے ہاتھ سے ہٹائے۔ اگر نہ ہٹے تو دھکا دے کر ہٹائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نمازی کے آگے سے گزرنے والا اگر جانتا کہ آگے سے گزرنے کا کتنا گناہ ہے تو چالیس سال ایک جگہ کھڑا رہنا پسند کرتا آگے سے نہ گزرتا۔ اور ایک روایت میں سو سال بھی ہے۔ اگر پتھر پھینکنے[2] قدر دور سے گزر جائے تو کوئی حرج نہیں۔

کتے کا نمازی کے آگے سے گزرنا

سوال:۔ مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ سرخ رنگ کا کتا آیا اور جماعت کے آگے سے گزر گیا۔ کیا اس سے نماز تو نہیں ٹوٹی۔؟

جواب:۔ نماز نہیں ٹوٹی۔ سیاہ کتے۔ عورت اور گدھے کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ گو حدیث میں آیا ہے۔ مگر اکثر علماء کے نزدیک اس سے مراد نماز کا بالکل ٹوٹنا نہیں بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ خشوع ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ نماز کو کوئی شے نہیں توڑتی۔

(مشکوٰۃ باب السترہ صد؟)

نمازی اور سترہ میں فاصلہ

سوال:۔ نمازی اگر بغیر سترہ کے نماز پڑھ رہا ہو تو گزرنے والا کتنے فاصلہ پر سے نمازی کے آگے سے گزر سکتا ہے۔؟

---

[1] منتقیٰ میں حدیث ہے کہ بیت اللہ شریف میں سترہ کی معافی ہے کیونکہ وہاں پر ہجوم رہتا ہے اور سترہ رکھنا مشکل ہے۔

[2] اس پھینکنے سے بعض دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر پھینکنا بتلاتے ہیں۔

جواب:۔ مرفوع حدیث میں فاصلہ کی حدبندی مصرح تو میرے علم میں ثابت نہیں۔ البتہ بین یدی المصلی کا لفظ بظاہر یہ چاہتا ہے کہ محل سترہ سے باہر سے اگر گزر جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر احتیاطی طریقہ اختیار کرے تو بہتر ہے (محمد علی از مرکز الاسلام لکھوکی)

مجیب لبیب نے جس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے اُس کی شرح میں صاحب سبل السلام نے تحریر فرمایا ہے:۔ والحدیث دلیل علی تحریم المرور مابین موضع جبهته فی سجوده وقدمیه ہاں ایک روایت میں رمیة الحجر کا لفظ آیا ہے اِس میں گو ضعف اور معنی کے لحاظ سے محتمل ہے۔ لیکن (احتیاطی طریقہ کے لئے) مفید ہوسکتی ہے ایسے مسائل میں کسی فریق پر تشدد سے بچنا انسب ہے۔ واللہ اعلم

احقر محمد عطاء اللہ بھوجیانی ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ

تبصرہ محدث روپڑی رح:۔ حدیث ابوداؤد میں تذفة بحجر کا لفظ ہے یعنی پتھر پھینکنے بقدر آگے سے گزر جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اگرچہ یہ حدیث ضعیف ہے مگر ایک دوسری حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے جو یہ ہے:۔

اذ جعلت بین یدیك مثل موخرة الرحل فلا یضرك من مر بین یدیك

یعنی پالان کی پچھلی لکڑی کے برابر آگے کوئی شے ہو اور پھر کوئی تیرے آگے سے گزر جائے تو کوئی حرج نہیں اِس حدیث پر عون المعبود میں لکھا ہے۔

ثم المراد من مر بین یدیك بین السترة والقبلة لا بینك وبین القبلة۔

یعنی آگے سے مراد سترہ اور قبلہ کے درمیان ہے نہ نمازی اور سترہ کے درمیان۔

اِس سے معلوم ہوا کہ سبل السلام والے کا یہ کہنا کہ پیشانی رکھنے کی جگہ اور پاؤں کی جگہ کا درمیان مراد ہونے پر دلالت کرتی ہے یہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ عون المعبود کی تشریح چاہتی ہے کہ محل سترہ سے بُعد میں آگے ہو پھر ضعیف حدیث پر عمل کرنے میں احتیاط ہے۔ خاص کر جب کوئی دوسری روایت نہیں۔ نہ صحیح اور نہ ضعیف تو پھر دلیری بالکل اچھی نہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

مورخہ ۹، ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ ۔ ۱۲ اگست ۱۹۳۳ء

بیت اللہ میں نمازی کے آگے سے گزرنا

سوال :۔ بیت اللہ شریف میں نمازی کے آگے سے گزرنے کی رخصت ہے یا نہیں ؟

محمد عبد التواب کلکتہ بنگال

جواب :۔ بیت اللہ شریف میں نمازی کے آگے سے گزرنا درست ہے۔ منتقیٰ میں حدیث ہے مطلب بن ابی وداعہ رضہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بیت اللہ میں) باب بنی سلم کی جانب سے یعنی حجر اسود کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ اور لوگ آگے سے گزرتے تھے۔ آپ کے اور بیت اللہ کے درمیان کوئی سترہ نہ تھا۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف میں سترہ کا حکم نہیں۔ اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ وہاں ہر وقت طواف ہوتا ہے اور ہر وقت نماز ہوتی ہے اور ہجوم رہتا ہے اس لئے سترہ کا انتظام مشکل ہے۔

اِس حدیث میں اگرچہ کچھ ضعف ہے لیکن سب مذاہب کا تعامل اس کا موید ہے۔ اور اس کے ساتھ مجبوری کو بھی شامل کر لیا جائے (کہ ہجوم کی وجہ سے سترے کا وہاں انتظام مشکل ہے) تو اس سے اور تقویت ہو جاتی ہے پس اس حدیث کی بنا پر بیت اللہ شریف سترہ کے حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔

عبد اللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

مورخہ ۱۴ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۸ء

نماز کی کیفیّت کا بیان

نماز کی شرائط

سوال :۔ نماز کی شرائط کیا ہیں۔ ان کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں۔

جواب :۔ ہر عمل کے لئے ایک طریقہ ہے اگر اس طریق پر وہ ادا نہ ہو تو محنت رائیگاں جاتی ہے۔ اور اس سے نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ہنڈیا اور روٹی پکانی ہو تو اس کے سیکھنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ نماز تو ایک بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے اِس کے لئے بھی بہت سے شرائط و فرائض اور متعلقات ہیں، اگر ان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو نماز سرے ہی سے ادا نہیں ہوتی یا ناقص ہوتی ہے۔ نماز کے لئے استقبال قبلہ شرط ہے ہاں اگر جنگل میں قبلہ کا پتہ

نہ لگے تو جس طرف قبلہ کی جانب کا زیادہ خیال ہو اُس طرف نماز پڑھ لے۔ اس طرح سواری پر بھی نفل پڑھنے ہوں تو نماز کی نیّت باندھنے کے وقت استقبال قبلہ کافی ہے۔ پھر خواہ رہے یا نہ رہے۔ ستر عورت شرط ہے۔ جس کی تفصیل ہو چکی ہے۔ اور اسی طرح طہارت شرط ہے۔ طہارت دو طرح کی ہے۔ ظاہری اور حکمی۔ ظاہری یہ ہے کہ ظاہری نجاسات سے بدن۔ کپڑا اور نماز کی جگہ پاک ہو۔ مثلاً پاخانہ۔ پیشاب وغیرہ یہ ظاہری نجاسات ہیں۔ حکمی نجاست یہ ہے۔ جنبی ہونا بے وضو ہونا اور عورت کا حیض والی ہونا وغیرہ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

زبان سے نماز کی نیّت

سوال:۔ تکبیر اولیٰ سے قبل نیت نماز ضروری ہے یا نہیں۔ کیا نیّت زبان سے ادا کی جائے۔ جب نیت کے لئے آیت قرآن انی وجهت قبل از تکبیر اولیٰ پڑھتے ہیں تو اس آیت کا نیت کے لئے پڑھنا کیوں ناجائز ہے

جواب:۔ تکبیر اولیٰ سے پہلے دل سے نیّت ضروری ہے زبان سے نیّت ثابت نہیں۔ بلکہ نیّت دل ہی کا فعل ہے نہ زبان کا۔ کیونکہ نیّت کا معنی قصد اور ارادہ ہے۔ قصد اور ارادہ دل کا فعل ہے اور انی وجهت نیّت کے لئے نہیں پڑھی جاتی۔ کیونکہ اس میں کسی خاص عبادت کا ذکر نہیں۔ اور نیّت خاص عبادت کی ہوتی ہے نیز انی وجهت کا تکبیر اولیٰ سے پہلے پڑھنا اس کا تسلی بخش کوئی ثبوت نہیں بلکہ بعض روایتوں سے تکبیر اولیٰ کے بعد پڑھنا ثابت ہے چنانچہ مشکوٰۃ "باب یقرأ بعد التکبیر" میں وہ روایت موجود ہے۔ پس صحیح بعد پڑھنا ہے۔ اور نیت پہلے ہوتی ہے تو اس کا نیّت کے لئے پڑھنا ثابت نہ ہوا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

نماز کے معنیٰ سیکھنے ضروری ہیں

سوال:۔ دیہاتی لوگوں کو نماز کے معنیٰ نہیں آتے جو لوگ نماز کے معنیٰ نہیں جانتے اُن کی نماز ادا ہو جاتی ہے یا نہیں۔؟

جواب:۔ آیندہ کے لئے معنیٰ سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ ایسے لوگوں کی نماز خطرہ میں ہے قرآن مجید میں ہے۔ لا تقربوا الصلوٰة وانتم سكارىٰ حتى تعلموا ما تقولون۔ یعنی نشہ کی حالت میں

نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کہتے ہو اُس کو جان لو۔

اِس آیت سے معلوم ہوا انسان نماز میں جو کہتا ہے اُس کو سمجھے تب نماز ہوتی ہے ورنہ نماز نہیں ہوتی۔ مشکوٰۃ باب المساجد میں حدیث ہے۔

اِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاِنَّمَا یُنَاجِیْ رَبَّہٗ

یعنی جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو وہ خدا سے مناجات کرتا ہے

اِس سے بھی معلوم ہوا کہ معنیٰ سمجھنا ضروری ہے کیونکہ بغیر سمجھے مناجات نہیں ہوتی۔ نیز مشکوٰۃ کتاب الدعوات فصل ۲ میں حدیث ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ۔

یعنی اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔

ظاہر ہے جو شخص معنیٰ نہیں جانتا وہ مقصد سے غافل ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہؒ جلد ۲ صفحہ ۱۹ میں ہے۔

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رض لَیْسَ لَکَ مِنْ صَلٰوتِکَ اِلَّا مَا عَقَلْتَ مِنْهَا

یعنی ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ تیرے لئے نماز سے وہی ہے جو تو نے سمجھ کر پڑھی۔

اور بخاری باب الوضوء من النوم میں حدیث ہے۔

اِذَا نَعَسَ اَحَدُکُمْ وَھُوَ یُصَلِّیْ فَلْیَرْقُدْ حَتّٰی یَذْھَبَ عَنْہُ النَّوْمُ

یعنی جب ایک تمہارے کو نماز میں اُونگھ آجائے تو نماز چھوڑ کر سو جائے یہاں تک کہ اس سے نیند دور ہو جائے حافظ ابن حجرؒ اس پر لکھتے ہیں۔

والمشهور التفرقة بينهما وان من فترت حواسه بحيث يسمع كلام جليسه ولا يفهم معناه فهو ناعس وان زاد على ذالك فهو نائم۔

یعنی مشہور یہ ہے کہ اونگھ اور نیند میں فرق ہے جس کے حواس اس طرح ٹھہر گئے کہ کلام سُنے اور معنیٰ نہ سمجھے اس کو اونگھ والا کہتے ہیں۔ اور جو اس پر زیادہ ہو جائے اُس کو سونے والا کہتے ہیں۔

جو لوگ معنیٰ نہیں جانتے اُن کی حالت بالکل اُونگھنے والے کی سی ہے۔ جب اُونگھ کی حالت میں نماز منع ہے تو اُن کی نماز کیسے درست ہو گی۔؟

خدا کی شان نماز جو دین کا ستون ہے اس سے لوگ بہت بے پرواہ ہیں۔ کسی قسم کا فکر نہیں کرتے۔ درست

ہو یا نہ اُن کے لئے یکساں ہے۔ اناللہ۔ خدا تعالیٰ ہماری حالتوں پر رحم کرے اور اپنے دین کا شوق دے۔ آمین

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ ۔ ۲ اگست ۱۹۳۴ء

سبحانک اللّٰھم سے پہلے بسم اللہ

سوال :۔ ثناء جو فاتحہ سے پہلے پڑھی جاتی ہے خصوصًا سبحنك اللّٰهم وبحمدك الخ سے قبل تسمیہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک عالم ثناء سے پہلے بسم اللہ پڑھنا ناجائز بتاتے ہیں۔

جواب :۔ ثناء سے پہلے بسم اللہ کا ذکر خصوصی طور پر نہیں آیا۔ البتہ عموم کے طور پر آیا ہے

كل امر ذی بال لم يبدأ فيه ببسم الله فهو ابتر۔

یعنی جو کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ دُم کٹا ہے یعنی بے برکت ہے۔

اِس حدیث سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اگر پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر دل میں کچھ تردّد رہتا ہے کہ نماز کے متعلق ہمیں ذرا ذرا سی باتیں پہنچ گئی ہیں۔ اگر ثناء سے پہلے آپؐ نے بسم اللہ پڑھی ہوتی تو اس کا ذکر کسی روایت میں ہوتا۔ اِس لئے نہ پڑھنے والے کو بھی بُرا نہ کہنا چاہیے۔ کیونکہ دونوں طرف کچھ نہ کچھ دلائل ہیں۔ پڑھنے والے کی دلیل عُموم ہے اور عام سے استدلال صحیح ہے۔ اور جو نہیں پڑھتا اُس کی دلیل یہ تردّد ہے جس کا ابھی ذکر ہُوا ہے ورنہ تردد بھی بے جا نہیں۔ اِس لئے ایسے موقع پر ایک دوسرے پر تشدد نہ چاہیئے۔ اور نہ ایسے مسائل پر زور دینا چاہیئے کیونکہ دونوں جانب معمولی دلیل ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ ۔ ۱۵ اگست ۱۹۳۳ء

نماز میں کھڑے ہونے اور ہاتھ باندھنے کا طریقہ

سوال :۔ نماز میں کیسے کھڑا ہونا چاہیئے اور ہاتھ کہاں اور کس طرح باندھے جائیں۔

ایک سائل

جواب :۔ نماز کے لئے قبلہ رُخ اِس طرح کھڑا ہو کہ پاؤں اور کندھوں کا فاصلہ برابر ہو تاکہ اگر دُوسرے کے ساتھ ملے تو نیچے اُوپر سے سارا مل سکے۔ اور نظر پاؤں کی جگہ رہے تو بہتر ہے۔ اگر پاؤں سے ہٹ جائے تو

سجدہ کی جگہ سے آگے نہیں بڑھنی چاہیئے۔ اپنے دل کو پورا خدا کی طرف متوجہ کرے۔ اور اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھے اور انگلیوں کو کشادہ رکھ کر ہتھیلیوں کو قبلہ رُخ کر کے کانوں تک یا کندھوں تک دونوں ہاتھ اٹھائے پھر بایاں ہاتھ نیچے اور دایاں اُوپر سینہ[۲] پر رکھے۔ اور اس کے بعد ثناء یا دُعا پڑھے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۵ محرم ۱۳۰۹ھ

نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا

سوال :۔ مولوی اشرف علی تھانوی نے اپنے رسالہ الاقتصاد میں لکھا ہے کہ :۔
قیام میں ہاتھ زیر ناف باندھے۔ ابُوداؤد نسخہ الاعرابی جلد اول ص۱۱۰ میں ابی جحیفہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ سُنّت طریقہ یہ ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ رکھا جائے۔ اور ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت ابُوہریرہؓ نے فرمایا کہ ہاتھ کا پکڑنا ہاتھ سے نماز کے اندر ناف کے نیچے ہے۔ (روایت کیا ان دونوں حدیثوں کو ابُوداؤد نے)
کیا مولوی اشرف علی کا بیان کردہ مسئلہ یہ درست ہے۔ ایک سائل

جواب :۔ مولوی اشرف علی نے بہت خیانت کی ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن اسحٰق کوفی ہے۔ ابُوداؤد میں لکھا ہے کہ میں نے امام احمدؒ سے سُنا ہے وہ اس کو ضعیف کہتے تھے۔

راوی کے اس ضعف کو ظاہر نہ کرنا یہ کس قدر خیانت ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ سینہ پر ہاتھ باندھنے کی صحیح حدیث بلوغ المرام میں موجُود ہے اس کا نام تک نہیں لیا۔ تاکہ کسی کو صحیح حدیث کا پتہ نہ لگ جائے اور وہ حدیث یہ ہے

وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى يَدِهِ الْيُسْرٰى عَلٰى صَدْرِهٖ اخرجه ابن خزيمه۔

یعنی وائل بن حجرؓ سے روایت ہے اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی پس آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر اپنے سینہ پر رکھا۔ ابن خزیمہ نے اس کو نکالا ہے۔

---

[۱] مجمع الزوائد [۲] ابن خزیمہ

اِس حدیث سے ظاہر ہے کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے جائیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۹۲۵ء

رفع الیدین

سوال:۔ حنفی لوگ رفع یدین کی ابتداء آغاز اسلام سے بتاتے ہیں کہ مسلمان کفار کی طرح بغلوں میں بت لے کر نماز پڑھتے تھے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کو ہٹانے کے لئے رفع یدین کا حکم دے دیا کیا یہ بات درست ہے ؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود رفع یدین کی ہے۔

جواب:۔ بیہقی میں رفع یدین کی حدیث ذکر کی ہے۔ اِس کے الفاظ یہ ہیں۔

فمازالت تلك صلوته حتى لقى الله۔

یعنی آخری دم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہی نماز رہی ہے۔

اِس سے معلوم ہُوا کہ آپ ہمیشہ رفع یدین کرتے تھے۔

بخاری میں حدیث ہے صلوا کما رأیتمونی اصلی۔ یعنی آپ نے فرمایا جیسے مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو۔ اِسی طرح نماز پڑھو تو گویا آپ نے فرما دیا کہ تم ہمیشہ رفع یدین کرو۔ کیونکہ آپ تا وفات رفع یدین کرتے رہے ـــــ یہ سب بے اصل اور بے دلیل باتیں ہیں کہ ابتداء اسلام میں لوگ بغلوں میں بت لے کر نماز کو آیا کرتے تھے۔ معاذ اللہ یہ صحابہؓ پر شرمناک حملہ ہے کسی مسلمان کے منہ سے یہ بات زیب نہیں دیتی۔

عبداللہ امرتسری ۳ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ ۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۷ء

کیا ترک رفع الیدین سے نماز میں نقص آتا ہے

سوال:۔ زید اور بکر رکوع کے وقت رفع یدین کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں۔ زید کہتا ہے کہ رفعیدین کے بغیر نماز ناقص و نامکمل ہے اور حدیث صلوا کما رایتمونی کے خلاف ہے۔ بکر کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ رفع یدین کا استحباب ثابت ہے اور اس کا ترک بھی بڑے بڑے صحابہؓ سے ثابت ہے۔ لہذا اگر رفع یدین کے بغیر نماز پڑھ لی جائے تو اس کا کوئی حرج نہیں۔ ان دونوں میں سے کس کی رائے درست ہے ؟۔ محمد فیروز الدین نائب مدرس لوئر مڈل سکول چاہڑ ڈاکخانہ پھلورہ ضلع سیالکوٹ

جواب:۔ ترک رفع یدین کے بارہ میں سب سے زبردست عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے۔ مگر اس میں بھی کئی طرح سے کلام ہے ملاحظہ ہو ابوداؤد و ترمذی۔ اس لئے احتیاط رفع یدین کرنے ہی میں ہے۔ نہ کرنے میں خطرہ ہے کہ نماز میں نقص آئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۱ جمادی الاول ۱۳۵۶ھ ۔ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء

کیا رفع یدین، آمین، فاتحہ خلف الامام منسوخ ہو گئی تھی؟

سوال:۔ ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ آمین۔ رفع یدین پہلے ابتداء اسلام میں کی گئی تھیں۔ آخر عمر میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور نہ صحابہؓ نے کی۔ کیا اس کا یہ کہنا درست ہے؟

محمد شفیع اہلحدیث موضع فرید پور ڈاکخانہ نیوڑ ریاست پٹیالہ

جواب:۔ ابتداء اسلام سے کیا مراد ہے مکہ شریف میں ہجرت سے پہلے یا کچھ اور۔ اگر مکہ شریف میں ہجرت سے پہلے کا وقت مراد ہے تو مشکوٰۃ وغیرہ میں ہجرت کے بعد کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔ جن میں رفع یدین کا ذکر ہے وائل بن حجرؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اخیر زمانہ میں آئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رفعیدین کرتے دیکھا۔ ملاحظہ ہو۔ مشکوٰۃ باب صفۃ الصلوٰۃ بلکہ بیہقی میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رفعیدین کرتے رہے یہاں تک کہ آپ وفات پا گئے ملاحظہ ہو تلخیص الحبیر۔ اسی طرح آمین کے متعلق وائل بن حجرؓ کی حدیث مشکوٰۃ باب القراۃ فی الصلوٰۃ فصل ۲ میں موجود ہے اصل بات یہ ہے کہ جب تک یہ ثبوت نہ دیا جائے کہ فلاں وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفعیدین کرتے رہے یا آمین کہتے رہے اس کے بعد منسوخ ہو گئی۔ اُس وقت تک یہ کہنا غلط ہے کہ رفعیدین ابتداء اسلام میں پہلے تھی۔ یہی حال فاتحہ خلف الامام کا ہے۔ اس کے متعلق بھی ثبوت ہونا چاہیے کہ کس وقت تک پڑھتے رہے اور کب منسوخ ہوئی تاکہ اس کے بعد پڑھنے کا ثبوت ہم دے سکیں۔ اور آیت کریمہ واذا قرئ القران سورہ اعراف کی ہے جو مکی ہے۔ چنانچہ عام طور پر قرآن مجید کے نسخوں میں اس سورہ کے شروع میں یہ لکھا ہے تو پھر اس آیت سے اخیر میں منسوخ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولوی کوئی جاہل بلکہ اجہل ہے جس نے کبھی قرآن مجید کھول کر نہیں دیکھا۔ انا للہ

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ (انبالہ)

مورخہ ۲ شعبان ۱۳۵۹ھ ۔ ۷ ستمبر ۱۹۴۰ء

حضورؐ نے رفع الیدین ہمیشہ کی ہے

سوال :۔ آمین بالجہر اور رفع یدین کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا فرمان بیان فرمائیں کہ اس میں ہمیشگی کا لفظ ہو۔

جواب :۔ سائل نے سوال کا جو طریق اختیار کیا ہے کہ آمین اور رفع یدین کے ثبوت میں آپ کے فرمان کے علاوہ ہمیشگی کا لفظ پیش کیا جائے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اس مطالبہ سے ان احکام کا انکار لازم آتا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے نماز کی نیت باندھنے کے وقت رفعیدین آپ کے فعل سے ثابت ہے۔ ایسی کوئی روایت نہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ تم نیت باندھنے کے وقت ہمیشہ رفعیدین کیا کرو۔ اس طرح نیت باندھ کر سبحانك اللھم یا اللھم باعد بینی وبین خطایای کی بابت بھی کوئی ایسی روایت نہیں آئی جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ نیت باندھ کر یہ پڑھا کرو۔ غرض ایسے بہت سے احکام ہیں۔ اگر سائل کے طریق پر ہر بات کا جواب قول ہی ہو اور اس میں ہمیشگی کا لفظ بھی ہو تو معاذ اللہ شریعت کے بہت سے حصے سے انکار کرنا پڑے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آمین اور رفعیدین کے لئے ہمیشگی کا لفظ طلب کرنے والے کوئی ناواقف ہیں۔ عالم ایسا سوال نہیں کرسکتا اور یہ یاد رہے کہ صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے قول کی نسبت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ یعنی آپؐ کے فعل کا اثر ان پر قول سے زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ بخاری طبع مصر کے صـ۲ وغیرہ میں حدیث ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحابہؓ کو قربانی کرنے کا حکم دیا صحابہؓ باوجود حکم کے، قربانی کرنے کے لئے نہ اٹھے۔ پھر فرمایا کوئی نہیں اٹھا۔ پھر فرمایا کوئی نہیں اٹھا۔ اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو کر حضرت اُم سلمہؓ کے پاس چلے آئے۔ حضرت اُم سلمہؓ نے غمی کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے قربانی کرنے کا کئی مرتبہ حکم دیا۔ مگر میرے حکم کی کسی نے پرواہ نہیں کی۔ حضرت اُم سلمہؓ نے فرمایا کہ آپ سب سے پہلے اپنی قربانی کر دیجئے اور حجامت بنوا لیجئے۔

چنانچہ آپؐ نے اسی طرح کیا۔ جب صحابہؓ نے دیکھا تو پھر وہ ایک دوسرے سے جلدی جلدی قربانی کرنے اور حجامت بنانے لگے حتیٰ کہ ہجوم کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ کوئی دب کر نہ مر جائے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابہؓ پر آپؐ کے قول کی نسبت فعل کا زیادہ اثر ہوتا تھا۔ اب جو شخص قولِ حدیث مانگتا ہے وہ بے علم نہیں تو اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم باعمل دے اور خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین۔

عبداللہ امرتسری

سجدہ کو جاتے، سجدہ میں اور سجدہ سے اُٹھتے وقت رفع الیدین

سوال :۔ سجدہ کو جاتے اور سجدہ سے اُٹھتے وقت رفع الیدین مسنون ہے یا نہیں؟ سجدہ کی رفعیدین کی احادیث قابل عمل ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں حالانکہ سجدہ کی رفع الیدین کی احادیث کتب سنن و غیر سنن میں ایک جماعت صحابہؓ سے آئی ہیں۔ جن میں ضعیف اور غیر ضعیف بھی ہیں۔ اگرچہ ضعیف ہیں مگر کثرت طرق سے ان کا ضعف منجبر بھی ہو سکتا ہے۔ امام نسائی نے مالک بن حویرث سے باب رفع الیدین للسجود میں اور نیز دوسری حدیث بروایت نصر ابن عاصم مالک بن حویرث سے بیان کی ہیں۔ جس میں وضاحت ہے کہ سجدہ سے اُٹھتے ہوئے حضور رفع الیدین کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے بھی مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۸۳ پر اسی مفہوم کی حدیث مالک بن الحویرث سے نقل کی ہے۔ اس حدیث پر بعض نے یہ جرح کی ہے کہ قتادہ راوی ہے جو مدلس ہے۔ اور قتادہ نے اس روایت کو لفظ عن سے روایت کیا ہے۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ امام ترمذی نے مطلقاً قتادہ کی ان روایتوں کو جو بلفظ عن مروی ہیں۔ بہت جگہ صحیح کہا ہے خواہ وہ شعبہ کے طریق سے ہوں یا غیر شعبہ کے طریق سے۔ نیز حافظ ابن حجرؒ نے قتادہ کی اس روایت کو جو بلفظ عن مروی ہے صحیح کہتے ہیں حالانکہ وہ غیر طریق شعبہ ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد۔ فتح الباری۔ تفسیر فتح البیان میں قتادہ کی ان روایتوں کو صحیح کہا ہے جن میں وہ عن سے روایت کرتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ تحفۃ الاحوذی صفحہ ۱۵ میں ہے۔

وقد تقرر ان روایۃ ابی اسحٰق من طریق شعبۃ محمولۃ علی السماع وان کانت معنعنۃ قال الحافظ ابن حجرؒ فی طبقات المدلسین قال البیہقی وروینا عن شعبۃ انہ قال کفیتکم تدلیس ثلثۃ الاعمش وابی اسحٰق و قتادہ قال الحافظ فہذہ قاعدۃ جیدۃ فی حدیث ہولاء الثلاثۃ انہا اذا جاءت من طریق شعبۃ دلت علی السماع ولو کانت معنعنۃ

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابو اسحٰق کی شعبہ کے واسطے سے سماع پر محمول ہے۔ خواہ عن کے ساتھ ہو حافظ ابن حجرؒ نے طبقات المدلسین میں بیہقی سے نقل کیا ہے۔ شعبہ کہتے ہیں میں نے تین کی تدلیس سے تمہاری کفایت کی ہے۔ اعمش۔ ابو اسحٰق۔ قتادہ۔ حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں۔ یہ کھرا قاعدہ ہے۔ ان

تینوں میں سے جب کوئی روایت شعبہ کے ذریعہ سے آئے۔ تو وہ سماع پر دلالت کرے گی۔ اگرچہ عن کے ساتھ روایت ہو۔ یہ تو تدلیس کا جواب ہے۔ اب صرف ایک اعتراض باقی ہے کہ نصر بن عاصم مالک بن حویرث روایت لینے میں متفرد ہیں۔ دو وجہ سے یہ جرح ضرر نہیں کرتی ہے۔ ایک اس لئے کہ نصر بن عاصم لیثی بصری ثقہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مالک بن حویرث کی یہ حدیث جو سنن ابی داؤد ص۲۶۳ مع عون المعبود میں ہے تائید کرتی ہے۔ جو میرے نزدیک اس باب میں اصل ہے۔ اور حدیث بروایت عبدالجبار بن وائل بن حجر اس کی موید ہے۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور عادل ہیں۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ امام ابوداؤد نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کو ہمام نے بھی محمد بن جحادہ سے روایت کیا ہے لیکن اُس نے سجدہ کی رفع یدین کا ذکر نہیں کیا۔ محمد بن جحادہ کے صرف ایک شاگرد عبدالوارث نے اس کو ذکر کیا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عبدالوارث کا متفرد ہونا ضرر نہیں کرتا کیونکہ عبدالوارث ہمام سے بڑھ کر عادل ہے۔ کیونکہ تقریب میں ہمام کو ثقاہت کا ایک درجہ دیا ہے اور عبدالوارث کو دو درجے زیادتی ثقہ احفظ کی بالاتفاق مقبول ہے۔

علاوہ ان ہر دو روایت کے متعدد احادیث ضعیفہ اور عمل ایک جماعت صحابہ و تابعین کا ان روایتوں کو قوت دیتا ہے۔ بعض اہل علم سجدہ کی رفعیدین کی احادیث پر یہ جرح کرتے ہیں کہ حدیث عبداللہ بن عمر اور علی بن ابی طالب اور موسیٰ اشعری ان احادیث کے معارض ہیں۔ کیونکہ ان کی احادیث میں سجدہ کی رفعیدین کا انکار اور نفی ہے۔ سو یہ جرح اہل حدیث کی شان سے بعید ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی احادیث کا اہل حدیث واصحاب الہدیٰ یہ جواب دیتے ہیں کہ روایات مثبتہ روایات نافیہ پر مقدم و ترجیح رکھتی ہیں۔

(مولوی سراج دین جدھ پور)

جواب:۔ سجدہ میں رفع یدین کی احادیث شبہ سے خالی نہیں جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔
اصول حدیث میں لکھا ہے کہ اگر کوئی محدث اسنادہ صحیح کہے تو اس سے صحت حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر اسنادہ صحیح کہہ کر اس کے بعد کوئی جرح ذکر نہ کرے تو یہ صحت حدیث پر دلالت ہو گی کیونکہ اگر کوئی جرح ہوتی تو وہ سکوت نہ کرتا۔

الفیہ عراقی میں ہے۔ والحکم للاسناد بالصحۃ او بالحسن دون الحکم للمتن
رأوا واقبلہ ان اطلقہ من یعتمد ولم یعقبہ لضعف ینتقد۔

یعنی اسناد کے صحیح یا حسن ہونے کا حکم متن کے صحیح یا حسن ہونے کو نہیں چاہتا۔ ہاں معتمد علیہ محدث اسناد

پر صحیح یا حسن ہونے کا حکم کرے اور اس کے بعد کوئی ضعف بیان نہ کرے۔ جس سے متن کی تنقید ہو تو اس صورت میں متن بھی صحیح ہوگا۔

اس عبارت کا مطلب اگرچہ بعض نے اتنا ہی بیان کیا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس عبارت سے دو باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ متن پر صحت یا حسن کا حکم لگانا یہ حدیث کے صحیح یا حسن ہونے کا کم درجہ ہے۔ کیونکہ اسناد پر حکم لگانے کی صورت میں یہ احتمال رہتا ہے کہ شاید اس میں شذوذ یا علت وغیرہ ہو۔ گویا اس احتمال کی بنا پر یہ حکم لگانے سے حدیث کی صحت یا حسن اس درجہ کی نہیں سمجھی جاتی جس درجہ کی متن پر حکم لگانے سے سمجھی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ کم درجہ معتبر ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ اسناد پر صحت یا حسن کا حکم لگانے کے بعد محدث سکوت کرے اور اس میں شذوذ[1] و علت وغیرہ بیان نہ کرے جو ضعف حدیث کا باعث ہو۔ یہ مطلب مقدمہ ابن صلاح کی عبارت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مقدمہ ابن صلاح کی نوع ثانیہ ص۱۶ میں ہے۔

قولهم هذا حديث صحيح الاسناد او حسن الاسناد دون قولهم هذا حديث صحيح او حديث حسن لانه قد يقال هذا حديث صحيح الاسناد ولا يصح لكونه شاذا او معللا غير ان المصنف المعتمد منهم اذا اقتصر على قوله انه صحيح الاسناد ولم يذكر له علة ولم يقدح فيه فالظاهر منه الحكم له بانه صحيح فى نفسه لان عدم العلة والقادح هو الاصل والظاهر والله اعلم

یعنی محدثین کا یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد یا حسن الاسناد ہے۔ یہ ان کے اس قول سے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا یہ حدیث حسن ہے۔ کم ہے کیونکہ بعض دفعہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور در حقیقت بوجہ شاذ یا معلل ہونے کے حدیث صحیح نہیں ہوتی ہاں معتمد مصنف صحیح الاسناد کہہ کر کوئی علت اور عیب ذکر نہ کرے تو ظاہر یہی ہے کہ اس کا یہ حکم حدیث کی صحت کی بابت ہے۔ کیونکہ اصل اور ظاہر یہی ہے کہ کوئی علت اور عیب نہیں ورنہ وہ ذکر کرتا۔

اس عبارت سے اوپر کی دونوں باتیں اچھی طرح واضح ہوگئیں کیونکہ اسناد پر صحت یا حسن کے حکم لگانے کی

---

[1] شذوذ اسے کہتے ہیں کہ ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ کی یا کئی ثقوں کی مخالفت کرے۔ اور علت پوشیدہ عیب کو کہتے ہیں۔ جس پر ہر ایک مطلع نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بڑے بڑے محدثین مطلع ہوتے ہیں

بابت کہا ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث صحیح ہے اور جب براہِ راست حدیث پر صحت یا حسن کا حکم لگا یا تو یہ حدیث کے صحیح یا حسن ہونے کی تنصیص اور تصریح ہے۔ اور ظاہر کا درجہ تنصیص سے کم ہے۔ کیونکہ ظاہر میں کچھ احتمال رہتا ہے۔ جیسے یہاں احتمال ہے کہ شاید شذوذ وغیرہ کا کوئی احتمال ہو۔ برخلاف تنصیص اور تصریح کے کہ اس میں اس قسم کی گنجائش نہیں۔ اور باوجود درجہ کم ہونے کے ظاہر پر بالاتفاق عمل ہوتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ جب ظاہر کا اور تنصیص کا مقابلہ ہو جائے تو پھر ظاہر پر عمل نہیں رہتا جیسے صحیح الاسناد کہنے سے اگرچہ صحت حدیث ظاہر ہوتی ہے لیکن جب صحیح الاسناد کہنے کے بعد محدث کسی عیب کی تنصیص اور تصریح کردے تو پھر اس تنصیص اور تصریح پر عمل ہوگا۔ ظاہر پر عمل نہیں ہوگا۔ یعنی حدیث صحیح نہیں سمجھی جائے گی۔ اگر یہ تنصیص اور تصریح نہ ہو۔ تو پھر ظاہر پر عمل ہوگا۔ یعنی حدیث صحیح سمجھی جائے گی تو ایک عام قاعدہ کا بیان تھا۔ اب اس اسناد کا حال سنئے جس کو حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے طبقات المدلسین صڈ میں مدلسینؒ کے پانچ مراتب ذکر کئے ہیں۔ ان سے تیسرے مرتبہ کی بابت فرماتے ہیں:۔

الثالثۃ من اکثر من التدلیس فلم یحتج الائمۃ من احادیثھم الا بما صرحوا فیہ بالسماع ومنھم من قبلھم کابی الزبیر۔ المکی انتھی۔

یعنی تیسرے مرتبہ کے وہ لوگ ہیں جو تدلیس بہت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی احادیث سے ائمہ نے استدلال نہیں پکڑا۔ مگر جن روایتوں میں انہوں نے سماع کی تصریح کی ہے وہ لائق استدلال ہیں اور بعض محدثین نے ان کی احادیث کو مطلق رد کردیا ہے۔ خواہ سماع کی تصریح کریں یا نہ۔ اور بعض محدثین نے مطلقاً قبول کر لیا ہے۔

اس کے بعد آگے چل کر اس مرتبہ کے پچاس آدمی تبلائے ہیں۔ جن سے ایک قتادہ کو بھی شمار کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔ ۹۵

قتادہ بن دعامۃ السدوسی البصری صاحب انس بن مالک رضی اللہ عنہ

لہ مدلس اس راوی کو کہتے ہیں جو اپنے ملاقاتی سے ایسے صیغہ کے ساتھ روایت کرے جس سے سماع کا وہم ہو مگر سُنا نہیں جیسے کہے قال فلان بن فلان۔

کان حافظ عصرہ وھو مشہور بالتدلیس وصفہ بہ النسائی وغیرہ (طبقات المدلسین ص۱۵)

یعنی قتادہ بن دعامۃ سدوسی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد اپنے زمانہ کے حافظ ہیں۔ اور وہ تدلیس کے ساتھ مشہور ہیں۔ امام نسائی وغیرہ نے ان کو مدلس کہا ہے۔

اب یہاں دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ حافظ ابن حجرؒ نے قتادہ کی تدلیس کا اعتبار نہ کیا ہو۔ اور اس کی حدیث کو مطلقاً قبول کرتے ہوئے اسنادہ صحیح کہہ کر سکوت کیا جس سے اُوپر کے قاعدہ کے مطابق یہ حدیث ادنیٰ درجہ کی صحیح ہوگئی۔ دُوسری صورت یہ کہ قتادہ چونکہ تدلیس کے ساتھ مشہور ہیں۔ اس لئے اسنادہ صحیح کے بعد اس بات کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی کہ اس میں قتادہ مدلس ہیں، کیونکہ شہرت بمنزلہ ذکر کے ہے۔ پس اس صورت میں حدیث ضعیف ہوگی۔ میرے خیال میں اس صورت کو ترجیح ہے، کیونکہ جب آئمہ حدیث تیسرے مرتبہ والوں کی احادیث کو لائق استدلال نہیں سمجھتے تو حافظ ابن حجرؒ سے ان کی مخالفت بعید ہے۔ اور امام ابوداؤد کا اس کو اپنی کتاب میں لانا اس کی صحت کی دلیل نہیں۔ کیونکہ وہ ایسی ضعیف احادیث بھی لے آتے ہیں جو تائید کے قابل ہوں۔ اور اگر بالفرض دوسری صورت کو ترجیح نہ ہو تو بھی معاملہ مشکوک رہا۔ کیونکہ احتمال ہے کہ حافظ ابن حجرؒ اسنادہ صحیح پر شہرت کی بنا پر سکوت کیا ہو۔ اور احتمال ہے کہ تدلیس کا اعتبار نہ کرتے ہوئے سکوت کیا ہو۔ بہرصورت حافظ ابن حجرؒ کے اسنادہ صحیح کہنے سے اس حدیث کی صحت سمجھنا ڈبل غلطی ہے۔ اور ابن سید النّاس کے کلام کو بھی اسی پر قیاس کرلیں بلکہ ابن سید النّاسؒ نے رجالہ ثقات کہہ کر اسنادہ صحیح کی تفسیر کردی ہے۔ یعنی اسنادہ صحیح سے مُراد یہ ہے کہ راوی ثقہ ہیں۔ اور قتادہ اگرچہ مدلس ہیں لیکن ثقہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور فتح البیان اور عون المعبود کی عبارت کا بھی یہی مطلب ہے۔ اور اگر کچھ اور ہے۔ تو ان کی غلطی ہے۔ اور امام شوکانی کے سکوت کی وجہ بھی شہرت ہے۔ یعنی قتادہ کی تدلیس مشہور ہے۔ اس لئے کچھ کلام نہیں کی ——— جب اس حدیث کی صحت میں شبہ رہا جس کی نسبت اسنادہ صحیح صراحۃً کہا گیا ہے تو سجدہ میں رفعیدین کی حدیث کی نسبت کس طرح تسلّی ہو سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شعبہؒ کی روایت اعمش۔ ابی اسحٰق اور قتادہ سے سماع پر محمول ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ اعمش اور ابی اسحٰق سے تو خواہ سماع پر محمول ہو۔ مگر شعبہ کی روایت کا سماع پر محمول ہونا مشکوک ہے جس کی وجہ مندرجہ ذیل ہے۔

طبقات المدلسین کی عبارت جو مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے تحفۃ الاحوذی میں نقل کی ہے وہ پوری اس طرح ہے :-

روقال البیھقی، فی المعرفة روینا عن شعبة قال کنت اتفقد فم قتادة فاذا قال حدثنا وسمعت حفظته واذا قال حدث فلان ترکته قال وروینا عن شعبة انه قال کفیتکم تدلیس ثلاثة الاعمش وابی اسحق وقتادة (قلت) فهذه قاعدة جیدة - الخ (طبقات المدلسین ص۱۱)

یعنی بیہقی نے معرفہ میں کہا ہے ہم نے شعبہ سے روایت کی فرماتے تھے کہ جب قتادہ حدیث سناتے تو میں ان کے منہ کی طرف خیال رکھتا۔ جب حدثنا اور سمعت کہتے تو میں یاد کرلیتا جب حدث کہتے تو میں چھوڑ دیتا نیز بیہقی نے کہا ہم نے شعبہؒ سے روایت کیا۔ فرماتے تھے میں نے تین تدلیس سے تمہاری کفایت کی۔ اعمشؒ، ابواسحقؒ، قتادہؒ ہیں (حافظ ابن حجرؒ) کہتا ہوں۔ یہ عمدہ قاعدہ ہے۔ ان تینوں سے جب کوئی روایت شعبہ کے واسطہ سے آئے تو وہ سماع پر دلالت کرے گی۔ خواہ عن ہی کے ساتھ روایت ہو۔

اس عبارت کے پہلے حصہ میں ہے کہ شعبہؒ نے قتادہ سے وہی روایتیں لی ہیں جن میں سماع کی تصریح ہے باقی چھوڑدی ہیں۔ تو اب عن والی روایت شعبہؒ سے آہی نہیں سکتی تو اس کے سماع پر محمول ہونے کے کیا معنیٰ؟ اور اس صورت میں قتادہ کی تدلیس کی کفایت کرنے سے شعبہ کا یہ مطلب ہے کہ جب قتادہ کا کوئی دوسرا شاگرد ایسے صیغہ کے ساتھ روایت کرے۔ جس میں سماع کی تصریح نہ ہو تو وہ روایت میرے پاس لاؤ۔ میں اس کی تمیز کردوں گا کہ وہ سماع والی ہے یا نہیں کیونکہ میں اس کی بڑی جستجو رکھتا تھا۔ پس یہ عبارت اس بات کی دلیل ہوئی کہ یہ عن والی روایت شعبہؒ کی نہیں بلکہ کسی راوی کی غلطی سے شعبہ کی طرف نسبت ہوگئی ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مالک بن حویرثؒ راوی حدیث کا اپنا عمل اس حدیث پر نہیں کیونکہ وہ صرف رکوع کو جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفعیدین کرتے تھے۔ چنانچہ مسلم باب استحباب رفع الیدین الخ میں، اور بخاری باب رفع الیدین الخ ہے۔ ہاں اگر تدلیس کی کفایت کرنے سے شعبہؒ کا مطلب یہ لیا جائے کہ جن روایتوں میں قتادہ نے سماع کی تصریح نہیں کی۔ ان کی بابت بعد کو شعبہ نے قتادہ سے تحقیقات کرکے سماع والی اور غیر سماع والی تمیز کرلیں۔ اور روایت کرنے کے وقت اسی لفظ سے روایت کیں جس لفظ کے ساتھ سنی تھیں جو سماع کے لفظ کے ساتھ سنیں وہ سماع کے لفظ کے ساتھ روایت کیں۔ اور جو عن وغیرہ کے ساتھ سنیں وہ عن وغیرہ کے ساتھ روایت کیں تو اس وقت بیشک حافظ ابن حجرؒ کا قاعدہ کہ شعبہ کی روایت ان تینوں سے سماع پر محمول ہے درست ہوگا۔ اور اس قاعدہ کی بنا پر رفعیدین کی حدیث صحیح ہوگی۔ لیکن شعبہ کے مطلب میں چونکہ شبہ پڑ گیا ہے۔ اس لئے

لسلی ۔ ی طرح نہیں کیوں ؟ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال ۔

اس کے علاوہ مالک بن حویرث رضؓ کا صرف دو جگہ رفعیدین کرنا بتلا رہا ہے کہ سجدہ کی رفع یدین کوئی مستقل رفعیدین نہیں ۔ بلکہ یہ وہی ہے جو سجدہ کو جاتے اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت ہاتھ رکھے اور اٹھائے جاتے ہیں ۔ کیونکہ احادیث کے مطابق دونوں ہتھیلیاں سجدہ میں کبھی کندھوں کے برابر کبھی منہ کے دونوں طرف رکھی جاتی ہیں اور سجدہ سے سر اٹھاتے وقت ساتھ اٹھائی جاتی ہیں ۔ اس کی شکل وصورت بظاہر رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کی سی بن جاتی ہے ۔ اس لئے راوی نے کبھی صورت وشکل کا لحاظ کرتے ہوئے رکوع کے رفعیدین کے ساتھ اس کا بھی ذکر کر دیا اور کبھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ رکوع کا رفعیدین مستقل ہے ۔ اور یہ کوئی مستقل رفعیدین نہیں ۔ اس کا ذکر چھوڑ دیا ۔ اور عبداللہ بن عمر رضؓ اور حضرت علی رضؓ وغیرہ کی احادیث میں جو وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں رفعیدین نہیں کرتے تھے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ یعنی انہوں نے بھی اس کے مستقل نہ ہونے کی وجہ سے نفی کر دی ہے ۔ آپ نے ان احادیث کو معارض بتایا ہے ۔ حالانکہ یہ مؤید ہیں پھر آپ کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عدم رویت اور اثبات رویت کے منافی نہیں ۔ کیونکہ یہاں عدم رویت اور اثبات رویت کا مقابلہ نہیں بلکہ رویت عدم اور رویت اثبات کا مقابلہ ہے ۔ یعنی جن روایتوں میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے ۔ ان سے کئی روائتوں میں رویت کی تصریح ہے ۔ ملاحظہ ہو مسلم باب مذکورہ اور بخاری باب الی این یرفع یدیہ فتاملؓ فیہ ۔ اور سندھی کا اس طرح سے تطبیق کرنا کہ آنحضرت صلعم سجدہ کی رفعیدین کبھی کرتے کبھی نہ کرتے یہ اس وقت مناسب ہے جب سجدہ کی رفعیدین مستقل طور پر ثابت ہو جائے

لہ اس سے ایک شبہ اور اس کے جواب کی طرف اشارہ ہے ۔ شبہ یہ ہے کہ یہاں عدم رویت اور اثبات رویت کہنا صحیح ہے ۔ کیونکہ جو فعل ایک نے دیکھا دوسرے نے نہیں دیکھا ۔ مثلاً مالک بن حویرث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں رفع یدین کرتے دیکھا اور عبداللہ ابن عمر رضؓ نے نہیں دیکھا ۔ اس طرح سے ایک طرف عدم رویت ہو گئی ۔ اور دوسری طرف اثبات رویت ہو گئی ۔ جواب اس کا یہ کہنا اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب ایک صحابی کہتا ہے کہ میں نے رفع یدین کرتے دیکھا ۔ دوسرا کہتا کہ میں نے نہیں دیکھا ۔ یا اس کے ذکر سے سکوت کرتا ۔ احادیث میں اس طرح نہیں بلکہ ایک میں ہے کرتے دیکھا ۔ دوسری میں ہے نہ کرتے دیکھا ۔ پس مقابلہ رویت اثبات اور رویت عدم میں ہوا ۔ نہ عدم رویت اور اثبات حدیث میں ۔ ۱۲

مگر جب ثبوت ہی مشکوک ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ؟ اس کے علاوہ یہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کی حدیث میں رکوع میں رفعیدین کا اثبات ہے اور سجدہ میں نفی ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں کبھی چھوڑ دیتے تھے۔ اور راوی نے جیسا دیکھا اُسے بیان کر دیا۔ تو اس پر سوال ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں کیوں چھوڑا۔ کیا جواز تبلانے کی غرض سے چھوڑا یا بھول کر چھوڑا یا منسوخ ہونے کی وجہ سے چھوڑا۔ بلا وجہ بھول کر نسبت آپ کی طرف غیر مناسب ہے۔ نیز بھول میں آپ کی اقتدار نہیں ہوتی تو گویا مطلب یہ ہوا کہ سجدہ میں ہمیشہ رفع الیدین کرنا چاہیئے۔ حالانکہ سندھی کی یہ مراد نہیں اس طرح نسخ کی صورت کو سمجھ لینا چاہیے کیونکہ نسخ کی صورت میں لازم آئے گا کہ سجدہ میں بالکل نہ کرنا چاہیئے حالانکہ سندھی کی یہ بھی مراد نہیں۔ اب رہی پہلی صورت یعنی جواز تبلانے کی غرض سے چھوڑا۔ سو اس کی بابت عرض ہے کہ سجدہ میں جواز تبلانے کی غرض سے چھوڑا ہے تو رکوع میں نہ چھوڑنے کا مطلب عدم جواز ہوگا۔ یعنی رکوع میں چھوڑنا جائز نہیں ہوگا۔ حالانکہ سندھی کی یہ مراد بھی بعید ہے۔ کیونکہ نسائی کتاب الافتتاح کی پہلی حدیث پر سندھیؒ نے رکوع میں بھی ترک جواز تسلیم کیا ہے۔

پھر یہاں پر ایک اور ڈبل اعتراض پڑتا ہے وہ یہ کہ اثبات اور نفی دونوں قسم کی احادیث میں استمرار کا صیغہ ہے جو ہمیشگی اور استمرار کو چاہتا ہے تو اب اس طرح سے موافقت نہیں ہو سکتی کہ کبھی کرتے کبھی نہ کرتے بلکہ اس کی صورت یہی ہے کہ سجدہ میں رفعیدین سے مراد مستقل رفع یدین نہیں بلکہ وہی شکل وصورت رفعیدین والی ہے۔ فتامل فیہ[1]

رہی وائل بن حجرؓ کی حدیث جس کو آپ نے اصل قرار دیا ہے۔ اس میں عبدالوارث بن سعید

---

[1] اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہاں دونوں طرف اگرچہ ہمیشگی اور استمرار کے صیغہ ہیں لیکن موافقت کے لئے تاویل کا کوئی حرج نہیں۔ وہ یوں کہ جب چند دن ایک شخص نے ایک حالت دیکھی تو یہ خیال کر کے کہ باقی دنوں میں بھی اسی طرح کرتے ہوں گے استمرار کا صیغہ استعمال کر دیا۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ حکم قائم رہے اور اس کا بدلنا ایک موہوم شے ہے پس یہ تیسرا اعتراض ٹھیک نہیں۔ ہاں پہلے دو اعتراض ٹھیک ہیں ایک یہ کہ جب مستقل رفعیدین کا ثبوت ہی مشکوک ہے تو پھر اس موافقت کی ضرورت کیا ؟ دوسرا یہ کہ اس سے لازم آتا ہے کہ رکوع کے رفعیدین کا ترک ناجائز ہو۔ فافہم ۱۲

بے شک ہمام سے زیادہ ثقہ ہے۔ لیکن ہمام کو خارج سے تقویت بہت ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کی متفق علیہ احادیث جن میں سجدہ میں رفعیدین کی نفی ہے اس کے شواہد ہیں۔ شرح نخبہ میں صحت کے چند درجے مقرر کئے ہیں اول نمبر بخاری مسلم کی روایات، پھر صرف بخاری کی، پھر صرف مسلم کی۔ پھر جو بخاری ومسلم کی شرط پر ہوں۔ پھر جو صرف بخاری کی شرط پر ہوں۔ پھر جو مسلم کی شرط پر ہوں۔ اور اس روایت کو مسلم نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس میں سجدہ میں رفعیدین نہیں۔

پس اس جہت سے بھی اس روایت کو تقویت ہوگئی پھر عبدالجبار بن وائل کے استاد میں اختلاف ہے عبیداللہ بن عمر بن میسرہؒ جو اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں جن کی بابت تقریب میں ثقہ ثبت لکھا ہے یہ عبدالوارث سے وائل بن علقمہ نقل کرتے ہیں۔ اور ابوخیثمہ زہیر بن حرب بھی اسی اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں وہ بھی عبدالوارث سے بواسطہ عبدالصمد بن عبدالوارث، وائل بن علقمہ ہی نقل کرتے ہیں۔ اور ابراہیم بن الحجاج سامی جس کو تقریب میں ثقۃ یھم قلیلا کہا ہے یعنی ثقہ ہے کچھ وہم کرتا ہے۔ اور عمران بن موسیٰ ابوعمرو البصری جس کو تقریب میں صدوق کہا ہے۔ یہ دونوں عبدالوارث سے علقمہ بن وائل نقل کرتے ہیں۔ اور صحیح یہی ہے چنانچہ تہذیب میں اور تقریب میں حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اب دیکھئے عبیداللہ اور ابوخیثمہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔ دونوں کی بابت تقریب میں ثقہ ثبت لکھا ہے۔ اور ابراہیم اور عمران یہ ان کی نسبت بہت ہلکے درجہ کے ہیں کیونکہ دوسرے کو توصرف سچا کہا ہے۔ اس کے حافظہ وغیرہ کی تعریف نہیں کی اور پہلے کے لئے جامع لفظ بولا ہے جو حافظہ وغیرہ کو بھی شامل ہے لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ کچھ وہم کرتا ہے مگر باوجود اس کے عبدالجبار بن وائل کے استاد کی نسبت انہی کا قول درست ہے یہ کیوں؟ اس لئے کہ ان کے قول کو خارج سے تقویت پہنچ گئی ہے۔ وہ یوں عفان بن مسلم البصری نے ہمام بن یحییٰ البصری سے علقمہ بن وائل نقل کیا ہے۔ اور اسحٰق بن ابی اسرائیل نے بھی عبدالصمد سے علقمہ بن وائل نقل کیا ہے۔ اس طرح کے بعض اور خارجی قرائن بھی ہیں جو عبدالجبار کا استاد علقمہ بن وائل ہونے کے مقتضی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ زیادہ ثقہ کی بات کو ہمیشہ ترجیح ہوا کرے بلکہ بعض خارجی شواہد ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیتے ہیں۔ اور اسی کی بات درست ہوتی ہے۔ پس اس بنا پر ہمام کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ امام مسلم ہمام کی روایات اپنی کتاب میں لائے ہیں۔ اور عبدالوارث کی نہیں لائے۔ ملاحظہ ہو باب وضع یدہ الیمنی الخ۔ پس جس روایت کو آپ نے اصل خیال کیا تھا وہ محل استدلال میں فرع

بھی نہ رہی۔ اس کے علاوہ مالک بن الحویرث رضہ کی حدیث میں سجدہ میں رفع یدین سے مراد مستقل رفعیدین مراد نہ ہو تو اس میں بھی وہی مراد لینا چاہیے تاکہ سب احادیث میں موافقت ہو جائے اور کسی قسم کا اختلاف نہ رہے۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۳۰ صفر ۱۳۵۳ھ - ۲۴ مئی ۱۹۳۵ء

سجدہ کے درمیان رفع الیدین کا مسئلہ

سوال :- ایک شخص سنن نسائی۔ مسند احمد۔ ابی داؤد۔ ابن ماجہ۔ دارقطنی رحہ۔ رفع الیدین امام بخاری رحہ طبرانی۔ بیہقی فی الخلافیات۔ صحیح ابن عوانہ۔ ابویعلی۔ مصنف ابن ابی شیبہ۔ مصنف عبدالرزاق تلخیص الحبیر کی روایات کی بنا پر سجدہ میں جاتے ہوئے اور بین السجدتین احیاناً رفعیدین کرتا ہے

(۱) مانعین مصیب ہیں یا عامل ؟ (۲) کیا حدیث صحیح ہے ؟ (۳) اگر صحیح ہے تو فی زمانہ اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا (۴) اگر مجروح ہے تو سنن نسائی کی دو روایتیں جو من طریق شعبہ اور سعید بن ابی عروبہ مروی ہیں۔ ان پر کونسی جرح ہے۔ مبہم جرح نہ ہو۔ اصل بنا ان ہی دو حدیثوں پر ہے باقی سب روایات انہی کی تائید میں ہیں۔ عام اس سے کہ صحاح سے ہوں یا ضعاف سے۔ (۵) کیا یہ رفع الیدین منسوخ ہو چکی ہے (۶) اگر منسوخ ہوگئی ہے تو حدیث ناسخ کو بمعہ اسناد تحریر فرمایئے (۷) اگر منسوخ نہیں ہوئی تو کونسے صحابہ رضہ اس کے عامل تھے (۸) اور کون کون سے تابعین اس طرف گئے ہیں (۹) کیا اس کے عامل کی اقتداء میں نماز ہو سکتی ہے (۱۰) جو شخص اس فعل کو روافض کے ساتھ تشبیہ دے اور ناراض ہو کر مخالفت کرے اس کا کیا حکم ہے۔

ابوحفص الراجلی الڈیرہ غازی خان از ملتان محلہ وزیر آباد

جامع اہل حدیث - ۱۱ جنوری ۱۹۳۶ء

جواب :- (۱) مانعین مصیب ہیں۔

(۲) حدیث صحیح نہیں۔

(۳) چونکہ حدیث صحیح نہیں اس لئے عمل نہیں۔

(۴) یہ دو طرح سے مجروح ہے ایک یہ کہ اس میں قتادہ مدلس[1] ہے اور اپنے استاد نصر بن عاصم سے سماع

[1] مدلس اس راوی کو کہتے ہیں جو اپنے ہمعصر سے جس کو وہ ملا ہے ایسے صیغہ سے روایت کرے کہ وہم سماع کا ہو (باقی صفحہ ۱۳۵ پر)

کی تصریح نہیں کی بلکہ کلمہ عن کے ساتھ روایت کرتا ہے اور مدلس کی عن والی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ شعبہ اور سعید بن ابی عروبہ کے شاگردوں میں اختلاف ہے کوئی سجدہ میں رفع الیدین کا ذکر کرتا ہے کوئی نہیں کرتا۔ نسائی میں دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں۔

(ملاحظہ ہو باب رفع الیدین للسجود اور کتاب الافتتاح)

اگر کہا جائے کہ زیادت ثقہ مقبول ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زیادت ثقہ کے خلاف کو ترجیح ہو تو پھر زیادت ثقہ معتبر نہیں۔ اور یہاں اس کے خلاف کو ترجیح ہے۔ ایک تو متفق علیہ روایات میں سجدہ میں رفع الیدین کی نفی آئی ہے۔ دوم شعبہ کے بعض شاگردوں نے سجدہ میں رفع الیدین کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی روایت میں قتادہ نے اپنے استاد نصر بن عاصم سے سماع کی تصریح کی ہے۔

پس یہ روایت صحیح نہ ہوئی۔ ملاحظہ ہو نسائی کتاب الافتتاح۔

اس کے علاوہ مالک بن حویرث صحابی رضہ سے سجدہ میں رفعیدین کرنے کی روایت نقل کی جاتی ہے۔ ان کا خود اس پر عمل نہیں اس قسم کے اور کئی وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ حدیث ناقابل عمل ہوگئی ہے اس لئے اس پر عمل متروک ہے۔

(۵-۶) جب صحت ثابت نہیں تو ناسخ منسوخ کا سوال بے محل ہے۔

(۷) نیل الاوطار جلد ۲ ص۲۰ میں بحوالہ ابوداؤد ذکر کیا ہے کہ میمون مکی نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضہ کو سجدہ میں دونوں ہتھیلیوں سے اشارہ کرتے دیکھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضہ کے پاس اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا اگر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز دیکھنا چاہتا ہے تو عبداللہ بن زبیر رضہ کی اقتداء کر۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صحابی رضہ اس کے قائل ہیں مگر نیل الاوطار میں ذکر ہے کہ اس کی اسناد میں عبداللہ بن لھیعہ ہے جس میں کلام مشہور ہے۔

(۸) نیل الاوطار کے اسی مقام میں بحوالہ ابوداؤد، نسائی ذکر کیا ہے۔ نصر بن کثیر سعدی کہتے ہیں کہ میں نے مسجد خیف میں عبداللہ بن طاؤس کے ایک کنارے نماز پڑھی۔ جب پہلا سجدہ کیا اور سر اٹھایا تو انہوں نے منہ کے برابر ہاتھ اٹھائے۔ میں نے اس کو انوکھا سمجھ کر وہیب بن خالد کے پاس ذکر کیا۔ انہوں نے عبداللہ بن طاؤس سے کہا

بقیہ ص۱۳۴۔ مگر حقیقت میں اس نے سنا نہ ہو مثلاً کہے عن فلاں یا قال فلاں ایسی روایت ضعیف ہے۔

طاؤس نے جواب دیا کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو یہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ آپ ایک ایسا کام کرتے ہیں جو کسی کو میں نے یہ کام کرتے نہیں دیکھا۔ عبداللہ بن طاؤس نے جواب دیا کہ میں نے اپنے والد کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔ اور میرے والد نے کہا۔ میں نے عبداللہ بن عباس رضؓ کو یہ کام کرتے دیکھا اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کام کرتے دیکھا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تابعینؒ سے طاؤس اس کے قائل ہیں۔ مگر نیل الاوطار میں ہے کہ نضر بن کثیر ضعیف ہے۔ اور حافظ ابو احمد نیشاپوری سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث عبداللہ بن طاؤسؒ کی حدیث کی جہت سے منکر ہے اس کے بعد نیل الاوطار میں کہا ہے دارقطنی نے عِلَل میں حدیث ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ ہر نیچے جانے اور اُٹھنے کے وقت رفعیدین کرتے اور فرماتے میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں زیادہ قریب ہوں۔ اور یہ احادیث استدلال کے لائق نہیں پس لازم یہی ہے کہ معاملہ عبداللہ بن عمر کی حدیث جس میں سجدہ میں رفعیدین کی نفی (ہے) جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ پر باقی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ کوئی دلیل صحیح قائم ہو جائے جیسے دو رکعت میں تشہد پڑھ کر اٹھنے کے وقت رفعیدین پر دلیل صحیح قائم ہو گئی ہے اور سجدہ میں رفعیدین کے استحباب کے اصحاب شافعیؒ سے ابو بکر بن المنذرؒ اور ابو علی طبریؒ اور بعض اہل حدیث بھی قائل ہیں۔

(۹) نماز ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں بوجہ احادیث کے اجتہادی غلطی لگ سکتی ہے۔ اور اجتہادی غلطی میں مواخذہ نہیں۔

(۱۰) یہ شخص غلطی کرتا ہے۔ روافض کے ساتھ مشابہت نہ دینی چاہیئے کیونکہ یہ اجتہادی غلطی ہے۔

نوٹ:۔ نواب صاحب نے بھی دلیل الطالب علی ارجح المطالب میں اس مسئلہ کی کافی تفصیل کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ سجدہ میں رفعیدین نہیں مگر انہوں نے زیادہ تر بنا اس پر رکھی ہے کہ مالک بن حویرث کا شاگرد نصر بن عاصم ضعیف ہے لیکن نواب صاحب کو اس میں ڈبل غلطی لگی ہے۔ انہوں نے نصر بن عاصم انطاکی سمجھا ہے جو واقعی ضعیف ہے مگر یہاں نصر بن عاصم بصری ہے جو ثقہ ہے تفصیل کے لئے تہذیب التہذیب وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑی مدیر تنظیم

۱۰ محرم ۱۳۵۵ھ - ۲ اپریل ۱۹۳۶ء

جلسہ استراحت

سوال:۔ پہلی اور تیسری رکعت سے اُٹھنے کے وقت بیٹھ کر اُٹھنا چاہیے یا بغیر بیٹھے اُٹھ کھڑا ہو۔ مولوی اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ ترمذی میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اپنے قدموں کے پنجوں پر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ روایت کیا اس کو ترمذی نے اور کہا کہ ابوہریرہ کی روایت پر عمل ہے اہلِ علم کے نزدیک۔ رسالہ الاقتصاد ص۱۲

جواب:۔ یہ جلسہ سنت ہے۔ مولوی اشرف علی نے ترمذی کے جس صفحہ سے یہ حدیث نقل کی ہے اسی صفحہ پر دو چار سطر پہلے مالک بن حویرث کی یہ حدیث موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی اور تیسری رکعت میں ذرا بیٹھ کر اُٹھتے تھے جس کو جلسہ استراحت کہتے ہیں۔ اور اس حدیث کو ترمذی نے صحیح کہا ہے بلکہ بخاری میں بھی ہے جس کی صحت متفق علیہ ہے۔ (مشکوٰۃ باب صفۃ الصلوٰۃ) اور جو حدیث مولوی اشرف علی نے نقل کی ہے اُس کی بابت ترمذی میں لکھا ہے کہ اس میں خالد بن ایاس راوی ضعیف ہے۔

تنبیہ ۱:۔ ترمذی کا یہ کہنا کہ "ابوہریرہؓ کی روایت پر عمل ہے اہلِ علم کے نزدیک" اس سے مراد کل اہلِ علم نہیں کیونکہ اس سے پہلی حدیث میں جو ہم نے ذکر کی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ اس پر بعض اہلِ علم کا عمل ہے۔ اور ہمارے اصحاب (اہلِ حدیث) کا بھی یہی مذہب ہے جب بعض اہلِ علم اور اہلِ حدیث کا مذہب اس حدیث کے موافق بھی ہوا تو ضرور ہے کہ دوسری حدیث میں کل مراد نہ ہوں۔ پس اب اس صورت میں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اہلِ علم کے عمل سے ابوہریرہ کی حدیث صحیح ہوگئی۔ کیونکہ جب کل نہ ہوئے تو اختلاف ہوا اور ضعیف حدیث عمل سے اس وقت صحیح ہوتی ہے جب اختلاف نہ ہو۔

تنبیہ ۲:۔ قدموں کے پنجوں پر کھڑا ہونے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلسہ استراحت کے بعد جب دوسری رکعت یا چوتھی رکعت کے لئے کھڑے ہوتے یا تشہد کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے کہ گھٹنے کھڑے کر لیں اور پاؤں پورے زمین پر لگا دیں کیونکہ جب اس طرح بیٹھ کر کھڑے ہوں گے اور ہاتھ بھی زمین پر ٹیکیں گے۔ چنانچہ اکثر دستور ہے کہ اکثر ٹیکے جاتے ہیں تو کتے کی بیٹھک کی شکل پیدا ہو جائے گی جس کو اقعاء کہتے ہیں۔ اور یہ منع ہے کیونکہ حدیثوں میں کہیں اونٹ کی بیٹھک سے کہیں درندے کی طرح ہاتھ پھیلانے سے کہیں کوے کی طرح ٹھونگے مارنے سے منع کیا گیا ہے گویا اس قسم کی ہیئات

حیوانیہ کو نماز میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ اقعاء سے بھی چونکہ نہی آئی ہے اس طرح بیٹھ کر کھڑے ہونے سے منع فرمایا تاکہ اقعاء کی شکل پیدا نہ ہو جائے۔ پس اس صورت میں جلسہ استراحت کی اس حدیث میں نفی نہیں ہوگی۔ اور دونوں حدیثوں میں موافقت ہو جائے گی۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۹۲۵ء

قرأت کا بیان

جہری نمازوں میں جہری بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال :- کیا قرأت بالجہر کے ساتھ بسم اللہ بھی جہری پڑھے یا سری۔ اور یہ جو حدیث ہے۔ عن انس ان النبی وابابکر وعمر کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمدللہ رب العٰلمین۔ کیا یہ صحیح ہے؟

سائل عبدالرحمٰن حصاری خطیب جامع مسجد کمالیہ

جواب :- بسم اللہ دونوں طرح درست ہے خواہ سری پڑھے یا جہری آہستہ پڑھنے کی دلیل ہے جو آپ نے بیان کی ہے۔ اور جہر کی دلیل نعیم کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت کی ہے۔ اور وہ نسائی میں ہے۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب آمین ورفع الیدین ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی۔ ۲۵ رجب ۱۳۸۳ھ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ء

پہلی دو رکعت میں جہری قرأت کی وجہ

سوال :- فرض نماز کی پہلی دو رکعت میں امام بآواز بلند اور فاتحہ کے ساتھ دوسری سورۃ شامل کرکے پڑھتا ہے اور پچھلی دو رکعت خاموشی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اور ان میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے حالانکہ فرض چار ہوں یا تین برابر درجہ رکھتے ہیں۔

جواب :- بلوغ المرام میں حدیث ہے پہلے نماز دو رکعت فرض ہوئی تھی پھر ہجرت کے بعد چار ہو گئی۔ فجر کی اس لئے دو رہی کہ اس میں قرأت لمبی ہوتی تھی اور مغرب دن کے وتر ہیں۔ اس لئے اس میں

ایک رکعت کم رہی۔ جب اصل نماز دو ہی تھی تو فرق کرنے کے لئے پہلی رکعتوں میں جہری قرأت کا حکم ہوا۔ اور قرأت کا بھی فرق کر دیا۔ پہلی دو میں فاتحہ اور سورۃ اور اخیر میں صرف فاتحہ۔ لیکن قرأت کا فرق حنفیہ کے نزدیک ضروری ہے نہ اہل حدیث کے نزدیک رہی یہ بات کہ دن میں جمعہ وغیرہ کے سوا جہر نہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کی آواز دن کی آواز سے پُرجوش ہوتی ہے۔ اور جمعہ وغیرہ میں کثرت جماعت کی رعایت رکھی گئی ہے تاکہ تذکیر کا فائدہ ہو۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۱۷ صفر ۱۳۵۳ھ ۔ ۳۱ مئی ۱۹۳۴ء

مقتدی کا فاتحہ کے ساتھ دوسری قرأت کا پڑھنا

سوال :۔ کیا مقتدی فاتحہ کے ساتھ دوسری قرات بھی پڑھنے کا مجاز ہے۔ نیز نوافل موکدہ میں سُورہ فاتحہ کے ساتھ اور سورۃ بھی ملانی چاہیے۔

محمد یونس متعلّم چک نمبر ۸۰۔ ای۔ بی ڈاکخانہ قبولہ ضلع منٹگمری

جواب :۔ سری نمازیں فاتحہ کے ساتھ دوسری قرأت پڑھ سکتا ہے۔ جہری نمازوں میں ممانعت آئی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک نوافل میں ضروری ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک جائز ہے۔ ضروری نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

یکم جمادی الاوّل ۱۳۸۳ھ ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

فاتحہ کی آیات کا تکرار

سوال :۔ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب سُورہ فاتحہ کا تکرار فرما رہے ہیں۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضورؐ نے نماز تہجّد میں سُورہ مائدہ کے آخری رکُوع کی آیات کا تکرار فرمایا ہے۔ اور خلیفہ سوم نے صبح کی نماز میں سورہ یُوسف کی آیات کو تکرار سے پڑھا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ نے اس کی تائید کی ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے۔

(محمد حسین ڈار ڈار برادرز د رجسٹر ڈ) گوجرانوالہ

جواب :۔ تکرار کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان عام طور پر تکرار کو مسنون سمجھے اور اس بنا پر

تکرار کرے تو یہ بدعت ہے۔ جو تعامل نبوی اور سلف کے خلاف ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ اتفاقی طور پر انسان کے دل میں رقت پیدا ہو جائے اور بار بار پڑھنے سے لذت آئے تو ایسے اتفاقی تکرار میں کوئی حرج نہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تہجد میں یا کسی صحابی کا تکرار اسی بنا پر ہے۔ رہا فاتحہ کا فرق سو یہ بے دلیل ہے کیونکہ جو جواز کی وجہ ہے وہ دونوں میں موجود ہے خواہ فاتحہ ہو یا غیر فاتحہ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامع قدس اہل حدیث لاہور

۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء — ۱۹ جمادی الاول ۱۳۶۲ھ

قرأت میں حضورؐ کا نام سن کر درود پڑھنا

سوال:۔ اگر امام نماز میں کوئی ایسی سورہ پڑھے جس میں حضورؐ کا نام مبارک ہو۔ مقتدی حسب عادت مقتدی ہونے کی حالت میں صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دے تو کیا اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

جواب:۔ مقتدی حضورؐ کا نام سن کر آہستہ سے "صلی اللہ علیہ وسلم" کہہ دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حدیث میں مطلق آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سنے تو درود پڑھے۔ اس میں نماز کی حالت بھی آسکتی ہے۔ اور اگر کوئی نہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں دوسری حدیث لَا تَقْرَءُوْا بِشَیْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِذَا جَهَرْتُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ۔ پر عمل ہو جائیگا۔ یعنی جب میں جہر سے پڑھوں تو فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۸ شعبان ۱۳۷۹ھ ۔ ۲۶ فروری ۱۹۶۰ء

استماع۔ سماع۔ انصات۔ سکوت میں فرق

سوال:۔ استماع۔ سماع۔ انصات۔ سکوت میں کیا فرق ہے۔ اور ان کا حقیقی و مجازی کیا معنیٰ ہے نیز فاستمعوا کے ہوتے ہوئے انصتوا کا کیا فائدہ ہے؟

جواب:۔ استماع یہ ہے کہ انسان کسی چیز کو خوب اچھی طرح کان لگا کر سنے یعنی پوری توجہ اور قصد کے ساتھ اس لئے استماع اور سماع میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الاول (الاستماع) یقال لما کان بقصد لانہ لا یکون الا بالاصغاء وھو المیل

والسماع یکون بقصد و دونه۔

اِس کے بعد سماع کی تعریف اِن لفظوں میں بھی کی گئی ہے ۔کل ما یستلذ الانسان من صوت طیب مگر استماع کے لئے مستمع کا خاموش رہنا ضروری نہیں ہے۔اور انصات کے لئے توجّہ کے ساتھ سُننا اور اُس کے ساتھ خاموش رہنا بھی ضروری ہے ۔چنانچہ لغت میں ہے۔ نصت نصتا والنصت وانتصت له سکت مستمعا لحدیثه ۔یعنی کسی بات کو خاموش رہ کر سُننا اُس کا نام انصات ہے۔کفار قرآن سنتے تو شور مچاتے کہ دل پر اس کا اثر نہ پڑ جائے اِس لئے استمعوا کے بعد انصتوا کا اضافہ کیا گیا۔یعنی شور وغل نہ کرو ممکن ہے تم پر اللہ کی رحمت ہو جائے۔قرآن مجید کو سُنتے ہوئے خاموش رہو یعنی چپ چاپ سُنو گے تو بہت ممکن ہے کہ ہدایت پا کر اللہ تعالےٰ کی رحمت میں داخل ہو جاؤ۔سورہ احقاف میں جنّات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے ۔واذا صرفنا الیك نفرا من الجن یستمعون القرآن فلما حضروہ قالوا انصتوا۔جب ہم نے جنّوں کے افراد کو تیری طرف بھیجا کہ وہ قرآن سُنیں تو جب وہ اِس موقعہ پر پہنچ گئے تو اُنہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ خاموشی کے ساتھ اِس قرآن کو سُنو۔

اِس مقام پر بھی استماع کے بعد انصات کا اضافہ ہے کہ محض استماع کا لفظ انصات کے مقصد کو واضح نہیں کرتا حدیث میں آتا ہے۔

واذا قلت لصاحبك یوم الجمعة انصت فقد لغوت

یعنی امام جب خطبہ پڑھ رہا ہو اس وقت اگر تو نے اپنے ساتھی کو کہا کہ خاموش رہو تو تُو نے لغو حرکت کی ہے یہاں بھی انصات کو غیر کی بات سُننے کے موقعہ پر خاموش رہنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ سکوت کا وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں خود اپنی بات سے اپنے آپ خاموش رہنا ہو۔اس لئے محاورہ میں کہا جاتا ہے۔تکلم الرجل ثم سکت یعنی کلام کر کے خاموش ہو گیا ۔ فاذا انقطع کلامه فلم یتکلم اوامحم قلت اسکت یعنی بول کر چپ ہو گیا۔اب بول نہیں سکتا منہ بند کر دیا گیا۔ ایسے موقع پر اس کا استعمال باب افعال سے کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے تکبیر کے بعد چپ ہو کر دُعا افتتاح پڑھنے کو سکوت اسکات سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔کان یسکت بین التکبیر وبین القرأة ۔پھر کہتے ہیں۔یارسول اللہ! اسکاتك بین التکبیر والقرأة ۔ ان مقاموں میں انصات کا لفظ نہیں آیا۔لفظ انصات کے معنٰی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ سری نماز میں بھی قرأۃ مقتدی کو اس

آیت سے منع کرتے ہیں وہ اصطلاح عرب سے ناواقف ہیں۔ کائنا من کان کیونکہ انصات اس سکوت کو کہتے ہیں جو کسی کے کلام کو سننے کے لئے کیا جائے۔ اور سکوت کا مجازی معنیٰ آہستہ کلام پر آتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضہ کی روایت سے ابھی معلوم ہو چکا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء باسترٖ (آہستہ) کو سکوت سے تعبیر کیا۔ واللہ اعلم۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۲۱ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ۔ یکم مارچ ۱۹۳۴ء

سورۃ فاتحہ خلف الامام پڑھنے کا امر ہے یا صرف خبر ہے؟

سوال:۔ سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنا ان الفاظ میں ثابت کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو یہ ارشاد فرمایا ہو کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھا کرو۔

جواب:۔ کتاب القراۃ بیہقی میں یہ حدیث ہے۔

لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ خَلْفَ الْاِمَامِ۔

یعنی جو شخص امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں

دیکھئے جن الفاظ کا آپ نے سوال کیا ہے اُن سے بھی یہ سخت ہیں کیونکہ آپ نے امر کا سوال کیا ہے اور یہاں سرے ہی سے نماز کی نفی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۵ ربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ۔ ۱۷ اگست ۱۹۶۲ء

قرأت نماز میں قرآنی ترتیب کے خلاف پڑھنا

سوال:۔ امام کا خلافِ ترتیب قرآن پڑھنا تقدیم و تاخیر سے درست ہے یا نہیں۔ اور فرض نماز میں کبھی ایک مرتبہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اثناء سورتوں سے متفرق رکوعات کا پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو آج کل پوری سورتیں نہ پڑھنا اور صرف درمیان سورۃ سے یا اول آخر سورۃ سے پڑھنا بدعت ہے یا نہیں؟

جواب:۔ امام کا موجودہ ترتیبِ قرآنی کے خلاف تقدیم و تاخیر سے پڑھنا یا اثناء سورتوں سے متفرق رکوعات کا پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری جلد اول صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷

باب الجمع بین السورتین فی رکعۃ بالخواتیم وبسورۃ قبل سورۃ وباول سورۃ ۔ یعنی امام بخاری رح نے باب باندھا ہے کہ دو سورتیں ایک رکعت میں یا سورتوں کے اخیر کی آیتیں یا موجودہ ترتیب کے خلاف سورتوں کا پڑھنا یا سورتوں کی پہلی آیتوں کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟

اب ذیل کے دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جائز ہے ملاحظہ ہو۔ عن انس رض کان رجل من الانصار کان یومھم فی مسجد قباء الحدیث ۔ حضرت انس رض فرماتے ہیں کہ ایک انصاری مسجد قباء میں امامت کراتا سورہ فاتحہ کے بعد پہلے قل ہو اللہ احد پڑھتا بعدہ کوئی سورہ ملاتا۔ اس پر اس کی قوم ناراض ہو کر اسے کہنے لگی تم قل ہو اللہ احد پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک اور سورۃ ملاتے ہو یہ ٹھیک نہیں ۔ یا تو صرف قل ہو اللہ احد پڑھا کرو یا قل ہو اللہ احد پڑھنا چھوڑ دو۔ کوئی دوسری سورۃ پڑھا کرو۔ امام نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے ۔ تمہاری مرضی ہو امامت کراؤں ورنہ چھوڑ دوں ۔ قوم مجبور تھی کیونکہ ان میں افضل یہی تھا۔ جب اس قوم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے تو لوگوں نے اپنے امام کی حالت بیان کی ۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے مقتدیوں کی بات کیوں نہیں سنتا اور تو نے ہر رکعت میں اس سورۃ کو اپنے اوپر کیوں لازم کر لیا ہے ۔ جواب دیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سورہ کو دوست رکھتا ہوں ۔ حضور نے فرمایا تیری یہ دوستی تجھ کو جنت میں لیجائے گی

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ۔

حدثنا آدم قال حدثنا شعبۃ قال حدثنا عمرو بن مرۃ قال سمعت ابا وائل قال جاء رجل الی ابن مسعود فقال قرأت المفصل اللیلۃ فی رکعۃ فقال ھذا کھذ الشعر عرفت النظائر التی کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرن بینھن فذکر عشرین سورۃ من المفصل سورتین فی کل رکعۃ ۔

حدیث بیان کی آدم نے شعبہ سے ۔ اس نے عمرو بن مرہ سے کہا ۔ عمرو بن مرہ نے سنا میں نے ابا وائل رض سے وہ کہتے تھے کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آکر کہنے لگا کہ میں نے آج کی رات ایک رکعت

میں مفصل سورتیں پڑھی ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ پڑھنا تیرا جلدی جلدی مثل شعر گوئی کے ہوگا۔ پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفصل کی دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھتے تھے اور میں ان دو سورتوں کو جانتا ہوں۔

سورتوں کی تعیین ابوداؤد جلد اول ص۲۰۶ مجتبائی میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عن علقمة والاسود قالا اتی ابن مسعود رجل فقال انی اقرأ المفصل فی رکعة فقال هذا کهذ الشعر ونثرا کنثر الدقل لکن النبیّ صلی اللہ علیه وسلّم کان یقرأ النظائر سورتین فی رکعة والنجم والرحمٰن فی رکعة واقتربت والحاقة فی رکعة والطور والذاریات فی رکعة واذا وقعت والنون فی رکعة وسأل سائل والنازعات فی رکعة وویل للمطففین وعبس فی رکعة والمدثر والمزمّل فی رکعة وهل اتٰی ولا اقسم بیوم القیمة فی رکعة وعم یتسائلون والمرسلات فی رکعة والدخان واذا الشمس کورت فی رکعة قال ابوداؤد وهذا فی تالیف ابن مسعود رضؓ۔

یعنی علقمہؒ اور اسودؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک آدمی آکر کہنے لگا کہ میں ایک رکعت میں مفصل پڑھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مثل شعر گوئی کے ہے۔ اور مثل گرنے ردی سوکھی کھجوروں کے ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتیں مقدار میں برابر کی ایک رکعت میں پڑھتے تھے سورۃ النجم و رحمٰن ایک رکعت میں۔ سورہ اقتربت والحاقہ ایک رکعت میں۔ طور والذاریات ایک رکعت میں واقعہ و نون ایک رکعت میں۔ سأل سائل والنازعات ایک رکعت میں مطففین و عبس ایک رکعت میں۔ مدثر و مزمل ایک رکعت میں و هل اتا ولا اقسم بیوم القیمة ایک رکعت میں و عم یتسالون و مرسلات ایک رکعت میں۔ دخان اور اذا الشمس ایک رکعت میں کہا ابوداؤد نے یہ عبداللہ بن مسعود کے مصحف کی بنا پر ہے۔

اس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ دو سورتوں کا جمع کرنا ایک رکعت میں دوسرا یہ کہ موجودہ ترتیب قرآنی کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنا ثابت ہوا کیونکہ ابن مسعودؓ

نے جس طرح رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سنا اسی طرح اپنے مصحف میں جمع کر دیا۔

نمبر ۲ کی دلیل یعنی نماز میں سورتوں کے اخیر پڑھنے کا ثبوت

وقال قتادہ فیمن یقرأ بسورۃ واحدۃ فی رکعتین اویردد سورۃ واحدۃ فی رکعتین کل کتاب اللہ عزوجل۔

یعنی قتادہ نے کہا جو شخص ایک سورۃ کو دو رکعتوں میں پڑھے یا ہر رکعت میں وہی سورت پڑھے درجائز ہے کیونکہ ہر ایک سورۃ میں کتاب اللہ ہی کا پڑھنا ہے۔ وجہ استدلال یوں ہے کہ جب ایک سورۃ کو دو رکعتوں میں آدھا آدھا کر کے پڑھے گا تو لا محالہ اخیر کی رکعت میں سورۃ کا اخیر ہوگا۔ جب ایک رکعت میں ایک سورۃ کا اخیر جائز ہوگیا تو دونوں رکعتوں میں دو سورتوں کے اخیر کی آیتیں یعنی قرأت بالخواتیم کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں بھی کتاب اللہ کا ہی پڑھنا ہوتا ہے جو عین مقصود شارع ہے یعنی نماز میں قرآن کا پڑھنا۔ نیز مسلم جلد اول ص۲۷۱ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو شخص اخیر بقرہ کی دو آیتیں رات کو پڑھے گا۔ اُس کو رات کی عبادت کے لئے کافی ہیں۔ یہ حدیث عام ہے۔ غیر نماز دونوں کو شامل ہے۔

نمبر ۳ کی دلیل یعنی موجودہ ترتیب کے خلاف تقدیم و تاخیر کرنا سورتوں کا نماز میں جائز ہے۔

قرأ الاحنف بالکھف فی الاولی وفی الثانیۃ بیوسف اویونس وذکر انہ صلی مع عمر الصبح بھما

یعنی احنفؒ بن قیس نے پہلی رکعتوں میں سورۃ کہف اور دوسری میں سورۃ یوسف یا یونس (شک راوی) پڑھی۔ اور ذکر کیا کہ میں نے حضرت عمرؓ کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی۔ حضرت عمرؓ نے بھی اسی طرح یعنی پہلی رکعت میں سورہ کہف اور دوسری میں سُورۃ یوسف یا سورۃ یونس پڑھی لہذا موجودہ ترتیب کے خلاف پڑھنا جائز ہو گیا۔

اس پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اُس وقت حضرت عثمانؓ کی ترتیب نہ تھی اس لئے جائز تھی۔ اب جائز نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عدم جواز کی کیا دلیل ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عدم جواز کی دلیل نہ تو قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ اگر قرآن و حدیث میں ترتیب عثمانی کے وجوب کی دلیل اللہ کی طرف سے ہو تو صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد ———— یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم خلاف نہ کرتے

جیسا کہ مصحف ابن مسعود میں ہے۔ نہ اجماع سے عدمِ جواز ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ ترتیب عثمانی پر اجماع نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو عبداللہؓ بن مسعود کا مصحف نہ ہوتا۔ حالانکہ اب تک ان کا مصحف موجود ہے۔ علاوہ اس کے تقدیم و تاخیر کی وجہ سے کتاب اللہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ جب کتاب اللہ ہے تو جائز ہے۔ یہی مقصود شارع ہے۔ یعنی نماز میں قرآن کا پڑھنا۔

نمبر ۴ کی دلیل یعنی رکعتوں میں سورتوں کی پہلی آیتوں کا پڑھنا عن عبداللہ بن السائب قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم المؤمنون فی الصبح حتی اذا جاء ذکر موسیٰ وھارون او ذکر عیسیٰ اخذته سعلة فرکع وقرأ عمر فی الرکعة الاولی بمائة وعشرین من البقرة وفی الثانية بسورة من المثانی وقرأ ابن مسعود باربعین اٰية من الانفال وفی الثانية بسورة من المفصل۔ یعنی عبداللہ بن السائب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں سورۃ مومنون پڑھی جب آپ آیت ثم ارسلنا موسیٰ واخاہ ہارون یا آیت وجعلنا ابن مریم وامہ پہنچے تو آپ کو کھانسی شروع ہو گئی پس رکوع کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پہلی رکعت میں انفال کی چالیس آیتیں اور دوسری میں مفصل کی ایک سورۃ پڑھی۔ ان دونوں حدیثوں سے نماز میں اوائل سورتوں کا پڑھنا ثابت ہو گیا۔ وجہ استدلال یوں ہے کہ جب پہلی رکعت میں اوائل سورتوں کا پڑھنا ثابت ہو گیا تو دوسری میں اختیار ہے خواہ بقیہ کو پڑھے یا کسی اور سورت کا پہلا حصہ پڑھے یا اخیر کا حصہ پڑھے۔ بہر صورت مقصود کتاب اللہ کا پڑھنا ہے جو مقصود شارع کا ہے

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ — ۲۷ نومبر ۱۹۵۹ء

قرآن مجید دیکھ کر امامت کرانا

سوال:۔ کیا امام جماعت کراتے وقت قرآن مجید دیکھ کر پڑھ سکتا ہے؟

بخاری شریف میں ہے کہ ام المومنین عائشہؓ نے اپنے غلام ذکوان کے پیچھے جو قرآن مجید دیکھ کر پڑھتا تھا نماز ادا کی ہے چنانچہ امام بخاری ”باب امامة العبد والمولیٰ“ میں اس بات کو درج کیا ہے۔ اور وہ یہ الفاظ ہیں۔ کانت عائشة یؤمها عبدها ذکوان من المصحف نصر الباری۔ ترجمہ۔ صحیح بخاری کے حاشیہ پر مولوی عبدالواحد بن مولوی عبداللہ غزنوی مرحوم

نے لکھا ہے کہ نمازی قرآن دیکھ کر قرأت پڑھے جائز ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ابوداؤد کتاب المصاحف میں اس بات کو موصولا بیان لایا ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں ——— نیز عرض ہے کہ سنا ہے کہ مولانا محمد حسین بٹالوی رح تراویح کی جماعت کراتے وقت جب قرأت بھول جاتے تو قرآن مجید سے دیکھ لیتے تھے۔ اس بات کی تحقیق جب مولوی صاحب کی صاحبزادی سے کی تو معلوم ہوا کہ تہجد کے وقت وہ نوافل پڑھتے وقت قرآن مجید دیکھ کر پڑھا کرتے تھے۔

عبدالجبار خان انگلش ٹیچر بر مکان مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی مرحوم محلہ پوریاں بٹالہ

۲۱/۳/۶۴ء

جواب :- بخاری کے حوالہ سے جو روایت آپ نے ذکر کی ہے وہ سنن ابی داؤد جو صحاح ستہ سے ہے اس میں نہیں بلکہ کتاب المصاحف میں ہے جو سنن کے علاوہ ہے۔ نیز یہ روایت مسند امام شافعی مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری جز ۳ صفحہ ۲۷۵ ومنتقی مع نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۰۔ اس کے علاوہ قیام اللیل کے صفحہ ۹۷ میں امام محمد بن نصر مروزی نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے اور اس کے علاوہ اور روایتیں بھی ذکر ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سئل ابن شہابؒ عن الرجل یوم الناس فی المصحف قال ما زالوا یفعلون ذلك منذ كان الاسلام كان خيارنا يقرؤن فی المصاحف۔

ابن شہاب زہری تابعیؒ سے سوال ہوا کہ قرآن میں دیکھ کر امامت کا کیا حکم ہے۔ فرمایا ہمیشہ علماء جب سے اسلام ہوا قرآن مجید دیکھ کر کراتے رہے جو ہمارے بہتر تھے وہ قرآن مجید دیکھکر پڑھتے تھے۔

۲۔ ابراهیم بن سعد عن ابیہ انہ كان یامرہ ان یقوم باهلہ فی رمضان ویامرہ ان یقرأ لهم فی المصحف ویقول اسمعنی صوتك۔

ابراہیم بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس کو حکم دیتے کہ اپنے اہل کو لے کر ماہ رمضان میں قیام کرے اور حکم دیتے کہ قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھے اور فرماتے کہ اتنا بلند آواز سے پڑھے کہ مجھے تیری آواز سنائی دے۔"

۳۔ قتادۃؒ عن سعید بن المسیبؒ فی الذی یقوم فی رمضان ان كان معه ما یقرأ بہ فی نسۃ والا فلیقرأ من المصحف فقال الحسن لیقرأ بهما

معه ویردده ولا یقرأ من المصحف کما تفعل الیهود فقال قتادۃ رح و قول سعید اعجب الیّ۔

قتادہ رح سعید بن مسیب رح سے روایت کرتے ہیں جو شخص رمضان میں قیام کرے اگر اس کو اتنا قرآن مجید یاد ہو کہ ایک رات کے لئے کافی ہو تو بہتر ورنہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھ لے۔ حسن بصری رح نے کہا جو کچھ تھوڑا بہت یاد ہو اس کو بار بار پڑھتا جائے اور یہود کی طرح قرآن مجید میں دیکھ کر نہ پڑھے۔ قتادہ کہتے ہیں میرے نزدیک سعید بن مسیب کا قول زیادہ پسندیدہ ہے"

۴۔ ایوب عن محمد انه کان لا یری بأساً ان یؤم الرجل القوم فی التطوع یقرأ فی المصحف۔

یعنی" ایوب رح محمد بن سیرین رح سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نوافل میں قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے"

۵۔ وقال عطاء فی الرجل یوم فی رمضان من المصحف لا باس به۔

عطا رح کہتے ہیں قرآن مجید میں دیکھ کر امامت کرانا کوئی حرج نہیں۔

۶۔ وقال یحیٰی بن سعید الانصاری رح لا اری بالقراءۃ من المصحف فی رمضان باسا یرید القیام۔

یعنی یحییٰ بن سعید انصاری رح کہتے ہیں کہ رمضان میں قیام کی حالت میں قرآن مجید دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا"

۷۔ ابن وهب سئل مالک عن اهل قریة لیس احد منهم جامعاً للقران اتری ان یجعلوا مصحفا یقرأ لهم رجل منهم فیه فقال لا باس به فقیل له فالرجل الذی قد جمع القران اتری ان یصلی فی المسجد خلف هٰذا الذی یقوم لهم فی المصحف اویصلی فی بیته فقال لا لیصل فی بیته"

یعنی ابن وہب رح کہتے ہیں۔ امام مالک رح سے سوال ہوا کہ ایک گاؤں میں کوئی حافظ قرآن نہیں۔ کیا آپ کے نزدیک درست ہے کہ وہ قرآن مجید آگے رکھیں اور ان سے ایک قرآن مجید دیکھ کر پڑھ کر امامت کرائے۔ فرمایا کوئی حرج نہیں۔ پھر کہا گیا حافظ قرآن میں دیکھ کر پڑھنے والے کی اقتداء کرے یا گھر

میں نماز پڑھے۔ فرمایا گھر میں نماز پڑھے۔"

۸۔ عن احمد فی رجل یؤم فی رمضان فی المصحف فرخص فیہ فقیل لہ یؤم فی الفریضۃ قال و یکون ھذا؟

یعنی امام احمدؒ سے روایت ہے کہ کوئی شخص رمضان میں قرآن مجید دیکھ کر امامت کرائے تو رخصت ہے۔ کہا گیا فرضوں میں بھی امامت کرا سکتا ہے۔ فرمایا فرضوں میں یہ ہوتا ہے؟ یعنی فرضوں میں لمبے قیام کی کیا ضرورت ہے۔ ایک آدھ سورۃ ہی کافی ہے۔

۹۔ وعنہ ایضا و قد سئل ھل یؤم فی المصحف فی رمضان قال ما یعجبنی الا ان یضطر الی ذلک وبہ قال اسحاق رح۔

یعنی امام احمد سے سوال ہوا کیا قرآن مجید دیکھ کر امامت کرائے۔ فرمایا مجھے پسند نہیں مگر بغیر ضرورت کے لئے جائز ہے اور امام اسحاقؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۱) قیام اللیل میں یہ روایت قرآن مجید دیکھ کر امامت کرانے کے متعلق ذکر کی ہے۔ اس کے بعد بعض تابعین وغیرہ سے کراہت نقل کی ہے جن سے ابراہیم نخعی کا قول ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں علماء قرآن مجید دیکھ کر امامت کرانے کو مکروہ سمجھتے تھے کیونکہ اس میں یہود سے مشابہت ہے۔

۲۔ سلیمان بن حنظلہؒ ایک قوم کے پاس سے گذرے۔ ایک شخص قرآن مجید سر پائی پر رکھ کر رمضان میں اُن کی امامت کرا رہا تھا۔ سلیمان حنظلہؒ نے قرآن مجید پرے پھینک دیا۔

۳۔ عامر شعبیؒ نے بھی اس بات کو مکروہ سمجھا کہ نماز کی حالت میں امام قرآن مجید دیکھ کر پڑھے۔

۴۔ سفیانؒ نے کہا رمضان ہو یا غیر رمضان ہو قرآن مجید دیکھ کر امامت مکروہ ہے اس میں اہل کتاب کی مشابہت ہے۔

۵۔ امام ابوحنیفہ سے روایت ہے کہ جو قرآن مجید دیکھ کر امامت کرائے اُس کی نماز فاسد ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے امام ابوحنیفہ کی اس میں مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں نماز ہو جائے گی ہاں یہ فعل مکروہ ہے۔ کیونکہ اس میں اہل کتاب کی مشابہت ہے امام ابوحنیفہؒ کے قول کی بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے۔ کہ قرآن مجید میں دیکھنا یہ عمل کثیر ہے۔ اور عمل کثیر سے نماز فاسد ہو جاتی ہے حالانکہ یہ دیکھنا قرأت کی خاطر ہے اور قرأت نماز میں داخل ہے اور دیکھنا بالتبع ہے جیسے اور اشیاء پر نظر پڑتی ہے۔ پس جو

شخص اس قسم کا ہلکا فعل کرے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے ثابت شدہ فعل کے مشابہ ہو یا اس کے قریب ہو۔ اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اگر حد سے گذر جائے تو فاسد ہو جائے گی اور دیکھ کر پڑھنا ثابت شدہ فعل کے قریب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عَلَم دار لوئی میں نماز پڑھی۔ آپ کا خیال لوئی کی طرف چلا گیا۔ آپ نے نماز ہی میں اُتار دی چونکہ یہ فعل نماز ہی کی خاطر تھا جس سے نماز کا بڑا جزو خشوع قائم رکھنا مقصود تھا۔ اس لئے اس سے نماز میں کوئی خلل نہیں آیا۔ پس امام ابوحنیفہ رح کا نماز کو فاسد کہنا اس کی کوئی وجہ نہیں جس نے مکروہ جانا اُس نے صرف اہل کتاب کی مشابہت سے مکروہ جانا ہے۔ یہ امام محمد بن نصر مروزیؒ کی تحقیق کا خلاصہ ہے۔ اُنہوں نے دونوں فریق کے اقوال سامنے رکھ دئے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے قول میں چونکہ کچھ زیادہ بُعد تھا اس لئے اس کی تردید کردی۔ یہود کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ کہنا بھی کمزور ہے۔ کیونکہ یہود کی مشابہت سے نہی اس بارے میں صراحۃً نہیں آئی۔ صرف ایک عام اُصول من تشبه بقوم فهو منهم کے تحت داخل کرکے اس سے نہی کی جاتی ہے مگر جب اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ نماز کے متعلق رسول اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اتنی تفصیل کی ہے کہ کسی حکم کی اتنی تفصیل نہیں کی، ذرا ذرا سی بات بتادی۔ جس بات میں یہود وغیرہ کی مخالفت کی ضرورت تھی وہ بھی بتادی۔ مثلاً سدل کرنا یعنی سر پر یا کندھوں پر چادر ڈال کر اس کی دونوں طرف لٹکی ہوئی چھوڑ دینا، نماز میں پہلو پر ہاتھ رکھنا۔ جوتوں میں نماز نہ پڑھنا وغیرہ۔ تو اگر قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے میں بھی مخالفت شارع کو مقصود ہوتی تو شارع کی طرف سے اس کے لئے بھی ہدایت ہوتی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھنا اُس عام اُصول کے تحت داخل نہیں۔ خاص کر نوافل میں، خاص کر ضرورت کے وقت کیونکہ یہود کا یہ فعل عام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں حفظ تورات کا رواج نہیں۔ پس جب یہ اُس عام اُصول کے تحت داخل نہ ہوا تو اس وجہ سے اس کو مکروہ کہنا بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اسی لئے قتادہ نے باوجود حسن بصریؒ سے فعل یہود ہونا نقل کرکے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے نزدیک سعید بن مسیب رح کا قول زیادہ پسند ہے اس کے علاوہ جواز کے قائلین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں جو جلیل القدر صحابیہ ہیں اور مکروہ کہنے والے صرف تابعین وغیرہ ہیں۔ پس اس وجہ سے بھی ترجیح جواز ہی کو ہے۔ مولوی محمد حسین مرحوم کا مندرجہ سوال مجھے پہلے بھی پہنچا ہے۔ غالباً وہ اسی بنا پر ہوگا پھر مشکوٰۃ باب الترجل فصل اوّل صفحہ ۳۸۰ میں ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ جس بات میں رسول اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کوئی حکم نہ ہوتا

اس میں اہلِ کتاب کی موافقت درست رکھتے۔ پس اب اپنے طور پر اہلِ کتاب کی مخالفت تجویز کرنا کیوں کر درست ہوگا۔ پس ترجیح اسی کو ہے کہ دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۱۷ رمضان ۱۳۵۵ھ۔ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء

رکوع کی رکعت ہوجاتی ہے تو سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں؟

سوال :۔ رکوع میں شامل ہونے سے اس رکعت کا ہوجانا کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الحمد کے پڑھے بغیر ہی رکعت ہوجاتی ہے۔ کیا امام کے پیچھے الحمد پڑھنا ضروری ہے؟

جواب :۔ رکوع میں رکعت کی بابت سخت اختلاف ہے۔ اس لئے شک سے نکل جانا چاہیے جس کی صورت یہ ہے کہ رکوع کی رکعت پڑھ لے۔ اگر رکوع کی رکعت نہ پڑھے تو دو فرض فوت ہوجاتے ہیں ایک قیام، ایک فاتحہ۔ اور جو لوگ رکوع کے ملنے سے پہلے تھوڑا سا قیام کرکے رکوع میں ملتے ہیں۔ وہ حدیث کا خلاف کرتے ہیں کیونکہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ امام کو جس حالت پر پاؤ مل جاؤ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء

قرأت فاتحہ کے وقت ثنا وغیرہ نہ پڑھی جائے

سوال :۔ جب امام الحمد پڑھ رہا ہو دعا ثنا، سبحانك اللھم وبحمدك کب پڑھی جائے؟

جواب :۔ امام جب جہری قرأت پڑھ رہا ہو تو مقتدی سبحانک اللھم یا کوئی اور دعا نہ پڑھے۔ صرف فاتحہ پڑھے کیونکہ حدیث میں ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ اور کتاب القرأت بیہقی میں ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب خلف الامام۔ یعنی جو شخص امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ واذا قری القرآن فاستمعوا لہ سے مراد فاتحہ کے سوا ہے کیونکہ فاتحہ کو حدیث نے خاص کر دیا۔ نیز یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے نہی کے بارہ میں اتری ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ

التحیات سے پہلے بسم اللہ

سوال :۔ تشہد سے پہلے بسم اللہ پڑھنا ناجائز کیوں ہے؟

محمد رفیق ہیڈ ماسٹر ڈی۔ بی سکول شاہکوٹ براستہ قصور ضلع لاہور

جواب :۔ التحیات سے پہلے بعض روایتوں میں بسم اللہ کا لفظ آیا ہے چنانچہ کشاف القناع عن متن الاقناع جلد اول صفحہ میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ مگر اس کی بابت تشدد نہ چاہیے کیونکہ ابن عباسؓ نے ایک شخص کو پڑھتے دیکھا تو جھڑکا۔ چنانچہ یہ بھی کشاف القناع کے صفحہ مذکور میں نقل کیا ہے۔ اور تلخیص الحبیر کے صفحہ ۱۰۲ پر بھی بسم اللہ پڑھنے کی روایتیں ذکر کی ہیں پھر ان پر بحث کی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ ۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

آمین بالجہر

سوال :۔ ایک مولوی صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا ہے کہ تم جماعت کے ساتھ آمین پکار کر کہتے ہو، ہم یہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین بالجہر کہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے یہ سنت کس وقت ادا کی ہے۔ اور وہ کونسا موقعہ تھا۔ کیا حضورؐ کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ مسلمانو! تم آمین بالجہر کہا کرو۔ اس مسئلہ کی آپ وضاحت فرمائیں۔

جواب : بخاری میں حدیث ہے۔ اذا امن الامام فامنوا۔ یعنی جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو۔ اس حدیث میں آمین کا حکم فرمایا اور بالجہر کہنا بھی ثابت ہو گیا۔ کیونکہ مقتدی جب امام کی آمین پر آمین کہے گا تو سن کر ہی کہے گا ورنہ اس کو کیا پتہ کہ امام نے آمین کہی ہے یا نہیں کہی۔ سو امام کو چاہیئے کہ آمین اونچی کہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین

یعنی جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

اوراس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوسکتے کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آہستہ آمین کہو۔ کیونکہ امام کے آہستہ پڑھنے کی صورت میں مقتدی کو کیسے علم ہوسکتا ہے کہ امام نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کس وقت پڑھا ہے بلکہ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین اُونچی پڑھے تو تم آمین کہو۔ پس ثابت ہُوا کہ آمین امام کو اُونچی کہنی چاہیئے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے صلوا کما رایتمونی اصلی یعنی جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھو۔ اسی طرح نماز پڑھو۔ تو گویا آپ نے فرمایا کہ تم آمین اُونچی کہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑ مدیر تنظیم ۳ ربیع الاوّل ۱۳۵۶ھ ۱۴ مئی ۱۹۳۷ء

مقتدی کا امام کے ساتھ سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کا مسئلہ

سوال: مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ امام کے ساتھ کہے۔ یا ربنا لک الحمد۔ حدیث قولوا ربنا لک الحمد صحیحین کی ہے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہے یہ حدیث دارقطنی کی ہے۔ ان میں تطبیق دے کر افضل فعل سے مطلع فرمایا جائے۔

عبدالرحمن جھنگوی چک نمبر ۲۸۱ رکھ برانچ لائل پور

جواب: دونوں طرح اختیار ہے۔ مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ کہے یا صرف ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیبا مبارکاً فیہ " پر اکتفا کرے۔ کیونکہ احادیث میں دونوں طرح آیا ہے اس لئے عمل دونوں طرح درست ہے۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۱۰ محرم ۱۳۶۰ھ ۷ فروری ۱۹۴۱ء

مقتدی امام کے ساتھ آمین کہے یا الحمد پڑھے

سوال: حکم ہے کہ جب امام آمین کہے تو مقتدی بھی کہے۔ ایک مقتدی اُس وقت جماعت میں شامل ہوا جب امام غیر المغضوب پڑھ چکا تھا تو وہ امام کے ساتھ آمین کہے یا پہلے الحمد پڑھے۔

محمدؐ علی خطیب جامع مسجد جنڈیالہ

جواب: دونوں باتوں پر عمل کرے۔ امام کے ساتھ بھی آمین کہے اور اپنی فاتحہ ختم کرکے بھی آمین

کہے۔ پہلی آمین جو امام کے ساتھ کہتا ہے اُس کی دلیل یہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ امام جب آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ اور دوسری آمین کی یہ دلیل ہے کہ ایک شخص نے بہت عاجزی سے دعا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس نے جنّت کو یا قبولیت دُعا کو اپنے لئے واجب کر لیا اگر ختم کیا۔ ایک شخص نے عرض کی کہ کس چیز کے ساتھ ختم کیا۔ فرمایا آمین کے ساتھ مشکوٰۃ باب القرأۃ فی الصلوٰۃ فصل ۲ حدیث۔ چونکہ فاتحہ بھی دُعا ہے اِس لئے اس کو آمین کے ساتھ ختم کرنا چاہیئے تاکہ قبولیت کے مقام پر پہنچ جائے یا اس کے لئے جنّت واجب ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ پہلی آمین امام کی فاتحہ پر ہے جس کی دلیل پہلی حدیث ہے۔ اور دوسری آمین اپنی فاتحہ پر ہے جس کی دلیل دوسری حدیث ہے۔ اِس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو گیا بلکہ تینوں حدیثوں پر تیسری حدیث جس میں ہے کہ فاتحہ بغیر نماز نہیں۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

۴ شوال ۱۳۵۸ھ - ۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

بعض سورتوں کے آخر میں امام کے سوا مقتدی کا جواب دینا

سوال :۔ قرآن مجید کی جن سورتوں میں جوابات دینا حدیث میں آیا ہے۔ کیا وہ جوابات صرف امام دے یا مقتدی کے لئے بھی جائز اور مستحب ہے۔

جواب :۔ قرآن مجید کی جن سورتوں کے جوابات حدیثوں میں آگئے ہیں وہ جس طرح امام کے لئے جائز اور مستحب ہیں اِسی طرح مقتدی کے لئے بھی جائز و مستحب ہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سامعین کا جواب دینا بہت محبوب تھا۔

چنانچہ مشکوٰۃ باب القرأۃ میں ہے :۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اَصْحَابِہٖ فَقَرَأَ عَلَیْھِمْ سُوْرَۃَ الرَّحْمٰنِ مِنْ اَوَّلِھَا اِلٰی اٰخِرِھَا فَسَکَتُوْا فَقَالَ لَقَدْ قَرَأْتُھَا عَلَی الْجِنِّ لَیْلَۃَ الْجِنِّ فَکَانُوْا اَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِّنْکُمْ کُنْتُ کُلَّمَا اَتَیْتُ عَلٰی قَوْلِہٖ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ قَالُوْا لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

یعنی ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے پاس آئے اور سورہ رحمٰن ساری پڑھی صحابہؓ خاموش سنتے رہے۔ آپ نے فرمایا میں نے سورہ رحمٰن جنوں پر پڑھی تھی۔ جب بھی میں آیت فبای الاء ربکما تکذبان پر پہنچا تو وہ نہایت اچھا جواب دیتے تھے وہ کہتے لا بشئی من نعمك ربنا نکذب فلك الحمد۔ یعنی اے ہمارے رب تیری کوئی ایسی نعمت نہیں جس کو ہم جھٹلا سکیں پس تیرے لئے حمد ہے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت پیاری لگتی تھی کہ سامعین بھی جواب دیں لہٰذا مقتدی کو جواب دینا چاہیئے۔

اِس حدیث میں اگرچہ ضعف ہے مگر امام شافعیؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سامع بھی جواب دے۔ امام شافعیؒ کے استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث قابلِ عمل ہے خاص کر فضائلِ اعمال میں۔ رہی یہ بات کہ نماز غیر نماز میں کوئی فرق ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی سمجھ لینا چاہیئے جیسے امام کی آمین کے ساتھ آمین کہی جاتی ہے کیونکہ سماع قرأت کو مخل نہیں۔ پس اس کا آمین پر قیاس صحیح ہے۔

عبداللہ امرتسری تنظیم اہلحدیث

۱۲ جمادی الاول ۱۳۸۲ھ۔

مقتدی فاتحہ کے علاوہ دوسری قرائت بھی پڑھ سکتا ہے

سوال:۔ مقتدی کو امام کے پیچھے حالتِ قیام میں سورہ فاتحہ کے سوا اور بھی کچھ پڑھنا چاہیئے۔ یا نہیں؟ نیز نوافل موکدہ میں فاتحہ کے بعد ہر رکعت میں کوئی سورۃ ملانی چاہیئے یا نہیں؟

محمد یونس ۸۷۔ای۔بی ڈاکخانہ قبولہ ضلع منٹگمری

جواب:۔ سری نمازمیں پڑھ سکتا ہے۔ جہری میں ممانعت آئی ہے۔ مشکوٰۃ۔ حنفیہ کے نزدیک ضروری نوافل میں ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک جائز ہے ضروری نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی یکم جمادی الاول ۱۳۸۳ھ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

کم سے کم قرائت کا مسئلہ

سوال:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں کم ازکم تین آیات ضروری ہیں۔کیاان کا یہ قول درست ہے۔؟

جواب:۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں کم ازکم تین آیتیں ضروری ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں میں پہلی رکعت میں آیت کریمہ قولوا امنّا باللہ وما انزل الینا پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا پڑھتے تھے۔ایک اور روایت میں ہے کہ ساری رات آپ نے ایک آیت کے ساتھ قیام کیا (مشکوٰۃ قیام اللیل) یہ اگرچہ نفلوں میں ہے لیکن فرضوں نفلوں میں اس میں کوئی فرق ثابت نہیں۔ بلکہ کئی احادیث اس قسم کی آئی ہیں کہ صرف فاتحہ ہی کافی ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے عربی رسالہ جواب فصل الخطاب کے صلا۱ و صلا۲ میں اِن روایتوں کا ذکر کیا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۶ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ۔ ۹ اگست ۱۹۳۳ء

رکوع کا بیان

سوال:۔ رکوع کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اس میں تسبیح کتنی مرتبہ پڑھنی چاہیئے۔؟

جواب:۔ رکوع کو جاتے وقت اللہ اکبر کہتا ہوا ہاتھ اٹھائے جیسا کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھائے تھے۔ رکوع کو جائے اور کمر کو اچھی طرح جھکائے۔ رکوع میں سر کو بہت نیچا نہ کرے اور نہ اونچا کرے بلکہ کمر کے برابر سیدھا رکھے۔ دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر اچھی طرح جگہ دے۔ گھٹنوں کو پکڑے اور انگلیوں کو کشادہ رکھے اور کہنیوں کو پہلوؤں سے دور کر کے اس طرح تن کر رکھے کہ گویا چِلّہ کمان ہے اور ہاتھ تندی۔ رکوع میں سبحان ربی العظیم کہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں سبحانك اللّٰھمّ ربّنا وبحمدك اللّٰھم اغفرلی بھی کہتے ۔ بعض دعائیں اور بھی آئی ہیں۔ اگر کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع۔ سجدہ دس تسبیح قدر ہوتا تھا۔ اور ایک ضعیف روایت میں سبحان ربی العظیم کم ازکم تین مرتبہ بھی آیا ہے۔ حضرت علی رضہ فرماتے ہیں کہ اگر مجبوری ہو تو تسبیح ایک مرتبہ بھی کافی ہے۔

رکوع کی رکعت

سوال:۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں رکوع کی رکعت نہ ہونے کو ترجیح دی ہے۔ مگر انہوں نے

اپنے فتاویٰ" الفتح الربانی" میں جمہور کے مذہب کو ترجیح دی ہے کہ رکوع میں رکعت ہوجاتی ہے۔ اور اس بارہ میں انہوں نے مرفوع روایات بھی بیان کی ہیں۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

(ایک سائل)

جواب :۔ علامہ شوکانی رحہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بنا انہوں نے حسب ذیل حدیث ابوہریرہ رضہ پر رکھی ہے۔

مَنْ اَدْرَكَ مَعَ الْاِمَامِ رَكْعَةً قَبْلَ اَنْ يُّقِيْمَ صُلْبَهٗ فَقَدْ اَدْرَكَهَا ۔

یعنی جو شخص امام کے پیچھے پیٹھ سیدھا کرنے سے پہلے امام کے ساتھ رکعت پالے اس نے رکعت پالی۔

اس حدیث کو ابی عدی اور بیہقیؒ نے ضعیف کہا ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب العمال جلد ۳ ص۲۵۶۔ نیز اس حدیث کے راوی ابوہریرہ رضہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔

حافظ ابن حجر رحہ تلخیص میں لکھتے ہیں۔

حديث ابى هريرة من ادرك فى الركوع فليركع معه وليعد الركعة البخارى فى القرأة خلف الامام من حديث ابى هريرة انه قال اذا ادركت القوم ركوعا لم يعتد بتلك الركعة و هو المعروف موقوف واما المرفوع فلا اصل له

(تلخيص الحبير ص۱۲۷)

یعنی ابوہریرہ رضہ فرماتے ہیں جو شخص امام کو رکوع میں پائے تو اس کے ساتھ رکوع کرے اور اس رکعت کو لوٹائے۔ امام بخاری رحہ نے جزء القرأۃ میں اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ جب تو جماعت کو رکوع میں پائے تو اس کا اعتبار نہیں۔

جب حضرت ابوہریرہ راوی حدیث رکوع میں رکعت کے قائل نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ روایت ٹھیک نہیں۔ ورنہ صحابیؓ سے یہ بعید ہے کہ راوی ہو کر صریح حدیث کا خلاف کرے۔

رکوع رکعت کے بارہ میں بعض لوگ ابوبکرہ کی حدیث بیان کرتے ہیں۔ جو ابوداؤد میں ہے وہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحہ معرفت میں ابوبکرہؓ کی حدیث پر لکھتے ہیں۔

ؔ ابوبکرہ کی حدیث وہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابوبکرہ رضہ نے صف سے ورے رکوع کر لیا اور اسی حالت میں چل کر صف میں مل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد فرمایا اللہ تیری حرص زیادہ کرے آئندہ ایسا نہ کرنا (مشکوٰۃ باب الموقف)

وفی ذالک دلالة علی ادراک الرکعة بادراک الرکوع وقد روی صریحا عن ابن مسعود وزید بن ثابت وابن عمر وفی خبر مرسل عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم وفی خبر موصول عنہ غیر قوی اما المرسل فرواہ عبد العزیز بن رفیع عن رجل عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم واما الموصول فاخبرناہ ابو عبد اللہ الحافظ قال اخبرنا الحسین بن الحسین بن ایوب قال حدّثنا ابو یحیٰی بن میسرة قال حدثنا ابن ابی مریم قال حدثنا نافع بن یزید قال حدثنا یحیٰی بن ابی سلیمان عن زید بن ابی عتاب وسعید بن ابی سعید المقبری عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جئتم الی الصّلوٰة ونحن سجود فاسجدوا ولا تعدوھا شیئا ومن ادرک الرّکعة فقد ادرک الصلوٰة تفرد بہ یحیٰی بن ابی سلیمان ھذا ولیس بالقوی (التعلیق المغنی علی سنن دارقطنی ص۱۳۱)

یعنی ابو بکرہ رضؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رکوع میں ملنے سے رکعت ہو جاتی ہے ۔ اور ابن مسعودؓ زید بن ثابت اور ابن عمر رضؓ کا صریح فتویٰ اس کی بابت مروی ہے اور ایک مرسل حدیث اور ایک موصول غیر قوی حدیث بھی اس کی بابت آئی ہے ۔ مرسل حدیث کو عبد العزیز بن رفیع نے ایک شخص سے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور موصول حدیث ابوہریرہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کو آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو اس کو کچھ نہ سمجھو اور جو رکعت پالے اس نے نماز پالی ۔ اس حدیث کی اسناد میں یحیٰی بن ابی سلیمان راوی ہے جو قوی نہیں ۔

اِس عبارت میں امام بیہقی نے یحیٰی بن ابی سلیمان کے ضعف کی تصریح کی ہے ۔ پس علاّمہ ذہبی کا یہ کہنا کہ کسی امام کی جرح اس پر مذکور نہیں یہ ٹھیک نہیں ۔ ہاں امام بیہقی نے جرح مفسر نہیں کی یعنی ضعف کی وجہ نہیں بتائی مگر اس کے مقابلہ میں کوئی زبردست توثیق بھی نہیں کی اس لئے اِس حدیث کی صحت کوئی پوری تسلی بخش نہیں ۔ اس کے علاوہ ابوہریرہ رضؓ اِس حدیث کے راوی اس کے خلاف ہیں ۔ چنانچہ ابھی گزرا ہے نیز رکعت بمعنی رکوع لینا خلاف ظاہر ہے ۔ بڑی دلیل اس حدیث میں رکعت سے رکوع مراد ہونے کی یہ پیش کی جاتی ہے کہ رکعت سجدہ کے مقابلہ میں ہے لیکن عبد العزیز بن رفیع کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ایک شخص سجدہ میں آکر شامل ہوا تھا تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجدہ کو کچھ

نہ سمجھو۔ گویا سجدہ کا ذکر رکعت سے مقابلہ کے طور پر نہیں بلکہ موقعہ ومحل کے لحاظ سے ہے اور رکعت اپنے معنیٰ پر ہے۔

عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کا جواب بھی یہی ہے۔ مولوی انور شاہ نے فصل الخطاب میں عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث سے رکوع میں رکعت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ہم نے اس کا جواب یہی دیا ہے کہ سجدہ کا ذکر موقع ومحل کے لحاظ سے ہے اور رکعت اپنے معنیٰ پر ہے۔ آپ نے بیہقی سے عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کی دو سندیں ذکر کی ہیں۔ پھر دونوں سندوں کے راویوں کی توثیق کی ہے۔ لیکن دونوں سندوں میں ایک ایک راوی چھوڑ دیا ہے۔ اس کی توثیق نہیں کی۔ پہلی سند میں محمد بن احمد بالویہ کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ اور دوسری سند میں ابوطاہر فقیہ کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ مولوی انور شاہ نے اس کو مطالب عالیہ سے ایک اور سند سے ذکر کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی نقل کی ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں :۔

(فیہ مرفوع قال الحافظ فی المطالب العالیۃ قال مسدد حدثنا یحیی عن سفیان حدثنی عبدالعزیز بن رفیع عن شیخ من الانصار قال ان رجلا دخل المسجد فسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفق نعلیہ فلما سلم قال کیف ادرکتنا قال سجودا فسجدت قال کذالک فافعل ولا تعتدوا بالسجدۃ مالم تدرکوا الرکعۃ فاذا رایتم الامام قائما فقوموا او راکعا فارکعوا و ساجدا فاسجدوا وجالسا فاجلسوا صحیح وھو عندنا اخرین ایضا وانما نقلہ عن المطالب لتصحیحہ ایاہ وما قالہ البیھقی فی المعرفۃ انہ مرسل فانہ یرید مالم یسم صحابیہ (فصل لا یعلم من الصحابۃ لمؐ ص۳)

رکوع میں رکعت ہونے کی بابت ایک مرفوع حدیث آئی ہے۔ حافظ رحمہ اللہ نے مطالب عالیہ میں کہا ہے مسدد بن مسرہد کہتے ہیں ہمیں یحیٰی بن سعید قطان نے حدیث سنائی ہے انہوں نے کہا ہمیں سفیان بن عیینہ نے حدیث سنائی ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں عبدالعزیز بن رفیع نے حدیث سنائی ہے وہ ایک شیخ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جوتوں کی آواز سنی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا تو نے ہمیں کس حالت میں پایا؟ کہا سجدہ میں پس میں نے

سجدہ کیا۔ فرمایا اس طرح کیا کرا اور سجدہ کو شمار میں نہ لاؤ جب تک رکعت نہ پاؤ۔ جب امام کو قیام کی حالت میں پاؤ تو قیام میں شامل ہوجاؤ۔ اگر رکوع میں پاؤ تو رکوع میں شامل ہوجاؤ۔ اگر سجدہ میں پاؤ تو سجدہ میں شامل ہوجاؤ۔ اگر بیٹھے پاؤ تو بیٹھ جاؤ۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث اور محدثین نے بھی ذکر کی ہے۔ لیکن میں نے اس کو مطالب عالیہ سے اس لئے نقل کیا ہے کہ حافظ نے مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہا ہے۔ اور بیہقی کا معرفہ میں اس کو مرسل کہنا اس سے مراد ہے کہ صحابی کا نام نہیں لیا گیا میں نے اس کا جواب الکتاب المستطاب فی جواب فصل الخطاب میں لکھا ہے۔

قوله۔ ولا تعتدوا بالسجدة مالم تدركوا الركعة الخ ذكر السجدة باعتبار المورد والركعة على معناها قوله مالم يسم صحابيه الخ هذا ليس معنى الارسال ثم لم يعلم ان الشيخ الذى لم يسم صحابى اولا فتامل فيه (الكتاب المستطاب ص٢٥٧۔ ص٢٥٨)

یعنی سجدہ کا ذکر موقع و محل کے لحاظ سے ہے اور رکعت اپنے معنی پر ہے اور بیہقی کے کلام میں مرسل سے یہ مراد لینا کہ اس کے صحابی کا نام نہیں لیا گیا۔ یہ مرسل کا معنی نہیں (مرسل کا معنی یہ ہے کہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے اور صحابی کا ذکر چھوڑ دے) پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شخص انصاری جس کا نام نہیں لیا گیا صحابی ہے یا نہیں اس میں تامل کر۔ ہمارے اس اخیر کے فقرے (اس میں تامل کر) سے اس طرف اشارہ ہے کہ ظاہر عبارت سے صحابی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ پورا اطمینان نہیں دوسرے ایک اور روایت کی طرف اشارہ ہے جس میں تصریح ہے کہ یہ شخص انصاری صحابی ہے۔

عون المعبود میں ہے۔

اخرج ابن ابی شيبة عن عبد العزيز بن رفيع عن رجل من اهل المدينة من الانصار عن النبى صلى الله عليه وسلم انه سمع خفق نعلى وهو ساجد فلما فرغ من صلوته قال من هذا الذى سمعت خفق نعليه فقال انا يا رسول الله قال فما صنعت قال وجدتك ساجدا فسجدت فقال هكذا فاصنعوا ولا تعتدوا بها من وجدنى راكعا او قائما او ساجدا ولكن معنى على حالتى التى انا عليها۔ (عون المعبود جلد اول ص٣٣٥)

ابن ابی شیبہ نے عبدالعزیز بن رفیع سے روایت ذکر کی ہے وہ ایک شخص انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے کی حالت میں میرے جوتے کی آواز سُنی ؟ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا وہ کون شخص تھا جس کے جوتے کی میں نے آواز سُنی ؟ کہا یا رسول اللہ میں ہوں ۔ فرمایا تو نے کیا کیا ؟ کہا میں نے آپ کو سجدہ میں پایا پس سجدہ کیا ۔ فرمایا اسی طرح کرو ۔ اور سجدہ کو شمار میں نہ لاؤ جو مجھے رکوع میں یا قیام میں یا سجدے میں پائے تو میرے ساتھ اسی حالت میں شامل ہو جائے جس حالت پر میں ہوں

اِس روایت میں تصریح ہے کہ یہ شیخ انصاری صحابی ہے کیونکہ یہ واقعہ اسی کا ہے ۔ اور اسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں پایا ہے ۔ اب بیہقی کا اس کو مرسل کہنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ بیہقی کو یہ روایت معلوم نہیں ہُوئی ۔ یا یہ روایت صحت کو نہیں پہنچی یا صحابی کا مجہول ہونا ہی ان کے نزدیک صحت کو مانع ہو اس لئے انہوں نے شیخ انصاری کے ذکر کو کالعدم قرار دے کر حدیث پر مرسل ہونے کا حکم لگا دیا ۔ اور صرف صحابی کا نام نہ ذکر ہونے سے مرسل کہنا جیسے انور شاہ کا خیال ہے ۔ یہ ٹھیک نہیں ۔ کیونکہ نہ تو یہ مرسل کا معنی ہے نہ اس کی یہ مراد ہے ۔ بلکہ مرسل سے مُراد ان کی موصول[1] کے مقابلہ میں ہے ۔ چنانچہ التعلیق المغنی کے حوالہ سے امام بیہقی کی عبارت گذر چکی ہے جس میں اُنہوں نے مرسل کو موصول کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے ۔ اور چونکہ ابن ابی شیبہ کی روایت کی صحت میں ہمیں بھی شُبہ ہے اِس لئے ہم نے اس میں تامل کر کے ، فقرے پر اکتفا کی اور کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ موصول ہے یا مرسل ہے اگر واقعی مرسل ہے تو حافظ صاحب کا اس کو صحیح کہنا اس سے صرف اسناد کی صحت مراد ہوگی ۔ اور اگر موصول ہو تو حدیث بلاشک وشُبہ صحیح ہوگی لیکن اس حدیث کے معنی میں شُبہ ہوگا کہ رکعت سے مراد رکوع ہے یا رکعت ہے ۔ ظاہر یہی ہے کہ رکعت سے رکعت ہی مُراد ہے جس میں کئی وجہیں ہیں ۔ ایک یہ ہے کہ رکعت کو رکوع کے معنی میں لینا تاویل ہے جو بغیر دلیل کے درست نہیں ۔ اور بیہقی کی جس روایت میں رکوع کی تصریح ہے اُس کی صحت معلوم نہیں ۔ نیز اس روایت بالمعنیٰ کا احتمال ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی راوی نے رکعت کے معنی رکُوع کے سمجھ کر رکعت کی جگہ رکوع کا لفظ بول دیا ہو ۔ چنانچہ روایت کا اختلاف بتلا رہا ہے اور اُس کی تائید اس سے بھی ہو سکتی ہے کہ ابو ہریرہ رضؓ کی حدیث جو اسی کے قریب ہے ۔ اِس لئے رکعت بمعنی رکوع لینا صحیح نہیں کیونکہ ابو ہریرۃؓ اس کے خلاف ہیں ۔ پس اس حدیث کا

---

[1] موصول وہ حدیث ہے جس میں کوئی راوی (صحابی وغیرہ) چھوٹا ہوا نہ ہو ۔ ۱۲

معنی اس کے موافق ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ رکوع میں رکعت ہونے کی نسبت کوئی تسلی بخش دلیل نہیں۔ اور ادھر دو فرض (قیام اور سورۂ فاتحہ) چھوٹے تھے تو پھر انسان اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالے۔ ہاں عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ سے رکوع میں رکعت ہونے کی تصریح ہے۔ وہاں ان سے صف کے ورے رکوع کر کے صف میں شامل ہونے کا بھی ذکر ہے جیسے التعلیق المغنی کے ص۱۳۱ میں بحوالہ بیہقی ذکر کیا ہے حالانکہ صف کے ورے رکوع ہونا منع ہے۔ چنانچہ پرچہ تنظیم اہل حدیث یکم اگست ۱۹۳۳ء میں مولوی احمد حسین کا مفصّل مضمون اس کی بابت درج ہو چکا ہے ہاں رکوع میں رکعت ہونے کے مسئلہ میں فریقین کے لئے تشدد مناسب نہیں کیونکہ یہ اختلاف سلف کی حدود میں ہے۔ واللہ الموفق عبداللہ امرتسری

۲۴ر جمادی الاول ۱۳۵۲ھ۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

تعاقب:۔ محدث روپڑیؒ نے جو جواب دیا ہے اس پر مولوی عبدالجلیل سامرودی نے تعاقب کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

محدث روپڑی نے فرمایا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ جو راوی حدیث ہیں وہ خود رکوع کی رکعت کے قائل نہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت ٹھیک نہیں۔

مولوی عبدالجلیل صاحب نے تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے راوی کا اپنی روایت کردہ روایت کے خلاف عمل کرنا فتویٰ دینا روایت کا مجروح۔ غیر مستند منسوخ حسن ظن راوی پر کرتے ہوئے قرار دینا محدثین کا مسلک نہیں ہے بلکہ مقلدین حنفیہ کا یہ مذہب ہے۔ چنانچہ امام حازمی ناسخ منسوخ ص۸ میں بعد علامات نسخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وعند الکوفیین زیادات اخر نحو حسن الظن بالراوی۔

یعنی علامات نسخ میں کوفیوں نے حسن ظن راوی کو بھی بڑھایا ہے۔

طحاوی نے کتے کے منہ ڈالے برتن کو سات بار دھونے کی حدیثوں کو ابوہریرہ رضؓ کے قول تین بار دھونے سے منسوخ قرار دیا ہے۔

فاضل شوکانی نے ارشاد الفحول میں بیان کیا ہے۔

ولا یقدح (ای الخبر) عمل الراوی بخلافہ خلافا للجمہور والحنفیۃ

ولبعض المالكية لانا متعبدون بما بلغ الينا من الخبر ولم نتعبد بما فهمه الراوي ولم يات من قدم عمل الراوي على رواية بحجة تصلح للاستدلال بها۔

یعنی عمل راوی کا حدیث کے خلاف ہو تو اس سے حدیث میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ برخلاف جمہور حنفیہ کے اور بعض مالکیہ کے۔ کیونکہ ہم حدیث پر عمل کے مامور ہیں نہ اس کے مقابلہ میں فہم راوی پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ اور جس نے عمل راوی کو حدیث پر مقدم کیا ہے اُس کے پاس کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں الخ

ماحصل یہ ہے کہ راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کو ضرر نہیں پہنچاتا۔ اور اس سے حدیث میں کسی قسم کی خامی نہیں آسکتی۔ اور نہ ہی اس کے عموم کا مخصص ہوسکتا ہے۔ اُمید ہے اس سے رجوع فرمائیں گے۔

محدثؒ روپڑی کا جواب

مولوی عبدالجلیل صاحب نے میرے مضمون کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ اس حدیث ابوہریرہؓ کو جس میں رکوع کی رکعت کا ذکر ہے ابن عدی اور بیہقی نے ضعیف کہا ہے۔ منتخب الکنز العمال جلد ۳ ص ۲۵ اس کے بعد اس کی تائید میں میں نے لکھا ہے کہ علاوہ ازیں اس حدیث کے راوی ابوہریرہؓ کا فتوے اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں جو شخص امام کو رکوع میں پائے تو اُس کے ساتھ رکوع کرے اور اس رکعت کو لوٹائے۔ تلخیص الحبیر ص ۱۲۷۔

جب ابوہریرہؓ راوی حدیث رکوع میں رکعت کے قائل نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ روایت ٹھیک نہیں میری اس عبارت کا مطلب واضح ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی مخالفت سے اس حدیث کے ضعف کو تقویت ہوگئی۔ اور ظاہر ہے کہ ضعیف حدیث کسی کے نزدیک قابلِ حجت نہیں۔

مولوی عبدالجلیل نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے اور اس صورت میں راوی اس کا خلاف کرے تو صرف اتنے سے یہ حدیث منسوخ یا متروک نہیں ہوگی۔ بتلایئے یہ میرے مضمون پر تعاقب ہے یا اپنی طرف سے نئے مضمون کی طرح ہے۔ مولوی عبدالجلیل صاحب آپ تو ماشاء اللہ سمجھدار آدمی ہیں پھر اتنی بے احتیاطی کیوں کرتے ہیں۔ خدا آپ کے علم و عمل میں برکت دے۔ آپ اعتراض جمانے کی بجائے سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس سے انشراحِ صدر حاصل ہوتا ہے۔ دیکھئے جلد بازی میں آپنے

معمولی بات میں کیسی ڈبل غلطی کی ہے۔

علاوہ ازیں راوی کے مخالف ہونے کی صورت میں حدیث کو منسوخ یا متروک کہنا یہ بے شک حنفیہ وغیرہ کا مذہب ہے لیکن اہل حدیث بھی ایسے موقعہ پر ایسے دلیر نہیں کہ بے دھڑک قول صحابی کو چھوڑ دیں آپ خیال نہیں کرتے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے مسئلہ میں اکثر متقدمین کیا مسلک رکھتے ہیں۔ ائمہ اربعہ رح اور جمہور اسی کے قائل ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہوتی ہیں۔ حالانکہ مسلم کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہوتی ہے۔

آئمہ اربعہ رح اور جمہور تین طلاق واقعہ ہونے کے قائل کیوں ہوئے؟ بڑی وجہ اس کی یہی ہے کہ راوی حدیث ابن عباس رض کا فتویٰ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل حدیث قول صحابی رض کو بے دھڑک نہیں چھوڑتے۔ ہاں قول صحابی اور اس کی حدیث میں موافقت کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ قول صحابی بشرط صحت حقیقت میں اس کی روایت کردہ حدیث کے مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک مجلس کی تین طلاق کی بابت ہم نے ابن عباس رض کے قول اور حدیث مرویہ کے ساتھ کئی طرح پر کر دی ہے۔ رہا ابوہریرہ رض کا فتویٰ کہ جس برتن میں کتا منہ ڈال دے اُس کو تین دفعہ دھویا جائے۔ حالانکہ ان سے مرفوع روایت آئی ہے کہ سات دفعہ دھونے سے پاک ہوتا ہے تو اس کی بابت عرض ہے کہ ابوہریرہ رض سے دو طرح کا فتویٰ روایت کیا گیا ہے ایوب نے محمد بن سیرین کے واسطہ سے ابوہریرہ رض سے سات کا فتویٰ روایت کیا ہے اور عبدالملک بن ابی سلیمان نے عطاء کے واسطہ سے تین کا فتویٰ ذکر کیا ہے۔ فتح الباری جز اول ص۱۳۹ میں ہے وھو دون الاول فی القوۃ بکثیر یعنی یہ دوسری سند پہلی سے قوت میں بہت کم ہے کیونکہ عبدالملک اگرچہ ثقہ ہے۔ لیکن غلطیاں کرتا ہے۔ تقریب میں ہے صدوق لہ اوھام یعنی سچا ہے لیکن وہمی ہے اور اصول کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک ثقہ اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت کرے تو اس کی وہ روایت شاذ ہوتی ہے تو اس بنا پر عبدالملک کی روایت شاذ ہوئی۔ اور شاذ ضعیف کی قسم ہے پس تین کا فتویٰ ضعیف ہوا۔ اس لئے بیہقی اپنی کتاب معرفہ میں لکھتے ہیں۔

لم یروہ غیر عبدالملک وعبدالملک لا یقبل منہ ما یخالف فیہ الثقات و عبدالملک تفرد بہ من بین اصحاب عطاء ثم اصحاب ابی ھریرۃ و

لمخالفته اهل الحفظ والثقة فی روایاته ترکه شعبة بن الحجاج ولم یحتج به محمد بن اسمٰعیل البخاری فی صحیحه (التعلیق المغنی علی دارقطنی صـ۲۴)

یعنی تین کا فتویٰ صرف عبدالملک نے روایت کیا ہے اور عبدالملک جس بات میں ثقوں کی مخالفت کرے۔ اس کی وہ بات مقبول نہیں۔ اس نے اس روایت میں عطاء اور ابوہریرہؓ کے تمام شاگردوں کی مخالفت کی ہے اور کئی روایات میں اس قسم کی مخالفت کی وجہ سے شعبہؒ نے اس کو ترک کر دیا ہے اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس سے حجت نہیں پکڑی یعنی اس کی روایت کو قابل استدلال نہیں سمجھا۔

جب عبدالملک کئی روایتوں میں مخالفت اور اغلاط کی وجہ سے محلِ اعتراض ہو گیا۔ اور اس کی روایت شاذ ہو گئی تو اب ابوہریرہ کا وہی فتویٰ درست رہا جو حدیث کے موافق ہے۔

ایک اور جواب

اور یہ بھی احتمال ہے کہ ابوہریرہ رضؓ نے تین کا فتویٰ نہ دیا ہو بلکہ عملی غلطی کی ہو مگر دیکھنے والے نے ان کا مذہب سمجھ کر نقل کر دیا۔ اور ایسا اتفاق بہت دفعہ ہو جاتا ہے۔ دیکھئے مشکوٰۃ میں ہے کہ عمارؓ نے مدائن شہر میں امامت کرائی اور وہ ایک چبوترے پر کھڑے ہوئے اور لوگ نیچے تھے۔ حذیفہؓ نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا یہانتک کہ عمار رضؓ کو چبوترے سے نیچے اُتار دیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حذیفہؓ نے فرمایا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا کہ امام کو مقتدیوں سے بلند جگہ پر نہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ عمار نے فرمایا سُنا ہے۔ اس لئے جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو میں آپ کے پیچھے ہو لیا۔ یعنی نماز کی نیت باندھنے کے وقت مجھے خیال نہیں رہا۔ جب آپ نے ہاتھ کھینچا تو یاد آگیا۔ (مشکوٰۃ)

ہو سکتا ہے ابوہریرہؓ سے بھی اس طرح کی غلطی ہو گئی ہو۔ خاص کر جب عبدالملک کی روایت میں اختلاف ہے کبھی وہ قول نقل کرتا ہے اور کبھی فعل۔ چنانچہ بیہقی نے اپنی کتاب معرفہ میں لکھا ہے۔

وحدیثه هذا مختلف علیه فروی عنه من قول ابی هریرة وروی عنه من فعله (مغنی علی دارقطنی صـ۲۵)

یعنی عبدالملک کے شاگرد مختلف ہیں۔ کوئی عبدالملک سے ابوھریرہ کا قول نقل کرتا ہے کوئی فعل۔

پس عبدالملک کی روایت کو اس صورت پر محمل کرنا مناسب ہے جس سے وہ صحیح حدیث کے موافق ہو جائے۔ سو وہ صورت یہی ہے کہ روایت اصل میں ابوہریرہ رضؓ کا فعل ہے جو عمار بن یاسر رضؓ کی طرح عملی غلطی ہے خلاصہ یہ کہ اول تو حدیث صحیح نہیں۔ دوم حدیث کے راوی ابوہریرہ رضؓ اس کے خلاف ہیں۔ سوم رکعت بمعنی رکوع لینا خلاف ظاہر ہے۔ مولوی عبدالجلیل صاحب نے ان جوابوں پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوہریرہ کی حدیث میں یحییٰ بن ابی سلیمان راوی ضعیف نہیں ثقہ ہے۔ ابن حبان۔ ذہبی۔ ابن خزیمہ۔ حاکم۔ ابوداؤد۔ منذری ان جلیل الشان محدثین کی بات کو محو کر دینا اہل تحقیق کی شان سے بعید ہے اس سے امام بخاری خلق افعال میں اور ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی روایت کرتے ہیں۔ مولوی عبدالجلیل نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ (محدث روپڑی) کا یہ فرمانا درست نہیں کہ سجدہ کا ذکر رکعت کے مقابلہ کے طور پر نہیں بلکہ موقع محل کے لحاظ سے ہے۔ اس لئے کہ اصولیین کا مقولہ ہے العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب۔ یعنی اعتبار عام لفظ کا ہے خاص سبب کا نہیں۔ امام بیہقی نے سنن میں مطالب عالیہ ہی کی سند سے روایت کیا ہے یعنی سفیان سے اخیر تک اس کے الفاظ یہ ہیں۔ اذا جئتم والامام راکع فارکعوا وان کان ساجدا فاسجدوا ولا تعتدوا بالسجود اذا لم یکن معہ الرکوع وفی روایۃ بالسجدۃ اذا لم تدرکوا الرکعۃ۔ یعنی جب تم نماز کو آؤ اور امام رکوع میں ہو تو رکوع کرو۔ اگر سجدہ میں ہو تو سجدہ کرو۔ اور سجدہ کو کچھ شمار نہ کرو جب تک اس کے ساتھ رکوع نہ ہو۔ اور ایک روایت میں ہے سجدہ کا اعتبار نہ کرو جب تک رکعت نہ پاؤ۔

اگر واقعی ایسا ہوتا جیسا آپ فرماتے ہیں تو ائمہ محدثین مثل ابوداؤد۔ نسائی رحمہ وغیرہ اس حدیث سے استدلال پر جرأت نہ کرتے وغیرہ وغیرہ۔

جواب۔

محدث روپڑی رحؒ نے فرمایا کہ مولوی عبدالجلیل صاحب نے اس عبارت میں دو اعتراض کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یحییٰ بن ابی سلیمان ضعیف نہیں ثقہ ہے۔ فلاں فلاں نے اس کو ثقہ کہا ہے اور اس کی حدیث حجت کے لائق ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کا واقعہ اگرچہ ایک خاص شخص کا ہے جو سجدہ میں آکر شامل ہوا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہدایت فرمائی تھی مگر اعتبار عموم کا لفظ ہے۔ یہ حکم اوروں کو بھی شامل ہے۔ ایک شخص کے ساتھ خاص نہیں۔ پس جو شخص امام سے رکوع کی حالت میں ملے اس کی رکعت ہو جائے گی۔ اور فلاں فلاں محدث نے اس حدیث کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اور اس لئے

انہوں نے رکوع کی رکعت ہونے پر اپنی اپنی کتاب میں باب باندھے ہیں۔

یہ مولوی عبدالجلیل کے دونوں اعتراضوں کا خلاصہ ہے لیکن مولوی عبدالجلیل نے پہلے اعتراض میں اُصول کی مخالفت کی ہے۔ اور دوسرا اعتراض کرتے وقت میری بات کو نہیں سمجھے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ محدثین کا اصول ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے یحییٰ بن ابی سلیمان کو اگرچہ بعض نے ثقہ کہا ہے لیکن بیہقی نے اس کو ایک جگہ غیر قوی کہا ہے اور ایک جگہ ضعیف۔ اور امام بخاریؒ نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے۔ امام بیہقی رح معرفہ میں لکھتے ہیں۔

تفرد به یحیٰی بن ابی سلیمان ولیس بالقوی (مغنی علی دارقطنی ص۱۳۲)

یعنی صرف یحییٰ بن ابی سلیمان اس حدیث کا راوی ہے اور وہ قوی نہیں۔

اور سنن کبریٰ میں امام بیہقی، ابُوداؤد والی حدیث ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

وقد روی باسناد اضعف من ذالك عن ابی هریرةؓ (سنن کبریٰ بیہقی جلد۲ ص۸۹)

یعنی اس حدیث کی ایک اور سند بھی ہے جو یحییٰ بن ابی سلیمان سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔

نیز سنن کبریٰ میں لکھتے ہیں۔

قال ابواحمد وحدّثنا الجنیدی حدثنا البخاری قال یحیٰی بن سلیمان المدنی عن ابن المقبری و ابن ابی عتاب منکرالحدیث قال الشیخ وقد روی باسناد مرسل۔ (سنن کبریٰ بیہقی جلد۲ ص۸۹)

یعنی امام بخاریؒ کہتے ہیں یحییٰ بن ابی سلیمان مدنی جو ابن مقبری اور ابن ابی عتاب سے روایت کرتا ہے منکر الحدیث ہے۔ یعنی باوجود ضعیف ہونے کے ثقوں کی مخالفت کرتا ہے۔

امام بخاریؒ نے یحییٰ بن ابی سلیمان پر جرح مفسّر کی ہے پس بہ قاعدہ اُصول یہ جرح دُوسرے عُلماء کی تعدیل پر مقدم ہوگی پھر تعدیل کرنے والوں سے امام ذہبیؒ کہتے ہیں کہ ہمیں اس میں کوئی جرح معلوم نہیں ہوتی۔

لہ اس سند میں یحییٰ بن حمید ہے جو قرہ بن عبدالرحمٰن کا شاگرد ہے یہ مجہول ہے اس پر اعتماد نہیں۔ امام بخاری نے کہا اس کی متابعت نہیں کی جاتی اور دارقطنی نے اس کو ضعیف کہا (جزء القراۃ) اور قرہ بن عبدالرحمٰن پر بھی بہت جرح ہے امام احمدرح نے اس کو سخت منکر الحدیث کہا ہے اور یحییٰ نے ضعیف الحدیث اور ابوحاتم نے لیس بقوی کہا ہے۔

چنانچہ ذہبی کی بعض عبارتوں میں اس کی تصریح ہے۔ اپنی مختصر میں مستدرک حاکم پر ایک جگہ لکھتے ہیں۔
ثقة (جلد اوّل ص۲۶۵) یعنی یحییٰ ثقہ ہے۔ اور ایک جگہ لکھتے ہیں لم یذکر بجرح (جلد اوّل ص۲۷۴)
یعنی جرح کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اسی بنا پر ابن خزیمہؒ نے اس کی روایت کی ہے کیونکہ ان کو بھی اس میں
جرح معلوم نہیں ہوئی اور ابن حبان کا ثقات میں شمار کرنا بھی اسی بنا پر ہے۔ کیونکہ ابن حبان رحؒ کا تساہل مشہور
ہے یعنی ذرا سے سہارے پر ثقوں میں شمار کر لیتے ہیں۔ ابوداؤد اور منذری کا سکوت بھی اسی بنا پر ہوسکتا ہے
پس جس شخص کو کوئی جرح معلوم نہیں ہوتی وہ اس سے بے علم رہا۔ اور دوسرے کو علم ہوگیا۔ پس علم والے کی بات
مقدم ہوگی۔ پھر جزء القراءۃ میں امام بخاریؒ نے اس حدیث کے ضعف کی وجہ اور تبلائی ہے وہ یہ کہ یحییٰ بن ابی سلیمان
کا سماع اپنے اُستاد زید اور ابن المقبری سے معلوم نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ویحیی هذا منكر الحديث روى عنه ابو سعيد مولى بنى هاشم وعبد الله بن رجاء البصري مناكير ولم يتبين سماعه من زيد ولا من ابن المقبري ولا يقوم به الحجة۔

یعنی یحییٰ منکر الحدیث ہے۔ اِس سے ابوسعید مولا بنی ہاشم اور عبداللہ بن رجاء بصری نے منکر حدیثیں
روایت کی ہیں۔ اور اس کا سماع زید سے اور ابن مقبری سے (جو اس حدیث میں اس کے استاد ہیں)
معلوم نہیں۔ اور اس کی حدیث سے اس کی حجت قائم نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ حدیث ضعیف ہے۔ استدلال کے لائق نہیں۔ خاص کر فاتحہ جیسے زبردست مسئلہ کے
مقابلہ میں جس کی فرضیت کالشمس فی نصف النہار تک ہے بھلا اس کی فرضیت ایسی ضعیف حدیث
سے کس طرح رفع ہوسکتی ہے؟

دوسرے اعتراض کا جواب

اب مولوی عبدالجلیل کے دُوسرے اعتراض کا حال سُنئے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم اس شخص کے
ساتھ خاص ہے جس کو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہدایت کی ہے بلکہ میں کہتا ہوں قیامت تک سب کو
شامل ہے مگر اس حدیث میں رکوع میں رکعت ہونے کا ثبوت نہیں۔ بلکہ رکعت سے مُراد رکعت ہی ہے
اور مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ جس نے رکعت پائی۔ اُس نے نماز پائی۔ کیونکہ ادنیٰ درجہ نماز ایک رکعت ہے
جس نے رکعت سے کم حصہ پایا مثلاً رکوع میں شریک ہوا اس نے نماز نہیں پائی۔ وہ یہ رکعت نئے سرے

سے پڑے چونکہ شبہ ہوتا تھا کہ اس حدیث میں رکعت سے مُراد رکوع ہے کیونکہ سجدہ کے مقابلہ میں جب رکعت آئے تو اس سے رکوع ہی مراد ہوتا ہے۔ تو اس شبہ کا جواب میں نے یہ دیا کہ اس حدیث میں سجدہ کا ذکر مقابلہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک شخص سجدہ میں آکر شامل ہوا تو اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سجدہ کا ذکر کرکے فرما دیا کہ سجدہ کو کچھ شمار نہ کرنا۔ اور ایسا بہت ہوتا ہے موقعہ کے لحاظ سے ایک لفظ بول دیا جاتا ہے اور حکم اس کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جمعہ کی آیت میں فرماتا ہے وذروا البیع یعنی خرید فروخت چھوڑ کر جمعہ کو آؤ۔ حالانکہ یہ حکم خرید و فروخت والوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دوسرے کاروبار والوں کو بھی شامل ہے مگر چونکہ اس کے بعد دوسری آیت کے نزول کے واقعہ میں تجارت کا سلسلہ تھا چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں تجارت کی تصریح ہے اس لئے بیع کے چھوڑنے کا ذکر کر دیا۔ ٹھیک اس طرح حدیث مذکور میں سجدہ کا ذکر کر دیا یہ مطلب نہیں کہ سجدہ میں رکعت نہیں ہوتی اور رکوع میں ہو جاتی ہے بلکہ رکوع میں بھی نہیں ہوتی۔ جب تک پُوری رکعت نہ پائے اُس وقت تک اس کو نماز کا پانے والا نہیں کہہ سکتے۔

مولوی عبدالجلیل کو خدا جانے کیا ہوا بغیر سمجھے دوسرے پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔

رہا بعض محدّثین کا اس حدیث پر باب باندھنا تو یہ الگ چیز ہے باب کبھی ضعیف اور محتمل حدیث پر بھی باندھا جاتا ہے اور کبھی دو باب مختلف بھی باندھے جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں پر مخفی نہیں۔ مثال کے لئے نسائی میں قرأۃ خلف الامام کے ابواب اور ابوداؤد میں استحاضہ کے ابواب ملاحظہ ہوں۔

اِس کے علاوہ راوئ حدیث ابُوہریرہ رضؓ کا فہم محدثین کے فہم پر مقدم ہے۔ ابوُہریرہ رضؓ نے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ رکُوع میں رکعت ہو جاتی ہے بلکہ وہ رکوع میں رکعت کے قائل نہیں۔ ملاحظہ ہو

(جزء القرأۃ امام بخاری)

پس ابُوہریرہؓ کے موافق اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ رکعت سے مراد رکوع نہیں بلکہ رکعت سے مراد رکعت ہی ہے۔ اور اصل بھی یہی ہے۔

عون المعبود میں ہے۔

قیل المراد به ههنا الرکوع فیکون مدرك الامام راکعا مدرکا لتلك الرکعة وفیه نظر لان الرکعة حقیقة لجمیعها واطلاقها علی

الركوع ومابعده مجاز لايصار اليه الابقرينة كما وقع عند مسلم من حديث البراء بلفظ فوجدت قيامه فركعته فاعتداله فسجدته فان وقوع الركعة فى مقابلة القيام والاعتدال والسجود قرينة تدل على ان المراد بها الركوع وههنا ليست قرينة تصرف عن حقيقة الركعة فليس فيه دليل على ان مدرك الامام راكعا مدرك لتلك الركعة۔ (عون المعبود جلد اول ص۳۳۲)

یعنی کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں رکعت سے مراد رکوع ہے پس جو امام کو رکوع میں پائے اس کی رکعت ہو جائے گی مگر یہ کہنا ٹھیک نہیں کیونکہ رکعت کا حقیقی معنی پوری رکعت ہے اور رکوع وغیرہ پر اس کا اطلاق مجازی ہے جس کے لئے قرینہ کی ضرورت ہے جیسے مسلم میں براء کی حدیث میں رکعت سے رکوع مراد ہے کیونکہ قیام اعتدال اور سجدہ کے مقابلہ میں واقعہ ہونا اس بات کا قرینہ ہے اور اس حدیث میں کوئی قرینہ نہیں۔ پس رکعت سے رکوع مراد لے کر یہ ثابت کرنا کہ رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے یہ صحیح نہ ہوا۔

مولوی انور شاہ دیوبندی نے فصل الخطاب میں عبد العزیز بن رفیع والی حدیث کو مطالب عالیہ سے نقل کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ میں نے اس حدیث کو مطالب عالیہ سے اس لئے نقل کیا ہے کہ حافظ نے مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہا ہے اور بیہقی کا معرفہ میں اس کو مرسل کہنا اس سے مراد یہ ہے کہ صحابی کا نام نہیں لیا گیا۔ سنن بیہقی میں اس کو ان الفاظ سے بھی ذکر کیا ہے۔

شعبة ثنا عبد العزيز بن محمّد المكى عن رجل عن النّبى صلّى الله عليه وسلّم قال من لم يدرك الركعة لم يدرك الصلوٰة (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۲ ص۸۹)

یعنی عبد العزیز (بن رفیع) بن محمد ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جس نے رکعت نہیں پائی اس نے نماز نہیں پائی۔

جواب

مولوی انور شاہ کا بیہقی کے کلام میں مرسل سے یہ مراد لینا کہ اس کے صحابی کا نام نہیں لیا گیا۔ یہ مرسل کا معنیٰ نہیں۔ مرسل کا یہ معنیٰ ہے کہ تابعی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرے اور صحابی کا ذکر چھوڑ دے اور ایسی روایت ضعیف ہوتی ہے پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شیخ انصاری صحابی ہے یا نہیں۔ اور حافظ رح کا مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہنا اس سے مراد صحابی کے علاوہ باقی سند کی صحت ہے۔

جواب ۲

مولوی عبدالجلیل صاحب نے بیہقی سے اس کی دو سندیں ذکر کی ہیں۔ مگر ایک راوی محمد بن احمد بن بالویہ اور ابوطاہر فقیہ کی ثقاہت بیان نہیں کی۔

جواب ۳

رکعت کے حقیقی معنی پوری رکعت ہے اس سے رکوع مراد لینا تاویل ہے۔

جواب ۴

بیہقی کی جس روایت میں رکوع کی تصریح ہے اس کی صحت معلوم نہیں۔ نیز روایت بالمعنی کا بھی احتمال ہے۔ یعنی کسی راوی نے رکعت کو رکوع کے معنی میں سمجھ کر رکوع کا لفظ بول دیا۔ نیز یہ حدیث ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔ اور ابوہریرہ رکوع میں رکعت کے قائل نہیں اس لئے رکعت بمعنی رکوع لینا ٹھیک نہیں۔

تعاقب ۱

مولوی عبدالجلیل نے محدث روپڑی کے مضمون بالا پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

آپ کا یہ فرمانا ٹھیک نہیں کہ دو سندوں میں ایک ایک راوی چھوڑ دیا ہے اس کی توثیق نہیں کی" حالانکہ یہ دونوں بیہقی کے اُستاد ہیں۔ یہ دونوں ہی ثقہ ہیں۔ محمد بن احمد بن بالویہ کو خطیب نے ثقہ کہا ہے (تاریخ بغداد ص ۲۸۲ جلد ۱۔ اور ابوطاہر فقیہ محمد بن محمد بن محمش الفقیہ مشہور ثقات سے ہیں۔ اس لئے ان کی توثیق ذکر نہیں کی تھی۔ دونوں سندیں بلکہ مطالبہ عالیہ کے ساتھ تینوں سندیں صحیح ہیں۔

تعاقب ۲

آپ نے لکھا ہے کہ صرف صحابی کا نام نہ ذکر ہونے سے مرسل کہنا ٹھیک نہیں" یہ بھی درست نہیں۔ واقعی جمہور محدثین اسے مرسل نہیں کہتے مگر یہ اصطلاح خاص خاص لوگوں کی ہے۔ ولا مشاحة فی الاصطلاح جیسے امام بیہقی رح اپنی سنن اور امام الحرمین وغیرہما چند معدود اہلِ علم ملاحظہ ہوں۔ تدریب الراوی ص ۶۶

واما اذا قال الراوی فی الاسناد فلان عن رجل او شیخ عن فلان فقال الحاکم هو منقطع لیس مرسلا وقال غیره مرسل الی ان قال فجعل رای البیهقی فی سننه ما رواه التابعی عن رجل من الصحابة لم یسم مرسلا الفیه عراقی

مع شرح فتح الباقی میں ہے۔

ویسموا منقطعا عن رجل وفی الاصول نعته بالمرسل ووقع فی کلام البیہقی

تسمیته ایضا مرسلا ومرادہ مجرد التسمیۃ ۔ نہایت السول شرح منہاج الوصول۔

بیضاوی میں فاضل اسنوی فرماتے ہیں ص ج ۲۔

قول الراوی اخبرنی اوعدل موثوق به من المرسل ایضا

راوی تابعی صحابی کا ذکر نہ کرے اور صرف عن رجل یا عن شیخ وغیرہ کہے تو وہ امام بیہقی کے نزدیک مرسل کہلاتی ہے۔ دیگر علماء منقطع کہتے ہیں۔ صحابی کے علاوہ ۔ ہاں تابعی صحابی کا ذکر نہ کرے۔ اور عن رجل کہے تو وہ صحابی کے نزدیک مرفوع اور حجت ہوتی ہے۔

تعاقب ۳

آپ نے لکھا ہے کہ رکعت کو بمعنی رکوع لینا تاویل ہے" یہ بھی ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں رکعت بمعنی رکوع وارد ہے۔ پھر اسے تاویل کہنا اہلِ علم کی شان سے بعید ہے۔

تعاقب ۴

آپ نے لکھا ہے جس روایت میں رکوع کی تصریح ہے اس کی صحت معلوم نہیں حالانکہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ صرف امام بیہقی کے اُستادوں کا ذکر باقی تھا وہ اب معلوم ہو گیا۔ سند وہی ہے جو مطالب عالیہ کی ہے سفیان سے اور اس سے قبل کے راوی سب کے سب ثقہ رجال بخاری اور مسلم وغیرہ سے ہیں۔ واللہ الموفق

تعاقب ۵

آپ نے لکھا ہے کہ اس میں روایت بالمعنیٰ کا احتمال ہے" میں کہتا ہوں کہ احادیث میں روایت بالمعنیٰ کو دخل ہے مگر یہ کیونکر ہو کہ اس جگہ بالمعنیٰ ہی قطعًا ہے۔ احتمال سے تو کوئی روایت خالی نہیں۔ اس لئے آئمہ لغت احادیث کے کلمات سے استدلال نہیں پکڑتے بلکہ دونوں لفظ ایک ہی معنیٰ میں ان کے نزدیک ہیں دونوں میں تنافی نہیں۔

تعاقب ۶

آپ نے بیان فرمایا ہے کہ" ابُوہریرہ رضا اس کے خلاف ہیں" میں کہتا ہوں کہ ابُوہریرہ رضو مخالف بھی ہیں۔ اور موافق بھی بلکہ موافق کی روایت تو اصح الکتب موطاء امام مالک کی ہے اور وہ یہ ہے۔

ان اباهريرة كان يقول من ادرك ركعة فقد ادرك السجدة ومن فاته

ام القران فقد فاته خیر کثیر۔

بے شک ابوہریرۃ رضؓ کہتے تھے جس نے رکعت پائی اس نے سجدہ پایا اور جس سے اُمّ القرآن فوت ہوگئی اُس سے خیر کثیر فوت ہوگئی۔

لہٰذا یہ کہنا کہ ابوہریرۃ رضؓ راوی حدیث کی بنا پر رکعت یعنی رکوع صحیح نہیں قابل سماع نہیں۔ دوسرا یہ کہہ سکتا ہے کہ ابوہریرہ کی اس روایت کی بنا پر صحیح ہے رکعت یعنی رکوع بلکہ مرفوع کے موافق کو ترجیح ہونی چاہیے۔ کما لا یخفیٰ اِس مؤطا کی روایت سے آپ کا بار بار یہ کہنا کہ راوی حدیث کا فتویٰ اس کے خلاف ہے ٹھیک نہ ہوا بلکہ راوی حدیث کا فتوی حدیث کے موافق ہے۔ حدیث کی تائید ہوئی مگر ہمیں تو اس کی ضرورت نہیں ۔ راوی حدیث خواہ خلاف ہی کرے۔ حدیث میں اس سے خامی نہیں آسکتی۔ مسئلہ صاف ہے قائلین مدرک رکوع مدرک رکعت پر کوئی عار و شنار نہیں۔ گو ایک جماعت نے عدم کو بھی استعمال کیا ہے مگر جمہور اس کے قائلین میں سے ہیں۔ لہٰذا تشدد اور ایک دوسرے کی تضلیل و تکفیر سے احتراز لازم ہے۔

جواب تعاقب اوّل

مطلوبہ راویوں کی ثقاہت تو آپ نے بیان کر دی لیکن یہ کہنا کہ دونوں سندیں بلکہ مطالب عالیہ کے ساتھ تینوں سندیں صحیح ہیں۔ یہ صحیح نہیں جس کی وجہ آگے بیان ہوتی ہے۔

جواب تعاقب دوم

بیہقی نے عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کو موصول کے مقابلہ میں مرسل کہا ہے۔

چنانچہ معرفۃ السنن میں لکھتے ہیں:۔

وقد روی ادراك الركعة بادراك الركوع فی خبر مرسل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفی خبر موصول عنہ غیر قوی اما المرسل فرواہ عبد العزیز بن رفیع عن رجل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انتہی ملخصا۔

یعنی رکوع میں رکعت کا ہونا مرسل حدیث میں بھی آیا ہے۔ مرسل کو عبدالعزیز بن رفیع نے ایک شخص سے اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

اس عبارت میں عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کو موصول کے مقابلہ میں مرسل کہا ہے اور ظاہر ہے کہ موصول وہ ہے جس میں کوئی راوی گرا ہوا نہ ہو تو گویا عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث میں کوئی راوی گرا ہوا ہے

اب اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ عبدالعزیز بن رفیع کا اُستاد شخص مجہول بیہقی کے نزدیک صحابی نہ ہو۔ اور ابن ابی شیبہ کی روایت[1] سے اس کا صحابی ہونا معلوم ہوتا ہے وہ بیہقی کو معلوم نہ ہو یا صحت کو نہ پہنچی ہو۔ دوسری صورت یہ کہ بیہقی کے نزدیک یہ شخص صحابی ہو لیکن صحابی کا مجہول ہونا ان کے نزدیک صحتِ حدیث کو مانع ہو۔ اس لئے انہوں نے اس کی حدیث کو کالعدم قرار دے کر حدیث پر مرسل ہونے کا حکم لگا دیا۔ تیسری صورت یہ کہ عبدالعزیز بن رفیع نے مجہول صحابی سے عن کے ساتھ عن سے روایت کی ہے اور جب تابعی مجہول صحابی سے عن کے ساتھ روایت کرے وہ روایت صحیح نہیں ہوتی تو گویا صحابی کا ذکر کالعدم ہوگیا۔ اِس لئے روایت مرسل ہوگئی۔

تدریب الراوی میں ہے۔

وَاِذَا قَالَ الرَّاوِیُ فِی الْاِسْنَادِ (فُلَانٌ عَنْ رَجُلٍ) اَوْ شَیْخٌ (عَنْ فُلَانٍ فقال الحاکِمُ) هُوَ مُنْقَطِعٌ لَیْسَ مُرْسَلاً وَقَالَ غَیْرُهُ) حَکَاهُ ابْنُ الصَّلَاحِ عَنْ بَعْضِ کُتُبِ الْاُصُوْلِ (مُرْسَلٌ، قَالَ الْعَرَاقِیُّ وَکُلٌّ مِنَ الْقَوْلَیْنِ خِلَافُ مَا عَلَیْهِ الْاَکْثَرُوْنَ فَاِنَّهُمْ ذَهَبُوْا اِلٰی اَنَّهٗ مُتَّصِلٌ فِیْ سَنَدٍ مَجْهُوْلٍ حَکَاهُ الرَّشِیْدُ الْعَطَّارُ وَاخْتَارَهُ الْعَلَائِیُّ قَالَ وَمَا حَکَاهُ ابْنُ الصَّلَاحِ عَنْ بَعْضِ کُتُبِ الاصول اراد به البرهان لامام الحرمین فانه ذکر ذالك فیه وزاد کتب النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الَّتِیْ لَمْ یُسَمَّ حَامِلُهَا وَزَادَ فِی الْمَحْصُوْلِ مَنْ سُمِّیَ بِاسْمٍ لَا یُعْرَفُ قَالَ وَعَلٰی ذَالِکَ مَشٰی اَبُوْدَاوٗدَ فِیْ کِتَابِ الْمَرَاسِیْلِ فَاِنَّهٗ یَرْوِیْ فِیْهِ مَا اُبْهِمَ فِیْهِ الرَّجُلُ قَالَ بَلْ زَادَ الْبَیْهَقِیُّ عَلٰی هٰذَا فِیْ سُنَنِهٖ فَجَعَلَ مَا رَوَاهُ التَّابِعِیُّ عَنْ

---

[1] روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ عن عبدالعزیز بن رفیع عن رجل من اهل المدینة عن النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم انه سمع خفق نعلی وهو ساجد فلما فرغ من صلوته قال من هذا الذی سمعت خفق نعله فقال انا یا رسول اللّٰه قال فما [ ] قال وجدتك ساجدا فسجدت فقال هکذا [ ] ولا تعتدوا بها من وجدنی راکعا او قائما او ساجدا فلیکن معی علی حالتی التی انا علیها۔

(عون المعبود جلد اول ص۳۳۵)

رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِ لَمْ يُسَمَّ مُرْسَلاً وَلَيْسَ بِجَيِّدٍ اَللّٰهُمَّ اِلَّا اِنْ كَانَ يُسَمِّيْهِ مُرْسَلاً وَيَجْعَلُهُ حُجَّةً كَمَرَاسِيْلِ الصَّحَابَةِ فَهُوَ قَرِيْبٌ وَقَدْ رَوَى الْبُخَارِيُّ عَنِ الْحُمَيْدِيِّ قَالَ اِذَا صَحَّ الاسناد عن الثقات الى رجل من الصحابة فَهُوَ حُجَّةٌ وَاِنْ لَمْ يُسَمَّ ذَالِكَ الرجل وقال الاثرم قُلْتُ لِاَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ اِذَا قَالَ رَجُلٌ مِنَ التَّابِعِيْنَ حَدَّثَنِيْ رَجُلٌ مِنَ الصَّحَابَةِ وَلَمْ يُسَمِّهِ فَالْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَفَرَّقَ الصيرفِيُّ مِنَ الشَّافِعِيَّةِ بَيْنَ اَنْ يَّرْوِيَهُ التَّابِعِيُّ مِنَ الصَّحَابِيِّ مُعَنْعَنًا اَوْ مُصَرِّحًا بِالسَّمَاعِ قَالَ وَهُوَ حَسَنٌ مُتَّجِهٌ وَكَلَامُ مَنْ اَطْلَقَ قُبُوْلَهُ مَحْمُوْلٌ عَلٰى هٰذَا التَّفْصِيْلِ الخ

(تدریب الراوی ص۱۲۴)

یعنی جب راوی اسناد میں رَجُل کا لفظ بولے یا شیخ کا لفظ بولے اور نام نہ لے تو حاکم کہتے ہیں یہ اسناد منقطع ہے۔ مرسل نہیں اور حاکم کے علاوہ اور کہتے ہیں کہ یہ مرسل ہے۔ چنانچہ ابن الصلاح سے بعض کتب اصول سے یہ نقل کیا ہے۔ عراقی کہتے ہیں یہ دونوں قول یعنی حاکم کا قول اور غیر حاکم کا قول اکثر کے خلاف ہے۔ کیونکہ اکثر کہتے ہیں یہ اسناد متصل مجہول ہے۔ رشید عطار نے اس کا ذکر کیا ہے اور علائی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور ابن الصلاح نے بعض کتب الاصول سے جو کچھ نقل کیا ہے اس سے مراد امام الحرمین کی کتاب برہان ہے۔ اس میں امام الحرمین نے ایسی روایت کا مرسل ہونا ذکر کیا ہے۔ جس میں راوی رجل یا شیخ کا لفظ بولے۔ اور امام الحرمین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خط و کتابت جس کے پہنچانے والے کا نام نہیں لیا گیا۔ اس کو بھی اسی (مرسل) میں شمار کیا ہے۔ اور امام رازی نے محصول میں اس شخص کی روایت کو بھی اسی میں داخل کیا ہے جو غیر مشہور نام کے ساتھ ذکر ہو جس سے پتہ نہ لگے کہ یہ کون ہے اور کہا ہے کہ امام ابوداؤد نے کتاب مراسیل میں یہی روش اختیار کی ہے۔ کیونکہ وہ اس میں ایسی روایتیں بھی لائے ہیں جن کے راوی مبہم نام کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ نیز امام رازی نے کہا ہے کہ امام بیہقی نے اپنی سنن میں اس روایت کو بھی مرسل میں شمار کیا ہے جس میں تابعی عن رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِ کہے اور صحابی کا نام نہ لے لیکن امام بیہقی کا اس کو مرسل کہنا ٹھیک نہیں (کیونکہ یہ حجت ہے) ہاں اگر صرف نام مرسل رکھے اور اس کو حجت سمجھے جیسے مراسیل صحابہ (باوجود مرسل ہونے کے) حجت

ہیں تو پھر یہ خیال قریب قریب درست ہے۔ اور امام بخاریؒ نے امام حمیدی سے نقل کیا ہے کہ جب صحابی تک سند صحیح ہو اور صحابی کا نام نہ لیا جائے تو یہ روایت حجت ہے۔ اور امام اثرم کہتے ہیں ۔ میں نے امام احمد بن حنبل سے سوال کیا ہے کہ جب تابعی کہے کہ مجھے ایک شخص صحابی نے حدیث سنائی اور صحابی کا نام نہ لے تو کیا یہ حدیث صحیح ہوگی؟ امام احمد نے کہا ہاں۔ امام رازیؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ امام صیرفی نے اس میں کچھ تفصیل کی ہے۔ وہ یہ کہ تابعی ایسے مجہول صحابی سے عن کے ساتھ روایت کرے تو اس کا حکم اور ہے اور اگر سماع کی تصریح کرے تو اس کا حکم اور ہے۔ یعنی دوسری صحیح ہے، پہلی صحیح نہیں۔ اور جس امام نے تصریح سماع کی شرط نہیں کی اس کا قول بھی اسی تفصیل پر محمول ہے۔ یعنی سماع کی تصریح ہو تو صحیح ہے ورنہ نہیں"

تدریب الراوی کی اس عبارت نے معاملہ بالکل صاف کر دیا۔ اور تبلادیا کہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث صحیح نہیں کیونکہ عبدالعزیز نے سماع کی تصریح نہیں کی بلکہ عن کے ساتھ روایت کی ہے۔

مولوی عبدالجلیل صاحب پر بڑا تعجب ہے کہ تدریب الراوی کے صد۱۲ سے عبارت نقل کرتے وقت اخیر کے حصے کو چھوڑ دیا حالانکہ یہی حصہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کے لئے فیصلہ کن ہے اور اسی سے امام بیہقی کے مرسل کہنے کی ایک صحیح وجہ معلوم ہو سکتی ہے۔ مولوی عبدالجلیل صاحب! اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میرا تعاقب مولوی انورشاہ صاحب پر بالکل درست ہے۔ اور میں بفضل خدا حق کے ساتھ ہوں۔ اور اس سے عداوت نہیں رکھتا۔ ہاں اب آپ پر آزمائش کا وقت آیا ہے دیکھئے آپ اپنی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے رجوع الی الحق کرتے ہیں یا نہیں۔ واللہ الموفق

نوٹ:۔

جب عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث صحیح نہ ہوئی تو اب حافظ رح کا مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہنا اس سے مراد مرسل صحیح ہوگی۔ یعنی صحابی کے علاوہ باقی سند صحیح ہے۔

جواب تعاقب نمبر ۴

رکعت کے حقیقی معنی پوری رکعت کے ہیں۔ شارع کے کلام میں بے شک رکعت کا معنی رکوع آیا ہے لیکن قرینہ کے ساتھ۔ اور یہاں کوئی قرینہ نہیں اس لئے رکعت بمعنی رکوع لینا تاویل ہے۔ چنانچہ پرچہ تنظیم اہلحدیث مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۵۲ھ صد۱ کالم ۳ میں اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔

جواب تعاقب نمبر ۴

عبدالعزیز بن رفیع کی بعض روایات میں آپ کے رکوع کا لفظ ذکر نہیں کیا۔ سو جب وہ حدیث ہی صحیح نہ ہوئی تو بعض روایات کا کیا اعتبار ہے۔

جواب تعاقب نمبر ۵

آپ کو شاید معلوم نہیں اِذَا جَاءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ قواعد سے واقف نہیں۔ مدعی کے ذمے ثبوت ہوتا ہے۔ اگر اس کے ثبوت میں کوئی خلاف احتمال آجائے تو ثبوت ردّی ہو جاتا ہے۔ آپ اس بات کے مدعی ہیں کہ باوجود فرضیت فاتحہ کے رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے۔ سو آپ کو کوئی زبردست ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ حدیث باوجود ضعیف ہونے کے اس میں روایت بالمعنی کا خلاف احتمال ہے کہ شاید راوی نے رکعت بمعنی رکوع سمجھ کر رکوع کا لفظ بول دیا ہو۔ اب اس کے مقابلے میں آپ کا یہ کہنا کہ یہ کیونکر ہوا اور کیا اس جگہ بالمعنی ہی ہے۔ قطعاً ہے یہ کس قدر دُور از عقل ہے۔ کیا قطعی بات ہی دلیل کو توڑا کرتی ہے۔ احتمال اور شک سے دلیل ردّی نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد یہ کہنا کہ احتمال سے تو کوئی روایت خالی نہیں؟ یہ کیسے بے محل ہے؟ کیا صرف احتمال ہونے سے یہ لازم آجاتا ہے کہ خلافِ احتمال ہو نفس احتمال اور شئے ہے۔ خلافِ احتمال اور شئے ہے۔ اِس حدیث کی تمام روایتوں میں رکعت کا لفظ ہے صرف ایک روایت میں رکوع کا لفظ ہے۔ اب تبلایئے۔ بہت کی رعایت چاہیے یا ایک کی۔ آپ کہتے ہیں سب روایتوں کو رکوع کی روایت کے تابع کر کے رکعت بمعنی رکوع لو۔ ہم کہتے ہیں رکوع کو روایت بالمعنی قرار دیکر رکعت کو اپنے معنی پر رکھو تاکہ زیادہ کی رعایت ہو۔ نیز ابُوہریرہ بھی اس حدیث کے راوی ہیں۔ ان کی موافقت ہو۔ نیز فرضیت فاتحہ کا مسئلہ ہمارا موید ہے۔ نیز یہ حدیث خاص کر رکوع والی حدیث صحیح سند سے مروی نہیں ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے انصاف سے کہیں کہ ترجیح کس جانب کو ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی صحیح سند جو متفق علیہ اس کے ساتھ اس حدیث کے الفاظ یُوں آئے ہیں۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔

یعنی جو شخص امام کے ساتھ رکعت پائے اس نے نماز پائی۔ (مشکوٰۃ باب الخطبہ والصلوٰۃ)

پس جو روایت الفاظ میں اس کے موافق ہوگی۔ اِسی کے الفاظ اصل روایت سمجھی جائے گی۔ سو اب ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کے کون سے الفاظ اس کے موافق ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہی الفاظ موافق

ہیں جو مطالب العالیہ کی روایت کے بعد بحوالہ سنن کبریٰ بیہقی سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

مَنْ لَمْ يُدْرِكِ الرَّكْعَةَ لَمْ يُدْرِكِ الصَّلٰوةَ۔

جس نے رکعت نہیں پائی اُس نے نماز نہیں پائی

جب یہ الفاظ اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت کے موافق ہوئے تو اب ضروری ہوا کہ ان الفاظ کو اصل سمجھا جائے اور رکوع وغیرہ کے لفظ کو اس کے تابع کرکے کہا جائے کہ کسی راوی نے رکعت بمعنی رکوع سمجھ کر رکوع کہہ دیا یا یہ کہ رکعت والی روایت کو رکوع کے معنیٰ میں لے کر رکوع والی روایت کے تابع کیا جائے کیونکہ ضعیف کی تاویل معمولی بات ہے۔ صحیح کو حتی الوسع ظاہر سے نہیں پھیرا جاتا۔ اب بھی اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر خلوص سے دعا کریں کہ خدا آپ کو شرح صدر عطا فرمائے۔ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ۔

جواب تعاقب نمبر ۶

مؤطا کی روایت جو آپ نے ذکر کی ہے اُس کی سند یہ ہے۔

عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُولُ مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ۔ الخ

یعنی امام مالک کو یہ پہنچا ہے کہ ابوہریرہ رضہ کہتے تھے جو رکعت پائے اُس نے نماز پائی

امام مالکؒ ابوہریرہ رضہ کو نہیں ملے بلکہ اُن میں اور ابوہریرہ رضہ میں کئی واسطے ہیں۔ اسی واسطے کہا کہ امام مالکؒ کو ابوہریرہ رضہ کی یہ بات پہنچی ہے۔ اب مولوی عبدالجلیل کا یہ کہنا کہ یہ روایت اصح الکتب کی ہے۔ یہ کتنا بڑا مغالطہ ہے۔ مؤطا کو بعض نے بے شک اصح الکتب کہا ہے لیکن ان روایتوں کے لئے جو اُس میں پوری سند کے ساتھ ذکر ہیں نہ اُن کے لئے جن کی سند ہی مذکور نہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض کی تو صحت ہی مشکل ہو جاتی ہے چہ جائیکہ اُن کو اعلیٰ درجہ کی صحیح شمار کیا جائے۔ مثلاً بخاری اصح الکتب ہے لیکن تعلیقات بخاری (جن کی سند بالکل یا پوری ذکر نہیں ہوتی) ان میں کئی محل گفتگو بھی ہیں۔ چہ جائیکہ ان کو اعلیٰ درجہ صحت کا دیا جائے۔

مولوی عبدالجلیل صاحب! ایسا مغالطہ آپ کے لائق نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس میں بھی رکعت کا لفظ ہے جو اپنے معنی پر ہے۔ رکعت کو رکوع کے معنی میں لینے پر کوئی دلیل نہیں۔ ہاں سجدہ اس میں نماز کے معنی میں ہے دلیل اس پر اوپر کی روایت ہے جو بحوالہ مشکوٰۃ اس سے پہلے بھی گزری ہے۔ یعنی مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔ پس جب سجدہ سے مراد نماز ہوئی اور رکعت اپنے معنی پر رہی تو ابوہریرہ کا فتوے رکوع میں رکعت کا نہ ہوا۔

اور ایک صورت میں سجدہ اپنے معنیٰ پر بھی رہ سکتا ہے۔ وہ یہ کہ سجدہ پانے سے یہ مراد ہے کہ سجدہ معتبر ہوگا اور شمار میں آئے گا۔ یعنی جو شخص رکعت پالے۔ اور جس سے بوجہ فاتحہ وغیرہ فوت کے رکعت فوت ہوگئی۔ اس کا سجدہ کسی گنتی میں نہیں۔ اس صورت میں بھی ابوہریرہ کا فتویٰ رکوع میں رکعت کا نہ ہوا۔ اور سب الفاظ بھی اپنے اپنے معنی پر رہے۔ رکعت اپنے معنی پر اور سجدہ اپنے معنی پر۔ رہا اس کا اخیر کا ٹکڑا یعنی وَمَنْ فَاتَهُ اُمُّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ یعنی جس سے فاتحہ فوت ہوگئی۔ اس سے خیر کثیر فوت ہوگئی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فاتحہ کوئی ضروری نہیں۔ اس کے بغیر بھی رکعت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خیر کا لفظ فرض واجب پر بھی بولا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے، جو شخص پانی نہ پائے وہ تیمم سے نماز پڑھتا رہے۔ خواہ دس سال گذر جائیں جب پانی پائے تو اپنی جلد کو لگالے یعنی غسل کرے۔ فَاِنَّ ذَالِكَ خَيْرٌ۔ کیونکہ یہ غسل اس کے لئے بہتر ہے دیکھئے یہاں غسل جنابت کو خیر کہا ہے۔ حالانکہ یہ فرض ہے۔ پس اسی طرح فاتحہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔

اس کے علاوہ فاتحہ کے فوت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مقتدی فاتحہ پڑھ نہیں سکا۔ اور امام رکوع میں چلا گیا بلکہ فاتحہ کے فوت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مقتدی امام کی فاتحہ نہیں پاسکا۔ کیونکہ امام کی فاتحہ پانے کی صورت میں امام کے ساتھ آمین کہنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جس سے حدیث فمن وافق تامینہ تامین الملئکۃ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

یعنی جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو جائے۔ اس کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور فرشتوں کی آمین امام کی آمین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ابوہریرہ سے جزء القراءۃ بخاری باب السکتات میں مروی ہے۔ اور مشکوٰۃ باب القراءۃ میں بھی ابوہریرہ رضی کی حدیث ہے جس میں اس کا ذکر ہے۔ پس امام کے ساتھ فاتحہ پانے سے اتنی بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اور جس سے امام کی فوت ہوگئی۔ اس سے خیر کثیر فوت ہوگئی۔ اس لئے حضرت ابوہریرہؓ نے جب مروان بن حکم کے موذن کو شرط کی کہ ولا الضالین کے ساتھ مجھ سے سبقت نہ کرنی ہوگی۔ ملاحظہ ہو فتح الباری باب جہر الامام بالتامین۔

سامرودی نے تعاقب کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی کے رکوع میں رکعت کے قائل ہونے کی بابت موطاء امام مالک رح کی یہ روایت پیش کی ہے۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ وَمَنْ فَاتَهٗ اُمُّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهٗ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔

یعنی "جس نے رکعت پائی اُس نے نماز پائی اور جس سے فاتحہ فوت ہو گئی اُس سے خیر کثیر فوت ہو گئی۔
لیکن مولوی عبدالجلیل کا اس روایت کو پیش کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ اس میں رکعت اپنے معنی پر ہے اور سجدہ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بھی اپنے معنی پر ہو۔ دوسرا یہ کہ بمعنی نماز ہو۔ چنانچہ اس کی تفصیل امام زرقانی شرح موطا میں لکھتے ہیں (فَقَدْ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ لِمَوْضِعِ التَّامِيْنِ وَمَا يَتَرَتَّبُ عَلَيْهِ مِنْ غُفْرَانِ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ قَالَهُ ابْنُ وَضَّاحٍ وَغَيْرُهٗ (زرقانی جلد اول ص۲۱۸) یعنی ابوہریرہ رضؓ کا یہ کہنا کہ جس سے فاتحہ فوت ہو گئی اُس سے خیر کثیر فوت ہو گئی اس کا مطلب آمین کا موقعہ پانا ہے۔ اور اس فضیلت کا حاصل کرنا جو آمین کا موقعہ پانے سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی تمام سابقہ گناہ کی معافی ہو جاتی ہے۔
اسی کے قریب حافظ ابن عبدالبر استذکار میں لکھتے ہیں۔ اور قاضی ابوالولید باجی منتقی شرح موطاء میں لکھتے ہیں۔

عَنْ مَالِكٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ الْحَدِيْثَ ۔ مَعْنٰى ذٰلِكَ اَنَّ مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ الْاِعْتِدَادَ بِالسَّجْدَةِ وَلَيْسَتْ فَضِيْلَةُ مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ دُوْنَ قِرَاءَةٍ كَفَضِيْلَةِ مَنْ اَدْرَكَ الْقِرَاءَةَ مِنْ اَوَّلِهَا وَاَشَارَ مِنْ ذٰلِكَ اِلٰى فَضِيْلَةِ حُضُوْرِ قِرَاءَةِ اُمِّ الْقُرْاٰنِ لِاَنَّهَا مِنْ اَعْظَمِ فَضِيْلَةِ قِرَاءَةِ الرَّكْعَةِ وَقَدْ قَالَ ابْنُ وَضَّاحٍ وَالدَّاوُدِيُّ اِنَّ تِلْكَ الْفَضِيْلَةَ قَوْلُ الْمَامُوْمِ اٰمِيْنَ عِنْدَ قَوْلِ الْاِمَامِ وَلَا الضَّالِّيْنَ لِمَا رُوِيَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ قَالَ لَا تَسْبِقْنِيْ بِاٰمِيْنَ فَثَبَتَ بِذَالِكَ اَنَّ لِاِدْرَاكِ هٰذَا الْمَوْضِعِ مِنَ الْقِرَاءَةِ مَزِيَّةً عَلٰى غَيْرِهٖ اِلَّا اَنَّ ظَاهِرَ قَوْلِهٖ هٰهُنَا يَقْتَضِيْ اَنَّ الْفَضِيْلَةَ الَّتِيْ اَدْرَكَ اِنَّمَا هِيَ بِجَمِيْعِ قِرَاءَةِ اُمِّ الْقُرْاٰنِ لِاَنَّ حُضُوْرَ قِرَاءَةِ جَمِيْعِهَا فَضِيْلَةٌ يَدْخُلُ فِيْهَا فَضِيْلَةُ اِدْرَاكِ اٰمِيْنَ وَغَيْرِهَا وَفِيْ هٰذَا الْاَثَرِ مَعْنًى اٰخَرُ وَ هُوَ اَنَّ مَنْ جَاءَ فَوَجَدَ الْاِمَامَ رَاكِعًا كَبَّرَ وَرَكَعَ وَلَمْ يَقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ وَيَتَّبِعُ الْاِمَامَ بَعْدَ رَفْعِ رَاسِهٖ مِنَ الرُّكُوْعِ وَلِذَالِكَ وَصَفَهٗ بِاَنَّهٗ قَدْ فَاتَهٗ قِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ وَلَوْ كَانَ مِنْ حُكْمِهٖ اَنَّ الْقِرَاءَةَ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ قَبْلَ اِتِّبَاعِ

اَلْاِمَامِ لِمَا وُصِفَ بِفَوَاتِ ذَالِكَ كَمَا لَا يُوْصَفُ بِفَوَاتِ تَكْبِيْرَةِ الْاِحْرَامِ۔

(کتاب المنتقی شرح موطاء قاضی ابوولید باجی جلد اوّل ص۱۸۲)

یعنی ابُوہریرہ رضہ کی روایت کے یہ معنی ہیں کہ جس نے رکعت پائی اس کا سجدہ بھی معتبر ہوگیا۔ اور جس نے قرأت امّ القرآن کے بغیر نہ رکعت پائی اس کی فضیلت ایسی نہیں جیسی شروع رکعت پانے والے کی ہے۔ اور اس سے قرأۃ ام القرآن امام کے ساتھ پانے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قرأۃ رکعت کی بڑی فضیلت یہی ہے کہ ام القرآن کو امام کے ساتھ پالے اور ابن وضاح اور داوُدی نے کہا ہے کہ یہ فضیلت مقتدی اور امام کی آمین میں موافقت کے لئے ہے۔ کیونکہ ابُوہریرہ رضہ سے مروی ہے کہ انہوں نے امام کو کہا۔ مجھ سے آمین کے ساتھ سبقت نہ کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ امام کی قرأۃ کے اس حصہ کو پانا جس سے آمین میں موافقت ہوجائے بہ نسبت دُوسری قرأت کے زیادہ فضیلت ہے لیکن ظاہر قول ابُوہریرہ رضہ کا ساری فاتحہ سے تعلّق رکھتا ہے۔ اور اس کے ضمن میں آمین کی موافقت بھی آجاتی ہے کیونکہ جو ساری فاتحہ امام کے ساتھ پائے وہ آمین کا موقع ولاالضالین بھی پالے گا۔ اور ابوہریرہ رضہ کے اس قول کا ایک اور معنی بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو امام کو رکوع میں پائے وہ امام کے ساتھ تکبیر کہہ کر شامل ہوجائے اور رکوع کرے اور اُمّ القرآن نہ پڑھے اور رکوع سے سر اٹھا کر سجدہ میں امام کی اتباع کرے۔ اسی لئے اس کی بابت فاتحہ کے فوت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس شخص کا یہ حکم ہوتا کہ امام سے پہلے فاتحہ پڑھ لے تو اس کی بابت فاتحہ کے فوت ہونے کا ذکر نہ ہوتا جیسے تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

قاضی ابوالید نے اس عبارت میں ابوہریرہ رضہ کی روایت کے دُو مطلب بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ امام کے ساتھ رکعت پائے تو سجدہ کا اعتبار بھی ہوسکتا ہے ورنہ نہیں اور امام کے ساتھ فاتحہ سمیت رکعت کا پانا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ اور اس میں آمین میں بھی موافقت ہے۔ اگر امام کے ساتھ فاتحہ سمیت رکعت نہ پائی بلکہ امام کے فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد آکر شامل ہوا تو پھر خواہ فاتحہ پڑھ ہی لی لیکن جو امام کے ساتھ فاتحہ پانے کی فضیلت تھی وہ فوت ہوگئی۔

دوسرا مطلب قاضی ابوالید نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو رکوع سے سر اٹھا کر امام کی تابعداری کرے اور فاتحہ اس سے فوت ہوگئی۔ یعنی اس کے پڑھنے کا موقعہ جاتا رہا۔ اس صورت میں بھی (باوجود رکعت یعنی رکوع ہونے کے) رکوع میں رکعت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ

اس سے اس بات کا بیان کرنا مقصود ہے کہ امام کو جس حالت میں پائے اس کے ساتھ مل جائے۔ اس سے پہلے جو کچھ رہ گیا۔ وہ رہ گیا۔ اب اس کو امام کی اقتداء کے وقت اتباع امام سے پہلے نہیں ادا کر سکتا۔ بعد کو ادا کرے۔ اگرچہ امام کے ساتھ ادائیگی کی فضیلت بہت تھی مگر وہ فوت ہوگئی۔ ہاں تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوتی اس کو امام سے الگ کہہ کر پھر امام کے ساتھ اس حال میں شامل ہو جائے جس حال میں امام ہو۔

غرض اس قسم کے کئی مطالب ابوہریرہؓ کے اس قول کے ہو سکتے ہیں۔ جس سے رکوع میں رکعت لازم نہیں آتی۔ خاص کر جب ابوہریرہ رضؓ کا صریح فتویٰ (رکوع میں رکعت نہ ہونے کا) صحیح سندوں کے ساتھ موجود ہے تو پھر مخالف صورت کیوں اختیار کی جائے۔ حتی الوسع موافقت چاہیے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی حتی الوسع موافقت اور قوت اسناد) رکوع میں رکعت نہ ہونے کو چاہتی ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

سجدہ کا بیان

ایک دوسرے کی پشت پر سجدہ

سوال:۔ اگر مسجد میں جگہ تھوڑی ہو۔ اور آدمی زیادہ ہوں تو کیا اتنی تنگ صفیں کر سکتے ہیں کہ پچھلی صفوں کے آدمی اگلے صفوں کے نمازیوں کی پشت پر سجدہ کر لیں یا کہ نہیں۔

حاکم علی گجراتی حال وارد چک ۲/۱ ڈاکخانہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری

جواب:۔ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی پیٹھ پر بھی سجدہ کا کوئی حرج نہیں۔

(فصل ربع مشکوٰۃ وغیرہ)

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم اہلحدیث روپڑ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ ۲۴ جون ۱۹۳۸ء

سجدہ کی صورت

سوال:۔ سجدہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ سجدہ کے وقت ہاتھ زمین پر پہلے رکھے جائیں یا گھٹنے؟

جواب:۔ اس میں اختیار ہے کہ ہاتھ پہلے ٹکائے یا گھٹنے۔ سجدہ سات اعضاء پر ہوتا ہے۔ دو پاؤں۔ دو ہاتھ۔ دو گھٹنے۔ ماتھا ناک سمیت۔

اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھے اور ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں ایک دوسرے سے ملا کر قبلہ رخ کرے تاکہ چہرہ کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی سجدہ کریں۔ پگڑی کا پیچ یا ٹوپی وغیرہ ماتھے کے آگے سے ہٹا دے۔ اگر زمین گرم ہو یا کوئی اور عارضہ ہو پھر ہٹانا ضروری نہیں۔ اور دونوں کہنیاں دونوں پہلوؤں سے ہٹا کر اور زمین سے اُٹھا کر سجدہ کرے۔ اس طرح پشت کا اٹھانا اور پیٹ کا رانوں سے اور دونوں رانوں کا ایک دوسرے سے جدا رکھنا بھی ضروری ہے لیکن عورت کے متعلق بعض حدیثوں میں استثناء آئی ہے کہ عورت پیٹھ نہ اُٹھائے۔ بلکہ رانوں سے ملائے۔ اگرچہ ان احادیث میں کچھ کلام ہے لیکن ان کے مویدات بھی ہیں اس لئے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔

حضرت اُم سلمہؓ مردوں کی طرح نماز پڑھا کرتی تھیں۔ پس عورت اگر مردوں کی طرح نماز پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ اس طرح کھل کر کرتے کہ دنبے کا بچہ نیچے سے گزر سکتا۔ درندہ کی طرح ہاتھ بچھا کر سجدہ نہیں کرنا چاہئے۔

سجدہ میں دونوں پاؤں کھڑے کرکے پاؤں کی انگلیاں قبلہ رُخ کرے تاکہ باقی اعضاء کے ساتھ ان کا بھی سجدہ ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

سجدہ میں تلاوت قرآن کی ممانعت اور تسبیح کی تعداد

سوال:۔ سجدہ میں قرآن مجید یا اس کی دعا پڑھ سکتا ہے اور تسبیح کی تعداد کم از کم کتنی ہے؟

جواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رکوع و سجدہ میں قرآن مجید نہ پڑھو۔ رکوع میں خدا کی تعظیم کرو۔ اور سجدہ میں دُعا کی کوشش کرو۔ کیونکہ سجدہ میں دُعا قبول ہوتی ہے۔

اس حدیث کے مطابق رکوع میں ظاہر دعا منع معلوم ہوتی ہے مگر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلی بھی بہت کہتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا منع نہیں۔ پس اس حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ رکوع میں اصل تعظیم ہے۔ دعا کی اس میں زیادہ کوشش نہ کی جائے اور سجدہ میں دعا کی کوشش کرنی چاہیئے مگر چونکہ رکوع سجدہ میں قرآن پڑھنے سے ممانعت ہے۔ اس لئے

قرآنی دعاؤں سے احتراز کرے۔ اگرچہ بعض علماء نے کہا ہے کہ قرآن کی دعا تلاوتِ قرآن مجید کی نیت سے پڑھے تو وہ قرآن کا حکم رکھتی ہے۔ اِس نیت سے رکوع وسجدہ میں قرآنی دعا نہ پڑھی جائے اور اگر دعا کی نیت سے پڑھے تو اس لحاظ سے وہ قرآن نہیں۔ رکوع اور سجدہ میں پڑھ سکتا ہے مگر چونکہ اس بارہ میں صراحتًہ کوئی روایت نہیں آئی۔ صرف بعض علماء کی رائے ہے۔ اِس لئے قرآنی دعا سے پرہیز مناسب ہے۔ احادیث میں بکثرت دعائیں آتی ہیں۔ انہی پر اکتفا کرے۔ اگر کسی کو اور دعاء یاد نہ ہو تو مذکورہ بالا دعا ہی کافی ہے۔

سجدہ کی تسبیحات کا اندازہ دس تسبیح قدر ہونا چاہیئے۔

اور ایک ضعیف روایت میں کم ازکم تین مرتبہ بھی آیا ہے۔

فصل رابع مشکوٰۃ میں ہے حضرت علی رضہ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی موقع سخت مجبوری کا ہو تو تسبیح ایک مرتبہ ہی کافی ہے بشرطیکہ ٹھہر کر تسلی سے کہے۔

سجدہ میں منع کی صورت

سوال:۔ سجدہ میں وہ کونسی صورت یا حالت ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جواب:۔ جب سجدہ سے سر اٹھائے اور دونوں ہاتھ دونوں رانوں پر یا گھٹنوں پر رکھے۔ اور بایاں پاؤں بچھا کر اس کے اُوپر بیٹھ جائے اور دایاں پاؤں انگلیوں کے بل کھڑا کرکے ایڑیوں پر بیٹھ جائے۔ تو یہ بھی جائز ہے۔ اس کو اقعاء کہتے ہیں۔ ایک قسم اقعاء کی منع ہے اور وہ یہ ہے کہ گھٹنے کھڑے کرکے چوتڑ ایڑیوں کے ساتھ لگا کر ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھے یہ کتے کی بیٹھک ہے۔ اِس لئے منع ہے۔ اور اقعاء کی اس قسم کو عقبۃ الشیطان بھی کہتے ہیں۔ اقعاء کی پہلی صورت اگرچہ جائز ہے لیکن بایاں پاؤں بچھا کر اس کے اُوپر بیٹھنے کی صورت بہتر ہے۔ کیونکہ زیادہ احادیث میں اس کا ذکر ہے۔

درود میں "علی سیّدنا" کا اضافہ

سوال:۔ زید کہتا ہے۔ اللّٰھم صلّ علی سیّدنا محمّد وعلیٰ اٰل سیدنا محمد وبارک وسلّم یہ درود پڑھنا جائز نہیں کیونکہ سیّد کا لفظ کسی حدیث میں نہیں آیا۔ اس واسطے یہ منع ہے۔ عمرو کہتا ہے کہ یہ درود پڑھنا جائز و درست ہے۔ سیّدنا کا لفظ شرافت و فضیلت کے لئے پڑھے تو کوئی منع نہیں (صدیق)

جواب :۔ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ تلبیہ میں بعض الفاظ اپنی طرف سے زیادہ کر دیا کرتے تھے۔ امام شافعی رحہ کہتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے جو کچھ زیادہ کیا۔ وہ جائز ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ پر اکتفاء کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اس بنا پر اگر جائز لفظ بڑھا لے تو کوئی حرج نہیں۔ ہاں بہتر آپ کے الفاظ پر اکتفاء ہے اور سید کا لفظ آپ کے حق میں جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

انا سید ولد ادم یوم القیمۃ (مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین ا

یعنی میں اولاد آدم کا سردار ہوں قیامت کے دن

اور ایک حدیث میں ہے صحابہؓ نے آپ کو سیدنا (ہمارے سردار) کہا تو فرمایا سید اللہ تعالےٰ ہے پھر صحابہؓ نے کہا آپ ہمارے افضل ہیں۔ تو فرمایا۔ یہ یا اس کا بعض کہو۔ (مشکوٰۃ باب المفاخرہ فصل ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ سید کا لفظ درود میں دو طرح سے بہتر نہیں۔ ایک تو فی نفسہ بہتر خیال نہیں کیا دوم آپ کے الفاظ پر اکتفا نہیں کیا۔ خیر جواز میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ زیادہ نہ کرے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۲ر شوال ۱۳۵۸ھ ۔ ۲۴ر نومبر ۱۹۳۹ء

درود پڑھنے سے کیا مراد ہے

سوال :۔ زید درود پڑھنے کے یہ معنیٰ بیان کرتا ہے کہ موجودہ دور کا مسلمان اپنے درود کی طرف توجہ کرے کہ وہ درود جو صرف تسبیح کے دانوں یا سنگریزوں پر دہرایا جاتا ہے اور تمام زندگی ظلمات میں گذر جاتی ہے۔ یا خود نبی کی راہ میں ظلمات پیدا کی جاتی ہیں۔ اس کے کیا معنیٰ ہیں۔ خدا تعالیٰ کا الصلوٰۃ کا عمل درود میں النبی کے ساتھ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ سے تاریکیوں کو دور کر کے نور کی طرف لے جاتا ہے ایسا ہی فرشتوں کا عمل الصلوٰۃ بھی سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں مخالفوں کی ہر ظلمت کا مقابلہ کر کے نور کی تائید کرتا ہے۔ مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ الصلوٰۃ کا عمل اس طرح دکھائے کہ ہر قسم کی ظلمات کو آپ کی راہ دین اسلام سے دور کرے نہ خود ظلمات کا مرتکب اور عامل ہو اور نہ اوروں کو ظلمات کا مرتکب اور عامل ہونے دے۔ یعنی اپنی زندگی بھی نور سے بھرپور ہو۔ اور اوروں کو بھی نور سے بھرپور کرے۔ یہی "الصلوٰۃ علی النبی" ہے۔ کیا اس کے

پیچھے نماز جائز ہے۔

قاضی محمد نواز سکنہ داجل ضلع ڈیرہ غازی خان

جواب :۔ یہ شخص التحیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا درود پڑھتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑھتا ہے تو اس سے خود ہی اس کے خیال کی تردید ہو گئی۔ اگر نہیں پڑھتا تو یہ شخص گمراہ اور ملحد ہے امامت کے قابل نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا منکر ہے۔ نیز قرآن مجید میں ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

یعنی اے محمد! تو ان پر درود پڑھ بے شک تیرا درود ان کے لئے تسلی کا باعث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

اگر درود کا معنی تاریکی کا دور کرنا ہو تو پھر اس کہنے کا کیا مطلب ہو گا کہ تیرا درود ان کے لئے تسلی ہے۔ ہاں درود کے معنی دعا کے یا رحمت بھیجنے کے ہوں تو پھر مطلب واضح ہے۔ یہ شخص دراصل حدیث کا منکر قرآن کا محرف ہے۔ اس کی اقتداء فی الصلوٰۃ تو کجا اس کو امامت سے کلیۃً علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ خدا ایسے ملحدوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ انبالہ

(مورخہ ۱۰ محرم ۱۳۶۰ھ)

آخر قعدہ میں درود شریف پڑھنا

سوال :۔ درود شریف آخری تشہد میں پڑھنے کا ثبوت صریحاً کس حدیث میں ہے؟

جواب :۔ عن رفاعة بن رافع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قمت فی صلوتك فكبر ثم اقرأ ما تيسر عليك من القران فاذا جلست فی وسط الصلوة فاطمئن وافترش فخذك اليسری ثم تشهد۔ رواہ ابوداؤد

(منتقی باب الامر بالتشہد الاول)

یعنی رفاعہ بن رافعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو اپنی نماز میں کھڑا ہو تو تکبیر کہہ۔ پھر قرآن سے جو آسان ہو پڑھ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ فاتحہ پڑھ اور جو خدا چاہے۔ جب تو درمیان نماز کے قعدہ کرے تو اطمینان سے بیٹھ اور اپنی بائیں ران بچھا لے پھر تشہد پڑھ۔

تلخیص الحبیر میں ہے۔

وروی احمد وابن خزیمۃ من حدیث ابن مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمہ التشہد وکان یقول اذا جلس فی وسط الصلوۃ وفی اخرھا علی ورکہ الیسری التحیات الی قولہ عبدہ ورسولہ قال ثم ان کان فی وسط الصلوۃ ینھض حین یفرغ من تشہدہ وان کان فی آخرھا دعا بعد تشہدہ بما شاء اللہ ان یدعو ثم یسلم۔ (باب صفۃ الصلوۃ)

امام احمدرح اور امام ابن خزیمہ رح نے ابن مسعودرضہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تشہد سکھایا۔ پس جب وہ درمیانہ قعدہ میں بیٹھتے اور آخر قعدہ میں بیٹھتے تو بائیں ران پر بیٹھتے اور التحیات عبدہ ورسولہ تک پڑھتے۔ پھر اگر درمیانے قعدہ میں ہوتے تو صرف تشہد پڑھ کر کھڑے ہوجاتے۔ اور اگر اخیر میں ہوتے تو تشہد کے بعد جو خدا چاہے دعا مانگتے پھر سلام پھیرتے۔

نیل الاوطار اور مشکوٰۃ شریف میں ہے۔

عن فضالۃ بن عبید قال بینما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاعدا ذدخل رجل فصلی فقال اللھم اغفرلی وارحمنی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عجلت ایھا المصلی اذا صلیت فقعدت فاحمد اللہ بما ھو اھلہ وصل علی ثم ادعہ قال ثم صلی رجل آخر بعد ذالک فحمد اللہ وصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایھا المصلی ادع تجب۔ رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی نحوہ

(المشکوٰۃ باب الصلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

یعنی فضالہ بن عبیدرضہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے۔ اس حال میں ایک شخص مسجد میں داخل ہوا نماز پڑھ کر اس نے کہا کہ اے اللہ! مجھے بخش اور رحم کر۔ آپ نے فرمایا۔ اے نمازی! تو نے جلدی کی جب تو نماز پڑھ چکے پس بیٹھے تو پہلے خدا کی شان کے لائق خدا کی تعریف وثنا کر اور مجھ پر درود بھیج پھر دعا مانگ۔ اس کے بعد ایک شخص نے نماز پڑھی۔ پس اس نے خدا کی تعریف کی اور آپ پر درود پڑھا۔ آپ نے اس کو فرمایا اے نمازی دعا کر قبول ہوگی۔

نیل الاوطار میں بحوالہ حاکم اور بیہقی لکھا ہے۔

عن رجل من ال الحارث عن ابن مسعود عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم

اذا تشہد احدکم فی الصلوٰۃ فلیقل الحدیث۔

یعنی ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ایک تمہارا نماز میں تشہد پڑھ چکے تو چاہیئے کہ کہے یعنی درود پڑھے۔

اس روایت میں اگرچہ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرنے والا راوی مجہول ہے۔ مگر عبداللہ بن مسعودؓ کی گذشتہ روایت اس کی مؤید ہے۔ ان سب روایتوں کے ملانے سے ثابت ہوا کہ پہلے قعدہ میں درود و دعا نہیں بلکہ یہ صرف آخری قعدہ میں ہے۔

اس کے علاوہ اور سنیئے۔ منتقیٰ میں ہے۔

عن ابی ہریرۃ رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ احدکم من التشہد الاخیرۃ فلیتعوذ من اربع من عذاب جہنم ومن عذاب القبر ومن فتنۃ المحیا والممات ومن شر المسیح الدجال رواہ الجماعۃ الا البخاری والترمذی (باب یدعوبہ فی آخر الصلوٰۃ)

ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک تمہارا تشہد اخیر سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے پناہ مانگے۔ عذاب جہنم اور عذاب قبر۔ فتنہ حیات و موت۔ فتنہ دجال سے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری تشہد کے بعد یہ دُعا چاہیئے اور فضالہ رض کی گذشتہ حدیث میں ہے کہ دُعا سے پہلے درُود چاہیئے۔ پس اخیری تشہد کے بعد ایک اور طرح سے بھی درُود ثابت ہوگیا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۷ رجب ۱۳۵۹ھ ۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۰ء

آخر التحیات میں چوتڑوں پر بیٹھنا

سوال :۔ مولوی اشرف علی تھانوی رحؒ نے لکھا ہے کہ قعدہ اخیر میں اس طرح بیٹھیں جس طرح

قعدہ اولیٰ میں بیٹھتے ہیں۔ اور ان دونوں قعدوں میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی کی احادیث میں۔ ہے کہ دایاں قدم کھڑا کرو۔ اور اس کی انگلیاں قبلہ کی طرف کرو اور بائیں پر بیٹھو۔ وغیرہ وغیرہ کیا ان کا یہ فرمان درست ہے ؟

جواب۔ ان لوگوں کی عجیب حالت ہے کہ خیانت بھی کرتے ہیں۔ پھر تصریحات کو چھوڑ کر اشاروں کنایوں سے کام لیتے ہیں۔ دیکھئے ترمذی۔ ابوداؤد وغیرہ میں دونوں قعدوں میں فرق کی تصریح ہے۔ ابی حمید رضہ نے دس صحابہ رضہ میں جن میں ابوقتادہ رضہ۔ ابواسید رضہ۔ سہل بن سعد رضہ۔ محمد بن مسلمہ بھی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت ذکر کی جس میں دونوں قعدوں میں فرق بیان کیا۔ ان دسوں نے تصدیق کی اور کہا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اس طرح تھی۔ فرق یوں بیان کیا کہ پہلے قعدہ میں ایک پاؤں کھڑا کیا اور دوسرا پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھ گئے۔ اور آخیری قعدہ میں دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر چوتڑوں پر بیٹھ گئے۔

ہم ان روایتوں کے منکر نہیں جو مولوی اشرف علی نے ذکر کی ہیں۔ ہم اس قعدہ کو سُنّت سمجھتے ہیں جو ان روایتوں میں مذکور ہے۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ چونکہ ان روایتوں میں تصریح نہیں کہ یہ کونسا قعدہ ہے۔ اور دس گیارہ صحابہ رضہ کی روایت میں تصریح ہے۔ اس لئے ان روایتوں کے قعدہ کو اول قعدہ پر حمل کیا جائے گا۔ پس اس طرح سب روایتوں میں موافقت ہو جائے گی۔ اور اگر بعض کو بعض پر ترجیح دی جائے تو بھی صریح غیر صریح پر مقدم ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کے نقل کرنے والے دس گیارہ صحابہ رضہ ہیں۔ رہا کسی کا ان میں سے منسوخ ہونا سو وہ تاریخ معلوم ہونے پر ہے۔ اور یہاں تاریخ معلوم ہی نہیں بلکہ اگر تاریخ معلوم بھی ہو تو حتی الامکان جمع بہتر ہے کیونکہ دلیل پر عمل کرنا دلیل کے بے کار کرنے سے بہتر ہے۔

علاوہ ازیں اور سُنئے مؤطا امام مالکؒ میں عبداللہ بن عمرؓ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا کر کے اور بایاں پاؤں بچھا کر چوتڑوں پر بیٹھے۔ اور موطا میں عبداللہ بن دینار سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضہ کا چوتڑوں پر بیٹھنا قعدہ اخیر میں تھا اب جو روایت مولوی اشرف علی نے نسائی سے ذکر کی ہے اس کی بابت یا تو یہ کہنا چاہیئے کہ اس میں اختصار ہے جو مؤطاء کی روایت سے ظاہر ہو گیا۔ اس صورت میں بقاعدہ الاحادیث یفسر بعضھا بعضا۔ یہ دونوں حدیثیں ایک ہو جائیں گی اور دونوں سے قعدہ اخیر مراد ہو گا یا نسائی کی روایت کو قعدہ اولیٰ پر محمول کیا جائے اور مؤطاء کی روایت کو قعدہ اخیرہ پر حمل کیا جائے۔ اس صورت میں دونوں حدیثیں الگ الگ ہوں گی اور دونوں سے الگ الگ مسئلہ ثابت ہو گا۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

سوال:۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟
جو امام فرض نماز پڑھ کر دعا نہ مانگے اور فوراً چلا جائے تو اس کی کیا فضیلت ہے؟

جواب:۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر جو دعا مانگی جاتی ہے وہ شرعاً درست ہے۔
بعض روایات میں اس کی تصریح بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ابو اسود عامری سے مروی ہے۔

عَنْ اَبِی الْاَسْوَدِ الْعَامِرِیِّ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ صَلَّیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْفَجْرَ فَلَمَّا سَلَّمَ انْحَرَفَ وَرَفَعَ یَدَیْهِ دَعَا۔ الحدیث۔ رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ۔

یعنی ابو اسود عامری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے فجر کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھی تو آپ نے سلام کے بعد ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔

یہ حدیث ضعیف ہے مگر اور روایاتِ عامہ فی الدعاء سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لئے جوازِ رفع یدین فی الدعاء بعد الصلوٰۃ المفروضہ میں کسی کو کلام نہیں۔ ہاں جو لوگ بعض نماز فرض ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں یہ ضرور بدعت کے مرتکب ہیں کیونکہ شرع میں جس امر کا وجوب و ضروری ہونا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو اور اس کو ضروری امر قرار دیا جائے تو وہ ضرور بدعت ہوتا ہے۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھانا ضروری طور سے کسی روایت مرفوع صحیح، حسن سے ثابت نہیں۔ پس فی زمانہ جب کہ عام لوگ رفع الیدین فی الدعاء کو بعد نماز فرض ضروری سمجھتے ہیں تو نہ اٹھانا ہی افضل ہے ورنہ جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے علامہ حافظ ابن القیم رح فرماتے ہیں۔

واما الذی بعد السلام من الصّلوٰۃ مستقبل القبلۃ اوالی المقتدین فلم یکن من هدیہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اصلاً ولا رواہ عنہ باسناد صحیح ولا حسن

(زاد المعاد جلد۱)

یعنی حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ طریقہ (مستمرہ) نہ تھا کہ آپ بعد سلام کے دعا کو قبلہ کی طرف یا مقتدیوں

کی طرف منہ کر کے کرتے ہوں اور نہ ایسا کسی صحیح حسن حدیث میں آیا ہے۔ واللہ اعلم

ابو محمد عبدالجبار مدرس مدرسہ دارالحدیث کھنڈیلہ جے پور

محدث روپڑیؒ۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق اخبار تنظیم میں کئی بار مضمون شائع ہو چکا ہے اور تعدد طرق کی بنا پر بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی حدیث کو ہم نے حسن ثابت کیا ہے بلکہ بعض اسانید حسن لذاتہ ہیں۔ اس لئے ہاتھ اٹھانے میں کوئی خدشہ نہیں بلکہ استحباب ہے۔ ہاں لازمی سمجھنا بری بات اور بدعت ہے۔ اصلاحی طور پر انسان کو ایسا کرنا چاہیئے کہ کبھی اٹھالے اور کبھی نہ اٹھائے تاکہ لوگوں کو عملی رنگ میں تبلیغ ہوتی رہے اور اس کے ضروری ہونے کا خیال ان کے دلوں سے نکل جائے کیونکہ عوام الناس ذرا سختی سے اس کی پابندی کرتے ہیں اور نہ اٹھانے والے پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ دوسرے بعض خواص بھی اس میں مبتلا ہیں اس لئے دوام میں نقصان ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۳ جمادی الاول ۱۳۶۰ھ

سوال: نماز کے بعد ہاتھ اٹھانے کے متعلق کوئی صحیح حدیث نہیں تو پھر جو لوگ دعا مانگتے ہیں۔ وہ بدعت کے مرتکب نہیں ہیں؟۔

جواب: مشکوٰۃ میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قِیْلَ اَیُّ الدُّعَاءِ اَفْضَلُ قَالَ جَوْفَ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ وَ دُبُرَ الصَّلٰوۃِ الْمَکْتُوْبَاتِ۔ (رواہ الترمذی)

یعنی ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کونسی دعاء زیادہ سنی جاتی ہے۔ فرمایا اخیر رات میں اور فرض نمازوں کے بعد۔

اس حدیث میں فرضوں کے بعد دعا مانگنے کا ذکر ہے اور خاص قبولیت کے اوقات میں شمار کیا ہے رہا ہاتھ اٹھانا۔ سو اس کی بابت سیوطیؒ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں چالیس سے اوپر حدیثیں دعا میں ہاتھ اٹھانے کی بابت لائے ہیں۔ چنانچہ وہ رسالہ سبل السلام شرح بلوغ المرام کے آخر میں ملحق ہو کر طبع ہو چکا ہے اور منتقی کے اوپر بھی ایک رسالہ چڑھا ہوا ہے جو اس سوال کا تسلی بخش جواب ہے۔ یہ رسالہ سید علامہ محمد عبدالرحمن بن سلیمان زبیدی یمانیؒ کا ہے۔ خلاصہ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی بابت عام حدیثیں بھی آئی ہیں۔ اور خاص بھی عام حدیثوں سے ایک یہ حدیث ہے۔ جس کو ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ ابن حبان اور حاکم

نے سلمان رضؓ سے روایت کیا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالےٰ کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اللہ تعالےٰ شرم کرتا ہے کہ خالی موڑے۔

اِس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا ہے اور حاکم نے بخاری مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری باب رفع الیدین فی الدعاء میں اس حدیث کی بابت کہا اس کی اسناد جید یعنی کھری ہے اور اس طرح کی حدیث حاکم نے انسؓ سے روایت کی ہے اس کو بھی حاکم نے صحیح کہا ہے۔ مسند احمد اور ابوداؤد میں مالک بن یسارؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ تعالےٰ سے سوال کرو تو ہاتھوں کے اندر سے سوال کرو نہ پیٹھوں سے اور جب فارغ ہو تو ہاتھ منہ پر مل لیا کرو۔ اور ترمذی میں عمر بن خطاب رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تو اُن کو نیچا نہ کرتے جب تک منہ پر نہ مل لیتے۔ اور خاص حدیثوں سے ایک حدیث یہ ہے جس کو ابن سنی نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ ہر نماز کے بعد ہاتھ پھیلا کر مندرجہ ذیل دُعا پڑھے تو اللہ تعالےٰ اُس کے ہاتھوں کو نامراد واپس نہیں کرے گا۔

اَللّٰھُمَّ اِلٰھِیْ وَاِلٰہ ابراھیم واسحاق ویعقوب والٰہ جبریل ومیکائیل واسرافیل اسئلك ان تستجیب دعوتی فانی مضطر وتعصمنی فی دینی فانی مبتلی وتنا ولنی برحمتك فانی مذنب وتنفی عنی الفقر فانی متمسکن۔

اے اللہ! میرے معبود۔ ابراہیم۔ اسحٰق۔ یعقوب کے معبود اور جبریل میکائیل اسرافیل کے معبود میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری دعا قبول کر۔ کیونکہ میں لاچار ہوں۔ دین میں مجھے سایہ رحمت میں لے لے کیونکہ میں گنہگار ہوں۔ مجھ سے محتاجی دُور کر کیونکہ میں مسکین ہوں۔

اِس حدیث کی اسناد میں عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ایک راوی ہے جس میں کچھ کلام ہے لیکن فضائل اعمال میں ضعیف غیر موضوع اور غیر متروک پر عمل درست ہے۔ چنانچہ ابن الہمام نے فتح القدیر کتاب الجنائز میں اس کی تصریح کی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے نکت علی ابن صلاح میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ کے شاگرد ابوالحسان قطان جو اہل مغرب کے حفاظ محدثین سے ہیں۔ بیان وہم وایہام میں فرماتے ہیں کہ ضعیف حدیث کے ساتھ فضائل اعمال میں عمل کیا جاتا ہے۔ اور امام نوویؒ نے اذکار میں کہا ہے کہ فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث کے ساتھ عمل جائز بلکہ مستحب ہے۔ امام نووی نے اپنی اربعین میں کہا ہے کہ

سب کا اس پر اتفاق ہے الا من شذ مثل ابن العربی ۔ اس کے علاوہ ایک اور حدیث اس کو تقویت دیتی ہے جو ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اسود عامری کے باپ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی جب آپ نے سلام پھیرا تو ہماری طرف پھرے اور دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی ۔ اور آئمہ حدیث نے ذکر کیا ہے کہ ضعیف حدیث ضعیف کے ساتھ مل کر معتبر ہو جاتی ہے اور امام جلال الدین سیوطی نے اپنے رسالہ فض الوعا فی احادیث رفع الیدین فی الدعاء میں بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ کہا ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز سے پہلے دعا مانگ رہا ہے جب دعا سے فارغ ہوا تو عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہوتے ۔ راوی اس حدیث کے ثقہ ہیں ۔

یہ اس رسالہ کا خلاصہ ہے اس طرح ایک فتویٰ وہ بھی ہے جو مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی اور علماء دہلی مولوی نذیر حسین صاحب اور ان کے صاحبزادے شریف حسین صاحب ۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب مولوی عبدالرب صاحب اور مولوی احمد حسن صاحب مصنف احسن التفاسیر سب کا متفقہ فتویٰ ہے ۔ رسالہ جرح و تعدیل تصنیف مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی کے آخر میں ملحق ہے ۔ غرض اس خصوص میں کئی علماء نے رسائل اور کئی فتاوی لکھے ہیں ۔ جن کا خلاصہ دو باتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ ضعیف سے استحباب ثابت ہو سکتا ہے اور اس پر عمل درست ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ضعیف حدیث کی موید اور احادیث بھی ہوں تو پھر حدیث ضعیف ہر طرح سے لائق اعتبار ہو جاتی ہے ۔ پس اب فرضوں کے بعد ہاتھ اٹھانے میں کوئی شبہ نہ رہا ۔ ہاں اتنی بات ضروری ہے کہ کبھی کبھی ترک کر دینا مناسب ہے کیونکہ آج کل اسے لازم سمجھے بیٹھے ہیں ۔ اور جب تک امام دعا نہیں مانگتا اس کے منہ کی طرف بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں ۔ اور اگر بغیر مانگے کھڑا ہوا تو اس کو برا مناتے ہیں بلکہ اعتراض کرتے ہیں خاص کر احناف میں تو اس کی بڑی پابندی ۔ خواہ خالی ہاتھ اٹھا کر منہ پر مل لیں ۔ مگر ملنے ضرور ہیں اور ختم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ساتھ کرتے ہیں حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ دعا ختم آمین کے ساتھ کرنی چاہیے چنانچہ یہ احادیث سے ثابت ہے اس سے کم و بیش بالکل نہ کرنا چاہئیے کیونکہ اللہ کی رضا رسول کی اتباع میں ہے نہ غیر کی اتباع میں ۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ۔ الآیۃ

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۲ محرم ۱۳۸۰ھ ۔ ۲۲ جولائی ۱۹۶۰ء

مسئلہ طفیل اور طریقہ دعاء

سوال:۔ بوقت دعاء انبیاء اور اولیاء رح و بزرگان دین کا واسطہ دینا مثلاً زید بوقت دعا یہ کلمات کہے۔ "اے اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یا سید عبدالقادر جیلانی کے واسطے میرا فلاں کام کر دے یا میری دعا قبول فرما۔ کسی صحیح مرفوع حدیث میں ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

سائل محمد شفیع خانپوری علاقہ بہاولپور

از مکہ معظمہ

دیوبندی جواب

یہ سنت طریق نہیں ہے نہ ضرور ہے۔

اِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

اور گناہ بھی نہیں اگر سوال اللہ تعالٰی سے کرتا ہے اور "اس واسطے کے" ذکر کرنے کو قبولیت دعاء کے لئے ضروری نہیں سمجھتا تو جائز ہے۔ اور اگر یہ اعتقاد رکھے کہ بغیر "اس واسطے کے ذکر" دعا قبول نہیں ہوگی تو پھر واسطے کا ذکر کرنا ممنوع ہے۔ (محمد عبداللہ درخواستی ناظم مدرسہ عربیہ خانپور)

دیوبندی جواب پر تعاقب

سوال:۔ مولوی عبداللہ درخواستی کا فتویٰ ارسالِ خدمت ہے غالباً وہ کسی کے طفیل کے ساتھ دعاء کرنے کو بدعتِ حسنہ سمجھتے ہیں۔ آپ اس پر کچھ تفصیل روشنی ڈالیں۔ اور اس طفیل کے مسئلہ میں بھی تحریر فرمائیں کہ دعا مانگنے کا سنت طریقہ کیا ہے مکہ شریف میں مولوی عبدالحق صاحب سے سنا تھا وہ فرماتے تھے۔ دُعا مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے الحمد شریف پھر دعا پھر آمین اور پھر درود شریف۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

(محمد شفیع از مکہ مکرمہ)

جواب:۔ اس طرح دعا کرنا بدعت ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔

حدیث میں ہے۔

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھو رد (مشکوٰۃ)

یعنی جو کوئی ہمارے دین میں نیا کام جاری کرے جو دین میں نہیں وہ مردود ہے۔

اس مسئلہ کی تفصیل ہمارے رسالہ دعا بحرمت انبیاء میں ہے۔

اور دین میں بدعت حسنہ کا وجود ہی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

کل بدعة ضلالة

یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔

ہاں دین میں کوئی چیز ثابت ہو۔ جیسے عثمانی (جمعہ کی پہلی) اذان پر اجماع ہو گیا۔ اور اجماع شرعی دلیل ہے۔ پس شرع میں اس کا وجود ثابت ہو گیا۔ چنانچہ اس کا ذکر فتح الباری میں ہے۔ اب لغوی معنیٰ سے اس کو بدعت کہا جا سکتا ہے نہ شرعی معنیٰ سے کیونکہ شرع میں اس کا وجود ہے۔

اِس طرح پہلے کوئی کام ہوتا ہو اور کسی وجہ سے ترک ہو گیا ہو تو اس کو کوئی جاری کرے تو اس کو بھی لغوی معنیٰ سے بدعت کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضہ نے تراویح کو بدعت کہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن نماز پڑھائی۔ پھر فرض کے خوف سے ترک کر دی۔ جیسے مسلم شریف میں ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہونے کی وجہ سے فرض کا خوف نہ رہا۔ اس لئے حضرت عمر رضہ نے جاری کر دیں۔

یہی معنیٰ ہے۔ من سن سنة حسنة فی الاسلام ۔الحدیث کا۔ یعنی اچھا طریق جو اسلام میں ثابت ہو اور کسی وجہ سے بند ہو گیا ہو کوئی اس کو جاری کر دے تو اس کے لئے اپنا اور جو اس پر عمل کرے ان سب کا ثواب ہے لیکن دین میں ایسا نیا کام جاری کرنا جو قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک تجدید دین ہے اور ایک احداث فی الدین ۔ تجدید تو ایک شرعی بات کا اجرا ہے یا لوگوں کو دین کے لئے بیدار کرنا اور احداث فی الدین یہ ہے کہ جو اَمر قرآن و حدیث سے ثابت نہیں اس کو دین میں داخل کرنا۔ پہلا کام بہت اچھا ہے اس کی خاطر اللہ تعالے ہر صدی کے سر پر ایسے لوگوں کو بھیجتا ہے جو دین کی تجدید کریں۔ اور دوسرا کام گمراہی ہے۔ اس لئے اس کو مردود فرمایا گیا۔ سائل کا سوال دوسرے سے ہے (مولوی عبداللہ درخواستی) نے اول کے ساتھ جواب دے دیا۔ اِسی کو کہتے ہیں۔

سوال از آسماں جواب از ریسماں

خداوند تعالےٰ ہدایت نصیب فرمائے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

نوٹ :۔ طریقہ دعا جو مولوی عبدالحق صاحب نے بتایا ہے ٹھیک ہے۔ چنانچہ دعاء قنوت وتر میں درود شریف اخیر میں اور آمین بھی اخیر میں آئی ہے۔ چنانچہ ابوزبیر نمیری کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے دعا بہت عاجزی سے مانگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس شخص نے دعا کی قبولیت کو واجب کر لیا اگر ختم کرے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! کس شے کے ساتھ ختم کرے۔ آپؐ نے فرمایا آمین کے ساتھ (مشکوٰۃ باب فی الصلوٰۃ فصل ثانی)

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ اہل حدیث لاہور

۲۵ ربیع الاوّل ۱۳۸۳ھ ۔ ۱۶ اگست ۱۹۶۳ء

نماز میں بعض امور کا ارتکاب

نماز کا توڑنا

سوال :۔ جماعت ہو رہی ہے۔ ایسے وقت ایک شخص کنوئیں میں گر پڑتا ہے یا کسی کے گھر آگ لگ جاتی ہے یا اس قسم کا کوئی اور حادثہ ہو جائے تو کیا نمازی نماز توڑ کر اس کی امداد کریں۔ یا نماز جاری رکھیں؟

حاکم علی گجراتی چک ۴/۱ ڈاکخانہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری

جواب :۔ کسی کے کنوئیں میں گرنے کی خبر آجائے یا اس قسم کا کوئی اور حادثہ ہو جائے تو نماز توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے سواری کے بھاگ جانے کے خطرہ سے نماز توڑ دی تھی ملاحظہ فصل رابع مشکوٰۃ۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ ۲۴ جون ۱۹۳۸ء

نماز میں کپڑا سنوارنا

سوال:۔ نماز میں کپڑا وغیرہ سنوارا جاسکتا ہے ؟ کپڑے کو ادھر اُدھر اور سجاؤ کرنا درست ہے یا نہیں

جواب:۔ مراسیل ابی داؤد میں ہے۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلًا یَسْجُدُ اِلٰی جَنْبِہٖ وَقَدِ اعْتَمَّ عَلٰی جَبْھَتِہٖ فَحَسَرَ عَنْ جَبْھَتِہٖ (نیل الاوطار جلد ۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا آپ کے پہلو میں سجدہ کرتا ہے اور ماتھے پر پگڑی باندھے ہوئے ہے سجدہ کرتے وقت پگڑی پیچھے ہٹا لیتا ہے۔

ابن ابی شیبہ میں ہے:۔

رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رَجُلًا یَسْجُدُ عَلٰی کَوْرِ الْعِمَامَۃِ فَاَوْمَأَ بِیَدِہٖ اِرْفَعْ عِمَامَتَکَ ۔

یعنی ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ اپنی پگڑی کے پیچ پر سجدہ کرتا ہے اُس کی طرف اشارہ کیا اپنی پگڑی اُوپر کرلے۔

منتقیٰ میں ہے۔

عَنِ ابن عباس قال لَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ یَوْمٍ مَطِیْرٍ وَھُوَ یَتَّقِی الطِّیْنَ اِذَا سَجَدَ بِکِسَاءٍ عَلَیْہِ یَجْعَلُہٗ دُوْنَ یَدَیْہِ اِلَی الْاَرْضِ اِذَا سَجَدَ ۔ رواہ احمد

یعنی حضرت ابن عباس رضہ کہتے ہیں کہ بارش والے دن میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا کہ آپ سجدہ کرتے وقت کیچڑ سے بچتے تھے آپ پر ایک کمبل تھا۔ سجدہ کے وقت اس کو ہاتھوں کے نیچے کر دیتے تاکہ ہاتھوں کو کیچڑ نہ لگے۔

نیز منتقیٰ "باب المصلی یسجد علی مایحملہ الخ" میں ہے :۔

عَنْ اَنَسٍ کُنَّا نُصَلِّیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ شِدَّۃِ الْحَرِّ فَاِذَا لَمْ یَسْتَطِعْ اَحَدُنَا اَنْ یُّمَکِّنَ جَبْھَتَہٗ مِنَ الْاَرْضِ بَسَطَ ثَوْبَہٗ فَسَجَدَ عَلَیْہِ ۔ رواہ الجماعۃ ۔

یعنی حضرت انس رضہ کہتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت گرمی میں نماز پڑھتے جب

ہم میں سے کوئی اچھی طرح ماتھا زمین پر نہ رکھ سکتا تو زمین پر کپڑا اچھاتا اور اُس پر سجدہ کرتا۔
نیز منتقی کے اسی باب میں ہے :۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ جَاءَ نَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی بِنَا فِیْ مَسْجِدِ بَنِیْ عَبْدِ الْاَشْهَلِ فَرَأَیْتُهٗ وَاضِعًا یَدَیْهِ فِیْ ثَوْبِهٖ اِذَا سَجَدَ۔ رواہ احمد وابن ماجۃ وقال علی ثوبہ۔

یعنی عبداللہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے مسجد بنی عبدالاشہل میں ہمیں نماز پڑھائی۔ میں نے آپ کو دیکھا کہ سجدہ کرتے وقت ہاتھ کپڑے پر رکھتے۔

عن ابن عبّاس انّ النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم صلی فی ثوب واحد یتقی بفضولہ حرالارض وبردھا (ش) عن ابن عباس ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم صلی فی کساء فخالف بین طرفیہ فی یوم بارد یتقی بالکساء کھیئۃ الحاقن (عب) منتخب کنزالعمال جلد ۳ صہ ۱۴۲)

ابن عباسؓ سے روایت ہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی۔ اس کے دامن کے ساتھ زمین کی گرمی اور اُس کی سردی سے بچتے۔ نیز اسی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سردی کے دن میں ایک کمبل میں اس کی دائیں طرف بائیں کندھے پر اور بائیں طرف دائیں کندھے پر ڈال کر نماز پڑھی۔ اس کمبل کے ساتھ کنکروں سے بچتے تھے جیسے ڈنگر پھیر مارتا ہے اس طرح کمبل کے دامن کو سجدہ جانے کے وقت آگے کو مارتے تاکہ ماتھے اور ہاتھوں کے نیچے آجائے۔
نیز منتخب کنزالعمال میں ہے۔

عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ثابت الصلت عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قام یصلی فی بنی عبد الاشہل وعلیہ کساء ملتف بہ یضع یدہ علیہ یتقیہ برد الحصا۔ ابن خزیمہ وابونعیم (جلد ۳ صہ ۱۴۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبدالاشہل میں نماز پڑھی اور آپ کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ اپنے ہاتھ کو کنکروں کی سردی سے بچاتے تھے۔ یعنی کمبل پر ہاتھ رکھ کر سجدہ کرتے تھے۔
بخاری صہ ۵۹ میں ہے۔

وضع ابواسحق قلنسوته فی الصلوٰۃ رفعھا۔

یعنی ابواسحٰق نے نماز میں اپنی ٹوپی رکھی اور اٹھائی۔

اِن سب روایتوں سے ثابت ہے کہ نماز میں کپڑا وغیرہ سنوارنا ضرورت کے لئے جائز ہے۔

عبداللہ امرتسری

پاؤں کو بار بار ملانا

سوال:۔ زید کہتا ہے کہ جماعت میں بار بار پاؤں کو جوڑنا منع ہے۔ عمرو کہتا ہے بار بار پاؤں جوڑنے میں نقص نماز نہیں بلکہ نماز کا کامل کرنا ہے۔ اگر کوئی حدیث اس بارہ میں ہے مطلع فرمائیں۔

صدرالدین قریشی سکنہ بھگیاڑی منڈی واربرٹن ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ بار بار ملانے کا اگر یہ مطلب ہے کہ قیام میں نہیں ملائے جاتے رکوع میں ملائے جاتے ہیں۔ پھر سجدہ میں اپنی جگہ سے ہٹائے جاتے ہیں پھر اُٹھ کر ملائے جاتے ہیں جیسے جاہلوں کی عادت ہے ایسا عداً کرنا اور ملانا تو ٹھیک نہیں کیونکہ نماز میں بلاوجہ پاؤں کو اِدھر اُدھر کرنا ناجائز ہے بلکہ تمام نماز میں پاؤں ایک جگہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ نماز میں فضول حرکت نہ ہو۔ ہاں اگر اتفاقیہ پاؤں ادھر اُدھر ہو جائے یا درمیان صف سے کوئی شخص نکل جائے تو ایسی صورت میں ملانا ضروری ہے۔ اِس کے لئے عام حدیث آئی ہے جو صف کو ملائے خدا اس کو ملائے گا۔ (مشکوٰۃ تسویۃ الصف فصل ۲)

اگر کوئی شخص جہالت کی وجہ سے پاؤں کو ہٹاتا جائے اور دُوسرا پاؤں پھیلاتا ہوا اس کے نزدیک کرتا چلا جائے یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ نمازی کو حکم ہے کہ دوسرے نمازی کے کندھے سے اپنا کندھا اور پاؤں سے پاؤں ملائے۔ پس اس کو چاہیئے کہ اپنا پاؤں اپنے کندھے کی سیدھ میں رکھے تاکہ دوسرے کے کندھے اور پاؤں سے مل سکے۔ اب جو شخص اپنا پاؤں اپنے کندھے کی حد سے اندر کر لیتا ہے وہ حد کو توڑتا ہے۔ پس دوسرا اپنی حد کو توڑ کر اس حکم کا خلاف کیوں کرتا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا پاؤں اس کے نیچے کرتا جاتا ہے۔ اور اپنی نماز میں بھی خلل ڈالتا ہے۔ ملانا صرف اسی حد تک ہے جو شرع نے اس کے لئے مقرر کی ہے نہ کہ دوسرے کے نیچے داخل ہو جائے اور بعض جاہل پاؤں خوب چوڑے کرتے رہتے ہیں۔ اور کندھوں کا خیال ہی نہیں کرتے۔ کندھوں کے انداز سے پاؤں بالکل چوڑے نہ کرنے چاہییں تاکہ پاؤں

اور کندھے دونوں مل سکیں — عبداللہ امرتسری روپڑی

گاڑی پر سوار ہونے کے لئے فرض نماز کا توڑنا

سوال :۔ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے اسی حال میں گاڑی آگئی جس پر اُس نے سوار ہونا ہے۔ کیا وہ شخص نماز چھوڑ سکتا ہے۔ اور وہ دوبارہ پوری نماز پڑھے یا جتنی باقی رہ گئی تھی اتنی ہی پڑھے۔

جواب :۔ ہاں نماز چھوڑ سکتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اکیلا فرض پڑھ رہا ہو اور جماعت کے لئے اقامت ہو جائے تو فرض چھوڑ کر نماز میں شامل ہونے کا حکم ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اکیلے کی نماز سے جماعت کی نماز افضل ہے۔ ایسے ہی گاڑی آنے کے وقت جو نماز پڑھے گا وہ بے قراری اور بے چینی کی نماز ہوگی۔ اور جو گاڑی پر سوار ہونے کے بعد پڑھے گا وہ تسلی اور اطمینان کی نماز ہوگی جو افضل ہے۔
اس بنا پر نماز توڑ کر گاڑی پر سوار ہونے کے بعد تسلی اور اطمینان سے نماز پڑھے۔ پہلی نماز پر بنا کرنا ثابت نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

(تنظیم ۵ مارچ ۱۹۶۵ء)

امامت کا بیان

امامت کس کا حق ہے

سوال :۔ جو امام مسجد جہری نماز میں قرآن کریم کو صحیح وصاف نہ پڑھتا ہو یا بوجہ زبان کی لکنت کے قرآن کے کلمات صاف نہ نکل سکتے ہوں۔ اور علاوہ زیر۔ زبر کی غلطیوں کے بھولتا۔ اٹکتا بھی اور حافظ قرآن بھی نہ ہو۔ اور مقتدیوں میں چند حافظ صحیح وعمدہ وصاف پڑھنے والے موجود ہوں تو کیا ایسا شخص جو قرآن صحیح وصاف نہ پڑھنے والا ہو وہ امامت کا مستحق ہو سکتا ہے تو اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا کہ جس میں صاف طور پر یہ ہے کہ امامت کا مستحق وہ ہے جو قرآن اچھا پڑھ سکتا ہو۔

جواب :۔ صورت مسئولہ میں امام مسجد مذکور امامت کا مستحق نہیں ہے اس صورت میں مقتدیوں میں

سے وہ مقتدی امامت کا مستحق ہے۔ جو حافظِ قرآن ہو اور قرآن صحیح وصاف پڑھتا ہو۔

چنانچہ حدیث میں ہے۔

عن ابن ابی مسعود عقبة بن عمرو قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یؤم القوم اقرأهم لکتاب الله الحدیث رواہ احمد ومسلم قال القاضی الشوکانی فی النیل قد اختلف فی المراد من قوله یؤم القوم اقرأهم فقیل المراد احسنهم قرأة وان کان اقلهم حفظا وقیل اکثرهم حفظا للقران ویدل علی ذالک ما رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجاله رجال الصحیح ۔ عن عمرو بن سلمة انه قال انطلقت مع ابی الی النبی صلی الله علیه وسلم باسلام قومه فکان فیما اوصانا لیؤمکم اکثرکم قرانا فکنت اکثرهم قرانا فقدمونی اخرجه ایضا البخاری وابوداؤد والنسائی ۔

یعنی قوم کی امامت اللہ کی کتاب (قرآن مجید) زیادہ پڑھنے والا کرے۔ قاضی شوکانی رح نے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ محدثین رح نے اقرأ (زیادہ پڑھنے والا) کے کئی معنی کئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مُراد وہ ہے جو بہترین طریقہ سے پڑھنے والا ہو۔ اگرچہ قرآن مجید اس کو کم یاد ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو زیادہ قرآن کا حافظ ہو۔ اس مطلب کی وہ روایت تائید کرتی ہے جس کو طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔ اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔ عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ جب میرا باپ اپنی قوم کے اسلام لانے کی خبر لے کر آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں بھی اپنے باپ کے ساتھ گیا۔ آپ کی وصیتوں میں سے ایک وصیت ہم کو یہ تھی کہ زیادہ قرآن والا امامت کرے۔ میں زیادہ قرآن والا تھا انہوں نے مجھ کو امام بنایا۔

عبدالرحمٰن مبارک پوری ۔ ۱۱ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ

محدث روپڑی فرماتے ہیں کہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے جواب کے بعد کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی مگر بعض جگہ کچھ تشریح کی ضرورت ہے اس لئے مختصر سی روشنی ڈالتے ہیں۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے ابومسعود رض کی حدیث ذکر کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو قرآن مجید کا زیادہ ماہر اور حافظ ہو وہ امامت کا حق دار ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ایسے شخص کو امام بنانا جو حفظ اور مہارت میں اس سے کم ہو مناسب نہیں۔ پس جب کم حفظ اور کم مہارت والے کو زیادہ ماہر اور حافظ کے مقابلہ

ہیں امام بنانا ٹھیک نہ ہوا تو موٹی زبان والے اور غلط پڑھنے والے کو امام بنانا کس طرح ٹھیک ہوگا۔

الرحمۃ المھداۃ فصل رابع مشکوٰۃ میں ہے۔

عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تؤمن امرأۃ رجلا ولا اعرابی مهاجرا ولا یؤمن فاجر مؤمنا الا ان یقهره بسلطان یخاف سوطه و سیفه۔ رواہ ابن ماجہ (الرحمۃ المھداۃ)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت مرد کی امامت نہ کرائے۔ نہ جنگلی مہاجر کی اور نہ فاجر مومن کی امامت کرائے مگر یہ کہ جبراً امام بن جائے اور مومن اس کے چابک اور اس کی تلوار سے ڈرتا ہو تو ایسی صورت میں مومن کا فاجر کے پیچھے نماز پڑھ لینا کوئی حرج نہیں۔

اس حدیث میں ارشاد ہے کہ جنگلی مہاجر کی امامت نہ کرائے۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ جنگلی کی زبان موٹی ہوتی ہے اور وہ الفاظ صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ جب صحیح پڑھنے والا شخص موجود ہو تو ایسے وقت موٹی زبان والے کا حق امامت نہیں۔ اور یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر مولوی عبدالرحمن صاحب نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے اس لئے اس کا ضعیف ہونا مضر نہیں بلکہ اس سے مسئلہ کی زیادہ تصریح ہوگئی۔

مولوی ثناء اللہ صاحب نے بھی پرچہ اہل حدیث مورخہ ۲ نومبر ۱۹۳۲ء میں اس سوال کا جواب دیا ہے مگر ایک طرح سے جواب دینے سے انکار ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

" ایسے مسائل میں واقعات کا علم ہونا ضروری ہے یعنی وہ اغلاط معلوم ہوں جو امام مذکور سے صادق ہوتی ہیں۔ کیونکہ بعض اغلاط قابل معافی بھی ہیں۔ امام منصوب کو معمولی باتوں سے معزول کرنا جائز نہیں پس جب تک اغلاط کا علم نہ ہو فتویٰ صحیح نہیں دیا جاسکتا۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ بعض اغلاط قابل معافی بھی ہیں مگر یہ اپنے لئے ہے نہ یہ کہ دوسرا جو صحیح پڑھ سکتا ہو وہ بھی ان اغلاط کے سننے کا مامور ہو پس غلط پڑھنے والے امام کو چاہیئے کہ فوراً امامت سے علیحدہ ہوجائے تاکہ دوسرے لوگ اس کے اغلاط سننے کے لئے مجبور نہ ہوں۔ خاص کر جب لوگ غلط پڑھنے کی وجہ سے اس کی امامت کو پسند نہ کرتے ہوں تو اس صورت اس کا امام رہنا زیادہ بُرا ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ تین شخصوں کی نماز کانوں سے اُوپر نہیں جاتی۔ ایک غلام آقا سے بھاگنے والا،

دوم عورت جس پر خاوند ساری رات ناراض رہا۔ سوم کسی قوم کا امام جس پر مقتدی ناراض ہوں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ تین کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ ایک یہی امام جس کو لوگ برا جانتے ہیں۔ دوسرا جس کی نماز (باجماعت) فوت ہو جائے۔ تیسرا جو آزاد کو غلام بنا لے۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۵ رمضان ۱۳۵۳ھ ۔ ۳ دسمبر ۱۹۳۴ء

دائم المریض اور قصوروار امام کی امامت

سوال:۔ زید ایک نابینا حافظ مسجد کا امام ہے اس میں یہ نقص ہیں۔

۱۔ دائم المریض ہے پانچ منٹ وضو قائم نہیں رکھ سکتا۔ بے علم ہے چند ایک لمبی سورتیں حفظ ہیں۔ امام مذکور کے اعزہ میں بیوی اور خاوند کے درمیان ناچاقی تھی۔ اس امام کے مشورہ سے وہ عورت اپنے رشتہ داروں میں چلی گئی۔ وہاں کسی کے گھر آباد ہو گئی۔ اس صورت میں جیسا زانی کو گناہ ویسا اصلاح کار کو گناہ ہے۔ قرآن مجید کی قرأت میں غلطیاں کرتا ہے۔ عیب جوئی اس کا کام ہے۔ حضورؐ کا نام لیتا ہے تو درود نہیں پڑھتا۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔

جواب:۔ عن ابی مسعودؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنْ كَانُوْا فِى الْقِرَاْءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا فِى السُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِى الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِنًّا وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِى سُلْطَانِهٖ وَلَا يَقْعُدُ عَلٰى تَكْرِمَتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِ اَهْلِهٖ۔ رواہ مسلم وفی روایۃ ولا یؤمن الرجل الرجل فی اھلہ (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو قرآن مجید کا زیادہ ماہر ہو وہ امامت کرائے۔ اگر قرآن میں برابر ہوں تو جو حدیث میں زیادہ ماہر ہو۔ اگر حدیث میں بھی برابر ہوں تو جس نے پہلے ہجرت کی ہو۔ اگر ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو۔ اور جہاں کسی کے اختیارات ہوں وہاں دوسرا امامت نہ کرائے اور نہ اس کی عزت کی جگہ میں بیٹھے مگر اس کے اذن سے۔

۲۔ عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثَلٰثَةٌ لَا تُقْبَلُ

مِنْھُمْ صَلٰوتُھُمْ مَنْ تَقَدَّمَ قَوْمًا وَھُمْ لَہٗ کَارِھُوْنَ وَرَجُلٌ اَتَی الصَّلٰوۃَ دِبَارًا وَالدِّبَارُ اَنْ یَّاْتِیَھَا بَعْدَ اَنْ تَفُوْتَہٗ وَرَجُلٌ اِعْتَبَدَ مُحَرَّرَۃً۔ رواہ ابُوداؤد وابن ماجۃ (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی ایک وہ شخص جو قوم کی امامت کرائے اور لوگ اس کی امامت پسند نہ کریں۔ دوسرا جو شخص جماعت سے فارغ ہونے کے بعد آئے تیسرا جس نے آزاد کو غلام بنالیا۔

۳۔ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَۃٌ لَا تُجَاوِزُ صَلٰوتُھُمْ اٰذَانَھُمْ اَلْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰی یَرْجِعَ وَامْرَاَۃٌ بَاتَتْ وَزَوْجُھَا عَلَیْھَا سَاخِطٌ وَاِمَامُ قَوْمٍ وَھُمْ لَہٗ کَارِھُوْنَ۔

تین شخصوں کی نماز ان کے کانوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ آقا سے بھاگا ہوا غلام یہاں تک کہ لوٹے۔ عورت جس کا خاوند اس پر ناراضگی میں رات گذارے۔ قوم کا امام جس کی امامت کو قوم پسند نہ کرے۔

۴۔ عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثۃ لا ترفع صلوتھم فوق رؤسھم شبرا رجل ام قوما وھم لہ کارھون وامراۃ باتت وزوجھا علیھا ساخط واخوان متصارمان۔ رواہ ابن ماجۃ (مشکوٰۃ)

یعنی تین شخصوں کی نماز ایک بالشت بھر سر سے اُوپر نہیں چڑھتی۔ قوم کا امام جس کی امامت کو قوم پسند نہ کرے۔ عورت جس پر اس کا خاوند ناراضگی میں رات گذارے۔ دو مسلمان بھائی جو رنج کی وجہ سے آپس میں نہیں ملتے۔

سوال میں جو نقائص بیان کئے گئے ہیں اگر واقعی امام میں موجود ہیں اور باوجود اُن کو دُور کر سکنے کے دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو ایسا امام امامت کا حق دار نہیں۔ اخیر کی تین حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اگر قوم ناراض ہو تو اس امام کی نماز قبول نہیں۔ بے جا ناراضگی معزولی امامت کا سبب نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ناراضگی بے جا نہ ہو۔ مثلاً وہ بے نماز کا جنازہ نہیں پڑھاتا یا ان کے نکاح وغیرہ نہیں پڑھاتا یا اس قسم کے اور بعض وجوہات ہیں۔ تو ایسی ناراضگی شرعًا معتبر نہیں بلکہ ناراضگی رکھنے والے قصوروار ہیں۔ ایسی ناراضگی سے امام کی نماز کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ چنانچہ جن باغیوں نے حضرت عثمان رضہ کو شہید کیا۔ اور

حضرت عثمان کی امامت پر راضی نہ تھے۔ اُنہوں نے اپنا اور امام مقرر کر لیا تھا۔ جیسے بخاری میں ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عثمانؓ کی امامت صحیح نہ رہے۔ ہاں اگر ایسے نقائص اور عیوب ہوں جن کا ذکر سوال میں ہے یا اس قسم کے اور ہوں تو ایسا شخص بلا شبہ اس وعید کا مستحق ہے جن کا ذکر ان تین حدیثوں میں ہے لوگوں کو چاہیے کہ ایسے شخص کو فوراً امامت سے جدا کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک شخص کو نماز میں قبلہ کی طرف تھوکنے پر امامت سے معزول کر دیا۔ (مشکوٰۃ)

یہ نقائص اور عیوب تو بڑے بڑے ہیں۔ ہاں اگر یہ شخص زور والا ہو اور جبراً امام بنا ہوا ہو۔ لوگ اس کے ہٹانے پر قادر نہ ہوں تو لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں ان کی نماز ہو جائے گی۔ جیسے صحابہ رضا ظالم بادشاہوں (مروان بن حکم اور حجاج بن یوسف جیسوں کے) پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ ہاں مشرک کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اس کے پیچھے بالکل نہ پڑھے۔ اگر اتفاقیہ پڑھی جائے تو دہرا لے۔

تقویٰ اور علم

پہلی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امامت میں علم اور تقوی اور عمر کا لحاظ ضروری ہے۔ قرآن کا ماہر حدیث کے ماہر پر مقدم ہے۔

مہارت کا مفہوم

لیکن مہارت سے مراد ہر طرح کی مہارت ہے یعنی الفاظ بھی درست ہوں معنیٰ اور مطلب میں بھی پوری لیاقت ہو۔ علم تفسیر سے واقف ہو۔ اگر ایک قاری اور حافظ ہو۔ اور دوسرا قرآن مجید کے معانی سے واقف ہو۔ اور قرآن مجید کے الفاظ غلط نہ پڑھتا ہو۔ اس کے بعد جو حدیث میں زیادہ ہو پھر ہجرت میں پہلے ہو۔ یہ پرہیزگاری اور عمل کے لحاظ سے قدیم ہے۔ پھر جو عمر میں زیادہ ہو۔ [1]

حنفیہ کا امام

حنفیہ نے حسب نسب پر چہرے کی خوبصورتی کا بھی اعتبار کیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ خوبصورت عورت والا غیر خوبصورت عورت والے پر مقدم ہے۔ بعض نے اس سے بھی ترقی کر کے یہ کہدیا ہے کہ جس کا سر بڑا ہو۔ اور آلت چھوٹی ہو وہ اس پر مقدم ہے جو ایسا نہ ہو لیکن یہ محض قیاسات ہیں۔ حدیث میں جو کچھ آگیا اس پر عمل

[1] بعض روایتوں میں عمر کی جگہ اسلام آیا ہے یعنی ہجرت کے بعد جس کا اسلام پہلے ہو وہ مقدم ہے (منتقی)

چاہیے۔

پہلی حدیث سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں کسی کا اختیار ہو وہاں دوسرے کو امامت کرنی جائز نہیں اور کسی کی خاص عزت والی جگہ بیٹھنا بھی جائز نہیں۔ ہاں اذن دے دے تو درست ہے چنانچہ حدیث میں الا باذنہ کا لفظ ہے۔

اذن کا مفہوم

اذن میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ امامت کے ساتھ بھی لگتا ہے اور عزت والی جگہ میں بیٹھنے کے ساتھ بھی لگتا ہے۔ یعنی جہاں کسی کا اختیار ہو اگر وہ امامت کی اجازت دے دے تو امامت کرانی جائز ہے بعض کہتے ہیں عزت والی جگہ میں اذن کے ساتھ بیٹھنا جائز ہے۔ امامت کسی صورت جائز نہیں۔ دلیل ان کی مندرجہ ذیل حدیث ہے۔

عَنْ اَبِیْ عَطِیَّۃَ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ کَانَ مَالِکُ بْنُ الْحُوَیْرِثِ یَاْتِیْنَا اِلٰی مُصَلَّانَا یَتَحَدَّثُ فَحَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ یَوْمًا قَالَ اَبُوْ عَطِیَّۃَ فَقُلْنَا لَہٗ تَقَدَّمْ فَصَلِّہٖ قَالَ لَنَا قَدِّمُوْا رَجُلًا مِّنْکُمْ یُصَلِّیْ بِکُمْ وَسَاُحَدِّثُکُمْ لِمَ لَا اُصَلِّیْ بِکُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا یَؤُمَّھُمْ وَلْیَؤُمَّھُمْ رَجُلٌ مِّنْھُمْ۔ رواہ ابو داود والترمذی والنسائی الا انہ اقتصر علی لفظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (مشکوۃ)

ابو عطیہ کہتے ہیں۔ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہمارے پاس ہماری نماز گاہ میں آیا کرتے تھے۔ ایک روز نماز کا وقت آگیا۔ ہم نے کہا نماز پڑھائیے فرمایا تم اپنے میں سے کسی کو آگے کرو تاکہ نماز پڑھائے اور میں اس لئے نماز نہیں پڑھاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے جو کسی قوم کی زیارت کرے وہ ان کو نماز نہ پڑھائے بلکہ انہی میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے۔

مالک بن حویرث نے باوجود اجازت کے بھی نماز نہیں پڑھائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت کے ساتھ اذن کا کوئی تعلق نہیں۔ جو کہتے ہیں ان دونوں کے ساتھ اذن لگتا ہے ان کے کئی دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: پہلی حدیث میں امامت اور عزت والی جگہ میں بیٹھنے سے منع کرنے کے بعد الا باذنہ ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اذن دونوں کے ساتھ لگتا ہے ایک کے ساتھ خاص کرنا بے دلیل ہے

مالک بن حویرث رضہ کی حدیث میں چونکہ الا باذنہ نہیں اس لئے مالک بن حویرث نے مطلقاً منع سمجھا۔ امام احمد شافعی رہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک کوئی قرینہ نہ ہو کہ اذن صرف عزت والی جگہ میں بیٹھنے کے ساتھ لگتا ہے۔ امامت کے ساتھ نہیں لگتا۔ اس وقت تک ایک کی تخصیص نہیں (نیل الاوطار)

نیل الاوطار میں بحوالہ بزار عبداللہ بن حنظب کی روایت ذکر کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الرَّجُلُ اَحَقُّ بِصَدْرِ فِرَاشِہٖ وَ اَحَقُّ بِصَدْرِ دَابَّتِہٖ وَاَحَقُّ اَنْ یَّؤُمَّ فِیْ بَیْتِہٖ۔

یعنی مرد اپنے بستر اور سواری کے اگلے حصہ کا اور اپنے گھر میں امامت کرانے کا زیادہ حقدار ہے۔

اِس حدیث میں مطلق فرمایا ہے کہ مرد اپنی سواری کے اگلے حصہ کا زیادہ حقدار ہے اس کے ساتھ اذن کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن دوسری حدیث میں اذن کا ذکر آگیا ہے جس کے راوی بریدہ رضہ ہیں۔ ٹھیک اس طرح امامت کے مسئلہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔ مالک بن حویرث کی حدیث میں ذکر نہیں لیکن ابومسعود کی حدیث میں ذکر آگیا ہے۔ پس انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

دوسری دلیل:۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلَّیْتُ اَنَا وَالْیَتِیْمُ فِیْ بَیْتِنَا خَلْفَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاُمِّیْ خَلْفَنَا اُمُّ سُلَیْمٍ۔ (منتقی)

یعنی انس رضہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہم نے اپنے گھر میں نماز پڑھی۔ میں اور ایک یتیم آپ کے پیچھے تھے۔ اور میری والدہ اُم سلیم رضہ ہمارے پیچھے تھی۔

یہ نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انس رضہ کے گھر میں پڑھائی ہے۔ اگر دوسرے کے اختیار والی جگہ میں امامت جائز نہ ہوتی تو آپ نہ پڑھاتے۔ اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف گئے ہیں تو وہاں آپ ہی امامت کراتے تھے۔ وہاں کا امام امامت نہیں کراتا تھا لیکن یہ دلیل کچھ کمزور ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہ تھے اس لئے جہاں آپ جاتے وہاں آپ اختیار والے تھے جیسے کسی جگہ کا کوئی متولی ہوتا ہے۔

تیسری اور چوتھی دلیل۔ واکثر اھل العلم انہ لا باس بامامۃ الزائر باذن رب المکان لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الا باذنہ ویعضدہ عموم

- ما روی ابن عمر رضہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلاثۃ علی کثبان المسک یوم القیمۃ عبد ادی حق اللہ وحق موالیہ ورجل ام قوما وھم بہ راضون و

رجل ینادی بالصلوات الخمس فی کل لیلۃ رواہ الترمذی وعن ابی ھریرۃ عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یحل لرجل یؤمن باللہ والیوم الاخر ان یؤم قوماً الا باذنھم ولا یخص بدعوۃ دونھم فان فعل فقد خانھم۔ (رواہ ابوداؤد منتقی)

اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ زیارت کرنے والا مالک مکان کے اذن سے امامت کرائے تو جائز ہے کیونکہ ابو مسعودؓ کی حدیث میں الا باذنہ آیا ہے اور ابن عمرؓ کی حدیث کا عموم بھی اس کا مؤید ہے جس میں ذکر ہے کہ تین شخص قیامت کے دن مُشک کے ڈھیروں پر ہوں گے۔ (۱) غلام جو اللہ کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے آقا کا بھی (۲) جو شخص کسی قوم کی امامت کرائے اور وہ اس پر خوش ہوں (۳) جو پانچوقتی نمازوں کے لئے ہر روز اذان دے۔ ——— ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کو جو اللہ اور دن آخرت پر ایمان لاتا ہے حلال نہیں کہ کسی قوم کی اُن کے اذن کے بغیر امامت کرائے۔ اور نہ ایسا کرے کہ خاص اپنے لئے دُعا کرے اور اُن کو شامل نہ کرے۔ اگر ایسا کیا تو اُس نے اُن کی خیانت کی۔

اِس عبارت میں صاحب منتقیٰ نے تین دلائل ذکر کئے ہیں۔ ایک الا باذنہ والی حدیث۔ ایک ابن عمرؓ کی حدیث۔ ایک ابوہریرہؓ کی حدیث۔

پانچویں دلیل۔ سعید بن منصور نے (ابو مسعودؓ) سے روایت کی ہے کہ کوئی شخص کسی کی اختیار والی جگہ میں اس کے اذن کے بغیر امامت نہ کرائے نہ اُس کے اذن کے بغیر اُس کے گھر میں اُس کی عزت والی جگہ میں بیٹھے۔

تنبیہ:۔ نیل الاوطار میں ولا یؤمَّنَّ الرجل الرجل فی سلطانہ حدیث پر لکھا ہے جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے۔ امام نووی ؒ نے کہا ہے فی سلطانہ سے مُراد یہ ہے کہ صاحب گھر صاحب مجلس امام مسجد یہ سب زیادہ حقدار ہیں۔ دوسرے شخص کو اس کی جگہ (بغیر اجازت کے) امامت نہ کرانی چاہیئے کیونکہ یہ جگہ اُس کے اختیار میں ہے امام نووی ؒ نے فی سلطانہ کے معنیٰ اگرچہ عام کئے ہیں لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صاحب حکومت اور صاحبِ سلطنت ہے نہ صاحب گھر اور نہ صاحبِ مجلس وغیرہ۔ اور اس کی تائید ابوداؤد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔ ولا یؤم الرجل فی بیتہ ولا فی سلطانہ۔ اِس روایت میں صاحبِ گھر کا الگ ذکر کیا ہے اور صاحبِ سلطنت کا الگ۔ جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ گھر صاحبِ سلطنت میں داخل نہیں۔ اور ظاہر اس حدیث کا چاہتا ہے کہ صاحب گھر اور صاحبِ حکومت

صاحب سلطنت امامت کے زیادہ حقدار ہیں خواہ دوسرا آدمی قرآن وحدیث میں زیادہ ماہر ہو تقویٰ و پرہیزگاری میں بڑھ کر ہو کیونکہ پہلے جو امامت کے زیادہ حق دار تھے اُن کا ذکر کرکے فرمایا ہے کہ جہاں کسی کی حکومت ہو یا کسی کا اختیار ہو وہاں کوئی امامت نہ کرائے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ جن کا ذکر ہوا ہے اُن کو کسی کے گھر میں یا کسی کی حکومت میں بغیر اذن کے امامت نہ کرانی چاہیئے۔ اور اصحاب امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ بادشاہ اور اُس کا نائب گھر والے اور امام مسجد وغیرہ سے مقدم ہیں۔ کیونکہ ان کے اختیارات اور تصرفات عام ہیں۔ اور اصحاب شافعی رح نے یہ بھی کہا ہے کہ گھر والے کے لئے مستحب ہے کہ جو اس سے افضل ہو اس کو اذن دیدے تاکہ وہ نماز پڑھائے۔

تنبیہ۔ ولا فی سلطانہ سے صاحب حکومت صاحب سلطنت اس وقت مراد ہو سکتا ہے جب کسی کی جگہ کے متولی کو صاحب گھر میں داخل کریں۔ اگر اس کو صاحب گھر میں داخل نہ کریں تو فی سلطانہ کے معنی صاحب اختیار کے ہوں گے تاکہ متولی اس میں داخل ہو جائے۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب

اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اسلامی میں بادشاہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص امام مسجد مقرر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں تک اس کی سلطنت ہے وہاں تک اس کے اختیارات ہیں تو اس حدیث کی رو سے جو شخص امامت کرانی چاہے وہ بادشاہ سے اذن لے حنفیہ تو صرف جمعہ کے لئے اذن بادشاہ شرط کہتے ہیں۔ یہاں پانچوقتی نمازمیں بھی اذن کی ضرورت پڑ گئی۔

جواب۔ اِس کا یہ ہے کہ اِس حدیث کا یہ مطلب غلط ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہاں بادشاہ موجود ہو یا امام مسجد وغیرہ موجود ہوں تو اُن کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے اگر یہ اشخاص موجود نہ ہوں تو پھر اس اُصول پر عمل کرے جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اول قرآن کا ماہر حقدار ہے پھر سُنّت کا پھر ہجرت میں اوّل پھر اسلام میں اوّل پھر عمر میں بڑا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس طرح ہوتا رہا۔ مالک بن حویرث رضؓ اور ایک دوسرے صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جب جانے لگے تو فرمایا۔

اذا حضرت الصلوٰۃ واذنا واقیما ولیومکما اکبرکما رواہ الجماعۃ ولاحمد ومسلم وکانا متقاربین فی القرأۃ ولابی داؤد وکنا یومئذ متقاربین

فی العلم (منتقیٰ)
یعنی جب نماز کا وقت آئے تو اذان دو اور اقامت کہو۔ اور جو تم سے بڑا ہو وہ امامت کرائے علم میں دونوں برابر تھے۔ اور اسلام بھی دونوں اکٹھے لائے تھے۔ اور ہجرت اس وقت فرض نہیں رہی تھی۔ اس لئے بڑا ہونے کا ذکر کیا۔

اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے امامت کے لئے کسی کو مقرر نہیں کیا بلکہ ان کی امامت کو اسی عام اصول کے تحت قرار دے کر فرمایا جو تم سے بڑا ہے وہ امامت کرائے۔

اسی طرح عمرو بن سلمہ کہتے ہیں فتح مکہ کے بعد میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی قوم کی طرف سے اسلام کی خبر لے کر آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فلاں نماز فلاں وقت پڑھو۔ فلاں نماز فلاں وقت۔ اور جو قرآن مجید زیادہ پڑھا ہوا ہو۔ اُس کو امام مقرر کرو۔ عمرو بن سلمہؓ کہتے ہیں۔ میں قرآن مجید زیادہ پڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے امام مقرر کر لیا۔ میری عمر اُس وقت چھ سات سال تھی (مشکوٰۃ)

اس قسم کی احادیث بہت ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت کا مسئلہ اسی اصول کے تحت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بادشاہ کی طرف سے تقرر یا اجازت کی ضرورت نہیں۔

پس حدیث کا مطلب یہی ہوا کہ جس شخص کا کسی جگہ اختیار ہو اس کی موجودگی میں دوسرا شخص بغیر اجازت کے کھڑا نہ ہو۔

ہماری عملی بے احتیاطی

اب عام طور پر جلسوں میں بڑی بے احتیاطی ہوتی ہے کوئی کسی کو نہیں پوچھتا جس کی مرضی ہوتی ہے نماز میں آگے ہو جاتا ہے پھر ایک ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے کئی کئی جماعتیں ہوتی ہیں۔ اسی قسم کی بے احتیاطیاں ہماری کمزوری کا باعث ہو رہی ہیں۔ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جس کو اجازت ہو وہی امامت کرائے اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی ہو کہ سب ایک دفعہ مل کر نماز پڑھیں۔ کوئی اتفاقیہ کسی عذر سے رہ جائے تو وہ کسی کو لے کر جماعت کرا سکتا ہے ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ بلا عذر ہی کئی کئی جماعتیں ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا آگے پیچھے ہونے کی سخت وعید فرمائی ہے کہ یا تو اپنی صفیں درست کرو گے یا اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں مخالفت ڈال دے گا۔ یہاں کئی جماعتیں آگے پیچھے ہوتی ہیں۔ کیا ان کی وجہ سے دلوں پر مخالفت کا اثر نہیں پڑتا۔ انجمنوں اور جلسوں کی اصلی غرض تو اتفاق و اتحاد ہے لیکن ہم بجائے اس کے

تشتت وافتراق کا بیج بو رہے ہیں۔ انا للہ

عبداللہ امرتسری روپڑی
۱۲ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ - ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء

دیوث کی امامت

سوال:- زید ایک مسجد کا امام ہے۔ خیالات اہل حدیث رکھتا ہے۔ ساتواں چالیسواں کو بدعت جانتا ہے۔ لیکن کھا ہر ایک چیز لیتا ہے اس کی بیوی کسی دوسرے شخص بدمعاش کے پاس بدمعاشی کے لئے چلی گئی تھی۔ دو تین ماہ کے بعد کوشش سے گھر منگوائی گئی ہے۔ مگر پھر بھی زنا سے باز نہیں آئی۔ بکر کی کوشش سے وہ کہتی ہے کہ میری توبہ آئندہ کوئی بدمعاشی نہیں کروں گی۔ باوجود ہندہ کی برائی کے اس کا خاوند زید اُس کو پسند کرتا رہا۔ برا نہیں منایا۔ اس کو امامت سے علیحدہ کر دیا تھا کہ تو دیوث ہے جب تک اس بیوی کو طلاق نہیں دو گے تجھے امام نہیں بنایا جائے گا۔ اب بعض مولوی آکر کہتے ہیں کہ اس کو امام بنالو چونکہ توبہ کر لی ہے مگر لوگوں نے ابھی تک نہیں مانا۔ آپ بتائیں کہ ایسا آدمی امام بن سکتا ہے۔

حکیم محمد حسین چک نمبر ۱۷۔ سردار پور ڈاکخانہ خاص ضلع منٹگمری

جواب:- سورہ والذاریات کی تفسیر میں ایک شخص صبیغ نامی کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ سے اُس نے کچھ اُلٹ پلٹ سوال کئے۔ جن سے معلوم ہوا کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر میں کچھ رائے کو دخل دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُسے سو درے تعزیر ماری۔ جب اُس نے توبہ کی تو پھر اُس کو چھیک دیا۔ مدت تک یہی حال رہا۔ جب معلوم ہوا کہ اُس کی توبہ خالص ہے تب اُس کو رہا کیا۔

اِس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اس شخص مذکور کی صرف زبانی توبہ کافی نہیں جب تک ایک مدت تک اس کا عمل دیکھ نہ لیا جائے۔ ہاں اگر امامت سے معزول ہونے سے پہلے توبہ کرتا اور اُس عورت کو مار پیٹ کرتا یا چھوڑ دیتا تو یہی عمل اُس کے خلوص کے لئے شہادت ہوتا۔ امامت سے معزول ہونے کے بعد توبہ کرنا یہ ظاہر گناہ سے توبہ نہیں بلکہ اصل غرض امامت کا حصول ہے۔ صبیغ مذکور کے متعلق بعض روایتوں میں سال کی میعاد آئی ہے یعنی ایک سال تک اُس کو چھیک دیا۔ سو اس امام کو بھی کم سے کم اتنا تو ضرور چھیکنا چاہیے۔ اگر سال تک حالت اچھی ہو جائے تو بہتر ورنہ اور امام رکھ لیا جائے اور اگر کسی طرح سے سال کے اندر اس کی خالص توبہ

معلوم ہو جائے۔ مثلاً اپنی عورت کو الگ کر دے جب تک عورت کی توبہ خالص معلوم نہ ہو گھر نہ رکھے تو اس صورت میں سال پورا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر صورت امام مذکور کا اُس کے عمل کے ذریعے خلوص دیکھنا ضروری ہے خواہ سال کی میعاد ہو یا کم و بیش رہا مقتدیوں کا اچھا نہ ہونا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب امام بھی آزاد رہے بلکہ امام کو نیک ہونا چاہیئے تاکہ لوگوں پر اس کی نیکی کا اثر پڑے۔ لوگوں کو اس سے ہدایت ہو۔ اور لوگوں کو جو نصیحت کرے۔ اس پر پہلے وہ خود عامل ہو تاکہ دیگراں را نصیحت خود را فضیحت کی مثال نہ بنے۔ امام ذمہ دار ہستی ہے اس کو ہدایت کا نمونہ بن کر رہنا چاہیے پھر مقتدیوں کی نمازیں اس کی نماز سے وابستہ ہیں۔ اگر اس کی حالت اچھی نہ ہوئی تو مقتدیوں کی نمازیں بھی خراب ہوں گی۔ اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اجعلوا ائمتکم خیارکم فانہم وفد بینکم وبین ربکم او کما قال (دارقطنی)

اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو کیونکہ وہ تمہارے اور خدا کے درمیان قاصد (نمائندے) ہیں۔

پس امام مذکور کی حالت جب تک اچھی نہ ہو بالکل امام نہ بنایا جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۵ محرم ۱۳۵۸ھ - ۷ مارچ ۱۹۳۹ء

مشرک کی امامت

سوال:۔ میرے گھر کے قریب مسجد ہے۔ اُس مسجد کے نمازی بدعتی ہیں۔ قبروں کے پجاری ہیں شیخ عبدالقادر جیلانی سے مُراد مانگتے ہیں اس واسطے میں اُن کے پیچھے نماز ادا نہیں کرتا۔ آپ فرمائیں کہ مشرک امام کے پیچھے نماز ہو جائے گی۔

محمد اسماعیل بھوانی پوری

جواب:۔ واقعی نماز باجماعت کی تاکید بہت ہے مگر جن لوگوں کا سوال میں ذکر ہے۔ اُن کے پیچھے نماز صحیح نہیں کیونکہ ایسے عقیدہ کا آدمی مشرک ہے اور قرآن مجید میں ہے۔ انما المشرکون نجس یعنی مشرک نجس ہیں۔ نجس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ - ۹ جنوری ۱۹۴۰ء

کھودا اور نامرد امام

سوال :۔ امام کھودا جس کی داڑھی مونچھ بالکل نہ ہو۔ عورت جیسا چہرہ ہو اُس کے پیچھے نماز جائز ہے اور اگر امام نامرد ہو اور مشہور بھی ہو گیا ہو تو اُس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔

رحمت اللہ موضع پرت تحصیل سمرالہ ضلع لودھانہ

جواب :۔ اگر امام قدرتی طور پر کھودا ہو تو اس کے پیچھے نماز درست ہے۔ کیونکہ اُس کا کوئی قصور نہیں اور اگر یہ خیال ہے کہ اس کا چہرہ عورت جیسا ہے اس لئے اس کا حکم عورت کا ہو گیا تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس سے لازم نہیں آتا ہے کہ اس کا حکم عورت کا ہو جائے۔ داڑھی آنے سے پہلے لڑکے کا چہرہ عورت کی طرح ہوتا ہے مگر اس کی امامت صحیح ہے۔ نیز حصہ وراثت وغیرہ میں مرد سمجھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف داڑھی مونچھ نہ ہونے سے عورت کا حکم نہیں ہو سکتا بلکہ اصل فرق عورت مرد کی بناوٹ ہے جس سے پیدا ہوتے ہی تمیز ہو جاتی ہے کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اور اسی سے نامرد کی امامت بھی درست ثابت ہو گئی۔ ہاں اگر مشت زنی یا کسی اور شرارت کی وجہ سے نامرد ہو گیا ہو تو تنبیہ کے طور پر مناسب ہے کہ اس کو امام نہ بنایا جائے اگر پورے طور پر نیک ہو جائے اور تسلی ہو جائے کہ اس کی طبیعت میں اب شرارت نہیں تو لوگوں کو اختیار ہے کہ امام بنائیں یا نہ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۳ ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ ۔ ۸ فروری ۱۹۳۵ء

زنا پر تعاون کرنے والا امام

سوال :۔ ایک امام مسجد ہے وہ اکثر عورتوں کے نکاح جو کہ اپنے خاوندوں کے گھر سے آباد رہ کر اور پیچھے جن کر کسی غیر آدمی کے ساتھ چلی گئی ہوں اور وہ آدمی مدت تک ان سے زنا بھی کرتے رہیں۔ یہ امام مسجد زانی مرد اور زانیہ عورت کا نکاح کر دیتا ہے۔ اور خاوند سے طلاق بھی نہیں لی جاتی ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہے جب کہ متقی اور نیک مقتدی اس کی امامت کو پسند نہیں کرتے اور بے دین لوگ پسند کرتے ہیں۔

جواب :۔ یہ امام دو وجہوں سے قابل امامت نہیں۔ ایک زناکاروں کے نکاح کر دیتا ہے۔ قبلہ

کی طرف تھوکنے سے جب امامت سے علیحدہ کیا جاتا ہے جیسا کہ مشکوٰۃ باب المساجد میں ہے تو زناکاروں کا معاون کب امامت کے لائق ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ یعنی نیک کاموں میں مدد کیا کرو اور برائی میں مدد نہ کرو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اصل مقتدی اس سے ناراض ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ جب امام پر اس کے مقتدی ناراض ہوں اس کی نماز اس کے کانوں سے اُوپر نہیں جاتی (مشکوٰۃ باب الامامۃ)

رہے دوسرے مقتدی جو صوم و صلوٰۃ کے پابند نہیں ہیں تو ان کی رضا اور عدم رضا کا شریعت میں اعتبار نہیں کیونکہ جب وہ خود دیندار نہیں تو امامت کے بارہ میں شریعت کے نزدیک ان کی رائے کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۵ رمضان سنہ ۱۳۵۳ھ۔ ۱۳ دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء

مٹھی سے کم داڑھی رکھنے اور ختم دینے والا امام

سوال:۔ ایک مٹھی سے کم داڑھی کٹنے اور ختم وغیرہ دینے والے امام کے پیچھے نماز درست ہے۔؟ اگر درست نہیں تو آج کل امام اسی قسم کے ملتے ہیں۔ کیا ایسے اماموں کے پیچھے اتفاقیہ بھی نماز نہیں ہوتی؟ حدیث میں ہے کان ابن عمر اذا حج اواعتمر قبض علی لحیتہ فما فضل اخذہ یعنی عبداللہ بن عمرؓ حج کرتے یا عمرہ کرتے تو مٹھی سے زائد داڑھی کٹا لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مٹھی سے زائد داڑھی کٹانے کی اجازت ہے اور اس سے زیادہ کٹانا شریعت کے خلاف ہے"

عبدالرحمٰن عاجز دواخانہ رحمانیہ مالیر کوٹلہ

جواب:۔ جو شخص مٹھی کے اندر داڑھی کٹائے تو اس پر سختی کی جائے۔ اور ایسا شخص امامت کے قابل نہیں۔ ہاں اتفاقیہ نماز پڑھی جائے گی مگر اپنا تھوڑا بہت جتنا بس چلے تو ایسے امام کے ہٹانے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہی حکم ختم وغیرہ دینے والے امام کا ہے کیونکہ ختم وغیرہ دینا بدعت ہے ہاں اگر اس کی کوئی بدعت شرک کی حد کو پہنچی ہو اس کے پیچھے اتفاقیہ بھی نماز نہیں ہوتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۲ صفر سنہ ۱۳۶۰ھ ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

قبر پر چراغ جلانے والا امام

سوال:۔ ایک خانقاہ کے نام زمین ہے اور اس خانقاہ پر چراغ وغیرہ جلائے جاتے ہیں۔ جو آدمی اس کا محافظ ہے اس کو امام مسجد بنایا ہوا ہے کیا اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں۔

جواب:۔ اگر یہ چراغ صرف اس لئے جلاتا ہے کہ زمین محفوظ رہے اور اس کے اعتقاد میں کوئی خرابی نہیں تو ایسے شخص کو امام بنانا جائز نہیں کیونکہ قبر پر چراغ جلانا حدیث میں منع آیا ہے۔ اور ویسے بھی یہ اسراف ہے یعنی خرچ ضائع ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۔

یعنی فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو صرف قبلہ کی طرف تھوکنے پر امامت سے معزول کر دیا تھا۔ اور قبر پر چراغ جلانا تو اس سے بڑا گناہ ہے کیونکہ اس میں مشرکوں سے مشابہت ہے۔ جو قبروں کی تعظیم کرتے ہیں اس لئے اس کے مرتکب کو امام بنانا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے۔ اجعلوا ائمتکم خیارکم یعنی اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔ ہاں اس شخص کے پیچھے کہیں اتفاقیہ نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی اور اگر اس کا شرکانہ اعتقاد ہے اور چراغ قبر کی تعظیم کے لئے جلاتا ہے تو اس کے پیچھے اتفاقیہ بھی نماز جائز نہیں۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ ضلع انبالہ
۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ - ۶ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

یا رسول اللہ کہنے والے کی امامت

سوال:۔ یا رسول اللہ کہنے والے کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

محمد حفیظ خاں ساکن بھٹیاں کلاں ریاست پٹیالہ

جواب:۔ اگر یا رسول اللہ حاضر ناظر جان کر کہتا ہے تو یہ شخص مشرک ہے اور مشرک کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے

إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ۔ یعنی مشرک نجس ہیں ۔

اور حدیث میں ہے ۔

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ ۔ یعنی جو کسی قوم سے مشابہت کرے وہ ان ہی سے ہے ۔

پس ایسے مشابہت کرنے والے کے پیچھے نماز میں شبہ ہے اس لئے احتیاط چاہیے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ۔ ۱۰ جنوری ۱۹۴۱ء

غیر شرعی فتویٰ دینے والا امام

سوال :۔ ایک امام مسجد سے مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے کہ چار سو روپیہ زکوٰۃ کا ہے اس سے مسافر خانہ بنادیا جائے ۔ چنانچہ اس زکوٰۃ سے مسافر خانہ بنادیا جاتا ہے کہ مسافر خانہ پر زکوٰۃ لگ سکتی ہے ۔ اگر نہیں تو ایسے غیر شرعی فتویٰ دینے والے کے پیچھے نماز جائز ہے ؟

جواب :۔ اگر امام پورا عالم نہیں اور ویسے ہی بے احتیاطی سے مسئلہ بتانے کی عادت ہے تو وہ امام بنانے کے قابل نہیں اس کو امامت سے علیحدہ کر دینا چاہیئے اور اگر وہ پورا عالم ہے اور مسئلہ احتیاط سے بتاتا ہے تو مسئلہ میں کسی وقت غلطی اس کو امامت سے علیحدہ نہیں کر سکتی ۔ رہا یہ سوال کہ زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہ مسافر خانہ بنانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ۔ کیونکہ قرآن مجید میں جو مصارف ذکر ہیں ۔ ان میں مسافر خانہ داخل نہیں مسافر خانہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ملکیت ہے ۔ خواہ اس کو قائم رکھے یا فروخت کر دے یہ اس کو اختیار ہے اور زکوٰۃ نئے سرے سے ادا کرے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء ۲۹ شعبان ۱۳۵۸ھ

میاں بیوی دونوں میں سے ایک امام اور ایک مقتدی

سوال :۔ میاں بیوی مل کر باجماعت نماز فرضیہ یا نوافل ادا کر سکتے ہیں یا نہیں ؟ اگر سکتے ہیں تو کس ترکیب سے ؟

محمد بن مولوی محمد حسین مرحوم گھیانہ کلاں

جواب :۔ عن انس قال صلينا انا ويتيم في بيتنا خلف النبي صلى الله عليه وسلم

وام سلیم خلفنا رواہ مسلم (مشکوٰۃ باب الموقف)

یعنی انس سے روایت ہے کہ میں نے اور ایک یتیم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اپنے گھر میں نماز پڑھی اور اُم سلیم (میری والدہ) ہمارے پیچھے اکیلی تھی۔

وعنہ ان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم صلی بہ و بامہ اوخالتہ قال فاقامنی عن یمینہ واقام المرأۃ خلفنا (رواہ مسلم)

یعنی انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اور اس کی والدہ یا خالہ کو نماز پڑھائی پس مجھے اپنی دائیں طرف کھڑا کیا اور میری والدہ یا خالہ کو پیچھے کھڑا کیا۔

عن الحارثۃ بن معاویۃ الکندی انہ رکب الی عمر بن الخطاب یسالہ عن ثلاث خلال فقدم المدینۃ فقال لہ عمر ما اقدمک علی قال لاسئلک عن ثلاث قال وما ھن قال ربما کنت انا والمرأۃ فی بناء مبنی فتحضر الصلٰوۃ فان صلیت انا وھی کانت بحذائی وان صلت خلفی خرجت من البناء فقال عمر تستر بینک وبینھا بثوب ثم تصلی بحذائک ان شاءت وعن الرکعتین بعد العصر فقال نھانی عنھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال وعن القصص فانھم ارادونی علی القصص فقال ما شئت کانہ کرہ ان یمنعہ قال انما اردت ان انتھی الی قولک قال اخشی علیک ان تقصص فترفع علیھم فی نفسک ثم تقص فترتفع حتی یخیل الیک انک فوقھم بمنزلۃ الثریا فیضعک اللہ تحت اقدامھم یوم القیمۃ بقدر ذالک حرض (منتخب کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۰۶)

حارث بن معاویہ کندی سے روایت ہے کہ وہ حضرت عمر بن الخطاب کے پاس تین باتوں کے متعلق سوال کرنے کے لئے مدینہ شریف میں آئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ کس طرح تشریف لائے کہا تین باتوں کے متعلق سوال کے لئے۔ فرمایا وہ کیا ہیں؟ کہا میں اور میری بیوی (تنگ) خیمہ میں ہوتے ہیں۔ پس نماز کا وقت ہو جاتا ہے اگر میں اور میری بیوی ایک ساتھ نماز پڑھیں تو وہ میرے برابر ہو جاتی ہے۔ اور اگر پیچھے کھڑی ہو تو باہر نکل جاتی ہے۔ عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو اپنے درمیان اور اس کے درمیان کپڑے

کا پردہ کر دے پھر وہ تیرے برابر نماز پڑھے اور عصر کے بعد دو رکعتوں سے سوال کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے منع فرمایا ہے اور وعظ سے سوال کیا کہ میری قوم مجھ سے وعظ کی خواہش رکھتی ہے۔ فرمایا جو کچھ تیری مرضی گویا کہ حضرت عمرؓ نے اس کو روکنے سے اچھا نہ سمجھا اور وعظ کو کچھ پسند بھی نہ کیا۔ حارث نے کہا میرا ارادہ ہے کہ آپ کے قول کے موافق عمل کروں فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ تو وعظ کرے اور تیرے دل میں کچھ اونچائی کا خیال آجائے پھر وعظ کرے پھر خیال آجائے یہاں تک کہ تو اپنے خیال ہی میں ستارہ ثریا تک پہنچ جائے پھر اتنا ہی قیامت کے دن خدا تعالیٰ تجھ کو ان کے قدموں کے نیچے کر دے۔

ان تینوں حدیثوں سے مسئلہ واضح ہو گیا کہ عورت کو جماعت میں ساتھ کھڑا نہ کرنا چاہیئے۔ خواہ ماں ہو یا خالہ ہو بہن ہو یا بیوی بلکہ وہ اکیلی پیچھے کھڑی ہو نماز خواہ فرض ہو یا نفلی خواہ لڑکا نابالغ ہی ہو۔ اس کے برابر بھی کھڑی نہیں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تیسری حدیث سے معلوم ہوا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۶ ربیع الاوّل ۱۳۶۰ھ ۔ ۴ اپریل ۱۹۴۱ء

تاخیر کر کے نماز پڑھنے والے کی امامت

سوال :۔ یہاں اہلحدیث کی کوئی مسجد نہیں۔ ہم جامعہ مسجد اہل احناف میں نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں مگر یہ تمام اوقات نماز پنجگانہ کرا کر نماز پڑھتے ہیں مثلاً ظہر دو بجے عصر ساڑھے چار بجے۔ خاص کر فجر کی نماز کو یہ لوگ بہت دیر کر کے پڑھتے ہیں۔ لہٰذا ان اوقات پر کیا ہم بھی ان کے ساتھ ہی نماز باجماعت ادا کرتے رہیں یا اول وقت علیحدہ اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیا کریں۔

ملا محمد ابراہیم سول ریسٹ ہاؤس کالکا ضلع انبالہ

جواب :۔ جو اوقات آپ نے نمازوں کے لکھے ہیں۔ ان میں بعض میں زیادہ دیر ہے۔ مثلاً آجکل عصر وہاں ساڑھے چار بجے زیادہ تاخیر سے ہوتی ہے اسی طرح ظہر میں کچھ زیادہ تاخیر ہے۔ سو آپ جس نماز کو وہ زیادہ تاخیر سے پڑھیں۔ اکیلے پڑھ لیا کریں۔ اگر دوبارہ ان کے ساتھ موقعہ ملے پڑھ لی ورنہ پہلی کافی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۷ شوال ۱۳۵۵ھ یکم جنوری ۱۹۳۷ء

مردہ شو امام

سوال :۔ ایک شخص امام مسجد ہے اور وہ مردہ شوئی کا کام کرتا ہے اُجرت لیتا ہے کیا ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہے ؟۔

جواب :۔ عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من غسل ميتا فادى فيه الامانة ولم يفش عليه مايكون منه عند ذالك خرج من ذنوبه كيوم ولدته امه ليله اقربكم ان كان يعلم فان لم يكن يعلم فمن ترون عنده حظا من ورع وامانة (رواه احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میت کو غسل دے اور اس میں امانت سے کام کرے اور میت کے عیب ظاہر نہ کرے اور وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک ہوگیا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اور میت کو اس کا قریبی غسل دے اگر غسل دینا جانتا ہو۔ اگر نہ جانتا ہو تو تم میں سے وہ شخص غسل دے جو پرہیز گاری اور امانت کا حصہ رکھتا ہو۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ غسل یا تو قریبی دے یا پرہیز گار آدمی دے۔ کیونکہ ممکن ہے میت کے بدن پر کوئی عیب ہو یا بیماری کی حالت میں پاکی پلیدی میں احتیاط نہ ہو۔ غسل کے وقت اندر سے کوئی آلائش نکلے۔ یا زیر ناف بال بڑھ گئے ہوں یا اس قسم کی کوئی پردہ والی بات ہو تو اگر غسل دینے والا قریبی ہوگا، یا پرہیز گار ہوگا تو میّت کا پردہ فاش ہو کر میّت کی بے عزتی نہیں ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ غسل دینے والا قریبی ہو یا پرہیز گار ہو۔

اِس کے علاوہ اس غسل دینے کو پیشہ بنا کر اس پر اُجرت لینا اور ہمیشہ اس کام کے لئے ایک شخص کو مقرر کر دینا یہ خیر قرون کے خلاف ہے۔ خیر قرون میں یہ کام پیشہ ہو کر معاش کا ذریعہ نہیں بنا بلکہ اپنے قریبی یا ہمسایہ وغیرہ غسل دیتے تھے پھر پیشہ بھی گندہ ہے۔ کیونکہ نمازی بے نماز ہر گندے سے پلے کو غسل دینا پڑتا ہے بلکہ زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ نیز خود ایسے پیشہ والے عموماً بے دین ہوتے ہیں پس یہ لوگ امامت کے حقدار نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۹ جمادی الاول ۱۳۵۱ھ ۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۲ء

نابالغ کی امامت

سوال :- نابالغ لڑکا نماز تراویح۔ فرض۔ وتر بحیثیت امام پڑھا سکتا ہے یا نہیں۔

جواب :- عَنْ عَمْرِو بْنِ سَلِمَةَ قَالَ كُنَّا بِمَاءٍ مَمَرَّ النَّاسِ يَمُرُّ بِنَا الرُّكْبَانُ نَسْأَلُهُمْ مَا لِلنَّاسِ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُونَ يَزْعُمُ أَنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيْهِ أَوْحٰى إِلَيْهِ كَذَا فَكُنْتُ أَحْفَظُ ذٰلِكَ الْكَلَامَ فَكَأَنَّمَا يَقْرِيْ فِيْ صَدْرِيْ وَكَانَتِ الْعَرَبُ تَلَوَّمُ بِإِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُولُونَ اُتْرُكُوْهُ وَقَوْمَهُ فَإِنَّهُ إِنْ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ فَهُوَ نَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ الْفَتْحِ بَادَرَ كُلُّ قَوْمٍ بِإِسْلَامِهِمْ وَبَدَرَ أَبِيْ قَوْمِيْ بِإِسْلَامِهِمْ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ جِئْتُكُمْ وَاللّٰهِ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ حَقًّا فَقَالَ صَلُّوْا صَلٰوةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا وَصَلٰوةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَلْيُؤَذِّنْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْاٰنًا فَنَظَرُوْا فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْاٰنًا مِنِّيْ لِمَا كُنْتُ أَتَلَقّٰى مِنَ الرُّكْبَانِ فَقَدَّمُوْنِيْ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعِ سِنِيْنَ وَكَانَتْ عَلَيَّ بُرْدَةٌ كُنْتُ إِذَا سَجَدْتُ تَقَلَّصَتْ عَنِّيْ فَقَالَتْ إِمْرَأَةٌ مِنَ الْحَيِّ أَلَا تُغَطُّوْنَ عَنَّا اسْتَ قَارِئِكُمْ فَاشْتَرَوْا فَقَطَعُوْا لِيْ قَمِيْصًا فَمَا فَرِحْتُ بِشَيْءٍ فَرَحِيْ بِذٰلِكَ الْقَمِيْصِ (رواہ البخاری) (مشکوٰۃ باب الامامۃ فصل ۳)

یعنی عمرو بن سلمہ رض سے روایت ہے کہ ہم ایک پانی پر لوگوں کی گذرگاہ میں رہتے تھے وہاں سے قافلے گذرتے ہم ان سے دریافت کرتے کہ لوگوں کو کیا ہوا؟ اور یہ شخص کون ہے؟ وہ جواب میں کہتے یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے رسول بنایا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کی طرف وحی کی ہے فلاں چیز میں یہ وحی میں لوگوں سے سن کر یاد کر لیتا اور وہ گویا میرے سینہ سے چپٹ جاتی اور عرب لوگ اسلام قبول کرنے میں فتح مکہ کے منتظر تھے وہ کہتے تھے اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر یہ ان پر غالب آگیا تو سچا نبی ہے۔ پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے اسلام لانے میں جلدی کی۔ جب واپس آئے تو کہا

اللہ کی قسم میں سچے نبی کے پاس سے آیا ہوں۔ وہ (نبی) کہتا ہے فلاں فلاں نماز فلاں فلاں وقت پڑھو جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک اذان کہے اور جو قرآن مجید زیادہ پڑھا ہوا ہو وہ تمہاری امامت کرائے جب میری قوم نے دیکھا تو مجھے سب سے زیادہ قرآن مجید یاد تھا کیونکہ میں آنے جانے والوں سے سُن کر یاد کر لیتا تھا پس اُنہوں نے مجھے اپنا امام بنالیا اور میری عمر اس وقت چھ سات برس کی تھی۔ اور مجھ پر ایک کملی تھی۔ جب میں سجدہ کرتا تو وہ سُکڑ جاتی۔ نیچے کا بدن ننگا ہو جاتا۔ قوم میں سے ایک عورت نے کہا کہ تم اپنے امام کا ستر کیوں نہیں ڈھانکتے۔ انہوں نے کپڑا خرید کر میرے لئے قمیص تیار کی میں اس سے اتنا خوش ہوا کہ اتنی خوشی مجھے کبھی نہیں ہوئی۔

اِس حدیث سے ثابت ہوا کہ نابالغ لڑکا جس کو قرآن مجید زیادہ یاد ہو اور نماز پڑھنے پڑھانے کا طریقہ جانتا ہو۔ اس کی امامت جائز اور صحیح ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کرام کا اس پر عمل ہے۔ دیکھئے عمرو بن سلمہ فرضوں میں امام تھے۔ وتر اور تراویح تو فرضوں کی نسبت معمولی شے ہے۔

قیام اللیل ص۱۰۰ میں حدیث ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فَلْيَؤُمَّهُمْ أَقْرَأُهُمْ وَإِنْ كَانَ أَصْغَرَهُمْ۔

یعنی امامت کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ جس کو قرآن مجید زیادہ یاد ہو وہ امامت کرائے اگرچہ سب سے چھوٹا ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔

كُنَّا نَأْخُذُ الصِّبْيَانَ مِنَ الْكُتَّابِ وَنُقَدِّمُهُمْ يُصَلُّوْنَ لَنَا شَهْرَ رَمَضَانَ فَنَعْمَلُ لَهُمُ الْقَلِيَّةَ وَالْخُشْكَارَ۔

یعنی ہم (عورتیں) مکتبوں سے نابالغ لڑکے لاکر ان کو امام بنالیتیں۔ وہ ہم کو ماہ رمضان المبارک میں نماز پڑھاتے ہم ان کو (بطور خدمت) بھنا ہوا گوشت اور گندم کی روٹی کھلادیا کرتی تھیں۔

اِس سے ثابت ہوا کہ نابالغ بچے گھروں میں عورتوں کو نماز تراویح پڑھاتے تھے۔

رئیس التابعین امام ابن شہاب زہری فرماتے ہیں:۔

لم يزل يبلغنا ان الغلمان يصلون بالنَّاسِ إِذَا عَقَلُوا الصَّلٰوةَ وَقَرَءُوا الْقُرْاٰنَ فِيْ رَمَضَانَ وَغَيْرِهٖ وَاِنْ لَمْ يَحْتَلِمُوْا

(قیام اللیل ص۱۰۰)

یعنی نابالغ بچے جو نماز پڑھنا اور قرآن پڑھنا جانتے تھے وہ رمضان اور غیر رمضان میں لوگوں کو نمازیں پڑھاتے تھے۔

قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ إِذَا أَحْصَى الصَّلٰوةَ وَصَامَ رَمَضَانَ فَلَا بَأْسَ بِالصَّلٰوةِ خَلْفَهٗ وَأَكْلِ ذَبِيحَتِهٖ ۔ (قیام اللیل ص۱۰۲)

حضرت سعید بن مسیب رح تابعی رح فرماتے ہیں نابالغ بچے یعنی بچہ جب مسائل نماز سے واقف ہو جائے اور روزہ رکھے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور اس کا ذبیحہ بھی جائز ہے۔

قیام اللیل ص۱۰۲ میں ہے۔

تراویح وغیرہ نوافل میں نابالغ کی امامت جائز اور درست ہے۔

لا اختلاف فی ذالك نعلمه

یعنی ہم اس بارہ میں کسی کا اختلاف نہیں جانتے۔

پس حدیث نبویؐ۔ عمل صحابہ کرامؓ۔ تابعین رح اور دیگر ائمہ دین رح سے ثابت اور واضح ہوا کہ نابالغ کی امامت جائز ہے۔ احادیث نبویؐ کے مقابلہ میں کسی کا قول وفعل ورائے قیاس کوئی حیثیت نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ نیک عمل کی توفیق بخشے۔ آمین

عبداللہ امرتسری روپڑی

یکم رمضان ۱۳۸۳ھ ۔ ۱۷ جنوری ۱۹۶۴ء

نویسندہ بیاج کی امامت

سوال :۔ جو شخص بیاج کا نویسندہ ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے۔؟

جواب :۔ سود لینے والے یا کاتب سود وغیرہ کو امام نہیں بنانا چاہیئے

عبداللہ امرتسری

حج کی وسعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کی امامت

سوال :۔ زید امام کے پاس اس قدر روپیہ ہے کہ وہ علاوہ اپنے اور بھی ایک دو شخص کو حج کرا

سکتا ہے۔ اور وہ تندرست ہے۔ جب حج کی تلقین کی جاتی ہے تو وہ نابینا ہونے کا عذر پیش کرتا ہے

سائل عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلی

جواب۔ زید کے پاس اگر اتنی وسعت ہے جتنی سوال میں مذکور ہے تو اس پر حج فرض ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر حج نہ کرے تو اس کو امامت سے ہٹا دیا جائے کیونکہ حج کے تارک پر حدیث میں یہودی، نصرانی ہونے کا وعید آیا ہے ایسے شخص کو امام بنانا درست نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

فاسق وفاجر کی امامت

سوال۔ فاسق فاجر کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب۔ بدعتی فاسق فاجر جو حد کفر کو نہ پہنچا ہو۔ اس کے پیچھے نماز تو ہو جاتی ہے مگر ایسے شخص کو امام بنانے والے مجرم ہیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے۔ اجعلوا ائمتکم خیارکم (دار قطنی) یعنی اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔ ہاں اگر ایسا شخص جبراً امام بن جائے اور مقتدی ہٹانے پر قادر نہ ہوں تو اس صورت میں مقتدی مجرم نہیں نہ اُن کی نماز میں کوئی خلل ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

شرعی عذر کے بغیر امام کی معزولی

سوال:۔ ایک نیک سیرت متدین مخلص حافظ عالم کو مسجد کی امامت سے بلاوجہ الگ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا بغیر شرعی عذر کے اس کو لوگ امامت سے علیحدہ کرنے کے مجاز ہیں؟

جواب:۔ صورت مسؤلہ میں کسی امام کو شرعی عذر کے بغیر امامت سے الگ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں امام کی توہین ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علی نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کو نماز کے لئے امام بنایا تو ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارے امیر بھی یہی ہیں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ پہلے قرآن کے زیادہ ماہر کو امام بناؤ۔ پھر جو حدیث کا زیادہ عالم ہو اُس کو امام بناؤ۔ اخیر میں فرمایا کہ جو تمہارا امام بن گیا وہی تمہارا امیر ہے۔

صورت مسئولہ میں بجائے اس کے امام کو امیر بنایا جائے اور اس کا مرتبہ بڑھایا جائے اس کو نماز کی امامت سے بھی علیحدہ کیا جا رہا ہے اس کو معزول کرنا احادیث کے سراسر خلاف ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور جامع قدس چوک دالگراں رام گلی نمبر ۵

۲۰ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ ۲۵ جولائی ۱۹۶۳ء

نماز سے فارغ ہو کر امام کا مقتدیوں کی طرف منہ پھیرنا فجر اور عصر کی نماز کے ساتھ خاص ہے یا نہیں؟

سوال :۔ کیا امام کے لئے فجر اور عصر کی نماز کے بعد ہی منہ پھیرنے کا حکم ہے یا کہ پنجگانہ نمازوں میں منہ پھیرا جا سکتا ہے۔ سنتِ صحیحہ سے کونسا عمل مسنون ہے۔

عبدالسلام از منڈی بہاؤ الدین

جواب :۔ آج تک یہ سوال کسی نے نہیں کیا اور نہ کسی محدث نے باب باندھا ہے۔ یہ خصوصیت سائل نے خدا جانے کہاں سے پیدا کی ہے اور سائل کو کس بنا پر شبہ ہوا ہے۔ حدیثوں میں تو عام آتا ہے صبح اور عصر کی کوئی تخصیص نہیں۔ خصوصیت کی جب تک دلیل نہ ہو کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور جامع قدس چوک دالگراں

۲۷ محرم ۱۳۸۶ھ ۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۳ء

ولد الزنا کے پیچھے نماز کا مسئلہ

سوال :۔ ایک لڑکا زنا سے پیدا ہوا ہے لیکن بظاہر وہ نیک آدمی ہے۔ پانچ ارکان اسلام کا سختی سے پابند ہے اُس کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے یا نہیں

جواب :۔ قرآن مجید میں ہے۔ ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔ یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس بنا پر گناہ زانی کا ہے بچہ کا کوئی قصور نہیں۔ پس نیک ہونے کی صورت میں اس کی امامت پر کوئی اعتراض نہیں۔ شرعاً صحیح ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی ۱۱۹ ۔ ۴ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ ۲۳ جولائی ۱۹۵۷ء

بدعتی اور غیر شرعی اُمور کے مرتکب کا نکاح پڑھانے والا امام

سوال:۔ گانا۔ سہرا بندھا ہوا ہو اور مہندی لگی ہوئی ہو تو ایسے لوگوں کے نکاح کرنے والے کی امامت صحیح ہے۔ کیا اس کے پیچھے نماز جائز ہے؟ نیز اگر لڑکے والے باجہ۔ آتشبازی اور گانے بجانے کا ہر ممکن سامان جو لہو الحدیث میں شمار ہوتا ہے جبراً ایسا کام کریں تو ایسا نکاح پڑھنا جائز ہے۔ اگر امام پرہیز نہ کرے تو اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

اگر امام نماز میں سُستی کرے اور بے وقت مسجد میں آئے تو کیا دوسرا آدمی اس کی جگہ نماز پڑھا سکتا ہے لیکن ایسا کرنے سے امام ناراض ہو جاتا ہے کہ میری اجازت کے بغیر جماعت جائز نہیں۔ اسی طرح جو امام بے نماز کا جنازہ پڑھائے تو کیا اس کے پیچھے نماز جائز ہے؟

حاجی عبدالکریم موضع قلعہ شبد یو سنگھ ڈاکخانہ مانانوالہ

تحصیل و ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ یہ سب کام خلافِ شرع ہیں۔ اور ان کے کرنے والا مجرم ہے۔ ایسا شخص امامت کے قابل نہیں۔ حدیث میں ہے اجعلوا ائمتکم خیارکم۔ یعنی امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔ یہ کہنا کہ امام کی اجازت کے بغیر مصلّی پر کھڑا نہ ہونا چاہیے یہ بھی اس امام کی غلطی ہے کیونکہ نماز کے فوت ہونے کا خوف ہو تو دوسرا آدمی نماز پڑھا سکتا ہے۔ چنانچہ مغیرہ بن شعبہ کی حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے سفر میں پیچھے رہ گئے تو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھا دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رکعت ملی جو عبدالرحمٰن بن عوف کے پیچھے پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

عبداللہ ثانی تیسری روڈ پڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹

مورخہ ۲۱ محرم ۱۳۷۸ھ ۸ اگست ۱۹۵۸ء

دیدہ دانستہ غلط قرآن مجید پڑھنے والے کی امامت

سوال: ایک شخص امامت کراتا ہے اور قرآن مجید عمداً غلط پڑھتا ہے اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب:۔ مسلمان کی شان سے بعید ہے کہ قرآن مجید میں عمداً کوئی غلطی کرے لیکن خدانخواستہ اگر کوئی شخص ایسا ہو تو اس کی امامت صحیح نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹

۱۵ جمادی الاول ۱۳۷۵ھ ۲۷ نومبر ۱۹۵۵ء

شریعت کے فیصلہ سے انکار کرنے والا امام

سوال:۔ ہمارے اور امام کے درمیان ایک زمین کے سلسلہ میں تنازعہ ہے۔ ہم نے کہا کہ اس تنازعہ کے فیصلہ کے لئے شریعت کو حاکم بنالیں مگر امام صاحب نے انکار کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ عدالت جو فیصلہ کرے گی منظور ہوگا۔ ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہے؟ یہ شخص وعدہ کی مخالفت بھی کرتا ہے۔

جواب:۔ صورت مسئولہ میں یہ الفاظ "کہ ہم شریعت پر فیصلہ نہیں کرتے" عدالت میں کریں گے یہ کلمہ کفر ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ

یعنی جو ہمارے نازل کئے ہوئے حکموں پر فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے

اور وعدہ خلافی کرنا فیصلہ کر کے اس پر قائم نہ رہنا یہ فسق ہے۔ فاسق کو امام بنانا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے۔ اِجْعَلُوْا اَئِمَّتَكُمْ خِيَارَكُمْ۔ یعنی اپنے امام بہتر لوگوں کو بناؤ۔ صورت مسئولہ میں امام مذکور کو فی الفور امامت سے علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ فقط

عبداللہ امرتسری روپڑی ماڈل ٹاؤن لاہور کوٹھی نمبر ۱۱۹ سی

۲ صفر ۱۳۷۹ھ ۸ اگست ۱۹۵۹ء

حقّہ پینے والا امام

سوال:۔ کیا حقہ نوش امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے۔

محمد علی موضع سنگھڑہ ڈاکخانہ فتح گڑھ تحصیل زیرہ ضلع فیروزپور

جواب:۔ مشکوۃ شریف میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو قبلہ کی طرف تھوکنے پر امامت سے معزول کر دیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو پرہیزگار نہ ہو وہ امامت کا اہل نہیں۔ حقہ بالکل حرام ہے جو اس سے پرہیز نہ کرے وہ امامت کا کب اہل ہو سکتا ہے؟

دارقطنی میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اجعلوا ائمتکم خیارکم۔ یعنی امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔ پس حقہ نوش امام کو فوراً علیحدہ کر دینا چاہیئے۔

نوٹ:۔ یہ تو امام بنانے کا مسئلہ ہے۔ رہا یہ کہ اگر اتفاقیہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لے تو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ حقہ پینے والا مجرم ہے کافر نہیں ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بدعتی کی امامت

سوال:۔ امام مسجد اہل حدیث ہے لیکن بدعتیوں کے ساتھ مل کر ہر قسم کی رسم کرتا ہے۔ گیارہویں ساتواں۔ چالیسواں۔ اسقاط وغیرہ رسمات ادا کرتا ہے اور جائز سمجھتا ہے کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے؟

جواب:۔ ایسا شخص بدعتی ہے اس کو امام بنانا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے ۔ اجعلوا ائمتکم خیارکم۔ اپنے امام بہتر لوگوں کو بنایا کرو۔ اتفاقیہ اگر ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھی جائے تو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

تنخواہ دار امام

سوال:۔ کیا امامت نماز پر تنخواہ جائز ہے؟

جواب:۔ محض نماز جماعت، پر تنخواہ جائز نہیں کیونکہ حدیث میں اذان پر بھی تنخواہ جائز نہیں سمجھی۔ امامت تو بڑی شے ہے

عبداللہ امرتسری روپڑی ۵ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ

مسبوق کی امامت

سوال :۔ جو شخص امام کے ساتھ کچھ نماز پڑھے اور باقی نماز جو اکیلا پڑھنا ہے بعد میں آنے والا شخص اس کو امام بنا کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ بعض علماء منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے تحصیل حاصل لازم آتا ہے کیونکہ ثواب اس کو جماعت کا حاصل ہو گیا پس اب دوبارہ جماعت کرنا بے کار ہے۔

مولوی عبد الجبار کھنڈیلوی

جواب :۔ جو لوگ مسبوق کی امامت کو منع کرتے ہیں وہ محض اس وجہ سے منع نہیں کرتے کہ وہ نماز باجماعت کا ثواب پا چکا ہے۔ کیونکہ اگر محض اس وجہ سے منع کریں تو کسی وقت جواز کے بھی قائل ہوں مثلاً جو شخص جماعت کے ساتھ پوری نماز پڑھ چکا ہے وہ شخص اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھا سکتا ہے۔ جو جماعت کے بعد آئے اور اس کے ساتھ کوئی اور نہ ہو۔ جب پوری نماز باجماعت پانے والا دوسرے شخص کو جماعت کا ثواب دلانے کی غرض سے دوبارہ نماز باجماعت پڑھ پڑھا سکتا ہے۔ تو کم پانے والا بطریق اولیٰ پڑھا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت مسبوق کو منع کرنے کی وجہ محض جماعت کا ثواب پانا نہیں بلکہ یہ اکثر صورتوں میں ہے اور عام وجہ شبہ یہ ہے کہ باقی نماز جو اُٹھ کر ادا کرتا ہے اس میں وہ منفرد کا حکم رکھتا ہے یا مقتدی کا اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ مسافر مسبوق امام کے پیچھے پوری نماز پڑھتا ہے کیونکہ مقتدی کی تحریمہ امام کی تحریمہ پر مبنی ہے یعنی اس کی اقتداء میں داخل ہو کر نماز کی نیت باندھی ہے۔ اس لحاظ سے مسبوق بقیہ نماز میں مقتدی ہے اور اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ بقیہ نماز میں اگر سہو ہو جائے تو یہ سجدہ سہو کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی حرکات اپنی مرضی سے ہیں تو اس لحاظ سے منفرد کے حکم میں ہے چونکہ اس کی حالت میں اشتباہ ہے اس لئے کوئی اس کی امامت کو منع کہتا ہے کوئی مشتبہ اس کے علاوہ یہ معاملہ کثیر الوقوع ہے یعنی جماعت نماز سے آگے پیچھے ہونے کا اتفاق اکثر لوگوں کو ہوتا رہتا ہے مگر ایک واقعہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا یا صحابہ رضی کا ایسا نہیں ملتا جس سے امامت مسبوق ثابت ہو۔ اس سے امامت مسبوق میں شبہ اور پختہ ہو جاتا ہے اس لئے احتیاط مناسب ہے اور بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ ائتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم۔ یعنی تم میری اقتدا کرو۔ اور جو تمہارے پیچھے ہیں، تمہاری اقتدا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی صفیں پہلی صفوں کی اقتدا کریں تو مقتدی کا حالت اقتداء میں امام بننا صحیح ہو گیا۔ تو اس کی بابت عرض ہے کہ یہ محض نیچے اوپر ہونے میں اقتدا ہے جیسے کوئی بہرہ اندھیری رات

میں امام کے پیچھے ہو تو وہ اپنے ساتھی کے ساتھ نیچے اُوپر ہوتا ہے یہ کوئی حقیقت میں امامت نہیں ۔اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مرض الموت میں بیٹھ کر نماز پڑھائی ۔حضرت ابوبکرؓ آپ کے پہلو میں کھڑے ہوتے تاکہ لوگوں کو تکبیر سنائیں کیونکہ کمزوری کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی آواز نہیں نکلتی تھی ۔اس طرح جب آدمی بہت ہوتا ہے ۔تو کسی کو تکبیر کے لئے مقرر کر دیتے ہیں تاکہ لوگ اس کی آواز کے ساتھ نیچے اوپر ہوں ۔ یہ کوئی حقیقت میں امامت نہیں ٹھیک اسی طرح حدیث ائتموبی ولیاتم بکم من بعدکم کو سمجھ لینا چاہیئے ۔اس کے علاوہ اس حدیث کا ایک دُوسرا معنی بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اے صحابہ! تم میری اقتداء کرو یعنی تم نماز وغیرہ میں میرا خیال رکھو کہ میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں اور تم سے بعد کے لوگ تابعین وغیرہ تمہاری اقتدا کریں تاکہ یہ سلسلہ دین کا آگے تک پہنچ جائے ۔

خلاصہ یہ کہ ایسی کوئی صاف روایت نہیں ملتی جس میں ایک وقت ایک شخص امام بھی ہو اور مقتدی بھی ہو ۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۶ شعبان ۱۳۵۲ھ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء

عورت کی امامت

سوال :۔ مستورات کی امامت جائز ہے یا ناجائز ۔اگر جائز ہے تو درمیان میں کھڑی ہو یا آگے ؟

جواب :۔ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ عورت عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے لیکن درمیان کھڑی ہو ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۲ رمضان ۱۳۸۳ھ ۷ فروری ۱۹۶۴ء

الگ جماعت کے لئے مقررہ امام سے اجازت لینا

سوال :۔ کیا اکیلی جماعت قائم کرنے کے لئے اصل امام سے اجازت لینے کی ضرورت ہے ۔

جواب :۔ حدیث میں ہے ۔

لا یؤمن الرجل الرجل فی سلطانہ (مشکوٰۃ باب الامامۃ فصل اوّل)

یعنی کوئی شخص دوسرے کی اختیار والی جگہ امامت نہ کرائے ۔

مذکورہ بالا صورت میں اصل امام مسجد کی امامت کا اختیار رکھتا ہے جو مقررہ امام کے علاوہ اس میں پہلے جماعت کراتے ہیں۔ ان کی جماعت اس حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ان کو اس جماعت کا ثواب ہو الٹا عذاب کا خطرہ ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۸ جمادی الاول ۱۳۸۰ھ ۱۸ نومبر ۱۹۶۰ء

مسبوق کا بیان

مسبوق کی کونسی رکعت ہے

سوال :۔ ایک مقتدی تیسری رکعت شام کو رکوع میں شامل جماعت ہوتا ہے۔ اور وہ امام کے سلام کے بعد دوسری رکعت میں سبحانک اللہ پڑھے یا نہ پڑھے گویا باقی رکعت میں مقتدی ثناء پڑھے یا نہ پڑھے اور اگر پڑھی جائے تو نماز میں کوئی نقص تو نہیں۔ چارگانہ میں بھی دو رکعت فجر والی میں بھی؟

خدا بخش از راجہ سانسی تحصیل اجنالہ ضلع امرتسر

جواب :۔ حدیث میں ہے۔

مَا اَدْرَکْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَکُمْ فَاَتِمُّوْا متفق علیہ (مشکوٰۃ)

یعنی جتنی نماز امام کے ساتھ پاؤ پڑھو اور جتنی فوت ہو جائے پوری کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسبوق امام کے فارغ ہونے کے بعد جتنی نماز پڑھتا ہے وہ اس کی پچھلی نماز ہے اور جو امام کے ساتھ پڑھی ہے وہ اس کی پہلی ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں فوت شدہ کی بابت اتمام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اخیر سے پورا کرنے کے ہیں۔ اور اخیر سے پورا کرنا اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ جو امام کی فراغت کے بعد پڑھے وہ اس کی اخیر کی ہو۔ اور بعض روایتوں میں اتمام کی جگہ قضاء کا لفظ آیا ہے تو وہ اس کے خلاف نہیں۔ کیونکہ قضا کے معنی پورا کرنے کے بھی آئے ہیں۔

جیسے قرآن مجید میں ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ۔

یعنی جب نماز پوری ہو جائے تو پھر روزی کی تلاش کے لئے زمین میں پھیل جاؤ

پس جب اخیری نماز ہوئی تو اس میں ثنا نہ پڑھنی چاہیے۔ اگر غلطی سے پڑھی جائے تو معاف ہے یا ایسا ہے جیسے قرآن جیسے میں متشابہ لگ جاتا ہے۔ دیدہ دانستہ پڑھنی ٹھیک نہیں خواہ مغرب کی نماز ہو یا کوئی اور چار رکعت والی یا دو رکعت والی نماز ہو کسی میں ثناء نہیں اور التحیات بھی اسی حساب سے بیٹھے یعنی اگر امام کے ساتھ ایک رکعت پائی ہے۔ تو ایک اور پڑھ کر بیٹھے۔ اگر رکوع میں امام کے ساتھ ملا ہے تو اسے رکعت شمار نہ کرے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۳۰ جمادی الاخری ۱۳۵۳ھ ۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۴ء

مسبوق کا جماعت کے ثواب کا مستحق ہونا

سوال: ۔ مسبوق کتنا حصہ نماز کا امام کے ساتھ پائے تو جماعت کے ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے۔

جواب: ۔ اگرچہ ائمہ اسلام کا اختلاف ہے مگر صحیح اور راجح از روئے دلائل یہ ہے کہ مسبوق اگرچہ آخری تشہد ہی میں قبل از سلام ہے تو جماعت کا ثواب پانے کا مستحق ہے۔

چنانچہ امام نووی شرح مسلم صفحہ ۲۲۱ جلد ا میں فرماتے ہیں۔

المسئلة الثالثة اذا ادرك مع الامام ركعة كان مدركا لفضيلة الجماعة بلاخلاف وان لم يدرك ركعة بل ادركه قبل السلام بحيث لا يحسب له ركعة ففيه الوجهان لاصحابنا۔ احدهما لا يكون مدركا للجماعة لمفهوم الحديث من ادرك ركعة من الصلوٰة والثاني وهو الصحيح وبه قال جمهور اصحابنا يكون مدركا لفضيلة الجماعة لانه ادرك جزءًا منه ويجاب عن مفهوم الحديث بما سبق انتهى هذا۔ والله اعلم۔

ترجمہ۔ مسبوق جب امام کے ساتھ ایک رکعت پالے تو اس نے بالاتفاق جماعت کی فضیلت پالی۔ اگر پوری رکعت نہ پائے تو اس میں ہمارے اصحاب کے دو خیال ہیں۔ ایک یہ جماعت پانے والا شمار نہیں ہوگا کیونکہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص امام کے ساتھ ایک رکعت پالے اس نے نماز

پالی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک رکعت سے کم پائے تو اس نے امام کے ساتھ نماز نہیں پائی دوسرا خیال یہ ہے کہ اگر رکعت نہ پائے تو بھی جماعت پانے والا شمار ہوگا۔ اور یہی صحیح ہے۔ اور ہمارے جمہور اصحاب اسی کے قائل ہیں اور اوپر کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو امام کے ساتھ ایک رکعت پائے اس نے گویا ساری نماز امام کے ساتھ پڑھی۔ یعنی اس کو جماعت کا پورا ثواب ملے گا۔ اگر کم پائی تو کچھ کم ملے گا۔ کیونکہ اس نے اتنا حصہ نہیں پایا کہ اس کو نماز کہا جائے۔

تنبیہ ۔ جو شخص بڑے اخلاص واشتیاق اور محبت سے وضو کر کے باجماعت نماز ادا کرنے کی نیت سے مسجد کو آتا ہے اور آتے ہی دیکھتا ہے کہ جماعت ہو چکی تو اس کو کثرت اخلاص وشوق کے سبب سے بہت افسوس اور حسرت ہوتی ہے۔ ایسا شخص بھی کثرت اخلاص سے حکماً مدرک فضیلۃ الجماعت ہے اگرچہ اب وہ اکیلا نماز پڑھے گا۔ وہ شرعاً صلوٰۃ الفرد (اکیلے نماز) ہوگی مگر فضیلت جماعت اس کو مل جائے گی۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

من توضأ فاحسن وضوءہ ثم راح فوجد الناس قد صلوا اعطاہ اللہ تعالیٰ مثل اجر من صلّٰھا وحضرھا لا ینقص ذلک من اجورھم شیئاً۔

(ابوداؤد۔ نسائی (مشکوٰۃ ص۱۰۲)

ترجمہ ۔ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد کو گیا لوگوں کو پایا کہ نماز پڑھ چکے۔ اللہ اس کو جماعت کے ساتھ پوری نماز پڑھنے والے کا سا اجر دے گا اس کو پورا اجر دینا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کے اجر سے کچھ کم نہیں کرے گا۔

دوسرا مسئلہ | جماعت کے ساتھ کتنی نماز پانے والے کی نماز باجماعت نماز شمار ہوگی

سوال :۔ مسبوق کتنا حصہ نماز کا امام کے ساتھ پاوے تو وہ امام کی نماز میں شریک ہوتا ہے۔ جس سے اس کو امام جتنی نماز پڑھنی ضروری ہوجاتی ہے۔

جواب :۔ مسبوق اگر کم از کم ایک رکعت کاملہ امام کے ساتھ پالیوے تو امام کے ساتھ امام کی نماز میں شریک ہوگیا اور امام جتنی نماز پڑھنی ضروری ہوگی۔ کیونکہ حدیث صحیح میں آیا ہے۔

من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ فقد ادرک الصلوٰۃ ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ :- جو نماز سے ایک رکعت پالے اُس نے نماز پالی۔ ——— نیز

من ادرک من الصبح رکعۃ قبل ان تطلع الشمس فقد ادرک الصلوٰۃ وفی روایۃ النسائی من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ فقد ادرک الصلوٰۃ کلھا الّا انہ یقضی مافاتہ وفی روایۃ اخری للبیھقی من ادرک رکعۃ من الصبح قبل ان تطلع الشمس فلیصل الیھا الاخری۔

ترجمہ۔ جو صبح کی نماز سے طلوعِ آفتاب سے قبل ایک رکعت پالے اس نے صبح کی نماز پالی۔ اور ایک روایت بیہقی میں ہے جس نے صبح کی نماز سے ایک رکعت قبل طلوع پائی اور ایک بعد طلوع تو اُس نے نماز پالی۔ اور ایک روایت نسائی میں ہے جس نے نماز سے ایک رکعت پالی اُس نے ساری نماز پالی لیکن جو اس سے پہلے ہو چکی ہے اس کو ادا کرے گا۔ اور ایک روایت بیہقی میں ہے جو طلوع آفتاب سے ایک رکعت پالے وہ دُوسری ساتھ ملالے ——— نیز

من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ مع الامام فقد ادرک الصلوٰۃ ۔ رواہ مسلم۔
قال الشیخ العلامۃ ابن تیمیۃ رح اخرجہ الشیخان۔

ترجمہ :- اور مسلم کی روایت میں ہے جو امام کے ساتھ ایک رکعت پالے اُس نے تمام نماز پالی۔
ابن تیمیہ رح فرماتے ہیں بخاری مسلم دونوں نے اس کو روایت کیا ہے۔

عاجز ملیم نفسہ کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ فقد ادرک الصلوٰۃ میں الصلوٰۃ لفظ معرف باللّام معرفہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس نماز سے اس نے پُوری رکعت پائی اُس نے وہی نماز پائی باقی اتمام کرے تو پس وہ امام کی نماز میں شریک ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

اور اگر رکعت کاملہ سے کم حصہ نماز کا اُس نے پایا تو جماعت کے ثواب کا مستحق ہوا نماز امام میں شریک نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

تیسرا مسئلہ | مسبوق مسافر مقیم امام کے پیچھے کتنی نماز پڑھے

سوال :- مسافر مسبوق مقیم امام کے پیچھے اقتداء کرنے لگا تو امام مقیم اس وقت آخری رکعت کے سجود میں ہے۔ ساتھ مل گیا۔ اب یہ مسبوق مسافر ساری نماز کی نیت کرکے جماعت کے ساتھ ملے یا قصر

کرنے کے خیال سے دوگانہ کی نیت کرے۔

جواب ۔ جماعت میں ملتے وقت قصر کے خیال سے دوگانہ کی نیت کرے کیونکہ جماعت میں ملنے کے سبب سے محض جماعت کا ثواب پانے کا مستحق ہوا۔ امام کی نماز میں اس وقت شریک ہوسکتا تھا۔ اور اس کو اتمام کرنا ضروری تھا جس وقت وہ رکعت کاملہ امام کے ہمراہ پاتا۔ اذلیس فلیس۔

چنانچہ حدیث صحیح میں ہے۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ مَعَ الْإِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔ اخرجہ مسلم

وقال الشیخ ابن تیمیہ فی فتاواہ ص ۲۳۶ ج ۱۔ اخرجہ الشیخان۔

یعنی جو امام کے ساتھ ایک رکعت پالے اس نے نماز پالی۔ اس کو صحیح مسلم نے روایت کیا ہے ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔

نیز اسی طرح شیخ الاسلامؒ نے اپنے فتاویٰ ص ۳۳۶ جلد ۲ میں لکھا ہے۔

ان المسافر اذا ائتم بمقیم وادرك معه ركعة فما فوقها فانه يتم الصلوٰة وان ادرك معه اقل من ركعة صلاها مقصورة نص عليه الامام احمد في احدى الروايتين عنه وهذا لانه بادراك الركعة قد ائتم بمقيم في جزء من صلوة فلزم الاتمام واذا لم يدرك معه ركعة فصلوته صلوة منفرد فيصليها مقصورة انتهى ما سطره هذا والله اعلم۔

ترجمہ۔ جب مسافر مقیم کے پیچھے نماز پڑھے اور ایک رکعت یا زیادہ پائے تو وہ پوری نماز پڑھے۔ اگر کم پائے تو دوگانہ پڑھے۔ امام احمد نے ایک روایت میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک رکعت اس نے امام کے ساتھ پالی تو نماز کا اتنا حصہ پالیا کہ جس کو نماز کہا جا سکتا ہے اس لئے اس کو پوری نماز پڑھنی پڑے گی۔ اور جب ایک رکعت سے کم پائے تو اس کی نماز گویا اکیلے کی نماز ہے اس لئے دوگانہ پڑھے گا۔

چوتھا مسئلہ جمعہ میں امام آخری رکعت کے سجدہ میں ہو اس وقت ملنے والا جمعہ کی نیت کرے یا ظہر کی

سوال :۔ مسبوق جمعہ کی جماعت میں ملنا چاہتا ہے۔ امام آخری رکعت کے سجدے کر رہا ہے۔ اب مسبوق جمعہ کی نیت کر کے جماعت کے ساتھ ملے یا ظہر کی نیت کرے۔

جواب :۔ اس مسئلہ میں ائمہ اسلام مختلف ہیں۔ امام شافعی رحہ، عبداللہ بن مبارک رحہ، امام سفیان ثوری رحہ، امام احمدؒ، امام اسحٰق رحہ بن راہویہ وغیرھم فرماتے ہیں کہ اگر مسبوق رکعت کاملہ امام کے ساتھ پائے تو دوسری رکعت پڑھ لیوے اس کا جمعہ ہو گیا۔ اور اگر رکعت سے کم حصہ پاوے یعنی دونوں رکعتوں کے ہو جانے کے بعد آیا ہے اور محض سجود یا تشہد ہی میں ملا ہے تو اس کا جمعہ رہ گیا۔ وہ ظہر کی نیت کر کے امام کے ساتھ ملے۔ امام ابوحنیفہ رحہ اور ان کے اتباع فرماتے ہیں کہ سلام پھیرنے سے پہلے ملنے والا بھی جمعہ ہی پڑھے یعنی رکعت کاملہ امام کے ساتھ پاوے یا رکعت سے کم اجزاء میں ملے دونوں صورتوں میں جمعہ کی نیت کرے۔ میرے فہم ناقص میں از روئے دلائل کے امام احمد رحہ و امام شافعی رحہ وغیرہما کا مسلک صحیح اور راجح ہے اور اس کی تین وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضہ کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں۔

ان الجمعة لا تدرك الا بركعة كما افتى به اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم منهم ابن عمر رض وابن مسعود رض وانس وغيرهم ولا يعلم لهم فى الصحابة مخالف وقد حكى غير واحد ان ذالك اجماع الصحابة

یعنی جمعہ کم سے کم ایک رکعت پانے سے مل سکتا ہے جیسے صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم نے اس کے ساتھ فتوےٰ دیا ہے جن سے ابن عمر رضہ - ابن مسعود رضہ - انس رضہ وغیرہ ہیں۔ صحابہ رضہ میں ان کا مخالف کوئی معلوم نہیں۔ اور کئی علماء نے اس پر اجماع صحابہ رضہ نقل کیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کئی ایک حدیثوں میں صاف صریح وارد ہے۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنْ صَلٰوةِ الْجُمُعَةِ اَوْ غَيْرِهَا فَلْيُضِفْ اِلَيْهَا اُخْرٰى وَقَدْ تَمَّتْ صَلٰوتُهٗ۔ (دارقطنی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

جو جمعہ وغیرہ کی ایک رکعت پالے وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملالے اور اس کی نماز پوری ہو گئی۔

یہ حضرت ابوہریرہ رضہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضہ کی حدیثیں کئی طرق سے مروی ہیں۔ اور اگرچہ یہ سب حدیثیں ضعیف ہیں۔ کما قال الحافظ فی تلخیص الحبیر مگر ان کی تائید حدیث من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ فقد ادرک الصلوٰۃ (جو ایک رکعت پالے اس نے نماز پالی) متفق علیہ سے بہت عمدہ طریق سے ہو سکتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صحیح حدیث میں ہے۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ مع الامام فقد ادرک الصلوٰۃ اخرجہ الامام مسلم فی صحیحہ وقال ابن تیمیہ رح فی فتاواہ ھو فی الصحیحین وقال رحمہ اللہ الرحیم ھذا (الحدیث) نص رافع للنزاع۔

یعنی جو امام کے ساتھ ایک رکعت پالے اس نے نماز پالی۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں۔ اس کو بخاری مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ اور فرماتے ہیں اس حدیث سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ ایک رکعت سے کم پائے تو اس کی جمعہ کی نماز رہ گئی۔

ابراہیم امام مسجد و مدرس مدرسہ عربیہ موضع باقی پور

محدث روپڑی

آپ فرماتے ہیں کہ جوابات سب صحیح ہیں صرف نمبر ۳ میں میرا خیال ہے کہ اگر رکعت سے کم پائے تو بھی پوری پڑھے یعنی مناسب ہے۔ کیونکہ رکعت سے کم پانے والے کی نماز کی بنا امام کی نماز پر ہے۔ اگر بالفرض امام نے غلطی سے بے وضو نماز پڑھائی ہو تو جیسے امام کو لوٹانی پڑے گی۔ اس کو بھی لوٹانی پڑے گی۔ پس اس کو من کل الوجوہ منفرد قرار دینا ٹھیک نہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ پوری نماز پڑھے تاکہ اختلاف سے نکل جائے اور حدیث من ادرک رکعۃ اس بارہ میں نص نہیں بلکہ کئی احتمال ہیں۔ مثلاً آفتاب کا طلوع اس کی نماز کا مفسد نہیں یا جمعہ کی یا جماعت کے پورے ثواب کی بابت ہے اور کئی علماء اس کو رکوع میں ملنے کی بابت لکھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۵۰ھ یوم الجمعہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء

مسبوق کی امامت

سوال :۔ مسبوق کی امامت صحیح ہے یا نہیں۔ بعض علماء منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تحصیل حاصل لازم آتا ہے کیونکہ ثواب اس کو جماعت کا حاصل ہوگیا۔ پس اب دوبارہ جماعت کرنا بے کار ہے۔

جواب :۔ جو لوگ مسبوق کی امامت کو منع کرتے ہیں وہ محض اس وجہ سے منع نہیں کرتے کہ وہ نماز باجماعت کا ثواب پا چکا ہے کیونکہ اگر محض اس وجہ سے منع کریں تو کسی وقت جواز کے بھی قائل ہوں۔ مثلاً جو شخص جماعت کے ساتھ پوری نماز پڑھ چکا ہے وہ اُس شخص کے ساتھ مل کر نماز پڑھ پڑھا سکتا ہے جو جماعت کے بعد آئے اور اس کے ساتھ کوئی اور نہ ہو۔ جب پوری نماز باجماعت پانے والا دوسرے شخص کو جماعت کا ثواب دلانے کی غرض سے دوبارہ نماز پڑھ پڑھا سکتا ہے تو کم پانے والا بالطریق اولیٰ پڑھا سکتا ہے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ امامت مسبوق کو منع کرنے کی وجہ محض جماعت کا ثواب پانا نہیں بلکہ یہ اکثر صورتوں میں ہے اور عام وجہ شُبہ ہے کہ باقی نماز جو اُٹھ کر ادا کرتا ہے۔ اِس میں وہ منفرد کا حکم رکھتا ہے یا مقتدی کا۔ اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ مسافر مسبوق امام مقیم کے پیچھے پوری نماز پڑھتا ہے کیونکہ مقتدی کی تحریمہ۔ امام کی تحریمہ پر مبنی ہے۔ یعنی اس کی اقتدا میں داخل ہو کر نماز کی نیّت باندھی ہے تو اس لحاظ سے مسبوق بقیہ نماز میں مقتدی ہے۔ اور اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ بقیہ نماز میں اگر سہو ہو جائے تو یہ سجدہ سہو کرتا ہے کیونکہ اس کے حرکات اپنی مرضی سے ہیں تو اس لحاظ سے یہ منفرد کے حکم میں ہے چونکہ اس کی حالت میں اشتباہ ہے۔ اِس لئے کوئی اس کی امامت کو منع کہتا ہے کوئی مشتبہ۔

اِس کے علاوہ یہ معاملہ کثیر الوقوع ہے۔ یعنی جماعت نماز سے آگے پیچھے ہونے کا اتفاق۔ اکثر لوگوں کو ہوتا رہتا ہے۔ مگر ایک واقعہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یا صحابہ کے زمانہ کا ایسا نہیں ملتا۔ جس سے امامت مسبوق ثابت ہو۔ اس امامت مسبوق میں شُبہ اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اِس لئے احتیاط مناسب ہے۔ اور بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے ائتموبی ولیأتم بکم۔ من بعد کم۔ یعنی تم میری اقتدا کرو۔ اور جو تمہارے پیچھے ہیں تمہاری اقتدا کریں۔ اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی صفیں پہلی صفوں کی اقتدا کریں تو مقتدی کا حالت اقتدا میں امام بننا صحیح ہو گیا۔ تو اس کی بابت عرض ہے کہ یہ محض نیچے اُوپر ہونے میں اقتدا ہے۔ جیسے کوئی بہرہ اندھیری رات میں امام کے پیچھے ہو تو وہ اپنے ساتھی کے ساتھ نیچے اُوپر ہوتا ہے۔ یہ کوئی حقیقتاً امامت نہیں۔ اِسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مرض الموت میں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ حضرت ابو بکرؓ آپ کے پہلو میں کھڑے ہوئے تاکہ لوگوں کو تکبیر سنائیں کیونکہ کمزوری کے

باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ اسی طرح جب آدم بہت ہوتا ہے تو کسی کو تکبیر کے لئے مقرر کر دیتے ہیں تاکہ لوگ اس کی آواز کے ساتھ نیچے اُوپر ہوں۔ یہ کوئی حقیقت میں امامت نہیں۔ ٹھیک اسی طرح حدیث ائتموا بی ولیأتم بکم من بعدکم کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس حدیث کا ایک دوسرا معنی بھی ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اے صحابہ تم میری اقتداء کرو یعنی نماز وغیرہ میں میرا خیال رکھو کہ میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ اور تم سے بعد کے لوگ تابعین وغیرہ تمہاری اقتداء کریں تاکہ یہ سلسلہ دین کا آگے تک پہنچ جائے

خلاصہ یہ کہ ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس میں ایک وقت ایک شخص امام بھی ہو اور مقتدی بھی۔

ایک صورت

ایک اور جگہ پر اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے کہ:۔

اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص نے جماعت کے ساتھ کچھ حصہ نماز کا پایا۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب وہ بقیہ نماز کو ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو اُس کے ساتھ اور لوگ آملے جو امام کے ساتھ شامل نہیں ہوئے۔ دُوسری صورت یہ کہ جو لوگ امام کے ساتھ شامل ہوئے اُن سے ایک شخص امام ہو جائے اور دُوسرے اُس کی اقتداء کریں یہاں دونوں صُورتوں میں کچھ کچھ شُبہ ہے۔ پہلی میں کم اور دوسری میں زیادہ۔ ہم ہر ایک کی الگ الگ تفصیل کرتے ہیں۔

پہلی صُورت کی تفصیل

اکثر علماء کا مذہب ہے۔ چنانچہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں گذر چکا ہے۔ لیکن اس میں ذرا اختصار ہے۔ دلیل مذکور نہیں۔ ہم ابن تیمیہ کی بقیہ عبارت بھی ذکر کرتے ہیں جس میں اس کی دلیل مذکور ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وذالك ان ذالك الرجل كان مؤتمًا فی اول الصّلوٰۃ وصار منفردًا بعد سلام الامام فاذا ائتم به ذالك الرجل صار المنفرد اماما كما صار النبی صلى الله عليه وسلم اماما بابن عبّاس بعد ان كان منفردًا وهذا یصحّ فی النفل كما جاء هذا الحدیث۔ كما هو منصوص عن احمد وغيره۔ من الائمة و ان كان قد ذكر فی مذهبه قول بانه لا یجوز واما فی الفرض فنزاع مشهور والصحیح جواز ذالك فی الفرض والنفل۔ الخ۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ شخص بقیہ نماز اکیلے نماز پڑھنے والے کا حکم رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ آکر مل جائے تو یہ ایسا ہوگیا جیسے کوئی شروع سے اکیلے پڑھنے والے کے ساتھ آملے۔ جیسے تہجد کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابن عباس آملے تھے حالانکہ آپ اکیلے پڑھ رہے تھے۔ اور یہ نفلوں میں صحیح ہے۔ جیسے یہ حدیث آئی ہے۔ اور امام احمد اور دیگر ائمہ سے بھی۔ اس کے جواز کی تصریح مروی ہے۔ اگرچہ امام احمد سے ایک قول عدم جواز کا بھی نقل کیا گیا ہے لیکن پہلا حدیث کے موافق ہے۔

رہا فرضوں میں اس کا صحیح ہونا تو اس میں اختلاف مشہور ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ فرضوں نفلوں دونوں میں درست ہے۔ کیونکہ نفلوں میں حالتِ انفراد انسان امامت کی نیت کرکے اپنے ذمہ زیادہ بوجھ لے لیتا ہے۔ سو اسی طرح فرضوں میں سمجھ لینا چاہیے۔ اس دلیل کا مدار اس پر ہے کہ یہ شخص بقیہ نمازمیں اکیلے کا حکم رکھتا ہے۔ اگر بقیہ نمازمیں اکیلے کا حکم نہ رکھے بلکہ اس کی ساری نماز جماعت کے ساتھ سمجھی جائے تو بقیہ نماز میں بھی اس کا مقتدی کا حکم ہوگا اور مقتدی کا حالتِ اقتداء میں امام ہونا اس کا کسی حدیث[1] میں ذکر نہیں۔ ہاں اقتدا کی حالت چھوڑ کر امام ہونا ثابت ہے۔ جیسے امام کا وضو ٹوٹ جائے یا کوئی عارضہ ہوجائے تو اس وقت کسی مقتدی کو اپنی جگہ کر سکتا ہے مگر اس وقت وہ مقتدی نہیں۔

اور عطا تابعی کا قول جو اوپر گذر چکا ہے اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسبوق کی امامت کے قائل ہوں۔ دوسرے یہ کہ جو سجدے یا رکوع وغیرہ میں شامل ہو۔ اس کی نماز کو وہ جماعت کے ساتھ نہ قرار دیتے ہوں کیونکہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کتنی نماز امام کے ساتھ پائے تو وہ جماعت میں سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] ایک حدیث میں ہے ائتموا بی ولیاتم بکم من بعدکم۔ مشکوٰۃ (باب تسویۃ الصفوف) تم میری اقتدا کرو اور جو تمہارے بعد ہیں وہ تمہاری اقتدا کریں۔ بعض نے کہا ہے کہ حالت اقتدا میں امامت کا اس حدیث میں ذکر ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ تم میری اقتدا کرو۔ اور پچھلی صفیں تمہاری اقتدا کریں۔ لیکن اس میں دو شبہے ہیں۔ ایک یہ کہ بعد والوں سے پچھلی صفیں مراد لینا بے دلیل ہے۔ اور مراد اس سے آئندہ آنے والے لوگ ہیں۔ اور اقتدا سے مراد اتباع ہے۔ دوسرا یہ کہ پہلی صفیں پچھلی صفوں کے لئے صورت میں امام ہیں۔ یعنی پچھلی صفیں پہلی صفوں کو دیکھ کر نیچے اوپر ہوتی ہیں۔ جیسے نابینا آدمی اگر امام سے دور ہو تو وہ ساتھی کے ساتھ نیچے اوپر ہوتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں امام ایک ہی ہے جو سب کو نماز پڑھا رہا ہے۔

اگر رکوع سجدے میں شامل ہونے والا۔ ان کے نزدیک جماعت میں شامل نہیں سمجھا گیا تو پھر یہ مسبوق نہ ہوا بلکہ ایسا ہوا جیسے ساری نماز اکیلا پڑھنے والا۔ پس عطا تابعی کا قول بھی اس مسئلہ میں کوئی تسلی بخش نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں لیث بن ابی سلیم ہے۔ جس کی روایتیں اخیر میں خلط ملط ہونے کی وجہ سے متروک ہو گیا۔

دوسری صورت کی تفصیل

دوسری صورت میں دو شبے ہیں۔ ایک وہ ہی شبہ جو پہلی صورت میں ہے۔ یعنی اقتدا کی حالت میں مقتدی کا امام ہونا، اس کا ذکر کسی حدیث میں نہیں۔ دوسرا یہ کہ جب سارے امام کے ساتھ شامل ہو گئے تو اُن کی نماز باجماعت ہو گئی تو پھر اور نماز باجماعت کی کیا ضرورت ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک دفعہ قضا حاجت کو چلے گئے۔ آپ سفر میں تھے۔ مغیرہ کہتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ پانی لے گیا۔ جب قضا حاجت سے فارغ ہوئے تو میں نے آپ کو وضو کرایا۔ آپ نے پیشانی اور پگڑی پر مسح کیا۔ پھر میں آپ کے موزے نکالنے کے لئے پاؤں کی طرف جھکا۔ فرمایا میں نے وضو کر کے موزے پہنے ہیں۔ اِن پہ آپ نے مسح کیا لوگ آگے چلے گئے۔ فجر کی نماز کو دیر ہو گئی۔ عبدالرحمن بن عوف نے جماعت قائم کر دی۔ ایک رکعت نماز پڑھی تھی کہ آپ پہنچ گئے۔ آپ جماعت میں شامل ہو گئے جب عبدالرحمن بن عوف نے سلام پھیرا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کھڑے ہو گئے اور میں بھی ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پس ہم نے وہ رکعت پڑھی جو پہلے ہو چکی تھی۔ اس حدیث کے آخر میں بعض روایتوں میں عبارت یوں ہے فلما سلّم. قام النّبیّ صلی اللہ علیہ وسلم وقمت معه فرکعنا الرکعت التی سبقتنا (مشکوٰۃ باب المسح علی الخفین ص۴۵) اس عبارت میں مغیرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کھڑے ہوئے تو میں بھی ساتھ کھڑا ہو گیا اور ہم نے باقی رکعت ادا کی۔ اِس عبارت کا مطلب بعض یہ بیان کرتے ہیں کہ باقی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم امام اور مغیرہ مقتدی ہو گئے۔ لیکن یہ مطلب ٹھیک نہیں کیونکہ ساتھ کھڑا ہونے کا یہ مطلب لینا کہ مغیرہ مقتدی ہو گئے یہ محض اپنا خیال ہے ورنہ درحقیقت یہ بیان واقع ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور مغیرہ صف میں اکٹھے کھڑے ہوئے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد اکٹھے ہی کھڑے ہونا تھا سو اسی بات کا یہ بیان ہے۔ اِس سے جماعت سمجھنا غلطی ہے۔ ہاں مسلم اور نسائی باب المسح علی الخفین میں یہ لفظ ہیں ثم صلّی بنا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں نماز پڑھائی۔ یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے امام ہونے پر دلالت کرتے ہیں مگر مسلم اور نسائی کی روایت کا واقعہ کسی دوسری نماز کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں عبدالرحمن بن عوف کا نماز قائم کرنا اور آپ کا ایک رکعت پانا مذکور نہیں۔ بلکہ اس میں یوں ہے ومسح

علیٰ خفیہ ثم صلی بنا۔ یعنی وضو میں اپنے موزوں پر مسح کیا پھر نماز پڑھائی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نماز فوت نہیں ہوئی اور جملہ ہمیں نماز پڑھائی یہی اس کا موید ہے۔ اگر اس سے مراد بقیہ رکعت ہے تو مغیرہ کہتے ہیں۔ مجھے نماز پڑھائی۔ کیونکہ پہلی روائت میں جملہ دقمت معہ (میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوا) اکیلے مغیرہ پر ہی دلالت کرتا ہے۔ غرض اس صورت کی بابت بھی کوئی صریح روایت نہیں۔ صرف قتادہ رض کا قول ہے جو چھوٹے تابعی ہیں جس کا ذکر ابن حزمؒ نے بغیر سند کے کیا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ رکعت پانے والا اُن کے نزدیک پوری جماعت پانے والا سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔ شاید اُن کا یہ مذہب ہو کہ جو دو رکعت سے کم پائے۔ اُس سے جماعت فوت ہو گئی اس لئے وہ نئی جماعت کا ارشاد فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ رکعت سے مراد رکوع بھی ہوتا ہے تو احتمال ہے کہ قتادہ کا مطلب یہ ہو کہ جو رکوع پائے اس میں گویا امام کے ساتھ جماعت نہیں پائی اس لئے نئی جماعت کی ضرورت ہوئی۔ پھر تابعی کا قول کسی کے نزدیک بھی حجت نہیں اور مسئلہ مختلف فیہا ہے۔ اس لئے جو کسی کی سمجھ میں آئے اُس پر عمل کرے۔ تشدد مناسب نہیں نہ کسی پر زور ڈالنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ابن حزمؒ نے تصریح کر دی ہے کہ بقیہ نماز میں جماعت نہ ہو تو اکیلے اکیلے کی بھی ادا ہو جاتی ہے خاص کر ایک آدھ رکعت کا امام کے ساتھ فوت ہو جانا یہ کثیر الوقوع ہے یعنی عموماً ہر نماز میں کسی نہ کسی شخص سے ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کہ ایک آدھ رکعت رہ جاتی ہے لیکن باوجود اس کے کسی روایت میں بقیہ نماز میں جماعت کی تصریح نہیں آئی۔ جو بالکل جماعت سے رہ جائے۔ اس کی بابت جماعت ثانیہ کی تصریح موجود ہے جو کچھ حصہ میں شامل ہو اس کی جماعت کا کہیں ذکر نہیں حالانکہ اس کا ذکر ضروری تھا کیونکہ کچھ جماعت میں شامل ہونے سے شبہ پڑ سکتا ہے کہ یہ ساری جماعت میں شامل ہے۔ اس کو دوسری جماعت کی ضرورت نہیں۔ اس شبہ کو دُور کرنے کے لئے اس کا ذکر اہم تھا لیکن کہیں ذکر نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسبوق کی امامت کوئی اہم مسئلہ نہیں پس اس پر بہت ذہن آزمائی کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۸ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ - ۱۵ جنوری ۱۹۳۳ء

امام نماز سے فارغ ہو کر کس طرف منہ کرے؟

سوال: امام مسجد جب سلام پھیر کر بیٹھے تو اس کا قبلہ کی طرف پیٹھ دے کر اور مقتدیوں کی طرف منہ

کر کے بیٹھنا افضل وسنّت ہے یا کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف کے مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا افضل ہے۔ اور پیغمبر علیہ السّلام سے کونسا طریقہ ثابت ہے بحوالہ حدیث معہ صحت راوی وغیرہ تحریر فرماویں۔

جواب :۔ مولوی محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم جب سلام پھیرتے تو قبلہ کی طرف پیٹھ اور مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے۔

عن سمرة بن جندب قال كان النّبىّ صلّى الله عليه وآله وسلّم اذا صلى صلوة اقبل علينا وجهه۔

یعنی سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم جب کوئی نماز پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنا چہرہ مبارک ہماری طرف کر کے بیٹھتے۔

قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲ میں لکھتے ہیں۔

وهو يدل على مشروعية استقبال الامام للمؤتمين بعد الفراغ من الصلوة والمواظبة على ذالك۔

یعنی یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر امام ہمیشہ مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھے۔

اور حافظ ابن حجر رح فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

وسياق سمرة ظاهرة انه كان يواظب على ذالك۔

اور ظاہر ہے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس پر ہمیشگی کرتے۔

اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے اپنی دائیں طرف کے مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا بھی ثابت ہے۔ صحیح مسلم میں ہے۔

عن البراء بن عازب قال كنا اذا صلينا خلف رسول الله صلّى الله عليه وسلّم احببنا ان نكون عن يمينه فيقبل علينا بوجهه۔

یعنی براء بن عازب سے روایت ہے کہ جب ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیچھے نماز پڑھتے تو اس بات کو محبوب رکھتے کہ ہم لوگ آپؐ کے داہنے جانب ہوں۔ پس آپ ہماری جانب چہرہ مبارک کر کے بیٹھیں۔

قاضی شوکانی رحہ نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں۔

حدیث براء بن عازب یدل علی ان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل علی من فی جھۃ المیمنۃ ویمکن الجمع بین الحدیثین (ای بین حدیث سمرۃ وبین حدیث البراء) بانہ کان تارۃ یستقبل جمیع المؤتمین و تارۃ یستقبل اھل المیمنۃ انتھی۔ ھذا کلہ ماعندی۔ واللہ اعلم۔

یعنی حدیث براء بن عازب اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں طرف کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور سمرہ اور براء رض کی حدیثوں میں یوں موافقت ہوسکتی ہے کہ کبھی سب مقتدیوں کی طرف منہ کرتے اور کبھی دائیں طرف والوں پر متوجہ ہوتے۔

محمد عبدالرحمٰن المبارکفوری عفا اللہ تعالیٰ۔ ۱۱ جمادی الاول ۱۳۵۳ھ

محدث روپڑی رحہ

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے کافی لکھدیا ہے۔ رہی احادیث میں موافقت تو وہ اس طرح ہے کہ بیٹھتے تو مقتدیوں کی طرف منہ کرکے لیکن کسی قدر دائیں طرف مائل ہوتے۔ اس لئے کسی نے مقتدیوں کی طرف کہدیا کسی نے دائیں طرف۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ بہت دنوں تک مقتدیوں کی طرف منہ کرتے رہتے بہت دنوں تک دائیں طرف رسو جسیا کسی راوی نے دیکھا بیان کردیا۔ اس کے علاوہ لفظ کان مضارع پر داخل ہوکر اگرچہ ہمیشگی کے معنی دیتا ہے لیکن اس میں نص نہیں بلکہ ظاہر ہے۔ اس لئے امام شوکانی رحہ نے کہا ہے کہ ظاہر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ہمیشگی کرتے، پس جب ظاہر ہوا تو دوسری احادیث کی وجہ سے اس کی تاویل ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد کثرت ہے۔ کثرت کو راوی نے مجازاً ہمیشگی کے لفظ سے بیان کردیا ہے۔ اور عبداللہ بن مسعود رض فرماتے ہیں کہ انسان اپنی نماز میں شیطان کا حصہ نہ کرے کہ دائیں طرف پھرنا اپنے ذمہ لازم سمجھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت دفعہ بائیں طرف پھرتے بھی دیکھا ہے۔

(ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب الدعاء فی التشہد فصل الاول ص ۹۰)

جب آپ بائیں طرف بھی پھرتے تھے تو ہمیشگی مراد لینی ٹھیک نہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

ضلع انبالہ

کیا مقتدی امام کے برابر کھڑے ہو سکتے ہیں؟

سوال :۔ اگر امام کے پیچھے خالی جگہ ہو اور مقتدی برابر کھڑے ہو جائیں تو کیا نماز ہو جائے گی؟ مکمل تشریح سے مطلع فرمادیں۔

جواب :۔ مقتدی ایک ہو تو امام کے برابر کھڑا ہو۔ اگر زیادہ ہوں تو امام کے پیچھے۔ اور عورت خواہ ایک ہو یا زیادہ امام کے پیچھے کھڑی ہوں۔ ہاں مجبوری کے وقت اس کے خلاف بھی درست ہے۔

منتخب کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۰۲ میں ہے۔

عن معاوية الكندي انه ركب الى عمر بن خطاب يسأله عن ثلث خصال فقدم المدينة فقال له عمر ما اقدمك على قال لاسئلك عن ثلاث قال وما هن قال ربما كنت انا والمرأة فى بناء بنى فحضرت الصلوة فان صليت انا وهى كانت بحذائى وان صلت خلفى خرجت من البناء فقال عمر تستر بينك وبينها بثوب ثم تصلى بحذائك ان شئت وعن الركعتين بعد العصر فقال نهانى عنهما رسول الله صلى الله عليه وسلم قال وعن القصص فانهم ارادونى على القصص فقال ما شئت كانه كره ان يمنعه قال انما اردت انتهى الى قولك قال اخشى عليك ان تقص فترتفع عليهم فى نفسك ثم تقص فترتفع حتى يخيل اليك انك فوقهم بمنزلة الثريا فيضعك الله تحت اقدامهم يوم القيامة بقدر ذلك (حم ص)

معاویہ کندیؓ سے روایت ہے وہ تین باتوں سے سوال کرنے کی غرض سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا وہ کیا ہیں؟ کہا ایک یہ کہ کبھی میں اور عورت چھوٹے سے مکان میں ہوتے ہیں۔ اور نماز کا وقت آجاتا ہے۔ اگر ہم دونوں نماز پڑھیں تو وہ میرے برابر ہو جاتی ہے۔ اگر پیچھے کھڑی ہو تو مکان سے باہر ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا سو درمیان کپڑے کا پردہ کر کے پھر وہ تیرے برابر نماز پڑھے۔ دوسری بات عصر کے بعد دو رکعت ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان سے منع کیا ہے۔ تیسری بات وعظ ہے قوم مجھے وعظ کے لئے کہتی

ہے۔ حضرت عمر رضہ نے کہا جو تو چاہے گویا حضرت عمر رضہ نے وعظ کو اچھا نہ سمجھا مگر روکنا بھی مناسب معلوم نہ ہوا۔ معاویہ کندی نے کہا کہ میرے آنے کی غرض ہی یہ ہے کہ میں آپ کے کہنے پر عمل کروں۔ فرمایا مجھے خوف ہے کہ وعظ کہتے کرتے تیرا دماغ بلند ہو جائے۔ یہاں تک کہ ثریا ستاروں کو پہنچ جائے۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہو کہ قیامت کے دن خدا تجھے اتنا ہی ان کے قدموں کے نیچے کر دے۔ اس کو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اور ضیاء مقدسیؒ نے مختارہ میں روایت کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجبوری کے وقت عورت برابر کھڑی ہو سکتی ہے۔ پس اسی طرح مردوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض دفعہ مساجد میں عورتوں کے لئے پیچھے جگہ نہیں ہوتی تو دائیں بائیں کوئی حرج نہیں۔

قصر نماز کا بیان

مسافت قصر

سوال :۔ مسافر پر کم از کم کتنے میل کے سفر کے بعد نماز قصر لازم آتی ہے۔

ماسٹر حفیظ الرحمن ایم۔ اے گورنمنٹ ہائی سکول للت پور ضلع جھانسی یو۔پی

جواب :۔ ۹ میل کے سفر میں دوگانہ درست ہے اس کی بابت صحیح مسلم میں حدیث آئی ہے۔ مسافر اپنے گاؤں یا شہر کی حدود سے باہر نکلتے ہی دوگانہ شروع کر سکتا ہے۔ چنانچہ دوسری روایات میں آیا ہے۔

عبداللہ امرتسری

مسافر کا پوری نماز پڑھنا

سوال :۔ مسافر پوری نماز پڑھ سکتا ہے۔

جواب :۔ دوگانہ کا تارک گنہ گار نہیں۔ ہاں بہتر یہی ہے کہ دوگانہ پڑھے۔ حدیث میں ہے۔ ان اللہ یحب ان توتی رخصہ۔ یعنی خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی رخصت قبول کی جائے۔

عبداللہ امرتسری

سفر کے موقعہ پر ریل وغیرہ میں قبلہ رُو ہونا

سوال:۔ کیا سفر میں نماز کے لئے قبلہ رُو کھڑا ہونا ضروری ہے۔ ریل میں بوقتِ نماز منہ کس طرف کرنا چاہیئے۔

جواب:۔ فرض نمازوں میں قبلہ رُو ہونا ضروری ہے خواہ ریل کا سفر ہو یا کوئی اور ہاں تھوڑے بہت فرق کا کوئی حرج نہیں کیونکہ حدیث ما بین المشرق والمغرب قبلۃ سے ثابت ہوتا ہے کہ عین بیت اللہ کی طرف منہ ضروری نہیں بلکہ وہ جانب کافی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ یکم مئی ۱۹۳۸ء ۔ ۲۷ صفر ۱۳۵۷ھ

تین میل یا اس سے کم مسافت پر قصر

سوال:۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کی کوئی حد مقرر نہیں کی تو چھوٹے سے چھوٹے سفر میں قصر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ بعض لوگ اسی خیال کے ہیں۔ زاد المعاد میں ہے

ولم یحد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ مسافۃ محدودۃ للقصر والفطر بل اطلق لھم ذالک فی مطلق السفر والضرب فی الارض کما اطلق لھم التیمم فی کل سفر واما ما یروی عنہ من التحدید بالیوم والیومین والثلاثۃ فلم یصح عنہ فیھا شیء البتۃ وجواز القصر والجمع فی طویل السفر وقصیرہ مذھب کثیر من السلف (سبل جلد ا) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں نماز قصر اور روزہ ترک کرنے کے لئے اُمت کو کوئی حد معین نہیں بتائی بلکہ مطلق سفر چھوٹے اور بڑے میں قصر اور فطر ان کے لئے جائز رکھا ہے۔ جیسا ان کے لئے تیمم ہر سفر میں جائز ہے اور جو ایک یا دو یا تین روز کی مسافت کے ساتھ حد سفر جناب سے منقول ہے اس میں سے کوئی بھی جناب سے صحیح طور پر ثابت نہیں اور ہر چھوٹے بڑے سفر میں قصر اور جمع بین الصلوٰتین کا جواز اکثر سلف کا مذہب ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سے ایک میل پر قصر کرنا صحیح سند سے ثابت ہے مگر یہ منشاء اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام نے سفر کو دواعی سہولت میں شمار کیا ہے اور غرض اسلام کی یہ ہے کہ جس طرح مرض سے انسان پر

احکام کی طاقت نہیں رہتی۔ اسی طرح سفر بھی جسم انسان کو چور کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی قوانین تخفیف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور بعض دفعہ قلت وقت اور تکلیف نزول سفر میں قصر کے علاوہ دیگر سہولت کے داعی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ جمع صلوتین سفر میں غالباً اسی لئے کی جاتی ہے تو میل دو میل کے سفر میں کس طرح افطار اور ترک جمعہ اور قصر وغیرہ کی اجازت ہو سکتی ہے۔ ہاں نو دس میل کا سفر جس میں اہل حدیث کے نزدیک قصر وغیرہ جائز ہے۔ ریل یا موٹر پر کسی ایسی تکلیف کا موجب نہیں ہوتا مگر پیادہ کے لئے تو تکلیف دہ ضرور ہے۔

کم از کم ایک صورت میں علت شرعی موجود ہے بخلاف اس کے کہ دو تین میل کا سفر تو ہر صورت علت حکم سے خالی ہے لہٰذا اس میں تخفیفات سفر کا استحقاق نہ ہونا چاہیے۔ بعض لوگ حد سفر مقرر کرتے ہیں مگر ان میں بھی سخت اختلاف ہے۔ سبل السلام میں حدیث انس کے تحت جو لکھا ہے اُس کا اُردو ترجمہ یہ ہے۔

" اس میں اختلاف ہے کہ قصر کتنی مسافت پر ہونا چاہیئے اس میں بیس قول ہیں۔ ظاہریہ کا عمل اس حدیث پر ہے (جس میں تین کوس یا نو کوس شک کے ساتھ آیا ہے) اور کہتے ہیں قصر کی مسافت تین کوس ہے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس میں تین کوس مشکوک ہے۔ ہاں اس حدیث سے نو کوس پر استدلال ہو سکتا ہے کیونکہ تین کوس نو میں داخل ہیں۔ پس اکثر لے لیا جائے گا۔ اور اسی میں احتیاط ہے لیکن کہا گیا ہے کہ نو کوس کی طرف کوئی نہیں گیا۔ البتہ سعید بن منصور کی حدیث سے ظاہریہ کا استدلال صحیح ہو سکتا ہے جس میں تین کوس بغیر شک کے ہے "

ابو سعید رضہ کی یہ حدیث تین کوس کے مسافر کو قصر کی اجازت دیتی ہے۔ نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۱۹۳ میں ہے

ولکنه روی سعید بن منصور عن ابی سعید قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سافر فرسخا یقصر الصلوٰۃ وقد اورد الحافظ هذا فی التلخیص ولم یتکلم علیه فان صح کان الفرسخ هذا هو المتیقن ولا یقصر فیما دونه الا اذا کان یسمی سفرا لغة وشرعا۔

سعید بن منصور نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین کوس پر قصر کرتے۔ اس حدیث کو حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص میں ذکر کیا ہے اور اس پر کلام نہیں کی پس اگر یہ حدیث صحیح ہو تو یہ فیصلہ کن ہے اور پھر تین کوس سے کم میں قصر نہیں ہو گی۔ مگر اس صورت میں کہ تین کوس سے کم پر بھی لغتاً یا شرعاً سفر کا اطلاق ہو سکے۔

کیا ابو سعید کی یہ حدیث قابل احتجاج ہے تو ٹھیک ورنہ ہم کسی صورت بھی نو میل سے کم مسافت پر قصر اور فطر

وغیرہ نہیں کرسکتے۔ میرے پاس نہ تلخیص ہے اور نہ اسماء الرجال کی کوئی کتاب ہے۔ لہٰذا برائے مہربانی حدیث ابی سعید کے متعلق تسلی بخش تحقیق عنایت فرمائیں تاکہ سارا اختلاف ختم ہو جائے۔ اور مسلم شریف کی مندرجہ ذیل حدیث کا شک راوی دفع ہو جائے۔

عن انس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرج مسیرۃ ثلاثۃ امیال او ثلاثۃ فراسخ قصر الصلوۃ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تین کوس یا تین فرسخ (نو کوس) نکلتے یعنی سفر کرتے تو دوگانہ پڑھتے۔

فتح الباری میں اس حدیث کے متعلق لکھا ہے وھو اصح حدیث ورد فی بیان ذالک واصرحہ۔ یعنی یہ حدیث اس بارہ میں بہت صحیح اور بہت صریح ہے۔

جواب:۔ میری تحقیق بھی یہی ہے کہ یہ حدیث فیصلہ کن ہے۔ سعید بن منصور کے حوالہ سے تین کوس کی حدیث جو سوال میں لکھی گئی ہے اس کی صحت معلوم نہیں۔ چنانچہ امام شوکانی کی عبارت سے ظاہر ہے تلخیص دیکھی گئی ہے اس میں بھی اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ صرف سعید بن منصور کے حوالہ سے ذکر کر دی ہے۔ اس پر کلام نہیں کی نہ اس کی سند ذکر کی ہے ـــــــ اور یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ والی مسلم کی ہے۔ جس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس لئے اس پر مسئلہ کی بنا رکھنی چاہیئے۔ مگر چونکہ اس حدیث میں تین کوس اور نو کوس شک کے ساتھ آیا ہے اس لئے احتیاطاً نو کوس پر دوگانہ پڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ نو کوس میں تین کوس آجاتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

قصر کی مدت

سوال:۔ اس بارہ میں بھی بہت اختلاف ہے کہ مسافر کتنے روز ایک جگہ مقیم رہ کر قصر کر سکتا ہے۔ بعض تین روز کہتے ہیں۔ ائمہ ثلاثہ مالکؒ۔ شافعیؒ۔ احمدؒ کا یہی مذہب ہے۔ بعض پندرہ بعض انیس کے قائل ہیں۔ اور دلائل بھی رکھتے ہیں۔ اس کو تردد پر محمول کرنا غلط ہے۔ کیونکہ صحابہ سے بلا تردد بلکہ عزم و جزم کی صورت میں انیس روز تک قصر ثابت ہے نیز تردد کی صورت میں کوئی تعداد ایام معین نہیں بلکہ متردد مسافر مہینوں تک بلکہ سالوں تک قصر کر سکتا ہے۔ ترمذی میں ہے۔

ثم اجمع اھل العلم علی ان للمسافر ان یقصر مالم یجمع اقامۃ وان اتی علیہ سنون۔ یعنی اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسافر جب تک اقامت کی پختہ نیت نہ کرے قصر کر

سکتا ہے۔ خواہ کئی سال گزر جائیں تو کیا انیس یا سترہ یا پندرہ روز اقامت کرنے والا مسافر قصر کر سکتا ہے نیز تین روز ایک جگہ رہنے والا مسافر جس طرح نماز قصر کر سکتا ہے اس طرح افطار اور ترک جمعہ بھی۔ ان تین دنوں میں کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر کر سکتا ہے تو بصورت جواز قصر بارہ یا پندرہ یا سترہ روز افطار و ترک جمعہ بھی جائز ہونا چاہیئے۔ اور جن کے نزدیک مذکورہ بالا ایام تک قصر جائز ہے ان کو اتنے روز افطار اور ترک جمعہ بھی جائز رکھنا چاہیئے۔

جواب:۔ چونکہ سلف میں اختلاف ہے اور جن صحابہ رضؓ (عبداللہ بن عباسؓ) سے انیس روز قصر کرنے کی روایت آئی ہے ان کی دلیل فتح مکہ کی حدیث ہے کہ آپ انیس روز مکہ میں ٹھہرے اور قصر کرتے رہے اس روایت میں یہ شبہ ہے کہ آپ اتنے روز تردد میں ٹھہرے ہوں اور تردد والا خواہ کتنے روز ٹھہرے وہ قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ ترمذی کے حوالے سے آپ نے ذکر کیا ہے۔ اور عبداللہ بن عباس رضؓ کا اس سے عزم و جزم سمجھنا یہ اسی صورت میں حجت ہو سکتا تھا جب کہ سلف کا اس مسئلہ میں اختلاف نہ ہوتا۔ جب وہ خود مختلف ہیں تو اب عزم و جزم کے متعلق کوئی تسلی نہیں۔ پس احتیاط اسی میں ہے کہ جتنے دن آپ کا قیام عزم و جزم سے ثابت ہے اس پر مسئلہ کی بنا رکھی جائے۔ سو وہ تین چار دن کے درمیان ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقعہ پر ۴ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ پہنچے ہیں۔ اور آٹھ کو منیٰ کی طرف روانہ ہو گئے اور ان تین چار دن میں دوگانہ پڑھتے رہے اور یہ قیام بہ نیت عزم و جزم تھا۔ کیونکہ حاجی کے لئے منیٰ کی طرف روانگی کا دن ۸ ذی الحجہ ہے پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ۸ ذی الحجہ تک بہ نیت عزم و جزم تھا۔ اور ان دنوں میں آپ قصر کرتے رہے تو یہ مسئلہ پختہ ہو گیا کہ تین اور چار کے درمیان عزم و جزم کی صورت میں مسافر دوگانہ پڑھ سکتا ہے اس سے زیادہ کی کوئی فیصلہ کن دلیل نہیں ملی اور نماز فرض ہے۔ پختہ دلیل کے بغیر اس کا کچھ حصہ ترک کرنا درست نہیں اس لئے تین چار دن سے زیادہ قصر نہ کرنی چاہیے۔ اور یہی اہل حدیث کا مذہب ہے۔

نوٹ:۔ تین چار دن تک رخصت صرف نماز کے لئے نہیں بلکہ افطار و جمعہ کے لئے بھی ہے۔ اور جو زیادہ کے قائل ہیں وہ بھی نماز قصر جمعہ و افطار میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم اہلحدیث

۱۲ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ ۲ فروری ۱۹۳۹ء

تاجر دوگانہ پڑھ سکتا ہے

سوال:۔ کوئی شخص اپنی دکان کا سامان خریدنے کے لئے دوسرے شہروں کو جاتا ہے کیا وہ دوگانہ پڑھ سکتا ہے۔ اگر پڑھ سکتا ہے تو اپنے شہر سے کتنے فاصلہ پر جا کر دوگانہ پڑھے۔

ابراہیم پیپلز کالونی لائل پور

جواب:۔ دکان کے لئے سامان خریدنے کے لئے جائے یا کسی اور ضرورت کے تحت سفر پر روانہ ہو تو دوگانہ پڑھ سکتا ہے۔ سفر خواہ ریل کا ہو یا لاری کا۔ جب اپنے گاؤں یا شہر کی حدود سے نکل جائے تو دوگانہ شروع کر دے کیونکہ حدود سے نکلتے ہی دوگانہ شروع ہو جاتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

مسافر مقیم کی اقتداء میں

سوال:۔ مقامی امام جب چار رکعت ادا کر رہا ہو مسافر جماعت کے ساتھ شامل ہو کر دوگانہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑھ سکتا ہے تو دو رکعت ادا کر کے سلام پھیر دے یا چار رکعت امام کے ساتھ ادا کرے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مقامی امام ایک رکعت ادا کر چکا ہوتا ہے اور مسافر ساتھ ملتا ہے کیا مسافر دوگانہ پڑھ کر سلام پھیر دے۔

ابراہیم

پیپلز کالونی لائل پور

جواب:۔ مقامی امام کے ساتھ پوری نماز پڑھنی پڑے گی۔ خواہ آخری التحیات میں ملے کیونکہ اس کی نماز کی بنا امام کی تکبیر تحریمہ پر ہے اور اس نے چار کی نیت باندھی ہے اور اگر امام مسافر ہو اور وہ پوری نماز پڑھے تو مقتدی مسافر کو بھی اس کے ساتھ چار پڑھنی پڑتی ہیں۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے چار رکعت پڑھا کرتے تھے۔ کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ تو مسافر کے لئے چار رکعت کے قائل نہیں پھر آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے چار کیوں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا الخلاف شر۔ یعنی مقتدی کو امام کی مخالفت کرنی بری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام مقیم ہو تو اس کے پیچھے بطریق اولیٰ پوری نماز پڑھنی چاہیئے

عبداللہ امرتسری روپڑی

مسافر کا دو نمازیں جمع کرنا

سوال :۔ مسافر دو دو گانے اکٹھے ایک ہی وقت میں ادا کر سکتا ہے یا نہیں جب کہ ظہر کی نماز کا وقت ہو۔ اور عصر بھی ساتھ ہی پڑھ لے۔

ابراہیم
پیپلز کالونی لائل پور

جواب :۔ مسافر کے لئے جمع نماز جائز ہے لیکن ترجیح اسی کو ہے کہ چلنے کے وقت یا اُترنے کے وقت جمع کرے۔ ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہو۔ مثلاً دو تین روز کے لئے قیام کیا ہوا ہو۔ تو ایسے مسافر کے لئے دوگانہ ثابت ہے۔ جمع ثابت نہیں اور چلنے کے وقت یا اُترنے کے وقت جمع کرے تو وہ دوگانہ ہی پڑھے گا۔ کیونکہ مسافر پر دوگانہ ہی ہے۔ چلنے کے وقت اگر خیال ہو کہ اپنی جگہ پہنچنے سے پہلے نماز کا وقت نہیں رہے گا اور رستہ میں بھی پڑھنے کا موقعہ نہیں ملے گا تو اس صورت میں پچھلی نماز کو پہلی نماز کے ساتھ جمع کرے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ مشکل زیادہ تر لاری میں پیش آتی ہے۔ ریل میں عموماً جگہ مل جایا کرتی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال ماڈل ٹاؤن لاہور

بیمار کے لئے نماز قصر کا مسئلہ

سوال :۔ کیا بیمار کی نمازیں بھی مسافر کی نماز کی طرح قصر ہے یا نہیں۔

محمد فیروزدین نائب مدرس لوئر مڈل سکول چاہڑ
ڈاکخانہ پھلورہ ضلع سیالکوٹ

جواب :۔ بیمار کی نمازیں قصر نہیں آئی۔ ہاں دوسری طرح سے تخفیف آئی ہے۔ مثلاً کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر بیٹھ کر نہ پڑھ سکے تو پہلو پر لیٹ کر سہی۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۱ جمادی الاول ۱۳۵۶ھ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء

جماعت کا بیان

سفر میں یا حضر میں جنگل یا آبادی میں اکیلا جماعت کرا سکتا ہے

سوال: خالد، زید، بکر تینوں کی اس مسئلہ میں نزاع ہے کہ اکیلا شخص جماعت کرا سکتا ہے یا نہیں۔
خالد مطلقاً انکار کرتا ہے کہ اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا۔ کیونکہ اس کا کوئی صریح ثبوت نہیں۔ اکیلا ہونا منفرد ہونا خود جماعت کے منافی ہے۔
زید کہتا ہے کہ صحرا یعنی جنگل میں اکیلا شخص اذان و اقامت کہہ کر جماعت کی نیت سے نماز پڑھ سکتا ہے اس کے پیچھے فرشتے کھڑے ہو جائیں گے۔ آبادی یعنی شہر یا گاؤں میں جماعت کی نیت سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ قرون ثلاثہ میں اس پر عمل ثابت ہوا ہے۔
صحرا میں بصورتِ جماعت اذان کہہ کر نماز پڑھنے کے ثبوت میں یہ حدیث ہے۔
نسائی "باب الاذان لمن یصلی وحدہ" میں ہے۔
عن عقبة بن عامر رض قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول یعجب ربك من راعی غنم فی راس شظیة الجبل یوذن بالصلوٰة ویصلی فیقول الله عزوجل انظروا الی عبدی هذا یوذن ویقیم الصلوٰة یخاف منی قد غفرت لعبدی و ادخلته الجنة۔
یعنی عقبہ بن عامر رض سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے اللہ تعالٰی بکریوں کے چرواہے پر تعجب کرتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر گذر اوقات کرتا ہے۔ اذان دیتا ہے۔ نماز پڑھتا ہے۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے۔ دیکھو میرا بندہ اذان دیتا ہے۔ نماز کی اقامت کہتا ہے۔ مجھ سے ڈرتا ہے میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اور اس کو جنت میں داخل کر دیا۔
اس حدیث میں اذان و اقامت کہہ کر نماز پڑھنے کا ثبوت ہوا۔
نیل الاوطار باب وجوب الاذان وفضیلته میں ایک روایت ہے۔
اخرج عبد الرزاق والمقدسی والنسائی فی المواعظ من سنته عن سلمان رفعه اذا کان الرجل فی ارض فی ای قفر فتوضأ فان لم یجد الماء تیمم ثم ینادی بالصلوٰة ثم یقیمها ویصلیها الا امّ من جنود الله صف و رواہ عبد الرزاق

وابن ابی شیبۃ عن معتمر التیمی عن ابیہ وروی نحوہ البیھقی والطبرانی فی الکبیر۔

عبدالرزاق اور مقدسی اور نسائی نے سلمان رضؓ سے مرفوع روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص جنگل میں ہو۔ پس وضو کرے۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کرے۔ پھر اذان دے۔ پھر اقامت کہے اور نماز پڑھے تو اس سے غائبانہ لشکروں کی امامت کی جو صف باندھ کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اور اس حدیث کو عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ معتمر تیمی عن ابیہ سے روایت کیا ہے اور اسی کے قریب بیہقی نے اور طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔

اِس حدیث سے بطور جماعت اکیلے کا نماز پڑھنا بالصراحت ثابت ہوا۔

خالد نے اِس استدلال پر یُوں نقض کیا ہے کہ اس سے جماعت اصطلاحی، عرفی ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اس حدیث سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اکیلے کو اذان دینا اور اقامت کہنا سفر میں مشروع ہے اور اس سے غرض تشبہ بالمسلمین فی جماعتہم ہے۔ اور ملائکہ اور جن کے لئے اعلام ہے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے اور جنگل کی چیزوں کو خدا تعالیٰ کی توحید پر شاہد بنانا ہے۔ جیسے ابوسعید خدری رضؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن ابی صعصعہ رضؓ سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تجھے جنگل میں رہنا اور بکریاں چرانا پسند ہے جب تو بکریاں چراتا یا جنگل میں ہو تو نماز کے لئے اذان دے کیوں کہ جہاں تک موذن کی آواز پہنچتی ہے۔ جن اور آدمی یا کوئی اور چیز آواز سُنتی ہے تو وہ قیامت کے دن اُس پر گواہ ہوگی۔ پھر ابوسعید رضؓ نے کہا کہ یہ مسئلہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔

اِس لئے نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ:۔

والحدیث یدل علی شرعیۃ الاذان للمنفرد فیکون صالحا للرد قول من قال ان شرعیۃ الاذان تختص بالجماعۃ۔

یعنی یہ حدیث اکیلے کے لئے اذان مشروع ہونے کی دلیل ہے۔ پس اس سے اس شخص کی تردید ہوگئی جو کہتا ہے کہ اذان جماعت کے ساتھ خاص ہے۔

لہ اذان تو اُس وقت کا اعلان ہوا۔ اقامت کیا ہوئی یہ صاف دلیل ہے کہ یہ نماز باجماعت ہے اور عبدالرزاق وغیرہ کی حدیث اس کی مؤید ہے۔

عون المعبود باب الاذان فی السفر میں ہے۔

وفی الحدیث دلیل علی استحباب الاذان والاقامۃ للمنفرد۔

اس حدیث میں دلیل ہے کہ اذان اور اقامت اکیلے پر مستحب ہے۔

پس اس سے منفرد کے لئے سفر میں اذان دینے کا مسئلہ ثابت ہوا۔ اور جماعت کے ساتھ اذان کی خصوصیت نہ رہی۔ باقی جماعت کرنا کرانا اکیلے شخص کا ثابت نہیں ہوا۔ ہاں عبدالرزاق کے طریق سے کچھ ثبوت نکلتا ہے مگر یہ غیر معتبر طبقہ کی کتابیں ہیں جب تک اس کی اسناد سامنے نہ ہو اور اس کی تنقید نہ کی جائے قابل اعتماد نہیں بکر کہتا ہے کہ جنگل ہو خواہ آبادی ہو منفرد جس کے ساتھ دوسرا شخص مل کر نماز پڑھنے والا نہ ہو جماعت کی نیت سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ہاں دوسرے شخص کو ملانے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن جب نہ ملے تو معذوری ہے نماز پڑھے۔ اس کے پیچھے خدا تعالیٰ کی کوئی غائبانہ مخلوق کھڑی ہو جائے گی۔ جیسے عبدالرزاق وغیرہ کی روایت صریح اس امر پر دال ہے۔ چنانچہ عون المعبود باب الاذان فی السفر میں ہے۔ اذا اذن واقام تصلی الملائکۃ معہ ویحصل لہ ثواب الجماعۃ۔ یعنی جب اذان دے۔ اور اقامت کہے تو فرشتے اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور اس کو جماعت کا ثواب مل جاتا ہے۔

جہاں اکثر آبادی ہندؤں کی ہے۔ مثلاً ریاست بیکانیر و ریاست پٹیالہ وغیرہ میں وہاں بعض گاؤں میں صرف ایک آدھ گھر مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ ایسے موضع میں صرف ایک شخص ہی اذان و اقامت کہہ کر نماز باجماعت کی نیت سے پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ بہت لوگ اس طرح پڑھتے ہیں۔ کسی نے منع نہیں کیا پس اس پر اجماع ہے۔

خالد نے کہا کہ بکر کا مذہب زید سے بھی عجیب ہے جو بالکل غیر ثابت اور بے دلیل ہے۔ اور اہلحدیث میں سے بعض لوگوں نے تو ایسا معمول بنایا ہے کہ مسجد میں جو شخص آتا ہے وہی اقامت کہہ کر اپنی جماعت شروع کر دیتا ہے خواہ اس کے ساتھ دوسرا آدمی ہو یا نہ ہو۔ اوّل تو جماعت ثانیہ میں نزاع تھا۔ دوم مسبوق کی امامت کا نزاع ہوا تھا۔ اب سوم منفرد کی امامت کا نزاع ہے کھینچ تان کر اس کو بھی حدیث کا مسئلہ

لہ صرف عبدالرزاق کی روایت نہیں بلکہ مقدسی وغیرہ نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور مقدسی نے صحت کی شرط کی ہے پھر یہ مسئلہ تو نسائی کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔ اس حدیث سے تائید ہو گئی اور تائید میں ضعیف حدیث بھی معتبر ہے۔

قرار دیا جارہا ہے حالانکہ اس پر کوئی نص موجود نہیں ہے ۔ اور نہ سلف صالحین کا یہ معمول تھا۔ اگر معمول ہوتا تو ضرور کتب حدیث سے منقول ہوتا۔

عون المعبود میں سے جو عبارت" یحصل لہ ثواب الجماعۃ" نقل کی ہے اس میں اس سے پہلے لفظ " قیل " ہے جو تمریض کے لئے مستعمل ہے۔ اس سے اس مذہب کی تضعیف کر دی گئی ہے ۔ نیز اس سے بھی جماعت اصطلاحی عرفی ثابت نہیں ہوتی بلکہ جماعت کا ثواب ملنا ثابت ہوتا ہے وہ بھی جنگل میں ایسا کرنے والے کے لئے نہ کہ ہر ایک کے لئے، سو ثواب ملنا جماعت کا اور چیز ہے اور جماعت کا وجود اور چیز ہے فتدبر۔

بحث نے کہا کہ نزاع تو آج ہر مسئلہ میں پڑ گیا ہے ہمیں تو ظاہر حدیث اور ہر دلیل شرعی پر عمل کرنا چاہیے موجودہ اختلاف کو نظر انداز کر دینا چاہیئے ۔ حدیث سے منفرد کے لئے اذان واقامت وجماعت کے طور پر نماز پڑھنا ثابت ہو گیا ہے۔ چنانچہ روایت بیان ہو چکی ہے پس اس کا ضعف ثابت کرنا آپ کے ذمہ ہے۔

باقی رہا آبادی وغیر آبادی کا سوال سو یہ کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ جنگل میں بھی منفرد اُس وقت اکیلا جماعت کی صورت میں اذان واقامت کہہ کر نماز پڑھے گا۔ جب اس کو کوئی دوسرا نہیں ملے گا۔ شہر یا گاؤں میں بھی جہاں کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس کا حکم بھی وہی ہے۔ دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ جب کوئی اکیلا ہو اور حق پر ہو تو اُس کو بھی جماعت کہہ سکتے ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کو اُمت فرمایا گیا ہے۔ باقی رہا سلف کا عمل اگر ان سے منقول نہ ہو تو بھی کچھ حرج نہیں، جب کہ حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہو چکا ہے مثلاً جنازہ علی الغائب حدیث سے ثابت ہے لیکن سلف کے عمل سے کچھ ثابت نہیں، مگر تاہم تمام اہل حدیث کا اس پر عمل ہے اور کسی نے انکار نہیں کیا اور مسئلہ ہذا میں تو سلفؒ کا عمل ثابت بھی ہے۔

چنانچہ بخاری باب " فضل الجماعۃ " میں ہے ۔

وجاء انس بن مالك الى مسجد قد صلى فيه فاذن واقام وصلى جماعة

یعنی حضرت انس رضؓ ایک مسجد میں آئے جس میں جماعت ہو چکی تھی۔ پس اذان دی اور اقامت کہی ۔ اور جماعت سے نماز پڑھی ۔

اور فتح الباری میں جو حضرت انسؓ کا بیس جوانوں کے ساتھ نماز پڑھنا نقل کیا گیا ہے وہ واقعہ اس کے علاوہ ہے کیونکہ اس میں تو حضرت انس رضؓ کا اذان واقامت کہنا مذکور ہے ۔

اور اس میں ہے ۔

فامر رجلا فاذن واقام - ایک شخص کو حکم دیا پس اذان و اقامت کہی سویہ تعدد واقعہ[1] پر دال ہے۔

زید نے کہا جو چیز گاہے بگاہے ہو۔ اور اس پر عام عمل نہ دیکھا گیا ہو تو اس کی اور بات ہے لیکن جو پانچ وقت دن رات کام ہوتا ہو۔ اس کا نقل ہونا ضروری ہے ورنہ بات محذوش ہے۔ حضرت انسؓ کی جو روایت بخاری سے نقل کی گئی ہے اس میں بھی منفرد کی جماعت کا ذکر نہیں بلکہ دیگر روایات جو موصولاً فتح الباری میں مذکور ہیں۔ اس میں دوسرے شخصوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ پس استدلال باطل ہوا۔ اب ہم اپنے وہ دلائل بیان کرتے ہیں جن سے اکیلے کی نماز کی نفی نکلتی ہے لیکن آبادی میں نہ کہ جنگل میں کیونکہ وہ ثابت شدہ امر ہے۔

۱۔ امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے "باب اثنان فما فوقہا جماعۃ" یعنی دو یا دو سے زیادہ جماعت ہے۔ اس کے تحت فتح الباری میں ہے۔ ھذہ الترجمۃ لفظ حدیث۔ یہ ترجمہ حدیث کے لفظ کا ہے پھر حدیث لکھ کر ظاہر کیا ہے کہ دو اور دو سے اوپر جماعت ہے (اخرجہ ابن ماجہ)

پھر صاحب فتح الباری نے یہ حدیث لکھی ہے۔

انہ صلی اللہ علیہ وسلم رای رجلا وحدہ فقال الا رجل یتصدق علی ھذا فیصلی معہ فقام رجل فصلی معہ فقال ھذان جماعۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اکیلے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ فرمایا کوئی شخص نہیں جو اس پر صدقہ کرے۔ پس اس کے ساتھ نماز پڑھے۔ ایک شخص کھڑا ہوا پس اس نے اس کے ساتھ نماز پڑھی پس فرمایا یہ دو جماعت ہیں۔

اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہو گیا کہ دو شخص جماعت ہیں اس سے کم جماعت نہیں وہ منفرد کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دو ہوں تو امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے کیونکہ وہ جماعت ہیں۔ اور اگر اکیلا ہو تو وہ پیچھے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ جماعت نہیں ہے بلکہ امام کے ساتھ کھڑا ہو گا تاکہ جماعت کا مصداق ہو۔ نیز اس

---

[1] یہ تعدد واقعہ کی دلیل نہیں کیونکہ حکم دینے والے کی طرف بھی نفس فعل کی طرف نسبت جائز ہے جیسے کہتے ہیں فلاں بادشاہ فلاں بادشاہ سے لڑتا ہے حالانکہ لڑنے والی فوج ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بخاری کی معلق روایت کو اسی لفظ "فامر رجلا" کے ساتھ موصول بیان کیا ہے گویا بخاری کے الفاظ اسی کا ملخص ہے۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا ورنہ آپ یہ نہ فرماتے الا رجل یتصدق
علی ھذا۔ کوئی شخص نہیں جو اس پر صدقہ کرے۔ صدقہ اُسی پر ہوتا ہے جو حاجت مند ہو۔ اگر اکیلا جماعت
کرا سکتا ہے تو وہ دُوسرے کا محتاج نہ رہا۔ پھر اس پر صدقہ کیسا خاص کر جب اس کے پیچھے نوری فرشتے
کھڑے ہوں۔ (علی زعمکم) تو پھر صدقہ کی ضرورت کیا ہوئی۔ فتذکر۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس بات کے تحت لکھا ہے۔

واستدل به علی ان اقل الجماعة امام وماموم اعم من ان یکون الماموم رجلا او صبیا او امرأة۔

اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اقل جماعت دو ہیں۔ اور مقتدی خواہ مرد ہو یا لڑکا ہو یا عورت ہو۔

امام بخاریؒ نے باب مذکور کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے۔

عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا حضرت الصلوٰة فاذنا واقیما ثم لیؤمکما اکبرکما۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب نماز حاضر ہو تو دونوں اذان دو۔ اور اقامت کہو۔ اور امامت تم سے بڑا کرے۔

اِس حدیث سے بھی امام بخاریؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقل درجہ جماعت کا دو ہیں۔ پس وہ لوگ جو امام بخاریؒ کے حکم کو حجتِ شرعی سمجھتے ہیں۔ اُن کو لازم ہے کہ یہ مسئلہ تسلیم کریں کہ جماعت کم از کم دو شخصوں کی منعقد ہوتی ہے اور وہ مسجدوں میں جو لگاتار منفردوں کی جماعتیں ہوتی ہیں بند کر دیں کیونکہ یہ تعامل ثابت نہیں ہے۔

۴۔ صلوٰة الرجل مع الرجل ازکی من صلوٰته وحده وصلوٰة الرجل مع الرجلین ازکی من صلوته مع الرجل وما کانوا اکثر فهو احب الی الله عزوجل۔

ایک مرد کی نماز دُوسرے مرد کے ساتھ اکیلے کی نماز سے بہت پاکیزہ ہے اور ایک مرد کی دو مردوں کے ساتھ۔ ایک کی ایک کے ساتھ سے بہت پاکیزہ ہے۔ اور جتنے زیادہ ہوں اتنا ہی اللہ عزوجل کو زیادہ محبوب ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اقل درجہ جماعت کا صلوٰۃ الرجل مع الرجل ہے۔ اس سے کم درجہ جماعت نہیں

سبل السلام میں ہے۔

وفیه دلالة علی ان اقل صلوٰۃ الجماعة امام وماموم

۵۔ فتح الباری جزء ثالث ص۳۶۲[1] میں حدیث ہے۔

صلوٰۃ الرجل فی الجماعة تضعف علی صلوٰته فی بیته وفی سوقه خمسة وعشرین ضعفا۔

آدمی کی نماز گھر کی نماز اور بازار کی نماز سے پچیس گنا زیادہ ہے۔

اِس کے تحت لکھا ہے۔

واستدل بها علی ان اقل الجماعة امام وماموم

اس حدیث[2] کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے کہ اقل جماعت دو ہیں۔ امام اور مقتدی۔

نیز ص۳۶۱ میں لکھا ہے۔

ان اقل الجماعة امام وماموم فلولا الامام ما سمی الماموم ماموما وکذا عکسه

اقل جماعت امام اور مقتدی ہے اگر امام نہ ہو تو مقتدی کو مقتدی نہیں کہہ سکتے اور اگر مقتدی نہ ہو تو امام کو امام نہیں کہہ سکتے۔

ص۳۶۲ میں ہے۔

روی ابن ابی شیبة باسناد صحیح عن ابراهیم النخعی قال اذا صلی الرجل مع الرجل فهما جماعة۔

[1] یہ حدیث متن بخاری کی ہے اگرچہ شرح کی طرف بھی اس کی نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ شرح حامل متن ہوتی ہے مگر بخاری کی شان بڑی ہے۔ اور شرح کی طرف نسبت کرنے سے پتہ نہیں چلتا کہ متن میں ہے اس لئے بجائے شرح کے متن کی طرف نسبت کرنا بہتر تھا۔

[2] اس سے مراد حافظ ابن حجر رح کی یہ حدیث نہیں کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اقل جماعت دو ہیں بلکہ حافظ ابن حجر رح کی مراد ص۲ کی حدیث ہے یعنی صلوٰۃ الرجل مع الرجل ازکی الحدیث

ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ ابراہیم نخعی رحمہ سے روایت کی ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھے پس وہ دونوں جماعت ہیں۔

عون المعبود ص۲۲۵ میں ہے۔ حدیث "یتصدق علی ھذا" پر لکھا ہے۔

قال المظھر سماہ صدقۃ لانہ یتصدق علیہ بثواب ستاوعشرین درجۃ اذلوصلی منفردا لم یحصل لہ الا ثواب صلوۃ واحدۃ۔

یعنی مظہر فرماتے ہیں ساتھ نماز پڑھنے کو صدقہ اس لئے کہا۔ اس پر چھبیس نمازوں کا ثواب صدقہ کرتا ہے کیونکہ اگر اکیلا پڑھتا تو اس کو ایک ہی نماز کا ثواب ملتا۔

اِس تصریح سے یہ اَمر صاف ثابت ہوگیا کہ جماعت کا ثواب جو پچیس درجہ ہے یہ اُسی شخص کے لئے ہے جو دُوسرے آدمی سے مِل کر جماعت سے نماز پڑھے۔ اکیلے کے لئے نہیں۔ اگر اکیلا جماعت کرا سکتا تو پھر دُوسرے کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ اَور نہ دو کو جماعت قرار دینے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ پھر سب ہی جماعت ہوتے۔

۶۔ عن ابی الدرداء قال سمعت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من ثلاثۃ فی قریۃ ولا بدو لا تقام فیھم الصّلوۃ الا قد استحوذ علیھم الشیطان فعلیك بالجماعۃ

یعنی ابُوالدرداء سے روایت ہے اُنہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سنا ہے فرماتے تھے نہیں تین آدمیوں سے بستی اور جنگل میں اور نہ قائم کی جاتی ہو اُن میں نماز مگر غالب ہوتا ہے اُن پر شیطان۔ پس لازم پکڑ تو جماعت۔

اِس سے بھی معلُوم ہوا کہ اکیلا جماعت نہیں ورنہ اکیلے پر بھی یہ وعید ہوتی۔

۷۔ امام نسائی نے کتاب الامامۃ والجماعۃ میں تین باب یُوں باندھے ہیں۔

۱۔ الجماعۃ اذا کانوا ثلاثۃ (۲) الجماعۃ اذا کانوا ثلاثۃ رجل وصبی وامرأۃ (۳) الجماعۃ اذا کانوا اثنین۔ مگر یہ باب نہیں باندھا الجماعۃ اذا کان منفردا۔

معلُوم ہوا کہ منفرد کی جماعت نہیں۔

۸۔ بخاری باب فضل الجماعۃ میں ہے۔

وکان الاسود اذا فاتتہ الجماعۃ ذھب الی مسجد آخر۔

یعنی اسودؓ سے جب جماعت کے ساتھ نماز فوت ہو جاتی تو دوسری مسجد کی طرف چلے جاتے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ اکیلا مسجد میں جماعت نہیں کرا سکتا۔ اگر ایک مسجد میں نماز نہ مل سکے تو دوسری مسجد میں چلا جائے کہ شاید وہاں مل جائے اکیلا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی بنیاد نہ رکھے۔

۹۔ وجاء انسؓ بن مالك الى مسجد قد صلّى فيه فاذن واقام وصلى جماعة (بخاری)

اس کے تحت فتح الباری میں اس کو موصولاً بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

فجاء انس فی نحو عشرین من فتیانه۔

انس قریباً اپنے بیس جوانوں میں آئے۔

اور ایک طریق میں ہے ثم صلى بالصحابة۔ پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ پس یہ کہنا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اکیلے جماعت کرائی صریح غلطی ہے۔ صلى جماعة کا لفظ ہی دلالت کر رہا ہے کہ اکیلے نماز نہیں پڑھی جماعت سے پڑھی۔

۱۰۔ عن عبد الرحمٰن بن ابی بکرة عن ابیه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اقبل من نواحی المدينة يريد الصلوة فوجد الناس قد صلوا فمال الى منزله فجمع اهله فصلى بهم رواه الطبرانی فی الكبير والاوسط وقال الهيثمی فی مجمع الزوائد رجاله ثقات (منقول از تحفة الاحوذی)

یعنی عبد الرحمٰن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے باہر سے آئے۔ نماز کا ارادہ کرتے تھے پس لوگوں کو پایا کہ وہ نماز پڑھ چکے تھے پس اپنے گھر کو لوٹے اپنے اہل وعیال کو جمع کر کے نماز پڑھی اس کو طبرانی نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا ہے اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

یہ حدیث اس امر پر نص ہے کہ آبادی میں اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا۔ مسجد میں کوئی شخص نہ ملے تو اپنے گھر والوں کو ملا کر جماعت سے نماز پڑھے (تین آمین والی حدیث سے تو یہ حدیث زیادہ معتبر ہے اس لئے تین آمین کے قائلین کو اپنی عادت مسجد میں اکیلے جماعت کرانے کی چھوڑ دینی چاہیئے۔ مسجد میں کسی نمازی کو اپنے ہمراہ ملائیں یا اپنے گھر چلے جائیں۔ وہاں بیوی کو ساتھ ملا کر نماز پڑھیں یہ نہیں کہ جو اکیلا آتا جائے وہ اپنی جماعت کر کے کھڑا ہوتا جائے اور سمجھے کہ میرے پیچھے فرشتے کھڑے ہیں۔ شاید ان کے خیال میں فرشتے مسجد کے دروازے پر انہی کے انتظار میں کھڑے رہتے ہوں گے کہ جب یہ اکیلے جماعت کے لئے آئیں اور ہم ان سے مل کر

نماز پڑھیں۔ افسوس ؎ بریں عقل و دانش بباید گریست

تلك عشرة كاملة

یہ دس دلائل ہیں جن سے ثابت ہوا کہ آبادی میں اکیلا جماعت نہیں کرا سکتا۔

خالد نے کہا کہ یہ سب دلائل میرے بھی موید ہیں۔ میرا بھی ان پر صاد ہے لیکن چونکہ آپ ازیلا جنگل میں منفرد کی جماعت کے قائل ہیں، اس لئے آپ پر بھی یہ حجت ہیں۔ میں مزید ایک دلیل پیش کرتا ہوں جس سے خاص میرا مدعا ثابت ہوتا ہے۔

ابوداؤد میں ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الصلوة فى جماعة يتدل خمسا و عشرين صلوة فاذا صلها فى فلاة فاتم ركوعها وسجودها بلغت خمسين صلوة قال ابوداؤد قال عبدالواحد بن زياد فى هذا الحديث صلوة الرجل فى الفلاة تضاعف على صلوته فى الجماعة۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز باجماعت پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ جب جنگل میں پڑھے، پس رکوع اور سجدہ پورا کرے تو وہ پچاس نمازوں کو پہنچ جاتی ہے۔ ابوداؤد نے کہا کہ عبدالواحد بن زیاد نے اس حدیث میں یوں کہا کہ آدمی کی نماز جنگل میں اُس نماز پر بڑھ جاتی ہے جو اُس نے جماعت میں پڑھی ہے۔[1]

والحكمة فى اختصاص صلوة الفلاة بهذا المزية ان المصلى فيها يكون فى الغالب مسافرا والسفر ظنه المشقة فاذا صلاها المسافر مع حصول المشقة تضاعف الى ذالك المقدار (انتهى بقدر الحاجة)

جنگل کی نماز کی اتنی فضیلت اس لئے ہے کہ جنگل میں انسان اکثر مسافر ہوتا ہے۔ اور سفر اکثر مشقت کا باعث ہے، پس باوجود مشقت کے مسافر اس کو پڑھے تو وہ اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔

[1] اس حدیث میں تو صرف جنگل کی نماز کی اس نماز پر فضیلت تبلائی جو لوگوں کے ساتھ جماعت میں پڑھی جاتی ہے خواہ جنگل کی نماز اذان جماعت کی صورت میں پڑھی جائے یا ویسے اس سے جنگل میں اذان جماعت کی صورت میں پڑھنے کی نفی نہیں ہوتی پس اس کو اپنے خاص مدعا کی دلیل کہنا ٹھیک نہیں۔

دیکھئے اِس حدیث سے صاف ثابت ہوا کہ مسافر جنگل میں اکیلا نماز پڑھے تو اس کو پچاس نمازوں کا ثواب ملتا ہے جو جماعت کی نماز سے دگنا درجہ رکھتی ہے۔ پس اس کو جماعت کی ضرورت نہ رہی جب جنگل میں اکیلا نماز نہ کرا سکا تو آبادی میں بطریق اولیٰ نہ کرائے گا۔

سوال :۔ تینوں شخصوں کا نزاع درپیش ہے اس مسئلہ کا آپ محققانہ تصفیہ فرمائیں۔

(عبدالقادر گنگوی حصاری)

جواب :۔ یہ بات تو تینوں فریق کے نزدیک مسلم ہے۔ اور فی الواقع صحیح بھی ہے کہ اکیلے کی جماعت نہیں بلکہ جماعت کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ دوسرا ساتھ ہو۔ اور ابراہیم علیہ السّلام کو جو اُمّت کہا گیا ہے تو وہ صرف شرف کی بنا پر کہا گیا ہے یعنی وہ اکیلے اتنی شان رکھتے ہیں۔ جیسے ایک جماعت کی شان ہوتی ہے یہاں نماز کے مسئلہ سے اِس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہاں جماعت سے مراد امام مقتدی ہے اور اکیلے کا امام مقتدی ہونا اس کا کچھ مطلب نہیں۔ پس کم سے کم دو ہونے ضروری ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ دوسرا کون ہو انسان ہو یا جنّ یا فرشتہ ہو تو اس میں بھی تینوں فریق متفق ہیں کہ یہ جماعت ہے اور واقعہ میں بھی یہ صحیح ہے۔ اور جماعت کا مفہوم بھی اس میں وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

اَب نزاع صرف جنّ اور فرشتہ میں رہی۔ خالد کا خیال ہے کہ جنّ فرشتہ سے جماعت نہیں بنتی، زید کہتا ہے کہ جنگل میں بن جاتی ہے۔ گھر میں نہیں بنتی۔ بکر کہتا ہے کہ جب جنگل میں بن جاتی ہے تو گھر میں بھی بن جاتی ہے ۔ یہ تینوں فریق کے نزاع کی تنقیح ہے۔

بکر کی دلیل چونکہ محض قیاس ہے اس لئے قابلِ اعتناء نہیں خاص کر جب قیاس بے محل ہو۔ کیونکہ یہ امر واضح ہے کہ فرشتوں کا یا جنّوں کا ہمارے ساتھ نماز پڑھنا یہ غیبی شے ہے جو خرق عادت کی قسم سے ہے اور ایسی اشیاء اپنے محل پر بند رہتی ہیں۔ ان میں قیاس جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے ۔ درود پہنچانے کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔ جہاں کوئی مجھ پر دُرود پڑھے فرشتے پہنچا دیتے ہیں۔ اِس سے اہلِ بدعت استدلال کرتے ہیں کہ جب فرشتے مقرر ہیں تو وہ ہماری درخواستیں دعاء وغیرہ کے متعلق بھی آپ کو پہنچا دیتے ہیں۔ اِس لئے جیسے زندگی میں اُن سے دُعاء وغیرہ کی درخواست ہو سکتی تھی اب بھی ہو سکتی ہے۔ اِس کا جواب ہماری طرف سے ان کو دو طرح سے دیا جاتا ہے۔ ایک اِس طرح کہ یہ غیبی شے ہے جتنا آپ نے بتایا اتنے پر ہمارا ایمان اور عمل ہے۔ اس پر دُوسری اشیاء کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دوم سلفؒ نے اس پر کیوں عمل نہیں کیا بلکہ سلف

کا عمل اس کے خلاف ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قحط سالی پڑ گئی تو حضرت عباسؓ کو دعا کے لئے آگے کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست نہیں کی اسی طرح معاویہؓ نے یزید بن اسود جرشی رضؓ کو آگے کیا۔ ملاحظہ ہو بخاری اور شرح مشکوٰۃ۔

ٹھیک اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جنگل میں جنوں یا فرشتوں کی شمولیت کی خبر دی ہے گھروں کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ غیب کی شے ہے۔ اپنی طرف سے اس پر حاشیہ آرائی نہیں کر سکتے۔ علاوہ اس کے شاید جنگل میں شمولیت اس لئے ہو کہ جنگل کی نماز بہت فضیلت رکھتی ہے جیسا کہ خالد کی پیش کردہ روایت سے ظاہر ہے۔ یہ فضیلت خواہ اس وجہ سے ہو جو امام شوکانی رحؒ نے بیان کی ہے یا اس وجہ سے ہو کہ گھر کی نمازیں عموماً کسی کے لحاظ یا کسی کے دباؤ کا دخل ہوتا ہے یا کسی کی دیکھا دیکھی ہوتی ہے نیز کئی طرح کی ریا کاری کا مظنہ ہے۔ برخلاف جنگل کی نماز کے کہ وہ ہر قسم کے نقائص سے بالا تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلوت میں خدا کے ڈر سے رونے والے کے لئے قیامت کے دن عرش کے سایہ کی خوش خبری ہے۔ جو صرف سات شخصوں کے لئے ہے۔ اور ممکن ہے کہ امام شوکانی رحؒ کی اور ہماری دونوں وجہیں ہوں یا کوئی اور وجہ بھی ہو۔ بہر صورت جب جنگل کی نماز کو فضیلت ہے تو پھر گھر کی نماز کو اس پر قیاس کرنا مع الفارق ہے خاص کر جماعت ثانیہ جو عموماً سستی کا نتیجہ ہے پھر جماعت کے مفہوم پر نظر کی جائے تو اس کا چسپاں ہونا بھی واضح نہیں۔ مثلاً انسان کے ساتھ فرس (گھوڑے) کو ملا دیا جائے تو یہ کوئی جماعت نہیں۔ اگرچہ دونوں جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح غیبی اور ظاہری چیز کا کچھ مطلب نہیں۔ عرفاً اس کو جماعت نہیں کہا جاسکتا۔ جنگل کے متعلق چونکہ خلاف قیاس حدیث آگئی ہے۔ اس لئے آمنّا وصدّقنا گھر کے متعلق کوئی حدیث نہیں آئی۔ اور خلاف قیاس پر قیاس نہیں ہوتا۔ پس یہ قیاس درست نہیں۔ پھر سلفؒ سے کسی سے گھر میں اکیلے کی جماعت ثابت نہیں بلکہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے کہ کوئی جماعت فوت ہونے کے وقت دوسری مسجد میں جاتا کوئی گھر آکر اہل کے ساتھ نماز پڑھتا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی فعل اوپر ذکر ہو چکا ہے اور حدیث الا رجل یتصدق علیہ وغیرہ بھی اس بارہ میں صاف ہے کہ اکیلے کی جماعت نہیں۔ پس بکر کا مذہب بالکل باطل ہے اور احداث محدث ہے اور عقلاً اور نقلاً مردود ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کہیں ہندوؤں وغیرہ کے درمیان مسلمانوں کا ایک ہی گھر ہو تو اگر وہاں اس کا اہل وعیال ہے جن کے ساتھ اذان جماعت کا سلسلہ قائم رہ سکتا ہے تو بہتر ورنہ وہاں سے اس کو ہجرت کرنی چاہیے کیونکہ اکیلے کی جماعت معتبر نہیں۔ نیز اس تفصیل سے خالد کے مذہب کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ وہ بھی درست

نہیں۔ بکر نے تو افراط کی جانب قدم رکھتے ہوئے بالکل آزادی دے دی تھی کہ سفر میں حضر میں جنگل میں، آبادی میں خواہ جماعت اولی ہو یا ثانیہ ہو۔ ہر صورت میں اکیلے کی جماعت درست ہے۔ خالد نے اس کے مقابلہ میں تفریط کی طرف قدم رکھ کر حدیث سے ثابت شدہ جنگل کی جماعت سے بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ مسلمان کی یہ شان نہیں کیونکہ سے

شانِ مُسلم ہے اطاعت سیّد الابرار کی
ہے سرِ تسلیم خم طاقت نہیں انکار کی

رہا زید کا مذہب تو وہ بالکل درست ہے کیونکہ زید نے دو دعوے کئے ہیں۔ ایک یہ کہ گھر میں اکیلے کی جماعت صحیح نہیں۔ دوم یہ کہ جنگل میں صحیح ہے۔ سو یہ دونوں احادیث سے صراحۃً ثابت ہیں۔ دوسرے دعویٰ کی دلیل تو نسائی اور عبدالرزاق کی حدیث ہے۔ اور پہلے دعوے کی دلیل کئی احادیث اور سلف کا عمل اور کتب محدثین کے تراجم الابواب وغیرہ ہیں۔ یہ سب دلیلیں زید کے بیان میں گذر چکی ہیں۔ اور ان کے علاوہ جماعت کا مفہوم بھی زید کے حق میں ہے کیونکہ اکیلا جماعت نہیں۔ اور غیبی شے کے ملانے سے عرفاً جماعت نہیں بنتی اور صراحۃً اس کے مقابلہ میں کوئی آیت یا حدیث نہیں تاکہ اس کی وجہ سے اس مفہوم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ جیسے جنگل میں نہیں کیا گیا۔ خاص کر جماعتِ ثانیہ میں اکیلے کی جماعت کو صحیح سمجھنا یہ سستی کا دروازہ کھولتا ہے۔ کیونکہ جماعتِ ثانیہ عموماً سستی کا نتیجہ ہے۔ بہت کم کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہے جس سے بغیر سستی کے اتفاقیہ طور پر جماعت اولیٰ فوت ہوتی ہے ورنہ کاروبار دنیا کے دھندے اور طبائع میں کچھ غفلت اس کا باعث ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شرعی احکام مصالح اور حِکَم پر مبنی ہیں۔ ان میں وہ پہلو کبھی اختیار نہیں کیا جاتا جس میں خطرہ ہو جماعت ثانیہ میں اگر دوسرا آدمی تلاش کرنا پڑے تاکہ اس کے ساتھ مل کر جماعت کا ثواب حاصل کرے تو یہ اس تھوڑی سی طبعی غفلت کا علاج ہو سکتا ہے کیونکہ دوسرا آدمی کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ اس فکر کی وجہ سے وہ پہلی جماعت کے پانے کی کوشش کرے گا اور اکیلے کی جماعت ہو جائے تو بتلائیے شرع نے اس میں مصلحت دیکھی یا شرعی مصلحت کے سراسر خلاف ہوا ظاہر ہے کہ خلاف ہوا۔ پس شرع اس کی کس طرح اجازت دے سکتی ہے۔

اسی طرح ایک شخص ہمیشہ ہندوؤں وغیرہ میں رہتا ہے انہی کے ساتھ اس کا میل جول اور رات دن کا تعلق ہے۔ اگر اس کو جماعت کی خاطر دوسری جگہ جانے کا حکم نہ ہو بلکہ وہیں اکیلے کی جماعت ہو جائے تو بتلائیے اس پر بدصحبت کا اثر ہوتے ہوتے کیا نتیجہ نکلے گا۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ عموماً ایک آدھ ہندوؤں میں رہنے والے برت برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ پس یہ بھی کسی طرح قرینِ مصلحت نہیں کہ شریعت اس اکیلے کی جماعت کو صحیح قرار دے

بلکہ ضرور اس کو وہاں سے ہجرت کرنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ بد صحبت اور ترک جماعت کے اثر سے معاذ اللہ ارتداد تک نوبت پہنچ جائے۔ بن جنگل میں رہنے والے کے لئے یہ خطرات نہیں۔ اس لئے اس اکیلے کی جماعت ہو جاتی ہے بلکہ اگر جماعت نہ کرے ویسے ہی نماز پڑھ لے تو بھی اجازت ہے کیونکہ مقصود جماعت سے فتنوں اور شیطانی تسلط سے حفاظت ہے۔ سو یہ اس کو حاصل ہے۔ اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر آبادی میں اذان جماعت مل سکے تو آبادی میں رہنا بہتر ہے یا جنگل میں۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم اور منہاج العابدین میں اس پر بہت بحث کی ہے۔ احادیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ فتنوں کے وقت جنگل میں رہنا بہتر ہے غرض جنگل فتنوں سے محفوظ جگہ ہے اس لئے اس میں اکیلے کی جماعت معتبر ہے۔ آبادی میں اس کی اجازت دینا شرعی مصلحت کے خلاف ہے اور مفہوم جماعت کے بھی خلاف۔ احادیث کے بھی خلاف عمل سلفؒ کے بھی خلاف، کتب احادیث کے تراجم کے بھی خلاف۔ پس زید کا مذہب عقلاً نقلاً ہر طرح سے صحیح ہے۔ واللہ الموفق للصواب والیہ مرجع والمآب وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۳ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ ۔ ۱۲ اپریل ۱۹۶۰ء

جماعت کا تارک کافر ہے یا فاسق و فاجر

سوال:۔ ترغیب و ترہیب میں حدیث ہے وعن معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال الجفاء کل الجفاء والکفر والنفاق من سمع منادی اللہ ینادی الی الصلوۃ فلا یجیبہ۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ جماعت کا تارک منافق اور کافر ہے۔ اس مسئلہ کو مفصل بیان فرمائیں۔

سلطان احمد میانوالی

مدرسہ دار العلوم رنچھوڑ لائن روڈ کراچی

جواب:۔ تارک دو طرح کا ہے اگر استخفافاً یعنی اس کو حقیر سمجھ کر تارک ہو تو یہ کفر ہے۔ اور اگر ویسے تارک ہو جیسے عام طور پر لوگ سستی کرتے ہیں تو وہ کافر نہیں بلکہ فاسق و فاجر ہے کیونکہ مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ صحابہؓ سوائے ترک نماز کے کسی اور چیز کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

قعدہ اولی اور تشہد میں

السّلام علی النبیؐ کہنے کا مسئلہ

قعدہ اولی اور تشہد

سوال:۔ قعدہ اولیٰ بیٹھنے کی کیا صورت ہے۔

جواب:۔ جب دوسری رکعت کے دوسرے سجدے سے سر اٹھائے تو اسی طریق پر بیٹھے جس طرح جلسہ استراحت پر بیٹھا تھا۔ صرف فرق اتنا ہے کہ داہنی کہنی ران سے دور رہے اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں یا دائیں گھٹنے یا دائیں ران پر رکھے اور دو انگلیاں خنصر بنصر (چھیچی اور اس کے ساتھ کی) بند کر لے۔ اور درمیانی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا لے اور سبابہ یا سباحہ (انگوٹھے کے ساتھ کی انگلی) کھلی رہنے دے اگر چاہے تو ترپن کی گرہ بنا لے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ سبابہ کو کھلا رہنے دے اور انگوٹھے کو سبابہ کی جڑ میں رکھے اور باقی تین انگلیاں بند کرے۔ جب تسلی سے بیٹھ جائے تو تشہد پڑھے اور تشہد پڑھتے ہوئے جب اشھدان لا الہ الّا اللہ کے لفظ پر پہنچے تو سباحہ انگلی اٹھائے۔ اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے۔ اشارہ کرتے وقت اس کو ہلاتا رہے۔ اگر نہ ہلائے تو بھی جائز ہے اور اپنی نظر انگلی کی طرف رکھے جب دو سجدوں کے درمیان بیٹھے تو اس وقت بھی انگلیاں اٹھانے کا ذکر ایک ضعیف[1] حدیث میں آیا ہے۔

تشہد میں السّلام علیک ایھا النبیّ یا السّلام علی النبیّ

سوال:۔ التحیات میں السلام علیک ایھا النبی یا السلام علی النبی ہے۔ حدیث میں کس طرح ہے۔ جواب مدلل ہو۔
محمد علی خطیب جامع مسجد جنڈیالہ

جواب:۔ اس میں اختیار ہے خواہ السّلام علیک ایّھا النبیّ کہے خواہ السّلام علی النبیّ کہے صحابہؓ سے دونوں طرح کی روایتیں آئی ہیں۔ تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ سماع موتی ملاحظہ ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۳ ذی الحجہ ۵۸ھ ۲ فروری ۱۹۴۰ء

[1] کشاف القناع عن متن الاقناع

تنبیہ

حضرت محدث روپڑی نے اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے اپنی تصنیف سماع موتی رسالہ کا حوالہ دیا ہے۔ وہ رسالہ تو ہمارے پاس نہیں ہے البتہ تشہد میں علی النبی کہنے کے متعلق فتح الباری سے نقل کرتے ہیں۔

فتح الباری میں ہے۔

بعض روایتوں میں عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہم تشہد پڑھتے ہوئے یاایہاالنبی کہتے تھے۔ اور آپ کی وفات کے بعد یاایہاالنبی کی جگہ علی النبی کہتے تھے اسی طرح ابوعوانہ سراج۔ جوزقی۔ ابونعیم اور بیہقی میں کئی روایتوں میں امام بخاری کے استاذ ابونعیم سے مروی ہے کہ جب حضورؐ وفات پاگئے تو ہم یعنی صحابہ السلام علی النبیؐ کا لفظ کہتے تھے۔ اس کی متابعت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو عبدالرزاق میں ہے۔

قال عبد الرزاق اخبرنا ابن جریج اخبرنی عطاء ان الصحابة کانوا یقولون والنبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم حی السّلام علیك ایّھا النبیؐ فلما مات قالوا السّلام علی النبیؐ وھذا اسناد صحیح۔

یعنی عبدالرزاق نے ابن جریج سے اور اس نے عطاء سے خبر دی ہے کہ صحابہ السّلام علیك ایّھا النبیؐ اس وقت کہتے تھے جب حضورؐ زندہ تھے جب آپؐ وفات پاگئے تو وہ السلام علی النبی کہتے تھے (مرتبہ محمد صدیق بن عبدالعزیز تلمیذ محدث روپڑی ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ)

نفلی جماعت کے ساتھ فرض نماز کی ادائیگی

سوال:۔ اخبار اہل حدیث مطبوعہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مولانا عبدالعزیز صاحب قلعہ میہاں سنگھ کا ایک مضمون طبع ہوا۔ اس میں انہوں نے ایک یہ مسئلہ بھی لکھا کہ ہمارے بعض بھائی فرض عشاء کے بعد تراویح امام کے پیچھے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ امام دو رکعت تراویح شروع کرتا ہے۔ اور یہ ہمارا بھائی محدث چار رکعت فرض عشاء کی اقتداء کرتا ہے۔ اور پھر سند یہ دیتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آں حضرتؐ کے پیچھے چار رکعت فرض عشاء ادا کر کے پھر وہی فرض اپنے محلہ میں آکر امام بن کر لوگوں کو پڑھاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو دوبارہ

اُس نے نماز پڑھائی وہ اُس کے نفل ہوئے اور پہلے فرض۔ اس لئے مفترض کا اقتداء متنفل کے پیچھے جائز ہوا بے شک اس کے پیچھے فرض پڑھنے والا فرض پڑھ لے۔ مگر سمجھ اتنی نہیں ہے کہ معاذ نے جو نماز پڑھائی، وہ عشاء کے چار فرض ہی تھے۔ جو اگرچہ دوبارہ پڑھنے سے وہ فرض زائد ہو گئے نہ کہ تراویح کی نماز پڑھائی یا ظہر کی چار سنتیں تھیں۔ وہ امام ہو کر پڑھائیں۔ یہاں جو دوبارہ فرض پڑھانے کا نام نفل رکھا گیا ہے اس سے مراد زائد فرض ہے۔ اسی کو قیاس مع الفارق کہتے ہیں۔

مولوی عبدالقادر حصاری نے اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولوی عبدالعزیز صاحب اہل حدیث ہو کر پھر بزرگ خاندان کے فرد ہو کر محدثین پر کس قدر بے باکانہ حملہ کر رہے ہیں۔ اور صریح نص کو قیاس قرار دے رہے ہیں۔ اور نفل کا معنیٰ خلاف محاورہ کلام شارع اور خلاف تشریح قدماء محدثین محض اپنے زعم فاسد کی بنا پر بیان کر کے اہل حدیث کے متفقہ مسئلہ کا بطلان کر رہے ہیں تفصیل اس کی یوں ہے کہ اہلحدیث اور احناف کا اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے کہ مفترض کی نماز متنفل کے پیچھے جائز ہے یا نہیں۔ اہل حدیث جائز کہتے ہیں اور حنفیہ ناجائز قرار دیتے ہیں۔

اہل حدیث جو مفترض کو اقتداء متنفل کی جائز کہتے ہیں وہ قیاس سے نہیں کہتے ہیں۔ کیونکہ قیاس محدثین کے نزدیک حجت نہیں ہے بلکہ وہ عین نص پیش کرتے ہیں جو اس مسئلہ پر دلیل قاطع ہے کہ متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز جائز ہے۔

چنانچہ امام دارقطنی اپنی کتاب دارقطنی میں پورا باب منعقد کرتے ہیں۔ باب ذکر الصلوٰۃ المفترض خلف المتنفل۔ یعنی باب ہے اس مسئلہ کے ذکر میں کہ مفترض کی نماز متنفل کے پیچھے جائز ہے پھر باسناد دو طریق حدیث معاذ لکھتے ہیں جن کے الفاظ یہ ہیں۔

۱۔ اِنَّ مُعَاذًا كَانَ يُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ يَنْصَرِفُ اِلٰى قَوْمِهٖ فَيُصَلِّي بِهِمْ هِيَ لَهٗ تَطَوُّعٌ وَلَهُمْ فَرِيْضَةٌ۔

۲۔ يُصَلِّي مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ يَنْصَرِفُ اِلٰى قَوْمِهٖ فَيُصَلِّي بِهِمْ تِلْكَ الصَّلٰوةَ هِيَ لَهٗ نَافِلَةٌ وَلَهُمْ فَرِيْضَةٌ۔

یعنی حضرت معاذ رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھا کرتے تھے پھر اپنی قوم کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ وہ نماز حضرت معاذ رض کی نفل ہوتی تھی اور قوم کی فرض ہوتی تھی۔

اس حدیث کے حاشیہ مغنی میں محدث عظیم آبادی رح فرماتے ہیں۔

واستدل بهذا الحديث على صحة اقتداء المفترض بالمتنفل بناء على ان معاذا كان ينوى بالاولى الفرض وبالثانية النفل ويدل عليه هذا الحديث الذى اخرجه المؤلف۔

یعنی اس حدیث کے ساتھ استدلال کیا گیا ہے کہ مفترض کی اقتداء متنفل کے ساتھ صحیح ہے۔ اس بناء پر کہ حضرت معاذ رض نے پہلے نماز فرض پڑھی تھی اور دوسری نفل تھی اور اس مسئلہ پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے جس کو امام دارقطنی نے بیان کیا ہے۔

تعلیق مغنی میں اور عون المعبود میں دارقطنی کی اس حدیث کو صحیح کہا گیا ہے اور فتح الباری میں بھی اس کی صحت ثابت کی گئی ہے۔ پس اس حدیث صحیح میں صاف یہ مسئلہ موجود ہے کہ حضرت معاذ نفل پڑھا کرتے تھے اور ان کے پیچھے ان کی قوم فرض پڑھا کرتی تھی۔ اور جب تک حضرت معاذ رض اس قوم میں رہے اس طرح کرتے رہے۔ چونکہ یہ کام آں حضرت صلعم کی حیات طیبہ میں ہوتا رہا ہے۔ اور زمانہ نزول وحی میں اس پر کوئی ممانعت شارع کی طرف سے وارد نہیں ہوئی۔ لہٰذا بلاشبہ نفل پر فرض کی بنا جائز ہوئی اور یہی محدثین کرام کا مذہب ہے جو کتب حدیث میں باب منعقد فرما کر اس حدیث کو ماتحت ذکر کر کے ظاہر کیا گیا ہے چنانچہ امام نووی رح فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جائز ہونا ثابت ہوا۔ نماز مفترض کا پیچھے متنفل کے کیونکہ حضرت معاذ رض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ فرض نماز پڑھتے تھے۔ پس فرض ان کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا تھا۔ پھر دوبارہ اپنی قوم کو نماز پڑھاتے تھے وہ نفل ہوتی تھی۔ اور قوم کی فرض ہوتی تھی جیسے مسلم کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں مصرح ہے۔ اور یہ کام جائز ہے۔ امام شافعی رح اور دیگر آئمہ رح اس کے قائل ہیں۔ ربیعہ رح امام مالک اور امام ابوحنیفہ رح کوفہ والے اس کو جائز نہیں کہتے وہ تاویل کرتے ہیں کہ آں حضرت کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ابتداء اسلام کا واقعہ ہے پھر منسوخ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ سب تاویلیں ایسے دعوے ہیں جن کا کوئی اصل نہیں ہے۔ پس ان تاویلوں سے ظاہر حدیث ترک نہ کی جائے گی۔

اور سنیئے فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے باجماع صحابہ جائز ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رح فتح الباری میں فرماتے ہیں۔

فان الذين كان يصلى بهم معاذ كلهم صحابة وفيهم ثلاثون عقبيا واربعون بدريا

قال ابن حزم قال لا یحفظ عن غیرھم من الصحابة امتناع ذالک بل قال منھم بالجواز عمرو بن عمرو و ابو الدرداء و انسؓ غیرھم۔

یعنی جن لوگوں کو حضرت معاذ رضؓ نے نماز پڑھائی تھی وہ صحابہ کرامؓ تھے۔ تیس تو ان میں عقبی تھے اور چالیس بدری تھے۔ جیسے امام ابن حزم نے کہا ہے اور کہا ہے کہ کسی صحابی رضؓ کا انکار ثابت نہیں ہوا بلکہ مذکورہ صحابہ رضؓ کے غیر سے جواز منقول ہے جیسے عمرو بن عمرو اور ابوالدرداء اور انسؓ اس کے قائل ہیں۔

پس اس مسئلہ پر اجماع سکوتی پایا گیا۔ کیونکہ اجماع سکوتی یہی ہے کہ بعض صحابہؓ قول یا عمل سے کسی امر کی تصریح کردیں اور باقی خاموش ہوجائیں (نورالانوار) چنانچہ آج تک فرض پڑھنے والے کی اقتدا نفل پڑھنے والے کے پیچھے ناجائز کہنے والا کوئی صحابی رضؓ ثابت نہیں ہوا۔

(ابوالشکور محمد عبدالقادر از گنگا ضلع حصار)

مولوی عبدالقادر صاحب نے اس مضمون کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ صورت مسئلہ کی یہ ہے کہ رمضان شریف میں امام نے فرضوں کی جماعت کرائی پھر جب تراویح کی جماعت شروع کی تو کوئی نمازی آگیا۔ اب وہ کیا کرے اکیلا فرض پڑھنے لگ جائے یا جماعت کے ساتھ مل جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ اکیلا نہ پڑھے جماعت میں مل جائے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے

وارکعوا مع الراکعین ۔ یعنی نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل جاؤ۔

اور آں حضرت صلعم نے فرمایا ہے۔

اذا جئت الی الصلوٰۃ فوجدت النّاس فصل معھم۔

یعنی جس وقت تو نماز کو آئے اور لوگوں کو اس حال میں پائے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہوں یعنی جماعت ہو رہی ہو تو تو بھی ان کے ساتھ پڑھ۔

یہ حکم عام ہے جو ہر نماز کو شامل ہے۔ اس لئے عشاء کے فرض پڑھنے والوں کو تراویح کی نماز میں مل جانا چاہیئے

محدّث روپڑی ۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ حکم جواز کی حد میں رہنا چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۸ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء

اقامت کے بعد نیت باندھے ہوئے نوافل و سُنن کا پورا کرنا

سوال :۔ اقامت شروع ہونے سے پہلے ہی ایک شخص سنتِ موکدہ یا نوافل پڑھ رہا ہے۔ اقامت سُن کر سلام پھیر دے یا نہ۔ اور اگر سلام پھیرنا ضروری ہے تو کس حد تک پہنچا ہو تو سلام پھیرے یا مطلقاً سلام پھیر کر جماعت سے ملنا ضروری ہے۔ اگرچہ آخری رکعت کے سجدے کر رہا ہو یا آخری تشہد ہی پڑھ رہا ہو۔

جواب :۔ حدیث میں آیا ہے۔

عن ابن عباس قال کنت اصلی واخذ المؤذن فی الاقامة فجذبنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال تصلی الصبح اربعا اخرجه ابوداؤد والطیالسی واخرجه البیہقی والبزار وابویعلی وابن حبان فی صحیحه والحاکم فی مستدرکه وقال انه علی شرط الشیخین والطبرانی (تحفة الاحوذی)

یعنی ابن عباس رضی کہتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا۔ موذن نے اقامت شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھینچا اور فرمایا کیا تو صبح کی نماز چار رکعت پڑھتا ہے اس کو ابوداؤد وطیالسی نے روایت کیا ہے۔ بیہقی۔ بزار۔ ابویعلی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت بخاری کی شرط پر ہے اور طبرانی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

اِسی طرح امام مالک نے موطا میں اس مفہوم کی حدیث بیان کی ہے ان سب احادیث کے الفاظ صاف دلالت کرتے ہیں کہ اقامت ہونے سے پہلے جو شخص سنت یا نوافل پڑھ رہا ہو وہ اقامت سنتے ہی سلام پھیر دے اور جماعت کے ساتھ مل جائے۔ فلا صلوۃ الا المکتوبة صاف دلیل ہے۔ اس کے متعلق اعلام میں عراقی کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فلا صلوۃ الا المکتوبة فرمانا اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب اقامت شروع ہو جائے تو اس وقت کوئی اور نماز شروع نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ خواہ نماز پہلے شروع کی ہوئی ہو۔ اس کو توڑ کر نماز میں مل جائے تا کہ امام کے ساتھ شامل ہونے سے تکبیر تحریمہ کی فضیلت مل جائے یا اقامت ہوتے ہی خود بخود نماز ٹوٹ جائے گی۔ خواہ پڑھنے والا اس کو نہ توڑے جیسے ہوا سرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے

مذکورہ بالا احادیث صریحہ مرفوعہ سے ثابت ہو گیا کہ اقامت شروع ہونے سے پہلے جو شخص نوافل یا سنن

پڑھ رہا ہے اقامت سن کر سلام پھیر دے اور جماعت کے ساتھ مل جائے۔

ہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ فلا صلوٰۃ کی نفی میں صلوٰۃ کی نفی ہے۔ اور صلوٰۃ کم از کم ایک رکعت کو کہا جاتا ہے۔

چنانچہ احادیث صحیحہ میں نماز پانے کے حکم میں فرمایا گیا ہے۔

من ادرك ركعة من الصلوٰة فقد ادركها۔

یعنی جو ایک رکعت پالے اس نے نماز پالی۔

اِس حدیث میں رکعت پانے کو نماز کا پانا کہا گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ شرع میں رکعت کو نماز کہا جاتا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک وتر جائز ہے۔

بناء علیٰ ہذا اگر اقامت سننے والا اقامت سننے کے بعد رکعت پڑھے گا۔ تو فلا صلوٰۃ کی رو سے وہ صحیح نہ ہوگی۔ البتہ وہ نیت کردہ نوافل یا سنن کی پوری پوری رکعت پڑھ چکا ہے۔ اور محض آخری رکعت کے سجود یا آخری تشہد وغیرہ ہی باقی ہے تو سلام نہ پھیرے کیونکہ یہ آخری حصہ نماز (سجود یا تشہد وغیرہ تتمات و تکملات صلوٰۃ سے ہیں صلوٰۃ نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ فلا صلوٰۃ کی نفی میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ اعلام اہل العصر میں بعض اہل الظاہر آئمہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔ نمازی اگر بالکل آخری جزء نماز میں بھی ہو تو پھر بھی اقامت سنتے ہی فوراً سلام پھیر کر جماعت کے ساتھ ضرور ملے۔ جس پر امام حافظ عراقی رح فرماتے ہیں یعنی ان اہل ظواہر کا خواہ مخواہ اگر صرف سلام پھیرنا باقی ہو تو کیا پھر بھی نماز توڑ کر جماعت سے مل جائے۔ کیا سلام پھیرنے پر وقت زیادہ لگتا ہے یا اقامت پر۔ ظاہر ہے کہ سلام پھیرنے پر تھوڑا وقت لگتا ہے۔ اقامت ختم ہونے تک سلام پھیر کر بخوبی امام سے شروع ہی سے نماز میں مل سکتا ہے پھر خواہ مخواہ تشدد کرنا فضول ہے کہ سلام باقی ہو تو بھی نماز توڑ دے

ابراہیم امام مسجد و مدرس مدرسہ عربیہ موضع باقی پور

محدث روپڑی

اس پر آپ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتیں ایسی ہلکی پڑھتے کان الاذان باذنیه (ابن ماجه) گویا آپ کے کان میں اذان یعنے اقامت کی آواز ہے۔ اذان سے مراد یہاں اقامت ہے۔ کیونکہ اقامت ہی کے وقت جلدی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت دستور تھا تبھی تشبیہ دی ہے لیکن چونکہ حدیث فلا صلوٰۃ الا المكتوبة نماز سے روکتی ہے اس لئے ایک رکعت سے کم ہو تو پوری کر لے ورنہ توڑ دے۔ کیونکہ ایک رکعت سے کم نماز

نہیں تمہ نماز ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ
۱۰ جمادی الثانی ۱۳۵۰ھ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء

مقتدی کا وضو ٹوٹ گیا اور دوبارہ وضو کر کے جماعت میں شامل ہو جائے تو پہلی نماز شمار میں آئے گی؟

سوال :۔ جماعت کھڑی ہے ۔ ایک رکعت پوری پڑھی گئی ۔ دوسری رکعت میں جب کہ امام نے الحمد پڑھنا شروع کیا۔ ایک نمازی کا وضو ٹوٹ گیا۔ اس نے جلدی سے وضو کیا۔ اور امام کے رکوع جانے سے پہلے جماعت کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ پہلی رکعت ضائع گئی یا نہیں ؟

محمد علی خطیب جامع مسجد جنڈیالہ

جواب :۔ اگر امام کے رکوع جانے سے پہلے امام کے ساتھ شامل ہو کر فاتحہ پڑھ لی تو اس کی یہ رکعت بالاتفاق ہو گئی۔ اگر فاتحہ نہیں پڑھی تو جن کے نزدیک رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ہو گئی اور جن کے نزدیک نہیں ہوتی ان کے نزدیک نہیں ہوئی۔ باقی رہی وضو ٹوٹنے سے پہلے جو نماز پڑھی گئی ہے وہ باطل ہے ۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے ۔

اذا فسا احدکم فی الصلوٰۃ فلینصرف ولیتوضا ولیعد الصلوۃ رواہ الخمسۃ وصححہ ابن حبان ۔

یعنی جب تم میں سے کسی کی نماز میں ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے اور وضو کرے اور نماز لوٹائے ۔
اس حدیث سے ظاہر ہے کہ وضو ٹوٹنے سے پہلے جو نماز پڑھی گئی ہے وہ باطل ہے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۲۴ شوال ۱۳۵۸ھ ۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

لاؤڈ سپیکر میں جماعت کرانا

سوال :۔ سپیکر میں جماعت کرانے پر روشنی ڈالیں۔

شفیق الرحمن آثم منگیڈھی (سیالکوٹ)

جواب :۔ لاؤڈ سپیکر میں جماعت کرانی جائز ہے ۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو میری تصنیف رسالہ لاؤڈ سپیکر

ملاحظہ کریں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۲ رمضان ۱۳۸۳ھ ۔ ، فروری ۱۹۶۴ء

جماعت میں ٹخنے سے ٹخنہ ملانا

سوال:۔ نماز با جماعت میں الزاق الکعبین (ٹخنوں سے ٹخنے ملا کر کھڑے ہونا) اہل حدیث کا مسلک ہے لیکن کسی مرفوع روایت سے الزاق الکعبین کا ثبوت صریح نہیں ہے ۔ صرف بخاری شریف و ابوداؤد میں نعمان بن بشیر صحابی سے اتنا آیا ہے ۔ رایت الرجل منا یلزق کعبہ بکعبہ صاحبہ ۔ سو یہ ایک کسی صحابی کا فعل ہے کوئی قولی یا فعلی مرفوع حدیث نہیں ہے ۔ پھر اس میں یہ بھی نہیں کہ یہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ایسا ہوتا تھا ۔ اور آپ نے اس کو دیکھ کر سکوت فرمایا جس سے یہ حدیث تقریری ہو جائے ۔ نیز الرجل منا پر الف لام عہد خارجی ہے جس سے عمومیت اس فعل کی نہیں سمجھی جاتی ۔

بعض صحابی کا صف بندی کرتے ہوئے یہاں تک اہتمام تھا فی روایۃ احدنا وہاں بھی اضافت سے تعیین ہی مراد ہے ۔ نیز الزاق کعبین پر جیسا دہلی وغیرہ میں عمل ہوتا ہے کہ پاؤں پر پاؤں چڑھا دیتے ہیں اور ٹخنے کو ٹخنے سے رگڑا جاتا ہے اور پاؤں کو قبلہ رخ سے ٹیڑھا کر دیا جاتا ہے ۔ اس ہیئت کذائیہ کا ثبوت کسی روایت سے نہیں ہے ۔ دوسرے الزاق کعبین میں بار بار رکوع و قیام میں حرکت کی جاتی ہے جو سکون فی الصلوٰۃ کے منافی ہے ۔ تیسرے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ الزاق کعبین صرف بوقت قیام ہی ہوتا تھا یا بوقت رکوع و سجود بھی ہوتا تھا ۔ میرے خیال میں حدیث کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ علمائے اہل حدیث نے سمجھا ہے بلکہ مقصود شارع علیہ السلام کا صرف التصاق فی الصف ہے ۔ وہ قدم سے قدم ملانے سے ہو سکتا ہے جو حدیث میں یلزق کعبہ بکعب صاحبہ ہے ۔ اس سے مراد فقط محاذات اور قرب فی الصف ہے اس طور سے فرجہ مابین الصف نہ رہے کیونکہ شارع علیہ السلام کا مقصود صرف وصل صف و سد فرجہ ہے کما قال سدا الخلل ولا تذروا فرجات للشیطان الحدیث ۔ اسی لئے امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اپنی صحیح میں اس اثر نعمان بن بشیر رض پر جو تبویب باندھی ہے وہ یہ ہے الزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم (صحیح بخاری جلد اول ص۱۰۰)

بخاری علیہ الرحمۃ نے یلزق کعبہ بکعب صاحبہ سے الزاق کعبین جو ظاہر الفاظ سے سمجھا جاتا ہے

تبویب میں ذکر نہیں کیا اس کو کہتے ہیں فقہ البخاری فی تراجمہ صرف الزاق القدم بالقدم اس سے سمجھا۔ پس آپ اس مسئلہ پر بخوبی روشنی ڈالیں"

(السائل ابو محمد عبدالجبار خطیب مسجد اہل حدیث رنگون برما)

جواب: شرح نخبہ میں جابرؓ کی حدیث کنا نعزل والقران ینزل (ہم عزل کرتے تھے اور قرآن اترتا تھا) کو مرفوع تقریری حکم میں شمار کیا ہے۔ یعنی صحابی اگر کہتے کہ ہم وحی کے زمانہ میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا عہد نبوی میں فلاں کام کرتے تھے یا اس قسم کی کوئی اور عبارت بولے جس کا مطلب یہی ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل یہ کام ہوتا تھا تو یہ بھی مرفوع حدیث کی قسم ہے۔ سو اس بناء پر نعمان بن بشیر کی روایت مرفوع ہوئی پھر آپ کس طرح کہتے ہیں کہ الزاق الکعبین (ٹخنوں سے ٹخنے ملا کر کھڑے ہونے کا مسئلہ) مرفوع حدیث نہیں۔ اس کے علاوہ نعمان کی حدیث میں پہلے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا صفیں ٹھیک کرو ورنہ خدا تمہارے دلوں میں مخالفت ڈال دے گا۔ اس کے بعد نعمانؓ کہتے ہیں۔

فرأيت رجلا يلزق منكبه بمنكب صاحبه وركبته بركبة صاحبه وكعبه بكعبه (ابوداؤد باب تسوية الصفوف)

پس میں نے دیکھا ایک شخص دوسرے شخص کے کندھے سے کندھا ملاتا ہے اور گھٹنے سے گھٹنہ اور ٹخنہ ٹخنہ سے

اس عبارت میں فرأیت کے لفظ میں فا بتا رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل انہوں نے اس سے کی کہ ایک دوسرے سے کندھے، گھٹنے اور ٹخنے ملا کر کھڑے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان کی طرف متوجہ تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کی یہ صورت اختیار کی ہے تو یہ حدیث قولاً بھی مرفوع ہوگی اور تقریر صریح سے بھی مرفوع ہوگی۔ اور انسؓ کی حدیث میں ہے جو بخاری کے اسی باب میں ہے

اتيموا صفوفكم فاني اراكم من وراء ظهري وكان احدنا يلزق منكبه بمنكبه وقدمه بقدمه

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اپنی صفیں ٹھیک کرو کیونکہ میں تمہیں اپنی پچھاڑی سے بھی دیکھتا ہوں۔ اور ہمارا ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملانا اور قدم سے قدم ملانا اس حدیث میں پچھاڑی سے بھی دیکھنے کا ذکر ہے۔ پس آپ کا اس کو مرفوع شمار نہ کرنا ڈبل غلطی ہے اور نعمان بن بشیر کی حدیث میں الرجل کے

الف لام کو عہد خارجی بنانا اور انسؓ کی حدیث میں احدنا سے ایک معین مراد لینا یہ بھی آپ کی ڈبل غلطی ہے کیونکہ الف لام عہد خارجی تب ہوتا جب نعمان بن بشیر کا مقصود صرف ایک شخص کا واقعہ بیان کرنا مقصود ہوتا جو متکلم مخاطب کے درمیان متعین ہوتا حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ وہ اس بات کو مسئلہ کے رنگ میں بیان کر رہے ہیں کہ ہم جماعت میں اس طرح مل کر کھڑے ہوتے کہ ایک دوسرے سے ٹخنے ملاتے یہاں ایک معین شخص سے کچھ مطلب ہی نہیں۔ اسی طرح انسؓ کی حدیث میں احدنا ایسا ہی ہے جیسے فاتحہ خلف الامام کی حدیث میں ہے۔

فلیقرأ احدکم فاتحۃ الکتاب فی نفسہ

چاہیے کہ ایک تمہارا آہستہ فاتحہ پڑھے

اور برتن میں کتے کے منہ ڈالنے کی حدیث میں ہے۔ "طھور اناء احدکم" پاکی برتن ایک تمہارے کی وغیرہ۔ رہی یہ بات کہ ٹخنے سے مراد ٹخنہ ہی ہے یا قدم ہے تو صحیح یہی ہے کہ قدم مراد ہے کیونکہ جب تک پاؤں ٹیڑھا نہ کیا جائے ٹخنے سے ٹخنہ نہیں مل سکتا تو گویا دونوں طرف ملانے کے لئے دونوں پاؤں ٹیڑھے کر کے کھڑا ہونا پڑے گا۔ جس میں کئی خرابیاں ہیں۔ ایک تو زیادہ دیر تک اس طرح کھڑے رہنا مشکل ہے۔ دوم انگلیاں قبلہ رُخ نہیں رہتیں سوم اس کے لئے بار بار حرکت کرنی پڑتی ہے جو نماز میں خشوع کے منافی ہے۔ چہارم پاؤں کے اندر کی جانب اُٹھانی پڑتی ہے جس سے سارا پاؤں زمین پر نہیں لگتا۔ غرض اس قسم کے کئی نقصان ہیں۔ اس لئے ٹخنے سے ٹخنہ مراد نہیں ہو سکتا بلکہ قدم مراد ہے۔ اور انسؓ کی حدیث میں ٹخنہ کی جگہ قدم ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ مراد قدم ہی ہے اس لئے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب بھی قدم ہی کا باندھا ہے اور بعض لوگ قدم زیادہ چوڑے کر کے کھڑے ہوتے ہیں جس سے کندھے نہیں ملتے وہ غلطی کرتے ہیں کیونکہ اس حدیث میں جیسے قدم ملانے کا ذکر ہے کندھے ملانے کا بھی ذکر ہے۔ پس قدموں میں فاصلہ اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا کندھوں میں ہے تاکہ دونوں مل جائیں۔

عبداللہ محدث روپڑی

پیچھے آنے والا مقتدی بچوں کو اگلی صف سے پیچھے ہٹا کر خود کھڑا ہو سکتا ہے؟

سوال :۔ پہلی صف میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی کھڑے ہوں تو بعد میں آنے والا کسی بچے کو پیچھے ہٹا کر خود اس کی جگہ کھڑا ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب :۔ پہلی صف میں اگر جگہ ہو تو بچے کھڑے ہو سکتے ہیں بلکہ بچہ اگر زیادہ پڑھا ہوا ہو۔ اور باقی لوگ

پڑھے ہوئے نہ ہوں تو بچہ امامت بھی کرا سکتا ہے۔

مشکوٰۃ میں یہ بھی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے قریب بالغ اور عقلمند یعنی اہل علم کھڑے ہوں۔ ایک صحابیؓ نے اس حدیث کی بنا پر ایک بچے کو پیچھے کر دیا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ

پیچھے آنے والا اپنے ساتھ ملانے کے لئے صف کے درمیان سے نمازی کو کھینچے یا صف کے کنارہ سے

سوال :۔ اکیلا خلف الصف کس جگہ سے نمازی کو کھینچے درمیان سے یا طرفین سے۔ اگر جماعت قعدہ یا تشہد یا قومہ یا رکوع میں ہو تو کھینچنے کی صورت کیا ہوگی

مولوی ولی محمدؒ

جواب :۔ اکیلا صف کے پیچھے درمیان سے کھینچے۔ کیونکہ حدیث میں ہے۔

وَسِّطُوا الْاِمَامَ وسدوا الخلل رواہ ابوداؤد (منتقیٰ باب وقوف الامام تلقاء وسط الصف)

ترجمہ۔ امام کو درمیان کرو اور خلل بند کرو۔

اس حدیث میں امام کو درمیان رکھنے کا ارشاد ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ درمیان سے کھینچے کیونکہ کنارہ سے کھینچنے کی صورت میں اگر کنارہ میں کھڑا ہو جائے تو اس حدیث کا خلاف لازم آتا ہے اور اگر کھینچ کر درمیان لائے تو ضرورت سے زیادہ حرکت لازم آتی ہے۔ رہا درمیان خلل پیدا ہونا سو اس کے متعلق سُدُّوا الخلل کا ارشاد اسی حدیث میں موجود ہے۔ بقیہ صف اس ارشاد کے تحت خلل کو خود ہی بند کر لے گی۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو تھوڑی حرکت کرنی پڑے گی جس سے نماز میں کچھ خلل نہیں آتا اور کنارہ سے کھینچ کر درمیان لانے سے تو بعض دفعہ بہت زیادہ چلنا پڑتا ہے جو بظاہر نماز کی شان کے خلاف ہے اور ہر ایک نمازی کا تھوڑا سرکنا منافی نہیں۔ پس ترجیح اسی کو ہے کہ درمیان سے کھینچے نہ کہ کنارہ سے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۷ رجب ۱۳۵۹ھ ۲۲ اگست ۱۹۴۰ء

سُنن اور نوافل کا بیان

پانچ وقتی نماز کی سنّتیں نہ پڑھنا جرم ہے

سوال:۔ پانچوں نمازوں کی سنّتیں نہ پڑھنے سے پکڑ ہے یا نہیں؟

جواب:۔ حدیث میں آیا ہے کہ سنّتیں اور نوافل فرضوں کی کمی پورا کرنے کی خاطر مقرر ہوئے ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب التطوع فصل ۲ میں حدیث ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فرض ہم سے کما حقّہ ادا نہیں ہوتا۔ اگر ظاہری قصور نہ ہو تو پورا خشوع مشکل ہے۔ اس لئے خطرہ ہے کہ سنّتیں نہ پڑھنے والا گرفت میں آجائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

جمع کی صورت میں سنّتوں کا مسئلہ

سوال:۔ بارش میں مغرب اور عشاء کی نماز جمع کی جائے تو شام کی سنّتیں پڑھنی چاہئیں یا نہیں۔

سائل مولوی محمد فاضل چک اگو ضلع گوجرانوالہ

جواب:۔ بارش کی وجہ سے جمع جائز ہے۔ نیل الاوطار میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ بھی جمع کر لیتے تھے جو سنّت کے بڑے متبع تھے۔ جہاں شرعًا جمع کرنے کی اجازت ہو وہاں سنّتیں معاف ہیں چنانچہ ابن عباس کی حدیث جس میں مدینہ میں جمع کرنے کا ذکر ہے سنّتیں نہیں پڑھیں۔ صرف آٹھ رکعتیں ظہر عصر کی پڑھی ہیں۔ اور سات رکعتیں مغرب عشاء کی پڑھی ہیں۔ اور اسی حدیث سے بارش میں جمع کرنے کا استدلال کیا جاتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۶ جمادی الثانی ۱۳۸۳ھ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء

فجر کی سنّتوں کے بعد لیٹنا

سوال:۔ زید کہتا ہے کہ فجر کی سنّتیں مسجد میں پڑھ کر لیٹنا سخت منع ہے۔ ہاں گھر میں سجدہ پڑھے اور گھر میں

میں فجر کی سنتیں پڑھے تو لیٹ سکتا ہے۔ مسجد میں سنّت پڑھ کر لیٹنا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ اگر ہے تو مسجد کا لفظ دکھاؤ آں حضرتؐ نے مسجد میں سنّتیں پڑھی ہوں اور لیٹے ہوں۔ عمرو کہتا ہے کہ سنّت پڑھنے والا جہاں کہیں بھی ہو لیٹ سکتا ہے اگرچہ جنگل میں سنّت پڑھے۔ کیونکہ حدیث میں عام ہے جو سنّت فجر پڑھے وہ لیٹ جائے۔

جواب:۔ اُصول کا قاعدہ ہے العبرۃ لعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ یعنی عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ خاص سبب کا۔ یہی وجہ ہے کہ حکم شانِ نزول پر بند نہیں ہوتا بلکہ جیسے عام الفاظ ہوتے ہیں۔ اس طرح حکم عام ہوتا ہے۔ مثلاً آیت کریمہ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ الایۃ (صدقات ان فقیروں کے لئے ہیں جو اللہ تعالےٰ کے راستہ میں رُکے ہوئے ہیں) اصحاب صفہ کے حق میں اُتری ہے مگر حکم اس کا عام ہے اور لیٹنے کی حدیث میں تو خاص سبب بھی نہیں۔ یہاں تو بطریق اولیٰ عموم لینا پڑے گا۔ پس ہر جگہ لیٹنا ثابت ہوگیا۔

اِس کے علاوہ اور سُنیئے خطبہ میں کوئی آئے تو اس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ دو رکعت پڑھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک سائل کو آپ نے فرمایا کہ دو رکعت پڑھ۔ حنفیہ اس روایت کو لے کر کہتے ہیں کہ یہ سائل کے لئے خاص تھا جس سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ لوگ اس کے حال کو دیکھ کر رحم کھائیں۔ گویا حنفیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی ضرورت کے موقع پر دو رکعت پڑھی جاسکتی ہیں۔ عام حکم نہیں۔ اہل حدیث اس حکم کو عام کرنے کے لئے وہی عام الفاظ پیش کرتے ہیں کہ جب کوئی خطبہ میں آئے تو دو رکعت ہلکی پڑھے کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہے اور یہ قاعدہ حنفیہ کے ہاں بھی مسلّم ہے ٹھیک اسی طرح لیٹنے کی حدیث کو سمجھ لینا چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء

عشائے سے پہلے چار رکعت

سوال:۔ زید کہتا ہے عشاء سے پہلے سنّت کی نیّت سے چار رکعت پڑھنی ہرگز جائز نہیں۔ عمرو کہتا ہے جائز ہے۔ اور بعض کتب سے جائز ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص عشاء سے پہلے چار رکعت پڑھے گویا اُس نے تہجّد پڑھی۔ اور جو کوئی پڑھتا ہے چار رکعت بعد عشاء کے گویا کہ پڑھی اُس نے چار رکعتیں لیلۃ القدر میں۔ رواہ سعید بن منصور مظاہر حق جلد اصفحہ ۱۰۴ و برہان شرح مواہب الرحمٰن یاد آتا ہے کہ مسک الختام میں نواب صاحب مرحوم بھی چار رکعت عشاء سے پہلے کی دلیل لاتے ہیں۔

جواب:۔ میں نے سعید بن منصور کی حدیث کی بنا پر اپنے رسالہ تعلیم الصلوٰۃ میں چار رکعت عشاء

سے پہلے پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق نہیں۔ اس حالت میں فضائل و اعمال کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر نفل کی نیت سے پڑھے نہ کہ سنت موکدہ کے طور پر۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ - ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء

سہو کا بیان

ایک سجدہ رہ جانے پر سہو کی صورت

سوال:۔ اگر ایک رکعت میں بجائے دو سجدوں کے سہواً ایک سجدہ ہو جائے اور ایک رہ جائے تو کیا سجدہ سہو لازم آئے گا۔ یا رکعت کا اعادہ لازم ہو گا۔؟

محمد فیروز دین موضع جاہر ضلع سیالکوٹ

جواب:۔ دو سجدوں میں اگر ایک سجدہ رہ جائے تو جس رکعت میں سجدہ رہا ہے وہیں سے نماز شروع کرے جس کی صورت یہ ہے کہ ایک سجدہ پہلے ہو چکا ہے۔ ایک اور سجدہ کر کے اس کے بعد کی رکعتیں پڑھ لے۔ پھر اخیر میں التحیات کے بعد سلام سے پہلے یا بعد سجدہ سہو کرے۔ کیونکہ دونوں سجدے رکن ہیں۔ ایک کے چھوٹنے سے نماز نہیں ہوتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۲ جمادی الاول ۱۳۵۶ھ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء

سہو کے وقت مقتدی کا اللہ اکبر کہنا

سوال:۔ امام قرأت بھول جائے تو کیا رکوع میں جانے کے لئے مقتدی اللہ اکبر کہہ سکتا ہے۔

جواب:۔ امام اگر قرأت بھول جائے تو اس کو رکوع جانے کے لئے اللہ اکبر کہنا ثابت نہیں۔ خواہ امام متشابہ اپنے آپ نکال سکے یا نہ نکال سکے۔ ہاں امام کو اپنے آپ چاہیئے کہ اگر اس سے متشابہ نہ نکلے تو رکوع کو چلا جائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فجر کی نماز میں سورۃ مومنون پڑھی۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام

یا عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر پہنچے تو کھانسی شروع ہو گئی آخر رکوع کر دیا۔ (مشکوٰۃ باب القرأۃ فی الصلوٰۃ)
اس سے معلوم ہوا کہ جب امام رک جائے تو رکوع کر دے کیونکہ کھانسی سے رکنا اور بھول کر رکنا ایک ہی بات ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان آگے چلنے سے رہ جاتا ہے۔
ہاں اگر امام سے تشابہ نہ نکلے اور نہ امام رکوع میں جائے تو اس صورت میں مقتدی سبحان اللہ کہہ سکتا ہے تاکہ امام سبحان اللہ سن کر رکوع میں چلا جائے کیونکہ امام کو کسی بات سے آگاہ کرنے کے لئے سبحان اللہ مقرر ہے۔
(مشکوٰۃ مالا یجوز من العمل فی الصلوٰۃ) عبداللہ امرتسری روپڑی
۱۶ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ ۔ ۱۹ اگست ۱۹۳۳ء

امام عمداً یا سہواً آیت چھوڑے تو کیا نماز کا اعادہ ہوگا یا سجدہ سہو کافی ہے

سوال:۔ ایک امام مسجد نے قرأت پڑھتے پڑھتے قرآن مجید کی ایک آدھ آیت بھول جانے پر نماز کو پورا کرنے کے بعد دہرایا۔ اور مقتدیوں نے بھی اس کے ساتھ نماز کو پورا کرنے کے بعد دہرالیا۔ کیا واقعی قرأت پڑھتے پڑھتے اگر کوئی آیت بھول کر رہ جائے یا آیت غلط پڑھی جائے تو نماز دہرانی پڑتی ہے۔ یا سجدہ سہو کی ضرورت پڑتی ہے۔

سائل خریدار تنظیم

جواب:۔ منتقیٰ میں ہے:۔
عن مسور بن یزید المالکی قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فترک آیۃ فقال لہ رجل یا رسول اللہ آیۃ کذا وکذا قال فھلا ذکرتنیھا رواہ ابوداؤد وعبداللہ بن احمد فی مسند ابیہ وعن ابن عمر رضؓ ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم صلی صلوٰۃ فقرأ فیھا فلبس علیہ فلما انصرف قال لابی اصلیت معنا قال نعم قال فما منعک۔ رواہ ابوداؤد (منتقیٰ باب الفتح فی القرأۃ علی الامام۔
مسور بن یزید مالکی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ ایک آیت چھوڑ دی۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے فلاں فلاں آیت چھوڑ دی۔ آپ نے فرمایا تو نے مجھے یاد کیوں نہ دلایا۔

اس کو ابوداؤد نے اور عبداللہ بن احمدؒ نے اپنے والد کی مسند میں روایت کیا ہے۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اس میں آپ پر قرأت مشتبہ ہو گئی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میرےؓ باپ کو فرمایا کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ کہا ہاں فرمایا تو نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قرأت میں کسی آیت کے ترک ہونے سے یا بھول جانے سے نہ نماز لوٹانے کی ضرورت ہے نہ سجدہ سہو پڑتا ہے۔ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز لوٹانے یا سجدہ سہو کرتے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کو لقمہ ضرور دینا چاہیے جو لوگ لقمہ دینے سے منع کرتے ہیں ان کا خیال ان احادیث کے خلاف ہے۔ ہاں ایک حدیث ابوداؤد میں منع کی بھی آئی ہے مگر ایک تو وہ منقطع ہے۔ اس میں ایک راوی ابواسحٰق ہے جس نے حارث اعور سے یہ حدیث نہیں سنی۔ نیز حارث اعور کذاب ہے۔ پس یہ حدیث استدلال کے بالکل قابل نہیں خاص کر اوپر کی احادیث کے مقابلہ میں کیونکہ وہ استدلال کے قابل ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ

نماز میں امام کو لقمہ دینا

سوال:۔ امام اگر نماز میں کوئی لفظ بھول جائے تو اس کو لقمہ دینا درست ہے یا نہیں اور کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں یہ مروی ہے کہ آپ فرض نماز میں بھول گئے ہوں اور صحابہؓ نے حالت اقتدا میں آپ کو لقمہ دیا ہو۔ احناف اس کو ناجائز کہتے ہیں اور منع کرتے ہیں۔ ان کے ہاں امام اگر بھول جائے تو صرف سجدہ سہو کرنا ہی کافی ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے۔

ابو محمد عبدالجبار خطیب مسجد اہلحدیث رنگون۔ محمد صدیق شاہ عالم مارکیٹ لاہور (دکھی بیکر)

جواب:۔ امام کو لقمہ دینا درست ہے۔ چنانچہ ابوداؤد بحوالہ عون المعبود جلد اول باب الفتح علی الامام میں ہے

عن یحیٰی الکاهلی عن المسور بن یزید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یحیٰی وربما قال شهدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الصلوۃ فترك شیئا لم یقراٗه فقال له رجل یا رسول اللہ ترکت ایة کذا وکذا فقال

لہ یائے کو ضمیر متکلم بنایا گیا ہے جو سہو ہے۔ حدیث پر ابی سے ابی بن کعب مراد لیا گیا ہے جو صحیح ہے۔ (مرتب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھلا اذکرتنیھا۔
۲۔ عن عبداللہ بن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی صلاۃ فقرأ فیہا
فلبس علیہ فلما انصرف قال لابی اصلیت معنا قال نعم قال فما منعک۔
یعنی مسور بن یزید مالکیؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نماز میں قرأت فرماتے تھے۔ آپ نے درمیان سے کچھ چھوڑ دیا۔ نماز کے بعد ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے فلاں فلاں آیت چھوڑ دی ہے۔ اس پر آپ نے اس کو جواب دیا کہ تونے کیوں نہ یاد دلایا۔
۲۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ پر قرأت مشتبہ ہوگئی یعنی بھول گئے یا آگے پیچھے ہوگئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت ابی ابن کعب رضؓ حافظ القرآن کو فرمایا کہ تونے میرے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ جواب دیا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا تونے مجھ کو لقمہ کیوں نہ دیا۔ کس چیز نے منع کیا۔
صاحب عون المعبود فرماتے ہیں۔
والحدیثان یدلان علی مشروعیۃ الفتح علی الامام وتقییدا الفتح بان یکون علی امام لم یؤد الواجب من القرأۃ وباخر رکعۃ مما لا دلیل علیہ۔
یعنی دونوں حدیثیں جواز لقمہ پر دلالت کرتی ہیں۔ اور جواز لقمہ کو مقید کرنا اس شرط کے ساتھ کہ جب امام بقدر واجب من القرأۃ بھول گیا ہو اور رکعت اخیری ہو۔ یہ قول بلا دلیل ہے۔
پھر صاحب عون فرماتے ہیں۔
والادلۃ قد دلت علی مشروعیۃ الفتح مطلقا فعند نسیان الامام الایۃ فی القرأۃ الجھریۃ یکون الفتح علیہ بتذکیرہ تلک الایۃ کما فی حدیث الباب وعند نسیانہ لغیرھا من الارکان یکون الفتح بالتسبیح للرجال والتصفیق للنساء۔
یعنی حدیثوں سے جواز لقمہ مطلقاً ثابت ہوتا ہے خواہ بقدر واجب من القرأۃ میں بھولے یا زیادہ میں۔ اور لقمہ کی دو صورتیں ہیں (۱) جہری نماز میں اگر امام بھول جائے تو مقتدی خواہ عورت ہو یا مرد امام کو بھولی ہوئی آیت بتلادے۔ (۲) اگر قرأت کے علاوہ مثلاً سجدہ یا قعدہ وغیرہ بھول جائے تو مقتدی مرد امام کو

اطلاع دینے کے لئے سبحان اللہ کہے۔ اور عورت اطلاع دینے کے لئے تالی بجا دے۔ یعنی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ایک مرتبہ مارے۔ فقہا بھی منع نہیں کرتے بلکہ وہ بھی جائز سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو شرح وقایہ جلد اول صفحہ ۱۵۳ مطبوعہ یوسفی باب مایفسد الصلوٰۃ ومایکرہ فیہا وفتحہ علی غیر امامہ انما قال علی غیر امامہ لانہ فتحہ علی امامہ قال بعض المشائخ اذا قرأ امامہ مقدار ما یجوزبہ الصلوٰۃ وانتقل الی آیۃ اخری ففتح تفسد صلوۃ الفاتح وان اخذ منہ تفسد صلوۃ الامام ایضا وبعضہم قالوا لاتفسد فی شیء من ذالک وسمعت ان الفتوی علی ذالک۔

مصلی اگر غیر امام کو لقمہ دے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ اگر مصلی اپنے امام کو لقمہ دے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔

بعض مشائخ کا قول ہے کہ امام اگر تین آیتیں پڑھ کر بھول گیا یا دوسری آیت شروع کر دی اس صورت میں لقمہ دینے والے کی نماز فاسد ہوگی۔ اگر امام نے لقمہ لے لیا تو امام کی بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ کسی کی بھی فاسد نہ ہوگی۔

عبداللہ بن مسعود رح تاج الشریعۃ صاحب شرح وقایہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے استادوں اور مشائخوں سے سنا ہے کہ فتوی اسی آخری قول (کسی کی فاسد نہ ہوگی) پر ہے۔"

شرح وقایہ کے حاشیہ پر بھی مولانا عبدالحق صاحب مرحوم محشی کتاب حنفی عالم نے بھی ابوداؤد کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لقمہ دینا جائز ہے۔

دلیل نمبر ۲۔ ہدایہ مع نہایہ جلد اول مطبوعہ احمدی صفحہ ۱۳۳ میں ہے۔

وان فتح علی امامہ لم یکن کلامًا۔

یعنی اگر امام کو لقمہ دیا جاوے تو وہ کلام میں شمار نہیں تاکہ نماز فاسد نہ ہو جائے۔

اس عبارت کی شرح میں لکھا ہے کہ قولہ۔

وان فتح علی امامہ لم یکن کلامًا واطلق ہذا دلیل علی ان ما اذا قرأ الامام

لہ :۔ غالباً جس نے یہ شرط لگائی ہے اس نے خیال کیا ہوگا کہ نماز شروع ہو تو نئے سرے سے نماز پڑھنی سہل ہے۔ اخیر نماز ہو تو نئے سرے سے پڑھنے میں دقت ہے۔ اس لئے شروع نماز میں لقمہ کی اجازت نہیں۔ اخیر میں اجازت ہے مگر ایسے قیاسات کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں۔

مقدار ما یجوز به الصلوۃ وبا ذا ما لم یقرأ لا تفسد الفاتح ولا صلوۃ الامام بالاخذ
یعنی شارح کہتے ہیں کہ مصنف کا کلام مطلق ہے اور یہ مطلق اس بات کی دلیل ہے کہ خواہ امام مقدار ما یجوز به الصلوۃ کے پڑھنے کے بعد یا اس سے کم ہیں بھولے ہر دو صورتوں ہیں اگر مقتدی لقمہ دے اور امام لقمہ قبول کرے ۔ نہ تو امام کی نماز فاسد ہوگی نہ مقتدی کی "

احناف کا یہ کہنا کہ امام اگر بھول جائے تو اس کو لقمہ نہ دیا جائے صرف سجدہ سہو کرنا کافی ہے ۔ اس کی دلیل کتب فقہ میں کہیں نہیں ہے ۔ یہ اُن کا زبانی قول بلا دلیل مردود ہے ۔ کتب فقہ اس کے خلاف ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا ۔

اعتراض

ابو داؤد میں النھی عن التلقین میں حدیث ہے ۔
عن ابی اسحق عن الحارث عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا علی لا تفتح علی الامام فی الصلوۃ ۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی ! امام کو نماز میں لقمہ نہ دے ۔

اس کے کئی جواب ہیں ۔
۱ ۔ اس حدیث کی سند میں حارث راوی ہے ۔ عون المعبود میں ہے کہ اس کی کنیت ابو زہیر ہے ۔ باپ عبداللہ ہے ۔ کوفی ہے ۔ منذری نے لکھا کہ اکثر ائمہ نے اس کو ضعیف کہا ہے ۔
۲ ۔ امام ابو داؤد نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ ابو اسحق نے اپنے استاذ سے سوائے چار حدیث کے اور کوئی حدیث نہیں سُنی ۔ اور یہ حدیث ان چار میں نہیں ہے ۔ لہذا یہ حدیث منقطع ہوئی ۔
۳ ۔ امام ابو سلیمان خطابی نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن اسلمی سے روایت کی گئی ہے حضرت علیؓ نے خود فرمایا اذا استطعمکم الامام فاطعموہ ۔ یعنی امام تم سے لقمہ طلب کرے تو اس کو لقمہ دو ۔
خلاصہ یہ کہ ان دلائل جواز کے باوجود بھی کوئی حنفی منع کرے تو وہ نہ حنفی ہے نہ اہلحدیث ۔ اگر حنفی ہوتا تو منع نہ کرتا کیونکہ کتب فقہ میں منع نہیں ۔ اور اگر اہلحدیث ہوتا تو منع کرنے کی جرأت نہ کرتا اس لئے کہ احادیث میں اس کا ذکر ہے

عبدالقیوم بردوانی مؤید عبداللہ امرتسری روپڑی

جو شخص نماز سے باہر ہے وہ نمازی کو لقمہ دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب۔ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ بھی لقمہ دے سکتا ہے۔

چنانچہ بخاری شریف میں ہے۔

عن البراء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم کان اوّل ما قدم المدینۃ علی اجدادہ اوقال اخوالہ وانہ صلی قبل بیت المقدس عشر شہرا وکان یعجبہ ان یکون قبلتہ قبل البیت وانہ صلی اول صلوۃ صلاہا صلوۃ العصر وصلی معہ قوم فخرج رجل ممن صلی معہ فمر علی اہل مسجد وہم راکعون فقال اشہد باللہ لقد صلیت مع رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قبل مکۃ فداروا کما ہم قبل البیت۔

(بخاری ج۱ باب الصلوۃ من الایمان)

براء بن عازبؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پہلے مدینہ میں تشریف لائے تو انصار سے اپنے ننھیال یا ماموؤں میں اترے۔ اور سولہ ماہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے اور بیت اللہ کی طرف منہ کرنا آپ کو پسند تھا۔ پہلی نماز جو بیت اللہ کی طرف منہ کرکے پڑھی وہ نماز عصر ہے اور آپؐ کے ساتھ ایک جماعت نے نماز پڑھی۔ ان میں سے ایک آدمی بعد فراغت نماز نکلا اور ایک مسجد والوں کے پاس سے گذرا وہ رکوع کی حالت میں تھے اس نے کہا میں خدا کے نام کے ساتھ شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔ مسجد والے رکوع ہی کی حالت میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ لقمہ دینے کے لئے داخل نماز ہونے کی شرط باطل ہے جو شخص نماز میں شامل نہ ہو لقمہ دے سکتا ہے۔ اس کے قریب ایک حدیث بخاری جلد ا باب ماجاء فی القبلۃ" میں عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے اور مسلم میں بھی ہے اور اس پر فتح الباری میں لکھا ہے۔

وفيه جواز تعليم من ليس في الصلوة من هو فيها وان استماع المصلي لكلام من ليس في الصلوة لا يفسد صلوته (فتح الباری جز ۲)

یعنی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر نمازی کا نمازی کو تعلیم دینا جائز ہے اور نمازی کا غیر نمازی کے کلام کو سننا اور اس پر عمل کرنا اس کی نماز کو فاسد نہیں کرتا۔

اور جب دوسری باتوں میں باہر کا لقمہ صحیح ہوا تو قراءۃ قرآن مجید میں بطریق اولیٰ صحیح ہو گیا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۱ شوال ۱۳۸۲ھ مطابق ۸ مارچ ۱۹۶۳ء

التحیات میں غلطی سے تھوڑا سا اُٹھ کر بیٹھنا

سوال: اگر قعدہ اولیٰ میں امام بجائے بیٹھنے کے کھڑا ہو جائے مگر پوری طرح کھڑا نہ ہو بلکہ اتنا کھڑا ہو کر گھٹنے زمین سے اُٹھ جائیں۔ ایسی حالت میں امام بیٹھ کر قعدہ کرے اور چار رکعت پوری کر کے دو سجدے سہو کرے تو نماز باطل ہو جائے گی یا نہیں۔

عبدالرحمٰن فضل الرحمٰن ٹوز مرچنٹ لوہا بازار بھوپال

جواب: منتقیٰ میں ہے۔

عن المغيرة بن شعبة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اِذَا قَامَ اَحَدُكُمْ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ فَلَمْ يَسْتَتِمَّ قَائِمًا فَلْيَجْلِسْ قَائِمًا وَاِنِ اسْتَتَمَّ قَائِمًا فَلَا يَجْلِسْ وَسَجَدَ سَجْدَتَيِ السهو ۔ رواه احمد وابوداؤد وابن ماجة ۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دو رکعت سے اُٹھا لیکن پورا کھڑا نہیں ہوا تو وہ بیٹھ جائے۔ اور التحیات پڑھ لے اور جو پورا کھڑا ہو گیا وہ نہ بیٹھے۔ اور (آخر میں) سجدہ کر لے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ سوال کی صورت میں نماز باطل نہیں ہوئی بلکہ بالکل درست ہوئی۔ اور یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے کیونکہ اس کی اسناد میں جابر جعفی ضعیف ہے مگر مندرجہ ذیل احادیث اس کی مؤید ہیں۔ اس لئے اس حدیث کا مسئلہ درست ہے۔

اوّل حدیث ۔ عن ابن بحينة ان النبي صلى الله عليه وسلم صلى فقام في الركعتين فسبحوا به فمضى فلما فرغ من صلوته سجد سجدتين ثم سلم ۔ رواه النسائي ۔

یعنی ابن بحینہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ دو رکعت میں کھڑے ہو گئے لوگوں نے سبحان اللہ کہا مگر آپ لوٹے نہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا۔

دوم حدیث

وعن زیاد بن علاقة قال صلی بنا المغيرة بن شعبة فلما صلی رکعتين قام ولم يجلس فسبح به من خلفه فاشار اليهم ان قوموا فلما فرغ من صلوته سلم ثم سجد سجدتين وسلم ثم قال هكذا صنع بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ رواه احمد والترمذی وصححه (منتقی)

یعنی زیاد بن علاقہ سے روایت ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے ہمیں نماز پڑھائی دو رکعت پڑھ کر کھڑے گئے، اور التحیات نہیں پڑھی۔ پچھلے لوگوں نے سبحان اللہ کہا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اشارہ کیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو سلام پھیرا۔ پھر دو سجدے کئے اور سلام پھیرا پھر فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا۔

سوم حدیث

عن انس انه صلى الله عليه وسلم تحرك للقيام فى الركعتين الآخرتين من العصر على جهة للقيام فسبحوا له فقعد ثم سجد للسهو اخرجه البيهقى والدارقطنى موقوفا وفى بعض طرقه انه قال هذا السنة قال الحافظ ورجاله ثقات (نيل الاوطار جلد)

یعنی انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت میں کھڑے ہونے کے لئے حرکت کی۔ لوگوں نے سبحان اللہ کہا۔ آپ بیٹھ گئے پھر سجدہ سہو کیا۔ ان تینوں حدیثوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ اگر سیدھا کھڑا ہو جائے تو پھر نہ لوٹے۔ اگر تھوڑی حرکت کی ہو تو لوٹ کر التحیات پڑھے اور سجدہ سہو ہر صورت میں کرنا پڑیگا خواہ سیدھا کھڑا ہو جائے یا تھوڑی حرکت کی ہو۔

عبد اللہ امرتسری روپڑ

۱۸ محرم سنہ ۱۳۵۳ھ - ۳ مئی سنہ ۱۹۳۴ء

نماز میں بھول کر دو سجدہ تلاوت کرنا

سوال:۔ سجدہ ایک کی بجائے دو سجدہ تلاوت ہو جائیں تو کیا کرنا چاہیئے۔

جواب :۔ حدیث میں ہے لکل سہو سجدتان (بلوغ المرام) ہر سہو کے لئے دو سجدے ہیں نماز میں دو سجدے تلاوت بھی ایک قسم سہو ہے اس لئے سجدہ کرلے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ
۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ - ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء

ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا

سوال :۔ بعض لوگ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

جواب :۔ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا صحیح نہیں صحیح یہ ہے کہ سجدہ سہو سلام سے پہلے کرے یا بعد یعنی دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرے۔ احادیث میں اسی طرح آیا ہے۔ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنے کا کہیں ذکر نہیں یہ محض قیاس ہے۔ ہاں ایک طرف سلام بھی حدیث میں آیا ہے لیکن جو ایک سلام کے بعد سجدہ کرتے ہیں وہ نماز سے فارغ ہونے کے لئے ایک سلام کے قائل نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۶ رمضان ۱۳۷۹ھ - ۱۵ مارچ ۱۹۶۰ء

نماز تہجد۔ وتر۔ تراویح

کیا نماز تہجد رمضان میں باجماعت بدعت ہے

سوال :۔ نماز تہجد کا رمضان مبارک میں پڑھنا اور باجماعت ادا کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب :۔ نماز تہجد اور تراویح ایک ہی ہے چنانچہ رسالہ اہل حدیث کے امتیازی مسائل میں ہم نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ تراویح۔ تہجد جب ایک ہوئی تو رمضان میں باجماعت ادا کرنا بھی ثابت ہوگیا کیونکہ تین روز رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باجماعت قیام کیا ہے پھر فرض ہونے کے خوف سے ترک کردیا۔ چنانچہ مسلم شریف میں حدیث ہے اب چونکہ فرض ہونے کا خوف نہیں اس لئے باجماعت پڑھنا مسنون ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

تہجّد کی رکعت

سوال :۔ نماز تہجّد کتنی رکعت ہے ؟

جواب :۔ تہجد۔ تراویح ایک ہی نماز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ تراویح پڑھائی ہیں۔
عبداللہ امرتسری روپڑ

سوال :۔ تہجد میں کونسی سورت پڑھی جائے۔

جواب :۔ سورت کوئی مقرر نہیں جو چاہے پڑھے۔ ہاں وتروں میں سورہ اعلیٰ۔ سورہ قل یاایّہا الکفرون سورہ قل ہو اللہ۔ یہ تینوں سورتیں تین رکعت میں ترتیب وار آئی ہیں۔ بعض روایتوں میں اخیری رکعتوں میں قل ھو اللہ احد۔ قل اعوذ برب الفلق۔ قل اعوذ برب الناس بھی آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو (مشکوٰۃ باب الوتر)
عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ
۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ ۔ ۹ جولائی ۱۹۳۷ء

تہجّد رہنے پر وتر کی قضائی

سوال :۔ اگر کسی کی تہجد کی نماز رہ جائے تو وہ وتروں کی قضائی دے یا ساری نماز ادا کرے۔
حاجی محمد اسماعیل گڑھ شنکر

جواب :۔ مشکوٰۃ باب الوتر میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نیند یا بیماری غالب آجاتی اور قیام اللیل رہ جاتا تو دن کو بارہ رکعت پڑھ لیتے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر سمیت اکثر گیارہ رکعت پڑھتے اس لئے دن میں ایک رکعت بڑھا کر بارہ پڑھ لیتے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ وتر کی ویسے قضا نہیں بلکہ دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لینی چاہیئے۔ اگر ایک وتر پڑھنا ہو تو دن میں اس کی بجائے دو پڑھے اگر تین پڑھنے ہوں تو چار۔ پانچ پڑھنے ہوں تو چھ۔ سات پڑھنے ہوں تو آٹھ اور اگر نو پڑھنے ہوں تو دس پڑھ لیں۔ بس یہی قضا ہے۔
عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ ۱۲ فروری ۱۹۳۷ء

وتر کی تین رکعت ایک قعدہ سے

سوال :- وتر کی تین رکعت دو قعدے اور ایک سلام سے پڑھتے ہیں۔ حدیث شریف سے ثابت ہے یا نہیں۔ (عبدالکریم)

جواب :- اس میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں۔ مغرب کی نماز کی طرح پڑھے۔ اہل حدیث کہتے ہیں کہ اس کے دو طریق ہیں۔ ایک یہ کہ دو پڑھ کر سلام پھیر دے۔ ایک الگ پڑھے۔ تاکہ صلوٰۃ اللیل مثنی مثنی پر عمل ہو جائے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ پانچ کی طرح پڑھے یعنی دو رکعت پر نہ تو التحیات پڑھے نہ سلام پھیرے۔ حدیث میں ہے۔

لا تو تروا بثلث تشبھوا بالمغرب - الحدیث

یعنی تین وتر نہ پڑھو اس میں مغرب کی مشابہت ہے۔

اور دوسری حدیث میں ہے۔

لا یسلم الا فی اخرھن

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رکعت میں سلام پھیرتے

ہر دو حدیثوں میں موافقت کی صورت یہ ہے کہ درمیان التحیات نہ بیٹھے۔ کیونکہ جب التحیات نہ بیٹھا تو مغرب کی مشابہت ٹوٹ گئی۔ اگر کہا جائے کہ دعا قنوت سے پہلے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ اٹھاتے ہیں تو اس سے مغرب اور وتر کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا تو اور نمازوں میں بھی ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی وغیرہ سے فجر کی نماز میں ثابت ہے (قیام اللیل) تو اگر کسی حادثہ کے وقت مغرب میں بھی دعا قنوت اس طریق پر پڑھی گئی تو وتر اور قنوت میں کچھ فرق نہیں رہے گا۔ ہاں اگر التحیات نہ بیٹھے تو اس صورت میں مغرب سے مشابہت نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ قرین قیاس بھی ہے کیونکہ التحیات پڑھ کر اخیر کی رکعت کو الگ کرنا سات سے شروع ہوتا ہے۔ اگر تین سے شروع ہوتا تو اس کے اوپر پانچ میں بھی ہوتا حالانکہ پانچ میں نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ نہ درمیان التحیات بیٹھے نہ سلام پھیرے۔ اس کے علاوہ ایک صریح روایت بھی ہے کہ آپ تین وتر میں درمیان نہیں بیٹھتے تھے

ف اگر کہا جائے کہ بعض سلف سے نماز مغرب کی طرح پڑھنا ثابت ہے۔ چنانچہ قیام اللیل میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قیام اللیل میں سلف کا عمل دونوں طرح سے لکھا ہے۔ یعنی نماز مغرب کی طرح بھی۔ اور بغیر التحیات اور سلام کے بھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دلیل کی رو سے کس کو ترجیح ہے یا بہتر صورت کونسی ہے تو دلیل کی رو سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تین وتر بغیر التحیات اور بغیر سلام کے پڑھنے چاہئیں۔ فافہم

تلخیص میں ہے۔

اَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُوْتِرُ بِثَلَاثٍ لَا یَجْلِسُ اِلَّا فِیْ اٰخِرِھِنَّ

(احمد۔ والنسائی والبیہقی والحاکم من روایۃ عائشۃ تلخیص ص۱۱۶)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھتے تھے۔ درمیان نہیں بیٹھتے تھے

روایت کیا اس کو نسائی۔ بیہقی اور حاکم نے حضرت عائشہ رضہ کی روایت سے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

قنوت سے پہلے تکبیر کہنا

سوال:۔ قنوت سے پہلے تکبیر کہنا درست ہے۔

جواب:۔ قنوت سے پہلے تکبیر کہنے کی بابت حدیث میں کچھ تصریح نہیں آئی۔ اور سلف کا اس میں اختلاف ہے۔ بہتر ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس کی بابت دلیل کی رو سے پوری تشفی نہ ہو۔ ہاں ہاتھ اٹھانا دعا میں بے شک ثابت ہے اور دعا قنوت بھی ایک دعا ہے تو اس وجہ سے اس میں بھی ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ بہت سے سلفؒ کا عمل بھی اس پر ہے (قیام اللیل) البتہ جس طریق سے حنفیہ اٹھاتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کی طرح رفع یدین کر کے ہاتھ باندھ لیتے ہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اور اسی طرح رکوع سے پہلے دعا قنوت کا ثابت کرنا اور اسی پر حصر کرنا یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ پہلے پیچھے دونوں طرح ثابت ہے پس دونوں پر عمل چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۹۲۵ء

ایک وتر

سوال:۔ کیا عشاء کی سنتوں کے بعد ایک وتر پڑھنا جائز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عشاء کے فرضوں کے بعد دو رکعت ہی پڑھ کر ایک وتر نہیں پڑھ سکتا۔ ہاں فرضوں کے بعد چار رکعت پڑھے تو ایک وتر پڑھ سکتا ہے۔ (صدرالدین بگھیاڑی)

جواب:۔ جب ایک وتر جائز ہے تو پھر اس سے پہلے دو رکعت شرط کرنا بے دلیل ہے اگر یہ خیال ہو کہ ایک وتر کس نماز کو طاق کرے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عشاء کے فرضوں اور سنتوں کو۔ کیونکہ دن کی نمازوں کے وتر مغرب کی نماز ہے اور رات کی نمازوں کے وتر رات کے وتر ہیں جو ایک سے لے کر تک ہیں چونکہ

وتر مغرب کی نماز ہے۔ اس لئے اگر کسی کی تہجد با وتر رہ جائیں تو وہ دن میں طاق نہیں پڑھ سکتا بلکہ ایک رکعت بڑھا کر جفت پڑھے۔ مثلاً رات کو وتر ایک پڑھتا ہے تو دن میں دو رکعت پڑھے۔ اگر زیادہ پڑھتا تھا تو اس پر ایک اور بڑھا لے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔ جب کسی وجہ سے تہجد رہ جاتی تو دوپہر سے پہلے ۱۲ رکعت پڑھ لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنی نماز رات کو پڑھتا ہے اس سے ایک رکعت بڑھا کر پڑھے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ ۔ ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء

دُعاء قنوت ۔ محل دُعاء ۔ نماز فجر میں دُعاء قنوت

سوال :۔ نماز وتر میں آخری رکعت میں رکوع کے بعد قومہ کی حالت میں دعاء قنوت ہاتھ اٹھا کر مانگنے کا کیا ثبوت ہے۔ اور نماز فجر میں دُعاء قنوت پڑھنے کا کیا حکم ہے۔

عبدالحمید خان معرفت نذیر محمد فائرمین ریلوے شیڈ لدھیانہ

جواب :۔ پانچوں نمازوں میں ہمیشہ دعا قنوت پڑھنا بدعت ہے۔ البتہ فجر کی نماز میں بدعت نہیں کہہ سکتے کیونکہ حدیث میں جب ضعف تھوڑا ہو تو فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ ہاں ضروری سمجھنا ٹھیک نہیں کیونکہ حدیث میں ضعف ہے۔

اللّٰھم اھدنا پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ عبداللہ بن مسعود رض تشہد میں السّلام علیك ایھا النبیّ کی جگہ السّلام علی النبی پڑھتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے حسب ضرورت دُعاء میں لفظ بدل جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اور ضمیر کا بدلنا تو کوئی بڑا تغیر بھی نہیں۔ السلام علی النبی کی نسبت معمولی ہے۔ پھر تشہد زیادہ احتیاط والی شے ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد اس طرح سکھاتے جیسے قرآن کی سورۃ سکھاتے۔ جب ایسی احتیاط کی شے میں حسب موقعہ تصرف جائز ہوا تو دعاء قنوت میں کیوں جائز نہ ہوگا جو اس کی نسبت معمولی ہے اور تصرف بھی ہلکا ہے۔ اس کے علاوہ بعض روایتوں میں تصریح بھی آئی ہے۔

سُنن کبریٰ بیہقی میں ہے۔

ان بريد بن ابى مريم اخبره قال سمعت ابن عباس ومحمد بن على هو ابن الحنفية بالخيف يقولان كان النبىّ صلّى الله عليه وسلّم يقنت فى صلوٰة الصبح

وفی وتر اللیل بهولاءِ الکلمات اللّٰهمّ اهدنی فیمن هدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولّیت وبارك لی فیما اعطیت وقنی شر ما قضیت انك تقضی ولا یقضی علیك انّه لا یذلّ من والیت تبارکت ربّنا وتعالیت وروینا عن الولید بن مسلم کما اخبرنا ابو عبدالله الحافظ حدثنا ابو الولید حسان بن محمّد الفقیه ثنا ابو بکر محمّد بن محمّد سلیمان ثنا هشام بن خالد الازرق ثنا الولید ابن مسلم حدّثنا ابن جریج عن ابی هرمز عن برید بن ابی مریم عن عبد الله بن عباس قال کان رسول الله صلّی الله علیه وسلّم یعلمنا دعاء تدعو به فی القنوت من صلوٰة الصبح اللّٰهمّ اهدنا فیمن هدیت وعافنا فیمن عافیت وتولنا فیمن تولیت وبارك لنا فیما اعطیت وقنا شر ما قضیت انّك تقضی ولا یقضی علیك انه لا یذل من والیت. تبارکت ربنا وتعالیت. رواه مخلد بن یزید الحرانی عن ابن جریج فذکر روایة برید مرسلة فی تعلیم النبی صلّی الله علیه وسلّم احد ابنی ابنته هذا الدّعاء فی وتره ثم قال برید سمعت ابن الحنفیه وابن عباس یقولان کان رسول الله صلّی الله علیه وسلّم یقولها فی قنوت اللیل وکذالك رواه ابو صفوان الاموی عن ابن جریج الا انه قال عن عبدالله بن هرمز وقال فی حدیث ابن عباس وابن الحنفیة فی قنوت صلوٰة الصبح فصح بهذا کله ان تعلیمه هذا الدّعاء وقع لقنوت صلوٰة الصبح وقنوت الوتر ان بریدا اخذ الحدیث من الوجهین الذین ذکرناهما وبالله التوفیق (سنن کبریٰ بیہقی جلد۲)

اِن حدیثوں کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے ابن عباس اور محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نماز صبح میں اور رات کے وتروں میں ان کلمات کے ساتھ دعا مانگتے تھے۔ اللّٰهمّ اهدنی فیمن هدیت نیز ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں دعاء قنوت کے یہ کلمات سکھاتے تھے اللّٰهم اهدنا فیمن هدیت وعافنا فیمن عافیت الخ۔ اور مخلد بن یزید نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے برید کی روایت مرسل ذکر کی یعنی ابن جریج کے استاد عبد الرحمٰن بن ہرمز کا نام نہیں لیا۔ پھر برید نے کہا میں نے محمد بن حنفیہ اور ابن عباسؓ سے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم

رات کی نماز میں یہ کلمات کہتے تھے اور ابوصفوان اموی نے بھی اس حدیث کو ابن جریج سے روایت کیا ہے لیکن اس نے ابن جریج کا استاد عبدالرحمٰن بن ہرمز کی بجائے عبداللہ بن ہرمز ذکر کیا ہے۔ نیز ابن عباس رضؓ اور محمد بن حنفیہ رحؒ کی حدیث میں صبح کی نماز کا نام لیا ہے۔ پس اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاءِ قنوت نمازِ صبح اور نمازِ وتر دونوں میں سکھائی ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بریدؓ نے ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہ دونوں سے سُنا ہے۔ وباللہ التوفیق

محل دعاءِ قنوت

مستدرک حاکم میں اِس دُعاء کا محل بھی بتایا ہے۔

عن الحسن بن علی قال علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وتری اذا رفعت راسی ولم یبق الا السجود اللھمّ اھدنی (مستدرک جلد ۳ ص۱۷۲)

یعنی حسن بن علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وتر میں جب میں رکوع سے سر اٹھاؤں اور صرف سجدہ باقی رہ جائے یہ دعاء سکھائی۔ اللّٰھمّ اھدنی

مختصر میں ذہبی نے اِس حدیث پر سکوت کیا ہے اور جس حدیث پر ذہبی مختصر میں سکوت کرتے ہیں وہ ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہے۔

ہاتھ اٹھانا

قیام اللیل مروزی ص۱۳۳ وغیرہ میں بعد رکوع کے دُعاء قنوت میں ہاتھ اٹھانا سلفؒ سے روایت کیا ہے

مقتدیوں کا دُعائے قنوت میں آمین کہنا

مقتدیوں کا دُعائے قنوت میں آمین کہنا ابوداؤد میں موجود ہے۔ مگر یہ عام دعائے قنوت کے متعلق ہے، وتروں کی خصوصیت نہیں آئی۔ ہاں وتر بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں کیونکہ وتروں کی دعاء بھی دُعائے قنوت ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۸ رمضان ۱۳۸۳ھ ۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء

دُعائے قنوت

سوال :- راقم الحروف عرصہ سے ملک ملایا میں مقیم ہے۔ جریدہ تنظیم میرے نام آتا ہے۔ ماشاء اللہ مسائل کی تحقیق خوب ہوتی ہے حسب ذیل مسئلہ تفصیل فرما کر مشکور فرمائیں۔
نماز وتر میں دُعاء قنوت رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا بعد اور دعاء قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھی جائے یا باندھ کر
آپ کا خادم عبداللہ خاں تپانگ ملک ملایا

جواب :- قیام اللیل مروزی میں حضرت انس رضؓ سے حدیث مروی ہے جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے۔
انس رضؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ عمر رضؓ رکوع کے بعد قنوت پڑھتے یہاں تک کہ عثمان رضؓ کی خلافت ہوئی۔ انہوں نے رکوع سے پہلے شروع کر دی تاکہ لوگ رکعت پالیں۔
اور عوام سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے ابوعثمان نہدی سے صبح کی قنوت سے سوال کیا تو فرمایا کہ رکوع کے بعد ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس سے نقل کی ہے فرمایا ابوبکر رضؓ۔ عمر رضؓ۔ عثمان رضؓ سے۔
اور ابن سیرینؒ کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضؓ کی خلافت میں ابی رضؓ لوگوں کو تراویح کی نماز پڑھاتے۔ جب نصف رمضان ہو جاتا تو رکوع کے بعد بلند آواز سے قنوت پڑھتے۔
اور ابو عبدالرحمنؒ کہتے ہیں۔ حضرت علی رضؓ وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھتے۔ اور ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں اسودؒ کے لئے میں قرآن مجید تھامے رکھتا وہ بیمار تھے۔ جب وتر کی تیسری رکعت سے فارغ ہوتے تو رکوع کے بعد قنوت پڑھتے۔
اسودؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضؓ وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے۔ اور ایک روایت میں ہے قرأت کے بعد رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے۔ اور عبداللہ بن شداد کہتے ہیں میں نے عمر رضؓ۔ علی رضؓ اور ابوموسیٰ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے صبح کی نماز میں قنوت رکوع سے پہلے پڑھی ہے۔ اور حمیدؒ سے روایت ہے کہ میں نے انس رضؓ سے قنوت کی بابت سوال کیا کہ رکوع سے پہلے ہے یا بعد۔ تو فرمایا کہ ہم پہلے بھی پڑھتے تھے اور پیچھے بھی۔ اور اسودؒ نے رکوع سے پہلے قنوت پڑھی اور امام احمد سے سوال کیا گیا کہ قنوت وتر رکوع سے پہلے ہے یا پیچھے؟ اور قنوت وتر میں ہاتھ اُٹھائے جائیں یا نہ۔ آپ نے فرمایا کہ قنوت رکوع کے بعد پڑھنی چاہیئے۔ اور قنوت وتر میں ہاتھ اُٹھائے جائیں۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق ہے۔ آپ فجر کی نماز میں اسی طرح کیا کرتے تھے۔
اور ایوب اور ابوخیثمہ اور ابن ابی شیبہ کا یہی مذہب ہے۔

فجر کی نماز میں دونوں طرح کی روایتیں ہیں مگر زیادہ تر رکوع کے بعد کی ہیں۔ اس لئے امام احمد رح نے رکوع کے بعد کو ترجیح دی ہے۔

رہا ہاتھوں کا اٹھانا تو اس کی بابت بھی روایتیں آئی ہیں۔ قیام اللیل میں ہے۔

عن الاسود ان عبداللہ بن مسعود کان یرفع یدیہ فی القنوت الی صدرہ وعن ابی عثمان النھدی کان عمر یقنت بنا فی صلوۃ الغداۃ ویرفع یدیہ حتی یخرج ضبعیہ وعن خلاس رایت ابن عباس رض یمد ضبعیہ فی قنوت صلوۃ الغداۃ وکان ابوھریرۃ یرفع یدیہ فی قنوتہ فی شھر رمضان۔ (قیام اللیل صہ ۱۳۳)

یعنی اسودؒ کہتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ قنوت میں سینہ تک ہاتھ اٹھاتے اور ابی عثمان کہتے ہیں۔ حضرت عمر رض صبح کی قنوت میں اتنے ہاتھ اٹھاتے کہ بازوؤں کے اندر کی طرف ظاہر ہو جاتی۔ اور خلاسؒ کہتے ہیں۔ میں نے ابن عباس رض کو دیکھا انہوں نے صبح کی نماز میں اپنے بازو لمبے کئے۔ اور ابوہریرہؓ ماہ رمضان میں اپنی قنوت میں دونوں ہاتھ اٹھاتے۔

جب امام کے ساتھ پڑھنے کا موقع ہو تو مقتدی صرف آمین کہے۔ سُنّت طریق یہی ہے۔ قیام اللیل مروزی میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے متواتر نماز ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشاء۔ فجر میں قنوت پڑھی۔ جب آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کہتے۔ کئی ایک قبائل بنی سلیم۔ رعل۔ ذکوان۔ عصیہ پر بددعا کرتے اور پچھلے لوگ آمین کہتے۔

عکرمہ کہتے ہیں۔ آمین قنوت کی چابی ہے۔ یعنی امام درمیان میں وقفہ کرے۔ جب مقتدی پہلے کلمہ پر آمین کہیں تو پھر امام اگلا کلمہ شروع کر دے۔ حسن کو کہا گیا لوگ قنوت میں شور ڈالتے ہیں یعنی سارے دعا پڑھتے ہیں۔ فرمایا یہ سنت کے خلاف ہے۔

حضرت عمر رض قنوت پڑھتے اور مقتدی آمین کہتے اور معاذ قاری نے دعاء قنوت میں کہا کہ بارش بند ہو گئی تو لوگوں نے اس پر آمین کہی۔ جب معاذ نماز سے فارغ ہوئے تو کہا میرے اس لفظ پر کہ " اے اللہ! بارش بند ہو گئی " تم نے آمین کیوں کہی۔ کیا تم سُنتے نہیں کہ میں کیا کہتا ہوں۔ پھر فرمایا آمین تو ایک دعائیہ کلمہ ہے۔ میرا یہ کلمہ کہ بارش بند ہو گئی یہ تو صرف خدا کے سامنے مصیبت کا اظہار ہے۔ کلمہ دُعائیہ کا محل تو اس کے بعد تھا مثلاً اظہارِ مصیبت کے بعد یہ کہا جاتا کہ یا اللہ! اس مصیبت کو دور کر۔ یہ کلمہ دُعائیہ ہے۔ تم اس پر آمین کہتے تم ویسے ہی

آمین کہہ دیتے ہو۔

اِس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مقتدی آمین کہیں۔ دوسری یہ کہ کلمہ دعائیہ پر آمین کہیں بے محل آمین نہ کہیں۔ جیسے کہ آج کل رواج ہے ویسے ہی بے سمجھے ہر کلمہ پر آمین کہے جاتے ہیں یہ خیال نہیں کرتے کہ امام کیا کہہ رہا ہے۔ اور اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضروری اور ہمیشہ کی دعا کا ترجمہ ضرور سیکھنا چاہیے تاکہ پتہ لگے کہ امام کیا کہہ رہا ہے۔

عوام اس معاملہ میں کوتاہی بہت کرتے ہیں بلکہ سرے سے ساری نماز ہی بے سمجھی میں پڑھتے ہیں کیونکہ ترجمہ نہ جاننے کی وجہ سے اُنہیں کچھ معلوم تو نہیں ہوتا کہ ہماری زبان سے کیا نکل رہا ہے۔

حدیث میں آیا ہے اللہ تعالےٰ غافل دل کی دُعا کو سنتا ہی نہیں (مشکوٰۃ کتاب الدعوات فصل ۲) تو بھلا ایسی بے سمجھی کی نماز خدا کے ہاں کیا قبول ہوگی۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ امام کے دُور ہونے کی وجہ سے مقتدی امام کی آواز نہ سنے یا سمجھ میں کچھ نہ آئے تو آمین کہنے کی بجائے اپنے طور پر دُعا مانگے۔

قال ابوداؤد سمعت احمد سئل عن القنوت فقال الذی یعجبنا یقنت الامام یؤمن من خلفہ قال وکنت اکون خلفہ فکنت فی القنوت فلا اسمع منہ شیئاً قلت لاحمد اذا لم اسمع قنوت الامام ادعوا قال نعم۔

یعنی امام ابوداؤد کہتے ہیں۔ امام احمد سے قنوت کی بابت سوال ہوا۔ فرمایا جو شے ہمیں پسند ہے وہ یہ ہے کہ امام قنوت پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں اور اُس کی آواز کے لئے کان لگاتا ہوں لیکن سنائی کچھ نہیں دیتا تو میں نے امام احمد سے کہا جب میں امام کی قنوت نہ سنوں تو اپنی دعا پڑھوں۔ فرمایا۔ ہاں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۳ جمادی الثانی ۱۳۸۲ھ ۹ نومبر ۱۹۶۲ء

تراویح اور تہجّد الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک؟ کیا آپ نے تراویح کے ساتھ تہجّد بھی پڑھی ہے؟

سوال: جن راتوں میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم رمضان شریف کا قیام کرنے کے لئے نہیں نکلے اور صحابہ کرام مسجد میں منتظر رہے۔ ان راتوں میں نماز تراویح آپ نے پڑھی تھی یا نہیں؟ اور لوگوں کو انتظار

کی تکلیف میں کیوں ڈالا ہے ویسے ہی مسئلہ کیوں نہ بتا دیا کیا تراویح اور تہجد دو نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کے دو نام ہیں۔

جواب :۔ تہجد اور تراویح ایک ہی ہے۔ مغایرت اسمی اس طرح کی ہے جیسے دریائے برہم پتر۔ سانپو۔ میگھنا یہ تینوں ایک دریا کے نام ہیں جو جھیل مانسرور کوہ ہمالیہ کی جانب شمال سے نکلتا ہے۔ اس طرح اٹک۔ سندھ وغیرہ۔ دریا ایک ہی ہے جس علاقہ سے گذرا۔ اُس کے نام سے موسوم ہوگیا۔ ٹھیک اسی طرح تراویح ہے۔ رمضان میں اسی تہجد کا نام تراویح رکھ دیا گیا۔ کیونکہ چار پڑھ کر ذرا ترویحہ کرتے ہیں یعنی ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر یہ نام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے زمانہ میں نہ تھا بلکہ اس کو اس وقت قیام رمضان کے نام سے موسوم کرتے تھے جو بالکل دریا کی مثال مذکورہ کے موافق ہے کہ جہاں سے گذرا وہاں کے نام سے موسوم ہوگیا۔

نماز وتر

رہے وتر تو وہ رات کی نمازوں کو طاق کرنے کے لئے ایک نماز ہے اگر اور نفل نہ ہوں تو الگ نماز ہے۔ اگر اور نفل ہوں تو یہ ان کی جزو بن جاتی ہے اس لئے جب وہ رات کی نماز سے مل جاتی ہے تو کبھی اس کے ساتھ شامل کر کے یُوں کہتے ہیں۔ گیارہ رکعت قیام رمضان یا گیارہ تراویح وغیرہ۔

تہجد کا اول رات پڑھنا بھی ثابت ہے۔ مشکوٰۃ عائشہؓ سے روایت ہے۔

كان النبیّ صلّى الله عليه وسلم يصلي فيما ان يفرغ من صلوٰة العشاء الى الفجر احدى عشرة ركعة الحديث (مشكوٰة باب صلوٰة الليل)

یعنی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء سے لے کر فجر تک گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ساری رات جاگتے۔ مگر یہ دوسری احادیث کے خلاف ہے کیونکہ آپؐ ساری رات نہیں جاگتے تھے۔ الا نادراً[1]۔

دُوسرا مطلب یہ کہ کبھی اوّل رات گیارہ رکعت پڑھتے کبھی اخیر رات۔ تیسرا مطلب یہ کہ کچھ دیر نماز پڑھتے

---

[1] جب تین روز تراویح باجماعت پڑھائی ہیں۔ ان سے آخری رات ساری رات جاگنا ثابت ہوتا ہے اس لئے الا نادراً کہا گیا ہے۔

پھر سو جاتے۔ ان دونوں مطلبوں کی صورت میں تہجد کا اول رات پڑھنا کچھ حصہ یا تمام ثابت ہو گیا بلکہ پہلے مطلب کی صورت میں بھی کچھ حصہ ثابت ہو گیا۔ بہرصورت تہجّد کو اخیر رات کے ساتھ خاص کرنا غلط ہے۔ ہاں اخیر رات افضل ہے۔ اس لئے آپ اکثر اخیر رات پڑھتے۔

مشکوٰۃ میں ایک اور حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ما کنا نشاء ان نری رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فی اللّیل مصلیا الا رایناہ ولا نشاء ان نراہ نائما الا رایناہ (حوالہ مذکور)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو رات کے کسی حصہ میں نماز پڑھتے دیکھنا چاہتے تو دیکھ لیتے۔ اس طرح کسی حصہ میں سوئے ہوئے دیکھنا چاہتے تو دیکھ لیتے۔

اِس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ تہجّد اخیر رات کے ساتھ خاص نہیں۔ نیز مشکوٰۃ باب الوتر میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔

ربما اوتر فی اول اللّیل و ربما اوتر فی آخرہ

یعنی بہت دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے وتر اول رات پڑھے ہیں اور بہت دفعہ اخیر رات۔

اِس سے مراد اگر پوری تہجّد وتر سمیت ہو تو پھر تہجّد کا اوّل رات ہونا واضح ہے اور اگر صرف وتر مراد ہوں تو وتروں کے بعد صرف دو رکعت بیٹھ کر آپ نے بعض اوقات پڑھی ہے ورنہ وتر آپ کی نماز کے اخیر ہوتے۔ اور آپ نے ارشاد بھی فرمایا اجعلوا اخر صلوتکم باللّیل وترا۔ یعنی رات کی اخیر نماز وتر کو کرو پس اس سے بھی تہجّد کی تخصیص اخیر رات کے ساتھ باطل ہوئی۔ خاص کر جب اس بات کو دیکھا جائے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تہجّد ضرور پڑھا کرتے تھے تو وتر تہجّد کی جز ہو گئے۔ چنانچہ اُوپر گزر چکا ہے۔ پس تہجّد کی تخصیص اخیر رات کے ساتھ نہ رہی۔

اب یہ سوال کہ جن راتوں میں صحابہ کرام مسجد میں انتظار کرتے رہے ان راتوں میں آپ نے نماز تراویح پڑھی یا نہیں پڑھی؟ یہ بے محل ہے کیونکہ جب نماز تراویح تہجد سے جدا نہ ہوئی اور تہجد آپ ضرور پڑھتے تھے تو وہی نماز تراویح ہو گئی۔ اور اگر بالفرض تہجّد نہ پڑھی ہو تو پھر نماز تراویح نہیں پڑھی۔ کیونکہ جب دونوں ایک ہیں تو ایک کا اثبات دوسری کا اثبات ہے۔ لہٰذا ایک کی نفی دوسری کی نفی ہے۔

اِس کے علاوہ تین راتیں جن میں آپؐ نے صحابہؓ کو نماز تراویح پڑھائی اُن سے اخیری رات میں ساری رات

صبح تک نماز پڑھائی ہے۔ اور مولوی عبدالحی صاحب لکھنویؒ عمدۃ الرعایہ میں لکھتے ہیں۔

واما العدد فروی ابن حبان وغیرہ انہ صلی بہم تلک اللیالی ثمان رکعات وثلث رکعات وتر۔

یعنی ابن حبان وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ان راتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو وتر سمیت گیارہ رکعت پڑھائی ہیں

جب صبح تک گیارہ رکعت پوری ہوئیں تو بتلائیے تہجد کس وقت پڑھی۔ پس تہجد اور تراویح کو دو کہنا ڈبل غلطی ہے اور تہجد کے لفظی معنی سونے کے بھی ہیں اور جاگنے کے بھی ہیں۔ اور بعض نے ترک نیند کے معنی بھی کئے ہیں۔ اور ترکِ نیند دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ وقت نیند کا ہو اور نہ سوئے (دوم) یہ کہ سویا ہوا ہو۔ اور وقت نیند کا باقی ہو مگر اس کو پورا نہ کرے۔ اور اب عرف شرع میں رات کی نیند کا نام ہوگیا ہے۔ خواہ اول رات ہو یا اخیر رات لیکن اخیر رات چونکہ افضل ہے اور اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اخیر رات پڑھتے اور تہجد گذار لوگ بھی رمضان کے سوا اکثر اخیر رات ہی پڑھتے ہیں۔ اس سے بعض کو دھوکا لگا ہے کہ تراویح تہجد نہیں ورنہ حقیقت ان کی ایک ہی ہے۔ صرف نام ہی کا فرق ہے۔ جیسے اوپر دریا کی مثال سے واضح کیا گیا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ، ۲۰ رجب ۱۳۵۷ھ، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء

بیس تراویح اور بدعت

سوال :۔ کیا حضرت عمرؓ نے بیس تراویح جاری کیں۔ اور کیا آپ بیس تراویح جاری کرنے کی وجہ سے معاذاللہ بدعتی ہیں۔

(کمال الدین ہیڈ ماسٹر)

جواب :۔ اعتصام بالسنۃ اور انتقاد الرجیح میں اس بات کا کہیں نام و نشان نہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس تراویح نکالی ہیں اس لئے بدعتی ہیں بلکہ حضرت عمرؓ کی اس قدر تعریف کی ہے جس سے زیادہ ان کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ انتقاد الرجیح میں لکھا ہے۔

وابوبکر افضل الناس بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم عمر

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ ہیں

یہی اعتصام بالسنۃ والے کا اعتقاد ہے۔ بھلا جو شخص حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کو سب لوگوں سے افضل کہے وہ ان کو معاذ اللہ بدعتی کہہ سکتا ہے۔ یہ محض افتراء ہے۔ پھر یہ بھی بناوٹ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیس تراویح نکالی ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ ایسی کوئی روایت نہیں آئی جس میں تصریح ہو کہ بیس تراویح حضرت عمرؓ نے جاری کی ہیں۔ اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ان کا ثبوت ہے۔ ہاں حضرت عمرؓ نے وترسمیت گیارہ تراویح کی جماعت قائم کی ہے۔ اور اس جماعت قائم کرنے کو بدعت حسنہ کہا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب قیام شہر رمضان میں ہے ——————————— رہی یہ بات کہ تراویح کی جماعت تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی ثابت ہے اور پھر حضرت عمرؓ نے اس کو بدعت کیوں کہا۔ تو اس کا جواب بھی مشکوٰۃ کے اسی باب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صرف تین دن جماعت کرائی ہے۔ پھر فرض ہونے کے خوف سے ترک کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی شروع خلافت میں اسی طرح بند رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے پھر نئے سرے سے جاری کر دی تو گویا بہ لغوی معنیٰ سے بدعت ہوئی۔ کیونکہ جو شرع میں بدعت ہو وہ مردود اور گمراہی ہے۔

مشکوٰۃ باب الاعتصام فصل اول میں ہے۔

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردّ

یعنی جو شخص دین میں نیا کام نکالے وہ مردود ہے۔

نیز خطبوں میں ہر وقت پڑھا جاتا ہے۔ کل بدعۃ ضلالۃ۔ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔

ہم نے اپنے رسالہ "ردّ بدعات" میں بتایا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی آٹھ تراویح ہیں باقی نفل یعنی سنّت صرف آٹھ ہیں۔ اس کے بعد نفل ہیں خواہ پڑھے یا نہ اگر پڑھے تو خواہ بیس پڑھے۔ یا کم و بیش اس کا کوئی حرج نہیں لیکن سنّت صرف آٹھ ہی ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ، جمادی الاول ۱۳۵۶ھ ۶ جولائی ۱۹۳۷ء

تراویح اُجرت پر پڑھانے کا مسئلہ

سوال :۔ کیا رمضان شریف میں تراویح میں قرآن مجید سنا کر اُجرت اور اُجرت مقرر کرنے پر قرآن شریف سنانا جائز ہے۔

عبدالرحیم خطیب فیروزوٹواں ڈاکخانہ خاص ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ اُجرت پر قرآن مجید تراویح میں سننا یا اُجرت پر قرآن مجید سنانا بالکل جائز نہیں بلکہ ایسے شخص کے پیچھے تراویح ہی نہیں ہوتیں۔ قیام اللیل میں اس مسئلہ کی تفصیل موجود ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۴ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ ۔ ۱۲ جون ۱۹۴۰ء

بیس تراویح پڑھنے والے امام کے پیچھے آٹھ تراویح

سوال:۔ ماہ رمضان شریف میں اہل احناف بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک آٹھ رکعت ہیں۔ اہل احناف تین رکعت وتر اوا کرتے ہیں۔ درمیان میں تشہد بیٹھتے ہیں۔ اہل حدیث یہ تشہد نہیں پڑھتے۔ کیا ہم بھی ان صورتوں میں ان کے ساتھ اقتدار کرتے رہیں کیونکہ اگر ان کے ساتھ تراویح نہ پڑھیں تو قرآن مجید سننے سے محروم رہتے ہیں۔

ملاں محمد ابراہیم سول ریسٹ ہاؤس کالکا ضلع انبالہ

جواب:۔ تراویح اصل میں آٹھ ہی ہیں۔ آپ آٹھ تراویح کی نیت سے پڑھ لیا کریں۔ اس کے بعد آپ کو اختیار ہے گھر میں جا کر وتر اوّل رات پڑھیں یا اخیر رات پڑھیں اگر چاہیں تو بیس رکعت پڑھنے میں کوئی حرج نہیں مگر آٹھ سے زائد محض نفلوں کی نیت کریں۔ اور وتر بدستور گھر میں پڑھیں۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء

پورا رمضان تراویح مسجد میں پڑھنے اور اس میں قرآن ختم کرنے کا ثبوت

سوال:۔ قیام رمضان یعنی نماز تراویح باجماعت سارا رمضان اوّل رات میں مسجد میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔؟

جواب:۔ سارا رمضان مسجد میں تراویح جائز ہے۔ کیونکہ بخاری، مسلم وغیرہ میں حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن باجماعت مسجد میں پڑھیں پھر فرض ہونے کے خوف سے ترک کر دیں۔ اور صحیح ابن حبان اور ابن خزیمہ میں ہے کہ ان راتوں میں آٹھ رکعتیں پڑھائیں۔ فرض ہونے کے خوف سے ترک کرنا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو سارا رمضان پڑھاتے اب چونکہ خوف نہیں اس لئے یہ سلسلہ اچھا ہے۔

بعض لوگ قرآن مجید کے ختم کے متعلق بھی سوال کرتے ہیں کہ رمضان میں ایک دفعہ ختم کرنا ضروری ہے اس کا کوئی ثبوت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ویسے تو انسان کو بارہ ماہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہر ماہ میں کم سے کم ایک دفعہ ختم کرے۔ کیونکہ عبداللہ بن عمرو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

صم کل شھر ثلاثة ایام واقرأ القرآن فی کل شھر (مشکوٰة باب صیام التطوع)

یعنی ہر ماہ میں تین روزے رکھا کر اور ہر ماہ میں قرآن ختم کیا کر۔

لیکن رمضان میں اس کا زیادہ اہتمام چاہیئے۔ کیونکہ مشکوٰة باب الاعتکاف میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں جبرئیل علیہ السلام سے قرآن شریف کا دور کرتے تھے اور جس سال آپ فوت ہوئے اس سال دو دفعہ دور کیا۔ اس کے علاوہ رمضان میں چونکہ قیام اللیل کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے اور اس کی ترغیب بھی زیادہ آئی ہے اور قیام قرآن مجید کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے رمضان میں زیادہ کوشش کرنی چاہیئے تاکہ کم سے کم ایکدفعہ قرآن مجید ختم ہو جائے۔ اگر خود نہ پڑھ سکے تو سن لے۔ کیونکہ کنز العمال جلد اول ص۱۲ بحوالہ مسند احمد ابوہریرہ رض کی حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من استمع الی اٰیة من کتاب اللہ کتبت لہ حسنة مضاعفة ومن تلا آیة من کتاب اللہ کانت لہ نورا یوم القیٰمة۔

یعنی جو شخص کتاب اللہ کی ایک آیت کی طرف کان لگائے اس کے لئے دوگنی نیکی لکھی جاتی ہے اور جو کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

یہ حدیث تفسیر امام سیوطیؒ درمنثور میں بھی زیر آیت کریمہ واذا قرئ القرآن الایة مذکور ہے اور امام سیوطیؒ نے اس کو حسن بھی کہا ہے۔ پس جو شخص پڑھ نہ سکے وہ پورا قرآن مجید سننے کی کوشش کرے۔

ترغیب ترہیب ص۱۱ منذری کتاب الصوم ص۱۱ میں ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الصیام والقرآن یشفعان للعبد یوم القیٰمة یقول الصیام ای رب منعته الطعام والشھوة فشفعنی فیه ویقول القرآن منعته النوم باللیل فشفعنی فیه فیشفعان رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر ورجاله محتج بھم فی الصحیح ورواہ ابن ابی الدنیا فی کتاب الجوع وغیرہ باسناد حسن والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں روزہ اور قرآن مجید قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے روزہ کہے گا یا اللہ! میں نے اس کو کھانے اور شہوت سے روکا اس کے حق میں میری سفارش قبول کر۔ اور قرآن مجید کہے گا میں نے رات میں نیند سے روکا اس کے حق میں میری سفارش قبول کر۔ پس سفارش قبول کی جائے گی۔

اس حدیث میں روزے کے مقابلہ میں رات کو قرآن مجید کا ذکر اسی قیام کی وجہ سے کیا ہے جس کا اہتمام رمضان میں زیادہ ہوتا ہے۔ پس قرآن مجید کا اہتمام بھی رمضان میں زیادہ ہونا چاہیئے۔

مشکوۃ باب قیام رمضان میں ہے کہ خیر قرون میں امام آٹھ رکعت میں سورہ بقرہ پڑھ جاتا تھا۔ اور اگر بارہ رکعت میں سورہ بقر پڑھتا تو لوگ اس کو بڑی تخفیف سمجھتے۔ اس حساب سے قریبًا دو دفعہ قریبًا قرآن مجید رمضان میں ختم ہوتا ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سورہ بقر اڑھائی پارہ سے قریبًا نصف ربع کم ہے۔ اب اگر ایک ختم نہ کیا جائے تو بتلایئے رمضان کی کیا قدر ہوئی۔

پس کم سے کم ایک ختم ضرور ہونا چاہیے خواہ پڑھ کر یا سُن کر تاکہ روزہ کے ساتھ قرآن مجید بھی سفارش کرے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۶ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ ۲۲ مارچ ۱۹۳۴ء

تراویح میں سامع کا ثبوت

سوال:۔ ایام رمضان میں بوقت سماع قرآن کریم تراویح میں سامع کے ثبوت کی ضرورت ہے بیان فرمائیں

جواب:۔ تراویح میں سامع کے متعلق آپ کو لکھا تھا کہ حضرت عمر رضؓ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضؓ دونوں کو اس لئے مقرر کیا تھا کہ ایک قاری اور ایک سامع رہے اور فصل رابع مشکوۃ باب ما علی الماموم میں حدیث ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہری نماز میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ ایک شخص کو کہا مجھ سے اس سورۃ میں رہ گیا ہے۔؟ کہا ایک آیت رہ گئی ہے فرمایا تو نے بتلائی کیوں نہ؟ کہا میں نے خیال کیا کہ منسوخ ہوگئی ہے۔ فرمایا ان قوموں کا کیا حال ہے جن کو پڑھے گئے اور چھوڑے گئے کی خبر نہیں۔ بنی اسرائیل کے دلوں سے اس طرح عظمت الٰہی نکل گئی ان کے بدن حاضر ہوتے دل غائب رہتے اور خدا عمل قبول نہیں کرتا جب تک بدن کے ساتھ دل حاضر ہو۔ اس قسم کی بعض روایتیں اور بھی آئی جو سامع کی ضرورت پر دلالت کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو ابوداؤد مع عون المعبود باب الفتح علی الامام فی الصلوٰۃ۔ عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۶ جنوری ۱۹۳۹ء

مسافر کے لئے نماز تراویح

سوال :۔ مسافر کو نماز تراویح معاف ہے یا نہیں سفر ایسا ہے جس میں وہ روزہ رکھ سکتا ہے۔

جواب :۔ نماز تراویح نفل ہے جب مسافر کو دو فرض معاف ہیں تو نفل معاف کیوں نہیں ہوں گے ہاں پڑھ لے تو بہتر ہے۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۱۵ رجب ۱۳۵۳ھ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۴ء

دُعائے قنوت کا وتر میں ہمیشہ پڑھنا

سوال :۔ دُعائے قنوت کا وتروں میں بوقت تہجد ہمیشہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ ایک مولوی صاحب ناجائز کا فتویٰ دیتے ہیں۔؟

محمد یعقوب سپوی خطیب جامعہ اہلحدیث بنوالہ ڈاکخانہ لمبی ضلع فیروزپور

جواب :۔ دُعاء قنوت میں مداومت جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت حسن رضؓ کو سکھائی تاکہ وہ وتروں میں پڑھیں۔ اور ظاہر ہے کہ وتر ہمیشہ پڑھے جاتے ہیں تو یہ دعاء قنوت بھی ہمیشہ ہوگی۔ بلکہ سنن کبرٰے بیہقی میں یہ الفاظ ہیں۔

کان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقنت فی صلوٰۃ الصبح و فی وتر اللیل بھولاء الکلمٰت اللھمّ اھدنی۔ الحدیث (سنن کبری بیہقی جلد ۲)

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں اور وتر میں دُعاء قنوت پڑھا کرتے تھے۔ یہ الفاظ استمرار اور ہمیشگی کے لئے آتے ہیں۔ پس ہمیشگی ثابت ہوگئی۔ ہاں اس سے صبح کی نماز میں بھی ہمیشگی ثابت ہوتی ہے مگر صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ترک بھی ثابت ہے اس لئے نماز فجر میں ہمیشگی سے مراد کثرت ہوگی اور وتر میں چونکہ آپؐ سے ترک ثابت نہیں اس لئے وہاں ہمیشگی اپنے معنیٰ پر رہے گی۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ ۲۶ جولائی ۱۹۴۰ء

تراویح اور تہجّد ایک ہی نماز ہے۔ نماز وتر آخر رات پڑھنا بہتر ہے

سوال:۔ ایک شخص ماہ رمضان المبارک میں نماز تراویح آٹھ رکعت باجماعت پڑھ کر وتر اس نیت سے چھوڑ دیتا ہے کہ آخر رات میں تہجد کے نوافل پڑھ کر بعد میں وتر پڑھوں گا کیا یہ طریقہ مطابق سنت ہے؟ اور ماہ رمضان میں نماز تراویح کے بعد عموماً نماز وتر جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ کیا وتر اس جماعت کے ساتھ پڑھنے بہتر ہیں یا آخر رات میں اکیلے پڑھنا زیادہ ثواب ہے۔

عبدالغفور بن اسماعیل گوجرانوالہ

جواب:۔ تراویح اور تہجد ایک ہی نماز کے دو نام ہیں۔ اول رات میں پڑھیں تو تراویح نام ہوگا آخر رات پڑھیں تو اس کو تہجد کہا جاتا ہے۔

سُنن ابن ماجہ میں باب ماجاء فی قیام شہر رمضان کے تحت ایک طویل روایت ہے۔ اس کا مختصر یہ ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہم (صحابہ) نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے۔ آپ نے آخری (ماہ) کی تین طاق راتوں میں ہمیں قیام اللیل نماز تراویح پڑھائی۔ پہلی رات اول حصہ میں پڑھائی۔ یہاں تک کہ تہائی رات گذر گئی۔ دوسری رات نصف شب تک پڑھائی۔ ہم نے بقیہ آدھی رات بھی تراویح پڑھانے کے لئے عرض کیا تو نبی علیہ السلام نے فرمایا جس نے امام کے ساتھ قیام کیا اُس کو پوری رات کے قیام کا ثواب ملے گا۔

تیسری رات حضورؐ نے اپنے گھر والوں کو جمع کیا۔ دوسرے لوگ بھی حاضر ہوگئے۔ سب کے ساتھ نمازِ تراویح پڑھی۔ یہاں تک کہ ہمیں سحری کا وقت گذر جانے کا اندیشہ ہوا۔

اِس حدیث سے ثابت ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح کو رات کے تینوں حصوں میں پڑھا ہے۔ اور اس کا وقت عشاء کے بعد سے آخر رات تک ہے۔

جب نماز تراویح اخیر رات تک پڑھائی تو پھر بتایئے باقی کونسا وقت رہا جس میں تراویح کے بعد فجر سے پہلے کوئی اور نماز پڑھی ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہی رات میں تراویح اور تہجد الگ الگ پڑھنا کسی روایت سے ثابت نہیں۔ پس تراویح اور تہجد ایک ہی نماز ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص آٹھ رکعت تراویح کے علاوہ رات کے کسی حصہ میں مزید نفل پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے لیکن رات کے اوّل حصہ میں پڑھی ہوئی اور آخری حصہ میں پڑھی ہوئی ساری نمازوں کو قیام اللیل ہی کہا جائے گا

بلکہ بعض نے سنیتالیس نفل تک پڑھتے ہیں اور اہلِ مدینہ چھتیس تک پڑھتے رہے ہیں۔
پہلی رات اور پچھلی رات کی نماز کو الگ الگ شمار کرنا کسی روایت سے ثابت نہیں۔ اور روز پچھلی رات میں پڑھنا بہتر ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

مسئلہ قضاء وتر کی تحقیق

سوال:۔ کسی نے سوال کیا تھا کہ تہجد رہ جائے تو وتر کی قضا ہے یا نہیں۔
ہم نے اس کا یہ جواب دیا کہ مشکوٰۃ باب الوتر ص۱۱۱ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نیند یا بیماری غالب آجاتی اور قیام اللیل رہ جاتا تو دن کو بارہ رکعت پڑھ لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر سمیت اکثر گیارہ رکعت پڑھتے۔ اس لئے دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لیتے۔
اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی ویسے قضا نہیں بلکہ دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لینی چاہیئے۔ اگر ایک وتر پڑھنا ہو تو دن میں اس کی بجائے دو پڑھے اگر تین ہو تو چار پڑھے۔ اگر نو ہوں تو دس پڑھے بس یہی اس کی قضا ہے۔

تعاقب

اس پر مولانا عبدالقادر صاحب حصاری نے تعاقب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔
ایک شق تیرہ رکعت کی آپ نے چھوڑ دی کیونکہ تیرہ رکعت وتر کا بھی ثبوت ہے۔
ابوداؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رض کا بیان ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اب آپ کے حساب سے دن کو قضا کے طور پر چودہ رکعت پڑھنی چاہیئے۔

جواب تعاقب

مولوی عبدالقادر نے اس تعاقب میں ڈبل غلطی کی ہے وتر کی حد نو تک ہے۔ اس لئے ہم نے نو تک لکھا ہے تیرہ رکعت وتر نہیں بلکہ تہجد سمیت تیرہ ہیں۔ ہمارا فتوےٰ دو حدیثوں پر مبنی ہے۔ پہلی حدیث جو ہم نے مشکوٰۃ کے حوالہ سے لکھی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

وَكَانَ إِذَا غَلَبَهُ نَوْمٌ أَوْ وَجَعٌ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ صَلَّى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً

یعنی جب کبھی آپ کو کوئی بیماری یا نیند غالب ہو جاتی تو آپ دن کو بارہ رکعت پڑھ لیا کرتے۔
دوسری حدیث یہ ہے۔ امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے باب قیام النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم باللیل

فی رمضان وغیرہ۔ اس کے تحت جو حدیث بیان کی ہے وہ یہ ہے۔

عن ابی سلمۃ بن عبد الرحمن انہ اخبرہ انہ سال عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیف کانت صلوٰۃ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فی رمضان فقالت ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعۃ الحدیث۔

یعنی ابی سلمہ بن عبد الرحمٰن نے حضرت عائشہ رضؓ سے پُوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز رمضان میں کس طرح ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔

مشکوٰۃ والی حدیث میں دو عذروں کا ذکر ہے۔ ایک غلبہ نیند کا۔ دُوسرا بیماری کا۔ لیکن مقصد اس سے مجبُوری ہے جس صورتیں اور بھی ہیں۔ جیسے بھُول کر رہ جائے یا امام نہ ہو مقتدی ہو۔ اور اقامت ہوگئی۔ مقتدی کو حکم ہے کہ نماز کے ساتھ ل ہو جائے وہ وتر نہیں پڑھ سکتا۔ ہاں اگر امام ہو تو وہ پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز کھڑی نہیں ہوتی۔

دوسری حدیث اکثریت پر محمول ہے کیونکہ شاذ و نادر رات کی نماز کم وبیش بھی ہوتی تھی لیکن حضرت عائشہ رضؓ نے کو اس طرح حصر کے ساتھ بیان کیا جس سے زیادہ کی نفی ہوگئی۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ گیارہ رکعت کے مقابلہ میں دوسری یں کالعدم اور شاذ ہیں۔ اس وجہ سے اہل حدیث نے تراویح کی بنا اس حدیث پر رکھی ہے اور وہ گیارہ رکعت یح پڑھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے ابی بن کعبؓ اور تمیم داری کو گیارہ رکعت کا حکم دیا۔

اعتراض

مولوی عبد القادر نے پہلا اعتراض یہ کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر رسیدہ ہوگئے تو نو رکعت قیام تے اس صورت میں ایک رکعت نہ پڑھی بلکہ تین پڑھیں۔ تب بارہ بنتی ہیں۔ اور جب تیرہ پڑھتے تو ایک رکعت ھنے سے چودہ ہوگئیں۔ اور چودہ کا ثبوت بھی کوئی نہیں۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے فتویٰ میں ایک رکعت کا ذکر حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث کی بنا پر کیا ہے۔ اور حصر کے ساتھ لکھا ہے بس یہی قضا ہے۔ جیسے حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث میں حصر ہے۔ باقی نو اور تیرہ اس پر محمول ہیں کیونکہ جب گیارہ کا حکم معلوم ہوگیا کہ وہاں ایک رکعت کی زیادتی ہے تو شاذ صورتوں کو بھی اس طرح سمجھ لینا

چاہیئے یعنی ان میں بھی ایک رکعت کی زیادتی ہوگئی۔

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی قضا صبح کی نماز سے پہلے دے لیتے ہوں اور یہ بارہ رکعت تہجد کی قضا ہو کہ قیام اللیل بارہ رکعت بغیر وتر کے ثابت ہے جو وتر ایک ملانے سے تیرہ بن جاتی ہیں۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام اللیل رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعت ہوتا تھا۔ اس کو چھوڑ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشکوٰۃ والی حدیث شاذ صورت تیرہ مراد لینا جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کالعدم قرار دے کر فرمایا ہے کہ گیارہ سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے یہ کس قدر کمزوری ہے اس لئے ہم نے اپنے فتوی کی بنا گیارہ پر ہی رکھی ہے۔

علاوہ ازیں مولوی عبدالقادر نے سائل کے سوال اور ہمارے فتوی پر غور نہیں کیا۔

سائل کا سوال یہ ہے۔

جب وتر رہ جائیں تو اس وقت وتروں کا کیا حکم ہے

مشکوٰۃ کی جو حدیث ہم نے پیش کی ہے وہ نیند اور بیماری پر بند نہیں بلکہ مقصد اس کا مجبوری کی حالت بیان کرنا ہے جیسے ابھی بیان ہوا ہے۔ امام تو جماعت سے پہلے پڑھ سکتا ہے لیکن مقتدی کیا کرے؟ وہ تو اقامت نماز کے بعد مجبور ہے۔ پس آپ کا یہ کہنا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پڑھ لیتے ہوں یہ مشکوٰۃ کی حدیث کے مقصد کے خلاف ہے۔

تیسرا اعتراض

تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ:۔

ہوسکتا ہے کہ بارہ رکعت جو دن کو پڑھی گئی ہیں۔ ان میں سے آٹھ رکعت تہجد کی ہوں اور چار رکعت صلوٰۃ الضحٰی ہو۔

جواب

یہ اعتراض جواب کا محتاج نہیں۔ مشکوٰۃ کی حدیث کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اس میں بارہ رکعت کو قیام اللیل کے قائم مقام بنایا ہے جس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ گیارہ رکعت سے زیادہ قیام نہیں

ہوتا تھا۔ اب یہ تقسیم تہجد اور صلوۃ الضحیٰ کی محض فرض ہے۔

چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ

شاید یہ بارہ رکعت نماز ضحیٰ کی ہوں اور اس کو قائم مقام قیام اللیل کر دیا ہو۔

جواب

یہ اعتراض بھی تیسرے اعتراض کی قسم ہے جو محض فرضی ہے۔ ایک نماز کو دوسری نماز کے قائمقام بغیر دلیل کے نہیں کیا جاتا۔ قرآن وحدیث میں کہیں یہ ذکر نہیں۔ اور نہ یہ کسی کا مذہب ہے کہ صلوۃ الضحیٰ قیام اللیل کے قائم مقام ہے۔

مولوی عبدالقادر نے اس مقام پر ایک حدیث نقل کی ہے اس کا حال بھی سن لیجئے الفاظ یہ ہیں۔

اربع رکعات قبل الظہر بعد الزوال تحسبن بمثلهن من السحر۔

یعنی زوال کے بعد نماز ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھنا سحری کی نماز کے برابر درجہ رکھتی ہیں۔

اس حدیث سے مراد ثواب ہے جیسے حدیث میں ہے کہ رمضان میں عمرہ حج کا درجہ رکھتا ہے یا مسجد قبا میں نماز پڑھنا عمرہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ حج عمرہ ادا ہو جاتا ہے۔ بلکہ نفس ثواب مطلب ہے پھر اس حدیث میں چار رکعت ظہر سے پہلے کا ذکر ہے کہ وہ سحری کی نماز کا درجہ رکھتی ہیں۔ نماز ضحیٰ کے متعلق تو کوئی حدیث نہیں آئی کہ وہ قیام اللیل کے قائم مقام ہے یہ محض آپ کا مفروضہ ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے حدیث کا مطلب غلط بیان کیا ہے۔ آپ نے مطلق کہا ہے کہ سحری کی نماز کا درجہ رکھتی ہیں جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ساری کی ساری نماز ان چار رکعت سے الگ ہے۔ اور وہ وہی قیام اللیل ہے جو کم سے کم سات رکعت ہوتی ہیں۔

حالانکہ یہ مطلب صحیح نہیں بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ نماز ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھنا ایسا ہے جیسے یہ چار رکعت سحری کے وقت پڑھی جائیں۔

گویا قیام اللیل سے یہاں کچھ مطلب ہی نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصد ہے کہ زوال کے بعد کا وقت چار رکعت کے حق میں ایسا ہی فضیلت والا ہے جیسا سحری کا وقت۔

اس کے علاوہ بخاری باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی صلوۃ اللیل والنوافل من غیر ایجاب میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ضحیٰ بعض دفعہ

نہیں پڑھی۔ پس مولوی عبدالقادر صاحب کے تیسرے چوتھے اعتراض کی جڑ ہی کٹ گئی۔

باقی جس کسی حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ضحیٰ کا ذکر آیا ہے تو وہ سببی ہے جیسے فتح مکہ میں پڑھی اس کا سبب ادائیگی شکر تھا اور سفر سے عموماً مدینہ منورہ میں ضحیٰ کے وقت واپس تشریف لاتے اور پہلے مسجد میں داخل ہوتے تو وہ نماز تحیۃ المسجد ہوتی۔

پانچواں اعتراض

یہ کیا ہے کہ ایک رکعت بڑھا کر پڑھنا یہ بیاج ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ بیاج نہیں لیتا کہ اس نے اس کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔

جواب

بیاج میں دستور ہے کہ وہ ضرور لیا جاتا ہے۔ سود اور بیاج قرضوں میں ہو سکتا ہے۔ نفل میں بیاج نہیں کیونکہ حدیث میں ہے اَلْمُتَطَوِّعُ اَمِیْرُ نَفْسِہٖ۔ یعنی نفل والا اپنے نفس کا امیر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے اونٹ خریدا تو اس کی قیمت سے زیادہ دے دیا (بخاری)

مولوی عبدالقادر صاحب نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے پو پھٹنے کے بعد وتر کی قضا ثابت ہے۔ باقی قسطوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے مگر تیسری قسط میں اس پر خصوصیت سے زیادہ زور دیا ہے گیارہ دلائل بالتفصیل ذکر کئے ہیں۔

لیکن اس بات پر زور دینا فضول ہے ہم پہلے ہی سے اس کے قائل ہیں۔

یہاں جس چیز کی بحث ہے وہ قضاء وتر بعد نماز فجر ہے یعنی نماز فجر سے پہلے وتروں کی قضائی کا کوئی جھگڑا نہیں جو کچھ جھگڑا ہے وہ نماز فجر کے بعد ہے۔

تعارضات

پہلی قسط میں مولوی عبدالقادر صاحب نے قضاء وتر پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

من نام عن صلوٰۃ او نسیہا فلیصل اذا ذکرہا۔

یعنی جو شخص اپنی نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو پڑھے جب کو یاد آئے۔

دوسری قسط میں قضاء وتر کے ثبوت کے لئے بلوغ المرام سے ابو سعید خدری رضؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من نام عن الوتر او نسیه فلیصل اذا اصبح او ذکر
یعنی جو شخص سوگیا یا بھول گیا اور اُس کے وتر رہ گئے تو وہ صبح کرے یا جب یاد کرے پڑھ لے۔
ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نماز فجر کے بعد بھی قضاء وتر ہے۔
تیسری قسط میں لکھا ہے۔
جس شخص کا قیام اللیل رہ جائے وہ دن میں بارہ نفل پڑھے یہ قضا نہیں ہے بلکہ دن کی عبادت ہے جو رات کو نہ کر سکا تو دن کو کرلی اس کو وتر کی قضا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قضا صبح کی نماز تک ہے۔
اس قسط کے آخر میں لکھا ہے۔
خلاصہ کلام یہ ہے کہ وتر کی قضا تو صبح تک ہے لیکن تاہم رات کی عبادت کا تدارک کرنا چاہیئے تو دن کو بارہ نفل پڑھ لے مگر اس کو وتر کی قضا نہ سمجھے۔
مولوی عبدالقادر کی پہلی اور دوسری قسط کی عبارتوں سے تو ثابت ہوتا ہے کہ وتر کی قضا صبح کی نماز کے بعد بھی ہے۔ اور تیسری قسط کی دونوں عبارتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد وتر کی قضا نہیں۔
اگر مولوی عبدالقادر کہیں کہ میری مراد یہ ہے کہ جو دیدہ دانستہ صبح سے پہلے وتر نہ پڑھے اس کے لئے بعد از نماز صبح قضا نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیدہ دانستہ چھوڑنے والے پر تو نماز صبح سے پہلے بھی قضاء نہیں چنانچہ قسط ۲ صد ۵ کالم ۳ میں بلوغ المرام کی حدیث لکھی ہے۔
من ادرک الصبح ولم یوتر فلا وتر له
یعنی جس نے دیدہ دانستہ وتر نہیں پڑھے اور صبح ہوگئی اس کے لئے کوئی وتر نہیں
پھر آپ کا اس بات پر زور دینا کہ دیدہ دانستہ وتر چھوڑنے والے پر صبح کی نماز کے بعد قضاء نہیں۔ یہ سب بحث فضول ہوگئی۔
نوٹ۔ ابن تیمیہؒ نے منتقی مع نیل الاوطار جلد ثالث میں باب باندھا ہے باب قضاء ما یفوت من الوتر والسنن والراتبۃ والاوراد۔ یعنی باب ہے وتر اور سنّتوں اور وظائف کی قضاء کا اس میں یہ حدیث لائے ہیں جو ہم نے اپنے فتویٰ میں نقل کی ہے۔
کان اذا منعه من قیام اللیل نوم او وجع صلی من النهار ثنتی عشرة رکعة
یعنی حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام اللیل سے نیند یا بیماری روکتی

تو دن میں بارہ رکعت پڑھ لیتے۔

اس باب میں اس حدیث کالانا دلیل ہے کہ یہ بارہ رکعت قیام اللیل کی قضا ہے اور قیام اللیل میں وتر بھی داخل ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ رضہ کی گیارہ رکعت والی حدیث پر باب باندھا ہے۔

باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللّیل فی رمضان وغیرہ

اس باب سے ثابت ہوا کہ گیارہ رکعت قیام اللیل ہے۔ پس ہم پر یہ اعتراض نہ رہا کہ بارہ رکعت کی قضا کہنا کسی کا مذہب نہیں۔ محدّثین کی عبارتوں سے اس کو قضاء کہنا ثابت ہو گیا۔ جس کی صورت یہی ہے کہ ایک رکعت بڑھا کر پڑھی جائے۔

تعارض دوم

ہم نے جو اپنے فتوے میں لکھا ہے کہ وتر کی ویسے قضا نہیں بلکہ دن میں ایک رکعت بڑھا کر پڑھ لینی چاہیئے اس پر مولوی عبدالقادر صاحب دوسری قسط کالم ۲ میں لکھتے ہیں کہ " یہ بعید ہے کیونکہ دیگر حدیث میں ذکر ہے کہ اللہ تعالےٰ بیاج نہیں لیتا کہ اس نے اس کو اپنے بندوں پر حرام کر دیا ہے۔ قضا و ہمیشہ بمثل ادا ہوتی ہے زائد کا دستور نہیں " اور پہلی قسط کالم دوم میں آپ لکھتے ہیں " وتر کی قضاء آپ صبح کی نماز سے پہلے دے لیتے ہوں۔ اور یہ بارہ رکعت تہجد کی قضاء ہو کہ قیام اللیل بارہ رکعت بغیر وتر کے ثابت ہے کہ وتر ایک رکعت ملانے سے تیرہ رکعت بن جاتی ہیں جن کا ثبوت موجود ہے۔ اس عبارت میں زائد رکعت کو بیاج قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ قضاء بمثل ہوتی ہے اور دوسری عبارت میں مشکوٰۃ والی حدیث کو تیرہ رکعت پر حمل کیا ہے۔

اب ایک اور حدیث سنیئے۔

عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی من اللیل ثلث عشرۃ رکعۃ یوتر من ذالک بخمس ولا یجلس فی شئی الا فی اٰخرھا متفق علیہ

حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ تیرہ رکعت پڑھتے ان سے پانچ وتر پڑھتے۔ ان میں کسی جگہ نہ بیٹھتے مگر آخر میں اس بنا پر بیاج ہو گیا کیونکہ وتر پانچ ہو گئے اور آٹھ رکعت کی قضاء بارہ ہوئی اور اگر وتر بھی بیچ میں قضاء مان لیں، ایک تو قضاء بمثل نہ ہوئی بلکہ شفع ہوئی، دوم دن میں وتر کی قضاء ثابت ہو گی حالانکہ آپ انکار کرتے ہیں۔

تعارض سوم:۔ فتوے میں جو مشکوٰۃ کے حوالہ سے حدیث ذکر ہوئی ہے اس پر مولوی عبدالقادر صاحب

قسط اول کالم دوم میں لکھتے ہیں۔ یہ مبہم ہے جس میں کئی احتمال ہیں۔ اور قسط دوم کالم دوم اور تین میں لکھتے ہیں کہ یہ مطلق ہے جس میں کئی احتمال ہیں۔

مبہم وہ ہوتا ہے جس کی مراد کا پتہ نہ لگے۔ اور وہ تفسیر کا محتاج ہوتا ہے جیسے جاء نی رجل ای زید (یعنی ایک شخص آیا ہے) اس سے پتہ نہیں چلا کہ وہ کون ہے زید ہے یا عمرو یا بکر ای زید (یعنی زید) اس کی تفسیر ہو گی اور معین ہو گیا۔ مطلق وہ ہوتا ہے جس کا معنی واضح ہو۔ اور اس کے متعلق اصول یہ ہے "المطلق یجری علی اطلاقہ" یعنی مطلق اپنے اطلاق پر جاری رہتا ہے جیسے آپ نے مشکوٰۃ کے حوالہ سے قسط دوم کالم تین میں یہ حدیث ذکر کی ہے من نام عن الوتر فلیصل اذا اصبح۔ یعنی جو سو گیا اور وتر نہ پڑھ سکا تو اس کو چاہیے کہ صبح کو وتر پڑھے۔ اس حدیث میں وتر مطلق ہے خواہ ایک ہو یا تین یا پانچ یا سات یا نو۔ کوئی معین نہیں جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک جب قیام اللیل مطلق ہے تو اس کو اپنے اطلاق پر رکھنا چاہیئے۔ اس کے لئے صورتیں پیدا کرنا اطلاق کے خلاف ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ؐ کا قیام خواہ نو رکعت ہو یا گیارہ رکعت یا تیرہ رکعت ہو۔ جب رہ جاتا تو اس کا تدارک یوں کرتے کہ دن میں بارہ رکعت پڑھ لیتے۔ رہا یہ کہ اس کا نام کیا رکھیں قضاء یا کچھ اور تو یہ لفظی بحث ہے جو اہل علم کی شان نہیں۔ مقصد عمل ہے اور ہم نے تو ابن تیمیہؒ (صاحب منتقیٰ) کے باب باندھنے سے اس کا قضاء ہونا بھی ثابت کر دیا ہے۔ پس لفظی بحث بھی نہ رہی۔ والحمد للہ علی ذالک

اصل بات یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر نے غور اور تدبر سے کام نہیں لیا اور قلم برداشتہ لکھتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام میں تعارضات پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ کئی جگہ معنی اور مطلب بھی صحیح بیان نہ کر سکے دیکھئے چار رکعت زوال کے بعد کی حدیث کا مطلب غلط بیان کیا۔ چنانچہ اُوپر ذکر ہو چکا ہے اور قسط ۳ صـ۹ کالم ۲ میں دارقطنی کے حوالہ سے عبداللہ بن عمرؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فاتہ الوتر من اللیل فلیقضہ من الغد۔

اس حدیث میں دو راوی ضعیف ہیں۔ ایک ابو عاصم ردّاد او دوسرا اُس کا استاد ناشل بن سعید بصری۔ پہلے کے متعلق مغنی حاشیہ دارقطنی میں ہے کہ اس میں ضعف ہے اور دوسرے کے متعلق مغنی میں ہے کہ اسحاق بن راہویہ اس کو کذاب کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ اور نسائی کہتے ہیں۔ متروک ہے یحییٰ اور دارقطنی نے اس کو ضعیف کیا ہے (دارقطنی مع مغنی صـ۱۷۱) اس کا ترجمہ یوں کیا ہے وہ جس کا وتر فوت ہو جائے وہ

صبح اس کی قضاء دے حالانکہ غد کے معنی کل (آئندہ) کے ہیں نہ کہ صبح کے۔ اور عبداللہ بن عمرؓ کا بھی یہی مذہب ہے۔ نیز اہل تک وتر کی قضاء کے قائل ہیں۔ اور کئی بڑے بڑے تابعین کا بھی یہی مذہب ہے۔ جیسے شعبیؒ عطاءؒ حسن بصریؒ طاؤسؒ مجاہدؒ اور حماد بن ابی سلیمانؒ ملاحظہ ہو۔ نیل الاوطار ۲ باب قضاء ما یفوت من الوتر ص۲۹۔ خیال فرمائیے۔ ایک طرف تو مولوی عبدالقادر صاحب دن میں وتر کی قضاء سے انکار کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ حدیث نقل کر رہے ہیں۔ جس سے دن میں وتر کی قضاء ثابت ہوتی ہے۔ لیکن سمجھتے نہیں۔ اسی طرح قسط ۳ صلا کالم ۲ میں مؤطا امام مالکؒ باب الوتر بعد طلوع الصبح کے حوالہ سے مولوی عبدالقادر صاحب کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ سو گئے۔ جب نیند سے بیدار ہوئے تو پوچھا کہ لوگ کیا کر رہے ہیں (خود وہ نابینا تھا) خادم نے کہا لوگ نماز سے فارغ ہو چکے ہیں۔ پس ابن عباس نے پہلے وتر پڑھے۔ پھر نماز پڑھی اور عبادہ بن صامت قوم کے امام تھے۔ ایک دن صبح کے بعد گھر سے نکلے۔ مؤذن اقامت کہنے لگا۔ اُس کو خاموش کر دیا۔ اور خود وتر پڑھنے لگے۔ اس کے بعد لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ ان کے علاوہ قاسم بن محمد اور عبداللہ بن عامر سے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے بعد فجر وتر پڑھے۔ ان افعال سلف کے بعد امام مالکؒ فیصلہ فرماتے ہیں کہ:۔

انما یوتر بعد الفجر من نام عن الوتر ولا ینبغی لاحد ان یتعمد ذالک حتی یضع وترہ بعد الفجر۔

اس عبارت کا معنی مولوی عبدالقادر صاحب یوں کرتے ہیں۔

فجر کے بعد وتر اُس شخص کے لئے جائز ہے جو سو گیا ہو۔ پھر بیدار ہوا۔ جو اختیاری طور پر عمداً ایسا کرے اُس کے لئے جائز نہیں۔

لیکن یہ معنی صحیح نہیں صحیح یوں ہے۔

کہ فجر (پوہ پھٹنے) کے بعد صرف وہ شخص وتر پڑھے جس کا وتر سونے کی وجہ سے رہ گیا ہو۔ اور کسی شخص کو یہ لائق نہیں کہ وہ فجر کے بعد وتر پڑھنے کا قصد کرے۔ یہاں تک کہ وہ وتر کو (رات سے ہٹا کر) فجر کے بعد رکھ دے۔

ابن عباسؓ اور عبادہ بن صامتؓ وغیرہ کے عمل سے چونکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بعد صبح وتر کا وقت ہے۔ اس غلطی میں مبتلا ہو کر ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص رات کو وتر چھوڑ کر اس وقت پڑھنے کا قصد رکھے۔ امام مالکؒ اس عبارت سے اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا قصد نہ کرے کیونکہ وتر کی ادائیگی کا وقت نہیں رہا یہ کہ مسئلہ کی ناواقفی

سے کسی نے رات کو وتر نہیں پڑھا یا مسئلہ سے واقف تھا کہ یہ وتر کا وقت نہیں ہے مگر سُستی سے رات کو اس سے وتر رہ گیا تو کیا اُس وقت قضاء کر سکتا ہے یا نہیں یہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس عبارت سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی سُستی سے فرض نماز نہ پڑھے تو کیا وہ اُس کی قضا دے یا صرف توبہ ہی کافی ہے۔ منتقیٰ میں اس پر باب باندھا ہے۔ اسی طرح روزہ وغیرہ کا حکم ہے۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک دفعہ کسی قوم کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد سنّتیں رہ گئیں پھر عصر کے بعد ان کی قضا دی۔ جیسے یہ سب مسائل اپنی اپنی جگہ علیحدہ ہیں اسی طرح وتر کا یہ مسئلہ علیحدہ ہے۔

امام مالکؒ اس عبارت میں اس کا بیان نہیں کر رہے بلکہ وتر کا اصل وقت بتا رہے ہیں۔ مولوی عبدالقادر صاحب نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اس مسئلہ کا بیان ہو رہا ہے۔ پھر امام مالکؒ کا یہ مذہب بھی نہیں کہ ایسا قصد کرنے والا شخص فجر کے بعد وتر نہ پڑھے۔ بلکہ پڑھے مگر کامل نہیں ہوگا ناقص ہوگا۔ کیونکہ ایسے شخص کے لئے یہ وقت مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہو زرقانی ج ا ص۲

اللہ تعالےٰ غور و تدبر کی توفیق بخشے اور خامیاں دُور کرے۔ اِس قسم کی بعض خامیاں اس مضمون میں اور بھی ہیں مگر ہمارا مقصد تنبیہ ہے۔ استقصاء نہیں۔ اس لئے اس پر اکتفا کی جاتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

" عبداللہ امرتسری روپڑی

تراویح اصل آٹھ ہیں، بیس نہیں ۔ اور حنفیہ کے اٹھارہ دلائل کا جواب

سوال :۔ مہربانی اور شفقت فرما کر مندرجہ حدیثوں کا جواب دیں۔ کیا واقعی ان حدیثوں سے بیس رکعت تراویح ثابت ہوتی ہیں۔

دلائل

۱۔ کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعۃ (موطا امام مالک)

" لوگ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ۲۳ رکعتیں تراویح پڑھتے تھے" بیس تراویح اور تین وتر

۲۔ سائب بن یزید سے روایت ہے۔

كنا نقوم فی عهد عمر بعشرین رکعة (بیہقی فی کتاب المعرفة باسناد صحیح)

ہم حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے۔

۳۔ ابن ابی شیبہ وکیع سے اور وہ مالک بن انسؓ سے وہ یحییٰ بن سعید سے اور وہ عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے امر رجلا یصلی بھم عشرین رکعة۔ ایک آدمی کو بیس تراویح پڑھانے کا حکم دیا (ابن ابی شیبہ)

۴۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

ان النبیؐ ھکذا صلی ھا وھی عشرون رکعة۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح اس نماز کو پڑھا ہے اور وہ بیس رکعتیں ہیں (غنیۃ الطالبین)

۵۔ تراویح ترویحہ کی جمع ہے۔ عربی کی جمع کم از کم تین پر بولی جاتی ہے اگر اس نماز کی آٹھ رکعت ہوتیں تو اس کا نام تراویح نہ ہوتا بلکہ ترویحہ ہوتا۔ کیونکہ چار رکعت کے بعد ایک ترویحہ اور آٹھ پر معاملہ ختم۔ پس اس نماز کا نام تراویح ہی بتا رہا ہے کہ اس کی رکعتیں آٹھ نہیں بلکہ زیادہ ہیں اور وہ بیس ہیں۔

۶۔ حضرت ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیس تراویح پڑھتے تھے (ابن ابی شیبہ۔ طبرانی بیہقی) اس حدیث میں ابی شیبہ راوی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے لہٰذا یہ حدیث قابلِ استدلال نہیں۔ جواب یہ ہے حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔ ابراھیم بن عثمان ابوشیبة الحافظ۔ کہ ابوشیبہ حافظ حدیث ہے "

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں۔ " ابوشیبہ کا حال اس قدر ضعیف نہیں کہ اس کی روایت کو چھوڑ دیا جائے۔ (رسالہ تراویح)

ابن عدی کہتے ہیں کہ ابوشیبہ کی حدیثیں بہت اچھی ہیں نقل کیا اس کو حافظ نے تہذیب الکمال میں۔

۷۔ کان ابی ابن کعب یصلی بالناس بالمدینة عشرین رکعة (ابن ابی شیبة)

ابن ابی کعب مدینہ میں بیس تراویح پڑھاتے تھے۔

۸۔ کان یومنا سوید بن غفلة فی رمضان فیصلی خمس ترویحات عشرین رکعة (بیہقی)

حضرت ابوالخصیب کہتے ہیں کہ سوید بن غفلہ رمضان میں ہمارے امام ہوتے تھے۔ اور پانچ ترویحوں سے ہم کو بیس تراویح پڑھاتے تھے۔

۹۔ ابن ابی شیبہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیس رکعت تراویح

پڑھتے تھے۔ اشعۃ اللمعات۔ عبدالحق محدث دہلوی)

۱۰۔ کان ابی بن کعب یصلی بالناس بالمدینۃ عشرین رکعۃ (ابن ابی شیبہ)

حضرت ابی ابن کعب مدینہ منورہ میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے۔

۱۱۔ ان علی بن ابی طالب امر رجلا یصلی بالناس خمس ترویحات عشرین رکعۃ (بیہقی)

حضرت علیؓ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحوں کے ساتھ بیس رکعت تراویح پڑھائے۔

۱۲۔ کان عبداللہ بن مسعود یصلی عشرین رکعۃ (عمدۃ القاری شرح بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیس رکعت پڑھاتے تھے۔"

۱۳۔ حضرت شبرمہ حضرت علی کے ساتھیوں سے ہیں وہ رمضان میں امامت کرتے تھے۔ فیصلی خمس ترویحات عشرین رکعۃ (بیہقی) اور پانچ ترویحوں سے ۲۰ رکعت تراویح پڑھاتے۔

۱۴۔ ابوعبدالرحمان سے روایت ہے۔

ان علیاً دعا القراء فی رمضان فامر رجلا یصلی بالناس عشرین رکعۃ وکان علی یوتر (بیہقی)

حضرت علیؓ نے قاریوں کو رمضان میں بلایا۔ اور ایک قاری کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھائے اور وتر حضرت علی رض خود پڑھاتے۔

۱۵۔ ترمذی شریف میں ہے اکثر اہل علم کا مذہب حضرت علیؓ۔ حضرت عمرؓ اور دیگر اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کے مطابق تراویح بیس رکعت ہیں۔ امام سفیان ثوری۔ عبداللہ بن مبارک۔ امام شافعی بھی بیس رکعت پڑھتے تھے۔ (ترمذی)

۱۶۔ امام عبدالبر فرماتے ہیں۔

وھو قول جمھور العلماء (بیس رکعت تراویح جمہور علماء کا قول ہے)

اہل کوفہ اور امام شافعی اور اکثر فقہاء بیس کے قائل ہیں۔

ابی ابن کعب کہتے ہیں۔ اس میں کسی صحابی کا اختلاف نہیں۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری)

۱۷۔ حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔

فصار اجماعا کما روی البیھقی باسناد صحیح انھم کانوا یقومون علی عھد

عمر بعشرین رکعة وعلی عهد عثمان وعلی (شرح وقایہ)

"بیہقی کی اس صحیح حدیث پر سب کا اجماع ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔"

۱۸۔ مولانا عبدالحی حنفی امام ابن حجر کا قول نقل کرتے ہیں۔

اجماع الصحابة علی ان التراویح عشرون رکعة۔

صحابہ کا اس پر اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعت ہیں (مجموعہ فتاوی تحفۃ الاخیار)

سائل چودھری عبدالماجد ہیراں اسٹریٹ۔ سیالکوٹ شہر

الجواب

۱۔ مؤطا امام مالک سے آپ نے جو ۲۳ رکعت والی روایت ذکر کی ہے اس میں لوگوں کے ۲۳ رکعت پڑھنے کا ذکر ہے اور اسی جگہ مؤطا امام مالک میں گیارہ رکعت پڑھنے والی حدیث ہے جس میں یہ لفظ ہیں۔ اَمَرَ عُمَرُ کہ حضرت عمرؓ نے گیارہ کا حکم دیا۔ اب خود ہی سمجھ لیں کہ ترجیح حکم کو ہے یا لوگوں کے پڑھنے کو۔

علاوہ ازیں سعید بن منصورؒ نے نقل کیا ہے۔ سائب بن یزید کہتے ہیں۔

کنا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب باحدی عشرہ رکعة

یعنی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں گیارہ رکعت کے ساتھ قیام کرتے تھے۔

امام سیوطی رسالہ تراویح میں لکھتے ہیں۔

اسنادہ فی غایة الصّحة " یعنی اس کی اسناد اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

فتح الباری ج ۴ ص۲۰۴ میں بھی یہی سعید بن منصورؒ کی روایت ذکر کی ہے۔ پس پہلی روایت سے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگوں کے گیارہ پڑھنے کا ثبوت ہوا۔

علامہ ابن الہمام حنفیہ کے بہت بڑے امام اور مجتہد ہیں۔ فتح القدیر ج ص۱۹۸ میں فرماتے ہیں کہ:۔

اصل سنت آٹھ رکعت ہی ہیں۔ باقی زائد نفل ہیں "

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے فتح سر المنان ص۴۹۲ میں لکھا ہے۔ صاحب بحر الرائق شرح کنز الدقائق (فقہ کی کتاب) اور علامہ طحطاوی حنفی نے بھی اسی طرح لکھا ہے (تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ " امتیازی مسائل " ص۶۲ ملاحظہ ہو) اور زائد نوافل اصل تراویح سے مل کر بیس سے کم وبیش بھی آئے ہیں چنانچہ علامہ عینی حنفی رہ

شرح بخاری جزء ۱۱ صلاۃ ۲ میں لکھتے ہیں کہ تراویح کے عدد میں علماء کا اختلاف ہے۔

۱۔ بعض ۴۷ کے قائل ہیں ۲۔ بعض ۴۱ کے۔ اہل مدینہ کا اسی پر عمل ہے ۳۔ بعض ۳۹ کے۔ ۳۶ رکعت اور تین وتر یا ۳۸ رکعت اور ایک وتر۔ یہ بھی اہل مدینہ کا ہی عمل ہے (۴) بعض ۳۴ کے اور (۵) بعض ۲۸ (۶) بعض ۲۴ (۷) بعض ۲۰ (۸) بعض ۱۶ (۹) اور بعض ۱۳ کے قائل ہیں۔ اور گیارہ کے متعلق اختلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت عائشہ رض کی حدیث متفق علیہ میں آگیا ہے اور اس کے علاوہ اور حدیثیں بھی ہیں۔ اسی طرح فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۲۰۴ و صفحہ ۲۵۳ میں آثار کا ذکر ہے۔ فتح الباری میں امام مالکؒ سے ۳۶ نفل اور تین وتر اور ۴۰ نفل اور ۷ وتر بھی نقل کئے ہیں۔

۲ اور دوسری روایت کی سند میں ابو عثمان بصری عمرو بن عبداللہ ہے۔ اس کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی حنفیؒ کے شاگرد شوق نیموی لکھتے ہیں۔ اس کا حال معلوم نہیں پس یہ مجہول ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باپ کے نام میں غلطی ہو گئی صحیح نام عبید ہے کیونکہ کتب اسماء الرجال میں ابو عثمانی بصری عمرو بن عبید ہے نیز لکھا ہے کہ جھوٹ سے متہم ہے پس یہ روایت بالکل ردی ہوگی۔

۳ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ یحییٰ بن سعید نے حضرت عمر رض کا زمانہ نہیں پایا۔ پس یہ روایت ضعیف ہے ضعیف فی نفسہ حجت نہیں تو صحیح کے مقابلہ میں اس کا کیا اعتبار۔؟

۴ غنیۃ الطالبین کی عبارت دھی عشرون رکعۃ حدیث کے الفاظ نہیں بلکہ یہ غنیۃ الطالبین والے کی اپنی عبارت ہے۔ رہی یہ بات کہ صاحب غنیۃ الطالبینؒ نے بیس کی تعداد کس حدیث سے لی ہے وہ اول نمبر کی ہوگی یا نمبر ۳ کی۔ اگر نمبر اول والی یا نمبر ۳ ہو تو اُن کا جواب ہو چکا۔ اور اگر نمبر ۴ والی ہوگی تو اس کا جواب آتا ہے۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ صاحب غنیہ کا مذہب دلیل ہے تو وہ رفع الیدین اور آمین وغیرہ کے بھی قائل ہیں۔ حنفیہ کو بھی یہ مذہب قبول کرنا پڑے گا اور فاتحہ کی فرضیت کے بھی قائل ہیں اور یہ بھی حنفیہ کو ماننا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اور باتوں میں بھی موافقت کرنی پڑے گی۔

۵ کسی حدیث میں تراویح کا نام نہیں آیا۔ یہ نام پچھلے لوگوں کا رکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر محدثین قیام رمضان کا باب باندھتے ہیں۔ اور امام بخاری نے بھی فضل من قام رمضان کا باب باندھا ہے اور ایک نسخہ میں تراویح کا باب بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نسخے والے نے بعد کو مشہور ہونے کی وجہ سے یہ عنوان باندھ دیا ہو یا بخاریؒ نے ہی باندھا ہو کیونکہ ان کے زمانہ میں اس نام کی بھی شہرت ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھی جماعت ہے چنانچہ بخاری نے باب باندھا ہے۔ اثنان فما فوقھما جماعۃ۔ اور یہ ابن ماجہ وغیرہ کی حدیث کے الفاظ ہیں

(ملاحظہ ہو فتح الباری جلد ثانی باب مذکورہ ص۱۱۲) اور آٹھ رکعت میں ہر چار دو ترویح ہو جاتے ہیں۔ پس بخاری کے باب اور حدیث کے مطابق جمع صحیح ہو گئی۔

۶ فتح الباری جلد ۳ باب فضل من قام فی رمضان ص۲۰۵ میں لکھا ہے۔

واما ما رواہ ابن ابی شیبۃ من حدیث ابن عباس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر فاسنادہ ضعیف"

بہر حال جو ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے اس کی سند ضعیف ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

وقد عارضہ حدیث عائشۃ ھذا الذی فی الصحیحین مع کونھا اعلم بحال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیلا من غیرھا۔ واللہ اعلم

اور ضعیف ہونے کے علاوہ یہ حضرت عائشہ کی اس حدیث کے خلاف ہے جو صحیحین میں ہے (صحیحین میں ہے کہ آپ رمضان غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے حالانکہ حضرت عائشہ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی حالت دوسروں سے زیادہ جانتی تھیں۔ واللہ اعلم۔

علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر ج ۱ ص۱۹۸ میں اور زیلعی نے نصب الرایہ ج ۱ ص۲۹۴ میں اسی طرح لکھا ہے کہ ابراہیم بن عثمان ابی شیبہ ضعیف ہے۔ نیز لکھا ہے کہ یہ عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث عائشہ رضؓ کی بخاری مسلم والی حدیث کے خلاف ہے۔

اور حافظ ابن حجر تقریب التہذیب ص۲۴ و ص۲۵ میں ابو شیبہ بن عثمان کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

ابراھیم (ت ق) بن عثمان العبسی بالموحدۃ ابو شیبۃ الکوفی قاضی واسط مشھور بکنیۃ متروک الحدیث من السابعۃ سنۃ تسع وستین۔

یعنی ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ متروک الحدیث ہے

اس سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا بھی جواب ہو گیا کیونکہ متروک وہ راوی ہے جس کی روایت بالکل ردی ہو۔ اور اس کی حدیث چھوڑ دی گئی ہو۔ اور رسالہ تراویح (جس کا حوالہ دیا ہے) معلوم نہیں کس کا رسالہ ہے اس کا مصنف کون ہے۔

تنبیہ ۔ حافظ ابن حجر کی کتاب تہذیب الکمال نہیں بلکہ تہذیب التہذیب ہے اور ابن عدی سے جو کچھ نقل کیا ہے اُس کے متعلق حافظ ابن حجر نے ہی فتح الباری میں فیصلہ کر دیا کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

۷ ابی بن کعب سے ترمذی نے اٹھ رکعت بھی نقل کی ہیں۔ جیسے یہ زائد ہیں۔ اسی طرح ہیں سمجھ لیں۔ باقی حضرت عمرؓ نے جو کچھ حضرت ابی اور تمیم داری کو حکم دیا وہ گیارہ ہی ہیں۔

پہلا نمبر ملاحظہ فرمائیے۔

۸ سوید بن غفلہ صحابی نہیں تابعی ہیں اور تابعین بلکہ صحابہ کے اور بھی کئی آثار ہیں۔ ایسے موقع پر فیصلہ مرفوع حدیث سے ہوتا ہے سو مرفوع حدیث سے آٹھ ہی رکعت ثابت ہیں۔

چنانچہ حافظ ابن حجر فتح الباری جلد ۲ فی باب الجمعہ فی المدن۔ القریٰ ص۳۱ میں لکھتے ہیں۔

فلما اختلف الصحابۃ وجب الرجوع الی المرفوع

پس جب صحابہ کا اختلاف ہو تو مرفوع حدیث کی طرف رجوع کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

۹ اور اشعۃ اللمعات کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے اس کا جواب نمبر اول میں گذر چکا ہے کہ فتح سرالمنان میں انہوں نے لکھا ہے کہ اصل تراویح آٹھ ہی ہیں باقی زوائد و نوافل ہیں۔

۱۰ اس کا جواب نمبر اول اور نمبر ۷ میں بھی گذر چکا ہے۔

۱۱ اس کی سند میں ایک راوی ابوالحسناء ہے جس کے متعلق مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد شوق نیموی آثار سنن میں لکھتے ہیں۔ لا یعرف (اس کا حال معلوم نہیں) اور تقریب میں لکھا ہے کہ مجہول ہے۔ اور بیہقی نے حضرت علی کا ایک اور اثر روایت کیا ہے اس میں حماد بن شعیب ہے جو سخت ضعیف ہے

شوق نیموی بحوالہ میزان الاعتدال لکھتے ہیں۔

ضعفہ ابن معین وغیرہ وقال یحیی مرۃ لا یکتب حدیثہ وقال البخاری فیہ نظر وقال النسائی ضعیف وقال ابن عدی اکثر حدیثہ مما لا یتابع علیہ

یعنی یحیی بن معین ؒ نے اسے ضعیف کہا ہے اور ایک مرتبہ یحیی ؒ نے کہا اس کی حدیث لکھنے کے قابل نہیں اور بخاری نے کہا اس میں نظر ہے اور نسائی نے کہا ضعیف ہے اور ابن عدی نے کہا اس کی اکثر احادیث میں متابعت نہیں کی جاتی۔

اور شیخ ابن الہمام تحریر کرتے ہیں۔

اذا قال البخاری للرجل فیه نظر فحدیثه لا یحتج به ولا یستشهد به ولا یصلح للاعتبار۔

یعنی جب امام بخاریؒ راوی کے حق میں فیہ نظر کہہ دیں تو اس کی حدیث سے نہ استدلال پکڑا جا سکتا ہے نہ دوسری روایت کی شاہد ہو سکتی ہے نہ وہ متابعت کا کام دے سکتی ہے۔"

۱۲ اس کے راوی اعمش ہیں جو عبداللہ ابن مسعود سے بیان کرتے ہیں۔ اعمش نے عبداللہ بن مسعود کو نہیں پایا ہے پس یہ روایت منقطع ہوئی۔ اور منقطع ضعیف ہوتی ہے۔

۱۳ شبرمہ آپ نے غلط لکھا ہے صحیح شتیر بن شکل ہے۔ شتیر یہ تابعی ہیں۔ جس کا ذکر نمبر ۸ میں گذر چکا ہے۔

۱۴ یہ وہی روایت ہے جس میں حماد بن شعیب ہے اس کا ذکر نمبر ۱ میں گذر چکا ہے۔

۱۵ ترمذی کی عبارت میں رُوی کا لفظ ہے جس سے امام ترمذی کا اشارہ ان کے ضعف کی طرف ہے چنانچہ اوپر ضعف بیان ہو چکا ہے باقی دیگر ائمہ کے اقوال مختلف ہیں۔ چنانچہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اور ترمذی میں بھی اوپر اقوال نقل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ابی اور امام اسحاق سے اسم روایت کی ہیں۔ اور امام احمد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا (جتنی چاہے پڑھے)

۱۶ جمہور علماء کوئی دلیل نہیں۔ فقہاء کے نزدیک کل دلیلیں چار ہیں۔ کتاب و سنّت، اجماع اور قیاس اور اہل حدیث کے نزدیک قیاس میں کلام ہے۔ پس جمہور کا عمل بیس پر ہے وہ حجت نہیں۔ امام مالک گیارہ پسند کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی جلد ۲ صفحہ ۷۳ اور ہمارا رسالہ امتیازی مسائل ص۱۶۶ اور رسالہ تراویح سیوطی میں ہے

ابن جوزی کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک تراویح کی کوئی حد نہیں کیونکہ وہ نفل ہیں اور یہ کہنا کہ کسی صحابی کا اختلاف نہیں یہ بھی غلط ہے۔ حضرت عمرؓ سے گیارہ رکعت کا ثبوت گذر چکا ہے۔ حضرت ابی اسم پڑھتے تھے۔

۱۷ ملا علی قاریؒ سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اجماع کیسے ہو سکتا ہے جب کہ ان میں کئی اقوال ہیں۔ چنانچہ نمبر اول میں گذر چکا ہے اور جو روایت بیہقی سے نقل کی ہے۔ اس کے متعلق شوق نیموی حنفیہ کے بہت بڑے بزرگ آثار السنن میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا ذکر کسی نے اپنی طرف سے داخل کر دیا ہے۔ تصانیف بیہقی میں اس کا نام نشان تک نہیں۔

۱۸ حافظ ابن حجر سے اجماع نقل کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود اختلاف نقل کر چکے ہیں۔ اور عینی سے بھی ہم نمبر اول میں اختلاف نقل کر چکے ہیں۔

تنبیہ ۔ آپ نے کسی رسالہ سے اٹھارہ دلائل پیش کر دیے مگر ایسے رسائل پر اعتماد نہ کریں ۔کیونکہ یہ لوگ بغیر تحقیق ویسے ہی دلائل لکھ دیتے ہیں ۔ تاکہ عوام پر کثرت دلائل کا اثر پڑے حالانکہ حقیقت میں ایک دلیل بھی صحیح نہیں ۔ چنانچہ آپ تفصیل معلوم کر چکے ہیں ۔ اب تحقیق آپ کے سامنے آگئی ہے کہ اصل سنّت آٹھ ہیں ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہی ثابت ہیں باقی زوائد نوافل ہیں ۔

از حضرت العلام حافظ عبداللہ روپڑی مدظلہ العالی

مسئلہ تراویح پر اعتراضات اور اُن کے جوابات

محدث روپڑی نے لکھا کہ :۔

ہم نے ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ کے پرچہ تنظیم میں لکھا تھا کہ آٹھ تراویح اہل حدیث اور حنفیہ کا متفقہ مسئلہ ہے جس کا عنوان تھا "مسئلہ تراویح ۔ اہل حدیث اور حنفیہ کا متفقہ فیصلہ" اور حنفیہ کے جد امجد ابن الہمام رح سے بحوالہ فتح القدیر حاشیہ ہدایہ ثابت کیا تھا کہ سنّت اصل آٹھ ہی ہیں ۔ باقی مستحب ہیں یعنی نوافل ہیں ۔ نیز مشکوٰۃ سے سائب بن یزید کی روایت ذکر کی تھی کہ عمرؓ نے ابی بن کعب اور تمیم داری کو رمضان المبارک میں حکم دیا کہ لوگوں کو ۱۱ رکعت پڑھائیں قیام کے لمبا ہونے سے ہم عصا پر ٹیک لگاتے فجر کے قریب فارغ ہوتے ۔

اس کے بعد میں نے لکھا کہ نفل کوئی زیادہ پڑھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں اس لئے سعید بن جبیرؒ پہلے ۲۴ پڑھتے ۔ اخیر دھاکہ میں ۲۸ پڑھتے ۔ اور عمر بن عبدالعزیز اور ابان بن یزید کے زمانہ میں لوگ ۳۶ پڑھتے ۔ اور ابن سیرین کہتے ہیں معاذ ابو حلیم قاری اکتالیس پڑھتے اور نفل سمجھ کر جتنے کوئی چاہے پڑھے مگر تراویح اصل آٹھ ہی ہیں ۔

اس پر "العدل" کے ایڈیٹر بہت سیخ پا ہوئے ہیں اور ہم پر بہت سی لے دے کے بعد دس سوال کرتے ہیں ۔ ہم ان کے رنج اور اُن کے لے دے کو خدا کے حوالہ کر کے سوالات کے جوابات دیتے ہیں ۔

اعتراض نمبر ۱

جناب نے شروع میں حضرت سائب بن یزید کی حدیث نقل فرمائی ہے جس میں حکم حضرت عمر فاروق اعظم کی طرف سے ہے ۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ لوگ پہلے بھی رمضان میں گیارہ رکعت باجماعت پڑھتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کو اس حکم سے نیا امام مقرر کیا تھا ۔ اور حضرت عمرؓ نے باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا تھا یا یہ مطلب ہے کہ نہ لوگ پہلے گیارہ رکعت جانتے تھے اور نہ ان کے ادا کرنے کی کیفیت

جانتے تھے۔ یہ سب کچھ حضرت عمرؓ کے حکم سے ہوا۔ جواب میں حدیثیں پیش کریں

جواب

مسلم صلہ ۲۵۹ میں حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر سختی کے قیام رمضان کی ترغیب دیتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حالت میں فوت ہو گئے پھر حضرت ابوبکر کے دنوں میں بھی یہی حال رہا۔ اور شروع خلافت عمرؓ میں بھی یہی حال رہا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے شروع خلافت عمرؓ ایک حالت رہی۔ مسلم کے اسی صفحہ پر دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رات باجماعت پڑھا کر فرضیت کے خوف سے ترک کر دی۔

بخاری کے صفحہ ۲۹۹ میں ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ نکلے تو لوگوں کو متفرق نماز پڑھتے دیکھا۔ کوئی اکیلا پڑھتا ہے۔ کوئی چند آدمی ساتھ لے کر نماز پڑھتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان سب کو ابی بن کعب پر جمع کر دیا۔

اسی طرح مؤطا وغیرہ میں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی ایک طریق مقرر نہ تھا۔ کوئی اکیلا پڑھتا، کوئی جماعت سے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب پر جمع کر دیا۔ اور مشکوٰۃ سے جو ہم نے روایت ذکر کی ہے اس میں تمیم داری کا بھی ذکر کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ تمیم داری کو بعد ملایا ہے۔ پہلے صرف ابی بن کعب تھے۔ ان سب روایتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین دن جماعت ہوئی پھر لوگ جس طرح چاہتے پڑھتے کوئی جماعت سے پڑھتا کوئی اکیلا پڑھتا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ایک جماعت کر دی۔

اب یہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ لوگوں کی نماز کی حالت تو معلوم ہوئی لیکن رکعتوں کی تعداد معلوم نہیں ہوئی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی عمدۃ الرعایہ صلہ ۱۷۴ میں لکھتے ہیں۔

ابن حبان وغیرہ میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن راتوں میں نماز باجماعت پڑھائی تھی ان میں آٹھ رکعتیں اور تین وتر پڑھائے تھے۔

اور فتح القدیر حاشیہ ہدایہ جلد اوّل صلہ ۱۶۶ میں ابن حبان سے اور سبل السلام صلہ ۱۳۷ میں صحیح ابن حبان اور صحیح ابن خزیمہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے۔

اسی طرح قیام اللیل صلہ ۹ میں احادیث ذکر کی ہیں اور بیس کی کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچی۔ چنانچہ خود

حنفیہ (ابن الہمام رح زیلعی رح) نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ ایک راوی ہے۔ جس کے ضعف پر اتفاق ہے۔ اس کی زیادہ تفصیل ہمارے رسالہ اہلحدیث کے امتیازی مسائل صفحہ ۱۴ و صفحہ ۱۵ میں ملاحظہ ہو۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعتیں پڑھائیں تو ثابت ہوگیا کہ شروع خلافت عمر رضہ تک یہی حالت رہی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرضیت کے خوف سے صرف جماعت ترک کی ہے تعداد کا ترک کہیں مذکور نہیں۔ پس شروع خلافت عمر رضہ تک متفرق طور پر اکثر یہی تعداد رہی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضہ نے اسی تعداد پر جماعت قائم کردی۔

اعتراض نمبر ۲

مضمون کے اخیر میں آپ نے فرمایا ہے۔ ہاں تراویح اصل آٹھ سنّت ہیں۔ جناب کا یہ قول آپ کے قائم کردہ عنوان کے نیچے اور صرف سائب بن یزید کی حدیث کے بعد ہمیں اس سوال کی اجازت دیتا ہے کہ ہم دریافت کریں کہ کیا صحابی کا حکم سُنّت ہے یا نہیں۔ اگر سنّت ہے تو کیا سنّتِ صحابہ کے بھی وہی اقسام ہیں۔ جو سنّتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں یا نہیں۔ پھر صحابی کا فعل سنّت تسلیم کر لینے کی حالت میں اس میں سارے صحابہ مساوی ہیں یا نہیں۔ جواب اہل حدیث رہ کر لکھیں۔

جواب

جواب نمبر اول سے معلوم ہوچکا کہ آٹھ تراویح با جماعت یہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے۔ حضرت عمر رضہ نے صرف اتنا کیا ہے کہ ایک فعل بند کو جاری کر دیا نہ تعداد اُن کی طرف سے نہ جماعت۔ کیونکہ تعداد بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ جماعت بھی ثابت ہے۔ آپ نے فرضیت کے خوف سے جماعت ترک کر دی تھی۔ پھر شروع خلافت عمر رضہ تک یہی حالت رہی۔ ایک دن حضرت عمر رضہ کو لوگوں کی متفرق حالت دیکھ کر خیال ہوا تو پھر نئے سرے سے جماعت جاری کر دی۔ اور اسی لحاظ سے باعتبار لغوی معنی کے حضرت عمر رضہ نے اس کو بدعت کہا جیسے بخاری میں ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ بدعت نہیں کیونکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس پر عملدرآمد ہوچکا تھا۔ اور میرا صرف سائب بن یزید کی حدیث کو ذکر کرنا اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ حضرت عمر رضہ کی سنّت ہے بلکہ یہ اس خیال سے ذکر کیا تھا تاکہ حنفیہ کے مشہور خیال کی تردید ہو جائے کہ حضرت عمر رضہ نے بیس تراویح جاری کیں۔ اور سب کا اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا تو گیارہ پر عمل متروک ہوگیا۔

اگر آپ میری عبارت کو غور سے دیکھتے تو خود یہ مطلب آپ پر واضح ہو جاتا کہ سنّت سے مراد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت ہے۔ میری پوری عبارت یہ ہے" ہاں تراویح اصل آٹھ سنت ہیں۔ کیونکہ دلیل اسی کو چاہتی ہے۔ چنانچہ ابن الہمام سے ہم نقل کر چکے ہیں"۔ اِس عبارت میں ہم نے کمال ابن الہمام کا حوالہ دیا ہے۔ اب کمال ابن الہمام کی عبارت فتح القدیر جلد اوّل صفحہ ۱۹۵ سے نکال کر دیکھ لیں کہ اُنہوں نے پہلے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے آٹھ تراویح ثابت کی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔ یہ آٹھ سنت ہیں اور باقی نفل ہیں۔ اب آپ سمجھ لیں کہ رسُول کی سنّت مراد ہے یا صحابی کی۔ رہی یہ بات کہ صحابی کے قول فعل کا کیا حکم ہے۔ سو اس کے لئے آپ میرے رسالہ "تعریف اہل سنّت" کا صفحہ ۲۲۳ اور رسالہ "تعریف اہل حدیث حصّہ اوّل کا صفحہ ۲۹۔ صفحہ ۳۔ صفحہ ۳۱۔ صفحہ ۵۶۔ صفحہ ۵۷ اور حصہ دوم کا صفحہ۔ اور رسالہ ردّ بدعات کا صفحہ ۴ ملاحظہ کریں۔

اعتراض نمبر ۳

مؤطا امام مالک میں گیارہ رکعت اور بیس رکعت دونوں کی حدیثیں موجود ہیں۔ اور امام مالک کا عمل آپ کے قول کے مطابق گیارہ والی حدیث کے خلاف ہے۔ اِسی طرح مؤطا کی گیارہ رکعت والی حدیث راوی سائب بن یزید کا عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔ اب دریافت طلب یہ بات ہے کہ کیا ناقل حدیث یا راوی حدیث کا عمل جو مروی حدیث کے خلاف ہو حدیث پر اثر انداز ہے یا نہیں۔ جواب مجتہدانہ رنگ میں ہو۔

جواب

مؤطا میں بیس رکعت کی روایت ان الفاظ سے ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ رمضان میں ۲۳ رکعت کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ اس میں نہ حضرت عمرؓ کا فعل ہے نہ اَمر۔ ہاں گیارہ رکعت والی میں اَمر فرمانا مذکور ہے رہی یہ بات کہ سائب بن یزید راوی کا عمل اس کے خلاف ہے اس کا آپ نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ پھر عمل کا خلاف ہونا دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ زیادہ نفل کے شوق سے زیادہ پڑھ لے تو یہ عمل خلاف نہیں۔ ایک یہ کہ سُنّت ہی زیادہ سمجھے تو یہ عمل خلاف ہے۔ سو آپ پہلے ثابت کریں پھر سوال کریں۔ اور امام مالک بھی ۳۶ کو سنت نہیں سمجھتے بلکہ فرماتے ہیں۔ اَسْتَحِبُّ (قیام اللیل صفحہ ۹۲) یعنی میں مستحب سمجھتا ہوں اور عینی شرح بخاری اور رسالہ تراویح للسیوطی میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ گیارہ ہی پسند کرتے۔ اِن کے دونوں قولوں میں موافقت یوں ہے کہ سنّت ہونے کے لحاظ سے گیارہ پسند کرتے۔ زیادہ نفل ہونے کی وجہ سے ۳۶ کو پسند کرتے یہ ایسا ہے جیسے عبداللہ بن عمرؓ حج کی تلبیہ کی دُعا میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعا پر کچھ الفاظ زیادہ کر دیتے۔ اس پر امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ فان زاد زائد فی التلبیۃ شیئًا من تعظیم اللہ فلا باس ان شاء اللہ واحب

الی ان یقتصر علی تلبیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی ص۱۰۱)

اگر کوئی تلبیہ کی دعاء میں تعظیم الہی کے لئے کوئی لفظ زیادہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن میرے نزدیک محبوب ترین یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ پر اکتفا کرے۔

اہل حدیث آٹھ کو اسی لئے ترجیح دیتے ہیں کہ اصل سنت آٹھ ہیں۔ ورنہ کوئی نفل سمجھ کر زیادہ پڑھے خواہ ۴۰ پڑھے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور نہ یہ مخالفت حدیث ہے کیونکہ نفل سمجھ کر پڑھتا ہے نہ سنت

اعتراض نمبر۴

آپ نے جس قدر بزرگان دین کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے وہ سب گیارہ والی حدیث کے خلاف پر عامل ہیں جیسے کہ آپ کو مسلم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان اکابر دین اور محدثین کے تعامل کا اثر صحت حدیث پر پڑ سکتا ہے یا نہیں۔ پھر ان ائمہ دین کے خلاف گیارہ رکعت پر عمل کرنے والے انہی کے ہم پایہ اور انہی کے معاصر آپ بیان فرمائیں۔

جواب

جواب نمبر۳ میں خلافت کی تشریح ہو چکی ہے۔ نفل کوئی زیادہ پڑھے تو یہ خلاف نہیں۔ اس کے علاوہ امام مالکؒ گیارہ پسند کرتے۔ چنانچہ ابھی گذرا ہے۔ قیام اللیل ص۹۱ میں ہے۔ محمد بن اسحاق جو کچھ سائب بن یزید نے روایت کیا ہے اُس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی ماثبت بالسنۃ میں لکھتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں (جو تابعین کا زمانہ ہے) اُس پر عملدرآمد رہا۔

حضرت عمرؓ کا زمانہ صحابہ کا ہے۔ اُنہوں نے اِس کو جاری کیا۔ اِس سے پہلے متفرق طور پر اس پر عمل رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر عمل کیا۔ عمر بن عبدالعزیز تابعین کے زمانہ میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ امام مالکؒ امام زمان اور اُن کے معاصر محمد بن اسحاق تبع تابعی کی تصریحات اس کی ترجیح میں موجود ہیں۔ اس کے بعد محدثین کے خیالات اسی کے موافق ہیں۔ حنفیہ کے ہیں راجح قول یہی ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے جدامجد کمال ابن الہمام نے نقل کر چکے ہیں۔ اب آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ سوائے سر جھکانے کے کوئی چارہ نہیں ہداللہ الہادی الی سبیل الرشاد۔

اعتراض نمبر۵

بخاری شریف کے ص۴۸۶ پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد ۷۰ ہے۔ ص۸۸۶ پر ۱۰۰ اور ص۹۹۴

پر ۹۰ پھر صفحہ ۱۱۱۳ پر ۶۰ ہے۔ اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آپ کے خیال میں یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔ یا ان میں سے کوئی خاص صحیح ہے اور باقی غلط۔ پھر جو طریق بھی آپ ان روایت میں اختیار کریں کیا وہ طریق تراویح کی روایتوں میں اختیار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ جواب میں مقلد نہ بن جائے۔

جواب

آپ لوگوں نے چونکہ قیاس کا باب بہت وسیع کیا ہوا ہے۔ اور شریعت کے گروں سے پُورے طور پر واقف نہیں۔ اس لئے اس قسم کے اغلاط بہت کرتے ہیں کہ کہیں حکم کو خبر پر قیاس کر لیتے ہیں۔ کہیں عمل کو غیر عمل سے نسبت دیتے ہیں۔ مولوی رشید احمد صاحب۔ مولوی محمود حسن صاحب۔ مولوی انور شاہ صاحب وغیرہ اسی قسم کے اغلاط میں پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اپنے اپنے موقعہ پر ان لوگوں کے اغلاط کو ہم نے واضح کیا ہے۔ آج آپ بھی اِسی غلطی میں واقع ہو گئے۔

سلیمان علیہ السّلام کے واقعہ میں تطبیق یُوں ہے۔ اصل عورتیں ۶۰ تھیں باقی لونڈیاں تھیں۔ سلیمان علیہ السلام نے ایک ہی مجلس میں پہلے ساٹھ کا ذکر کیا کہا قسم ہے میں ساٹھ عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ پھر لونڈیاں جو کئی مراتب کی تھیں۔ ان کو درجہ بدرجہ شامل کر لیا۔ پہلے دس شامل کر کے ستر کہا پھر نوے پھر سو۔ غرض ایک ہی مجلس میں جوش و غصہ میں یہ قول کئی دفعہ کیا۔ ہر دفعہ مناسب تعداد بڑھاتے گئے اور رات اسی طرح قسم پوری کی۔ پہلے ساٹھ کے پاس گئے پھر وقفہ کر کے درجہ بدرجہ باقی تعداد پوری کی۔ اور بعض عدد تکثیر پر بھی محمول ہو سکتے ہیں۔ جیسے ستر کیونکہ یہ تکثیر کے لئے بہت آتا ہے۔

جیسے قرآن میں ہے۔

ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم

اگر تو منافقوں کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت مانگے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

اس میں ستر دفعہ کی حد بندی مقصود نہیں بلکہ یہ ایسے ہے جیسے کہتے ہیں میں نے تجھے سو دفعہ کہا ہے یہ کام نہ کر یو۔ اس جگہ بھی ستر سے مُراد یہ ہو سکتی ہے کہ میں بہت عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ اس کے علاوہ یُوں بھی موافقت ہو سکتی ہے کہ کل عورتیں لونڈیاں سمیت نوے اور سو کے درمیان تھیں۔ ساٹھ تو اصیل ہونے کی بنا پر نقل کیں اور ستر تکثیر کے لئے اور نوے میں کسر ڈال دی اور سو میں کسر پوری کر دی کیونکہ ایک آدھ کی کمی کالعدم قرار دی جاتی ہے۔ جیسے شعبان کے روزوں میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا سارا شعبان روزے رکھتے تھے حالانکہ

سارا شعبان نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح اور محاورات بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو ترمذی صہ۹۲۔ غرض سلیمان علیہ السّلام کے واقعہ کو تراویح سے کوئی تعلق نہیں وہ ایک قول ہے۔ جو ایک ہی مجلس میں معین عدد پر کئی مراتب میں ہو سکتا ہے تراویح عمل ہے۔ اس میں یہ صورت مشکل ہے۔ ہاں اس میں دوسری صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ پڑی ہوں۔ دوسری راتوں میں زیادہ پڑھی ہوں۔ مگر الحمد للہ تراویح میں اس قسم کا اختلاف ہی نہیں صحیح روایتوں میں صرف آٹھ ہی کی تعداد آئی ہے چنانچہ نمبر اول میں تفصیل ہو چکی ہے۔

اعتراض نمبر ۶

جب جناب نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ گیارہ سے زائد نفل ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ نفل کو بدعت کہنے والا اور اس سے نفرت کرنے والا شرعاً آپ سے کیا فتویٰ حاصل کر سکتا ہے۔

جواب

جو سنّت سمجھ کر پڑھے وہ غلطی پر ہے۔ اس کو کوئی بُرا کہے تو اس کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اگر نفل سمجھ کر پڑھے تو اس کو بُرا سمجھنے والا بُرا ہے۔

اعتراض نمبر ۷

آپ کی جماعت بیس تراویح سے سخت بیزار اور اُن کو بدعت کہتی ہے۔ کیا کبھی آپ نے کوئی ایسا مضمون لکھا ہے۔ جس میں اُن کو ایسا کرنے سے روکا ہو۔ اور پھر اس کا کچھ اثر ہوا ہو۔

جواب

بیزار اُن سے ہوں گے جو بیس کو سنّت سمجھ کر پڑھتے ہیں اور ترک کو بُرا جانتے ہیں۔ ورنہ نفل سمجھ کر پڑھنے والے کو شاید ہی کوئی بُرا جانتا ہو۔ میں نے اس مسئلہ کی کئی دفعہ وضاحت کی ہے کہ نفل سمجھ کر زائد پڑھنے والے پر کوئی اعتراض نہیں ملاحظہ ہو" اہل حدیث کے امتیازی صہ۶۶ اور پرچہ تنظیم ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ پر مضمون لوگوں کی خاطر ہی لکھا ہے۔ اگر کوئی بُرا کہتا ہو گا تو اُمید ہے اُس کو فائدہ ہو گا۔ ہاں بہت سے اختلاف کو فائدہ مشاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے بیس پر تشدد چھوڑ دیا۔ اب آٹھ بھی پڑھ لیتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۸

مستحب کو عملاً سنّت بنا دینا اور مستحب کو اعتقاداً بدعت کہنا آپ کے نزدیک کچھ فرق رکھتے ہیں یا نہیں اہل حدیث رد کر بتائیں۔

جواب

مستحب کو عملاً سنت بنا نا بھی درحقیقت اعتقاد میں فرق پڑنے سے ہوتا ہے جو عموماً آثار سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے عموماً آج بیس تراویح پر تشدد کرنے والوں کی حالت ہے اس لحاظ سے اس میں اور مستحب کو اعتقاداً بدعت کہنے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں بُرا کرتے ہیں۔ کیونکہ مرکز سے دونوں ہٹے ہوئے ہیں۔

اعتراض نمبر ۹

آپ کی جماعت کی تحقیقات عموماً تخفیف پر منتج ہوتی ہیں دلائل سے آپ اس کی وجہ بیان فرمائیں۔

جواب

یہ بات غلط ہے حنفیہ اس میں اول نمبر ہیں۔ اہل حدیث کہتے ہیں فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔ حنفیہ ایک آیت یا تین آیتیں کافی کہتے ہیں۔ اہل حدیث کہتے ہیں۔ رکوع سجدہ میں اطمینان کے بغیر نماز نہیں۔ حنفیہ کہتے ہیں ہو جاتی ہے۔ اہل حدیث کہتے ہیں تشہد درود وغیرہ کے بغیر نماز نہیں۔ حنفیہ کہتے ہیں ان کے بغیر ہو جاتی ہے۔ اہلحدیث کہتے ہیں سلام پھیرے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ حنفیہ کہتے ہیں خواہ سلام کی جگہ پاد نماز ہو جائے گی۔ ہم کہاں تک ان کی تخفیفات لکھیں کچھ نمونہ دیکھنا ہو تو اہلحدیث کے امتیازی مسائل کے اخیر میں صفحہ ۷ دیکھ لیں۔

اعتراض نمبر ۱۰

مضمون میں نقل شدہ حدیث میں مذکور ہے کہ صحابہ گیارہ رکعت صبح تک ادا کرتے رہتے تھے۔ اور ان میں کھڑا رہ کر ادا کرنا اتنا ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ صحابہ لاٹھیوں کے سہارے کھڑے رہتے تھے لیکن بیٹھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے کسی کونے میں غیر مقلدین کا کوئی ایسا گروہ ہے جس کا تراویح میں اس پر عمل ہو۔ اگر ہے تو بیان کریں۔ اور اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ پھر ایک شخص خلافِ حدیث نوافل کو التزاماً مسجد میں ادا کرتے۔ اور ساری رات میں ختم کرنے کی بجائے صرف آٹھ پڑھے تو آپ کے خیال میں وہ کس فتویٰ کا مستحق ہے؟

جواب

بخاری صفحہ ۲۶۹ میں ہے۔

قال نعم البدعۃ ھذہ والتی تنامون عنھا افضل من التی تقومون یرید اٰخر الّیل وکان الناس یقومون اولہ۔

یعنی یہ نیا کام اچھا ہے۔ اور جس نماز سے سوجاتے ہیں اُس سے اچھی ہے جو پڑھتے ہیں (یعنی اخیر رات کی اچھی ہے اور لوگ پہلی رات قیام کرتے تھے۔

اِس روایت سے معلوم ہوا کہ فجر تک نماز ضروری نہیں دلیسے کبھی کبھی زیادہ شوق کی وجہ سے قریب فجر تک بھی جاگتے رہتے تھے۔ مگر ضروری نہیں سمجھتے۔ ورنہ اوّل رات نماز پڑھ کر اخیر رات کیوں سو رہتے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تین راتیں نماز پڑھائی تھی تو ساری رات نہیں پڑھائی۔ صرف تیسری رات جاگے ہیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ ساری رات جاگنا ضروری نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرضیت کے خوف سے مسجد میں نفلوں کی نماز ترک کر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں ہمیشہ یہ سلسلہ جاری رکھنا اچھا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے جاری کر دیا۔ اِس کو حدیث کے خلاف کہنا غلطی ہے۔ رہا گیارہ کی بجائے آٹھ پڑھنے کا اعتراض تو اس کا جواب بھی اِس روایت سے نکل آیا۔ کیونکہ اخیر رات جب نماز افضل ہوئی تو کم سے کم وتر تو اخیر رات کے لئے ضرور رکھ لے۔ خیر یہ تو اہلحدیث کی عملی حالت کے متعلق جواب ہوا۔ مگر اعتراض لکھتے وقت آپ نے گھر کی طرف بھی توجہ کی۔ گھنٹے کن کے ہاں چھوٹتے ہیں۔ قرآن مجید کا ستیاناس کن کے ہاں ہوتا ہے۔ آٹھ سے بیس میں کن کے ہاں کم وقت صرف ہوتا ہے۔ حالانکہ قیام اللیل کے صـ۹۱ میں بیس کے پڑھنے کی کیفیت یہ لکھی ہے

یقرؤن بالمئین من القران وانهم کانوا یعتمدون علی العصی فی زمان عمر بن الخطاب۔

یعنی سو سو آیت والی سورتیں ایک ایک رکعت میں پڑھتے اور لاٹھیوں پر سہارا کرتے۔ خدا اپنے فضل سے نیکی بر باد گناہ لازم کی حالت سے بچائے۔ آمین۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

ایک مسجد میں بیک وقت کئی حافظوں کا نماز تراویح پڑھانا

سوال۔ ایک سہ منزلہ مسجد میں نماز تراویح بیک وقت پانچ حافظ پڑھاتے ہیں۔ اِس طور سے کہ نیچے کی منزل میں جہاں امام فرض نماز پڑھاتا ہے اس جگہ ایک حافظ اور تین حافظ دوسری منزل میں ہر ایک میں چند گز کا فاصلہ ہوتا ہے اور پانچواں حافظ تیسری منزل پر نماز تراویح میں قرآن مجید سناتا ہے۔ زید کہتا ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے اور کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ بیک وقت ایک سے زائد امام کسی صورت میں خواہ نماز تراویح ہو یا کوئی دوسری نماز۔ زمانہ نبوی سے لے کر خلفاء راشدین

صحابہ کرام۔ محدثین عظام اور ائمہ دین کے زمانہ میں کبھی اس طرح نماز باجماعت ادا نہیں کی گئی۔ اس لئے یہ بدعت ہے۔

عمرو کہتا ہے کہ یہ صورت جائز ہے۔ اس لئے کہ قوم کے لئے بچے حافظ ہوتے ہیں۔ اگر ان کو مسجد میں قرآن سنانے اور پڑھنے کا موقعہ نہ دیا جائے تو وہ پابندی سے پڑھ نہیں سکتے۔

زید اور عمرو دونوں میں سے کس کی رائے صحیح ہے۔

ایک سائل کلکتہ انڈیا

جواب:۔ اس مسئلہ میں ہم چند روایات مقاصد حسنہ صفحہ ۱ سے نقل کرتے ہیں۔ جن سے مسئلہ بخوبی واضح ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔

لا یجھر بعضکم علی بعض بالقرآن (قال شیخنا) وھو صحیح من حدیث البیاضی فی الموطاء وابی داؤد وغیرھما قلت وحدیث البیاضی عند ابی عبید فی فضائل القرآن من جھة ابی حازم التمار عنه قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی الناس وھم یصلون وقد علت اصواتھم فقال المصلی یناجی ربه فلینظر بما یناجیه ولا یجھر بعضکم علی بعض بالقران وان حدیث الاوزاعی عن یحیٰی بن ابی کثیر رفعه مرسلا مثله۔

یعنی صحیح حدیث میں ہے کہ بعض تمہارا بعض پر قرآن مجید کے ساتھ آواز بلند نہ کرے یہ حدیث موطاء اور ابو داؤد وغیرہ میں ہے۔ اور فضائل القرآن ابی عبیدہ میں ابی حازم کے واسطہ سے اس حدیث کو بیاضی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (گھر سے) لوگوں پر نکلے اور وہ متفرق طور پر نمازیں پڑھ رہے تھے۔ اور اُن کی آوازیں بلند تھیں۔ فرمایا نمازی خدا سے مناجات کرتا ہے پس دیکھے کہ مناجات کیا کرتا ہے اور بعض تمہارا بعض پر قرآن مجید کے ساتھ آواز بلند نہ کرے۔

۲۔ عن علی مرفوعا لا یجھر بعضکم علی بعض بالقراۃ قبل العشاء وبعدھا وھو عند الغزالی فی الاحیاء بلفظ بین المغرب والعشاء واخرجه ابو عبید من حدیث ابی اسحق عن الحارث عن علی قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان یرفع الرجل صوته بالقراءۃ قبل العشاء الاخرۃ وبعدھا یغلط اصحابه۔

یعنی حضرت علیؓ سے مرفوع روایت ہے کہ بعض تمہارا بعض پر قرأت کے ساتھ آواز بلند نہ کرے نہ عشاء سے پہلے اور نہ عشاء کے بعد اور غزالی نے احیاء میں اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ اس میں درمیان اور مغرب اور عشاء کے ہے۔

اور ابو عبیدہ نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ بعض تمہارا بعض پر قرأت کے ساتھ آواز بلند کرے۔ خواہ پہلے عشاء خواہ بعد ساتھیوں کو غلطی میں ڈالتا ہے۔

ولابی داؤد من حدیث اسماعیل بن امیۃ عن ابی سلمۃ عن ابی سعید الخدری قال اعتکف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد فسمعھم یجھرون بالقرأۃ فکشف الستر وقال الا ان کلکم مناج ربہ فلا یوذین بعضکم بعضا ولا یرفع بعضکم علی بعض بالقرأۃ اوقال فی الصلوۃ واخرجہ النسائی فی فضائل القران من سننہ ایضا۔

یعنی ابوداؤد میں ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں اعتکاف بیٹھے۔ لوگوں کو سنا کہ آواز بلند سے قرأت کرتے ہیں۔ آپ نے پردہ اٹھا کر فرمایا کہ تم سب خدا سے مناجات کرتے ہو۔ بعض تمہارا بعض کو ایذا نہ دے اور ایک دوسرے پر قرأت یا نماز بلند آواز نہ کرے۔ اور نسائی نے بھی اپنی کتاب سنن باب فضائل القرآن میں اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

ان روایتوں سے ثابت ہوا کہ جب ایک دوسرے کو آواز پہنچے تو اس طرح سے ایک وقت میں کئی حافظوں کا تراویح پڑھانا درست نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

نماز تراویح کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

سوال :۔ ہمارے ملک میں بہت سے علماء اہل حدیث نماز تراویح پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں اس کے بعد تین وتر پڑھتے ہیں۔ کیا اس طرح دعا کا کوئی ثبوت ہے۔

عبدالرحمٰن حصاری

جواب:۔ آپ کا سوال ہاتھ اٹھانے کے متعلق ہے۔ حالانکہ مطلق دعاء ہی کا ذکر نہیں۔ یعنی ہاتھ اٹھانے اور نہ اٹھانے دونوں کا ذکر نہیں۔ سکوت محض ہے۔ ایسے موقعہ پر عمومات پر عمل ہوتا ہے۔ یعنی دُعاء کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ عام اجازت ہے۔ جس وقت چاہے مانگے۔ اور ہاتھ اُٹھائے چاہے نہ اٹھائے عمومات پر عمل کا طریقہ یہ ہے کہ کسی خاص صورت کا التزام نہ کرے۔ جس سے شُبہ پڑے کہ اس وقت دُعاء مانگنے کا حکم ہے بلکہ کبھی مانگ لے اور کبھی ترک کر دے۔ اور کبھی کسی وقت مانگے اور کبھی کسی وقت۔ خاص کر جماعتی صورت میں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ عوام لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ جماعتی شکل میں جو کام ہو رہا ہے تو یہ حکم اس طرح ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ۔ ۷ امئی ۱۹۶۳ء

قرآن مجید ختم ہونے پر وعظ کرنا اور مٹھائی تقسیم کرنا

سوال:۔ ماہ رمضان المبارک میں جب مساجد میں قرآن مجید ختم ہوتا ہے تو وعظ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔ بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب سورۃ بقرہ ختم کی تو دس اونٹ ذبح کئے اس سے معلوم ہوا کہ کسی دینی کتاب کے ختم ہونے پر اگر کوئی خوشی کی جائے تو حرج نہیں لیکن اس کا التزام کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا جیسے آج کل ہوتا ہے یہ طریقہ مناسب نہیں۔ کیونکہ سلف میں اس قسم کے التزام کا ثبوت نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

جمعہ کا بیان

جمعہ اور ظہر کیا یہ الگ الگ دو ہیں یا ایک

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء غیر مقلدین و مانع ظہر بعد الجمعہ اس مسئلہ میں کہ:۔

۱۔ نماز جمعہ عین ظہر ہے یا غیر ظہر

اگر عین ظہر ہے تو اس میں تخالف کیوں ہے مثلاً

(۱) غلام۔ مسافر۔ قیدی عورت۔ نابینا۔ لنگڑا۔ بیمار۔ بیمار کی خدمت کرنے والا۔ جنازہ کرنے والا۔ بوقتِ بارش دیہاتی صحرائی پر جمعہ فرض نہیں مگر ظہر ان سب پر فرض ہے۔

(۲) جمعہ بلا شرط خطبہ ادا نہیں ہوتا مگر ظہر بلا خطبہ ادا ہوتی ہے۔

(۳) جمعہ بلا جماعت نہیں مگر ظہر اکیلے بھی درست ہے۔

(۴) جمعہ بلا شاہ اسلام نہیں مگر ظہر بغیر اس کے فرض ہے۔

(۵) جمعہ اپنے وقت سے باہر فرض نہیں مگر ظہر اپنے وقت اور خارج از وقت برابر فرض ہے۔

(۶) جمعہ بغیر عذر کے ترک ہو جائے تو ایک دینار دینے سے معاف ہو جاتا ہے مگر ظہر کے لئے یہ شرط نہیں۔

(۷) جمعہ دو رکعت اور ظہر چار رکعت۔ ظہر میں قرارت آہستہ اور جمعہ میں بلند پھر اس پر حکم ظہر؟

(۸) نماز پنجگانہ روزانہ ہر مومن و مومنات پر فرض ہے یا نہیں۔ اگر فرض ہے تو کتنی رکعت؟

(۹) پانچ نمازیں پہلے فرض ہوئیں یا جمعہ۔ اگر پنجگانہ پہلے فرض ہوئیں تو بروز جمعہ ترکِ ظہر کے لئے کونسی دلیل ہے؟

(۱۰) اگر جمعہ پہلے فرض ہوا ہے تو قبل از فرضیت صلوٰۃ خمسہ حضور صلعم کہاں پر جمعہ ادا فرماتے تھے۔ اکیلے اکیلے یا جماعت کے ساتھ۔

(۱۱) بروز جمعہ ظہر فرض ہے یا جمعہ۔ اگر ظہر فرض ہے تو کتنے رکعت۔ اگر جمعہ فرض ہے تو کتنے رکعت۔ اگر جمعہ فرض ہے تو جس کو جمعہ نہ ملے تو وہ جمعہ پڑھے یا ظہر اگر جمعہ پڑھے تو اس کی دلیل تحریر ہو۔ اگر ظہر پڑھے تو کیوں؟ اس روز تو بقول آپ کے اس پر جمعہ ہی فرض نہ تھا۔ نہ ظہر فرض تھی۔

(۱۲) ہر نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا شرط ہے۔ اگر بقول آپ کے خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے تو اس میں توجہ قبلہ کیوں نہیں۔ اگر نماز مشرق کی طرف منہ کر کے پڑھیں تو کیا نماز ادا ہو جائے گی۔

(۱۳) اگر کسی کا نصف خطبہ ترک ہو جائے تو بعد سلام امام یا مقتدی ایک رکعت اٹھ کر ادا کرے یا نہیں۔

(۱۴) جمعہ کی ایک رکعت پانے والا بعد سلام امام مقتدی تین رکعت ادا کرے یا نہیں۔

(۱۵) جماعت ظہر میں ایک رکعت پانے والا بعد سلام امام مقتدی تین رکعت ادا کرے گا یا نہیں۔

(۱۶) جمعہ مشروط با شرائط ادا ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا ایک شرط کے فوت ہونے سے جمعہ ادا ہو جائے گا۔ یعنی فرض وقتی سے بری الذمہ ہو جائے گا۔ اگر مشروط نہیں تو اکیلے جہاں چاہے آبادی ہو یا جنگل سواری ریل ہو یا کشتی جمعہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں۔

(۱۷) جس مسجد میں جمعہ ہو چکا ہو۔ وہاں ایک دو نمازی بعد میں آئیں تو ظہر پڑھیں یا جمعہ۔ اگر جمعہ پڑھیں تو اذان و اقامت سے ادا کریں یا نہیں۔

یہ تمام سوالات ایک حنفی مقلد نے کئے ہیں۔

راقم محمد از کھیپانوالی ڈاکخانہ مکتسر ضلع فیروز پور مورخہ ۲ شوال ۱۳۵۵ھ

جواب ۔ جمعہ کے عین ظہر ہونے سے کیا مراد ہے۔ اگر یہ مراد ہے کہ احکام میں فرق نہیں تو اس معنیٰ سے عین ظہر نہیں بلکہ غیر ظہر ہے۔ کیونکہ ظہر اور جمعہ میں کئی احکام میں فرق ہے۔ چنانچہ سوال میں ذکر ہے اگرچہ سوال میں بعض ایسے احکام بھی ذکر ہیں جو صحیح نہیں جیسے بادشاہ کی شرط کرنا یا بلا عذر ترک کی صورت میں بغیر توبہ کے ایک دینار سے معاف ہوجانا لیکن بعض کی صحت میں کوئی شبہ نہیں جیسے خطبہ جماعت وغیرہ۔

اگر عین ظہر ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس سے ظہر ساقط ہوجاتی ہے تو بے شک صحیح ہے۔ دلیل اس کی قرآن و حدیث ہے۔ قرآن مجید میں ہے وَاِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ۔ اس آیت میں نماز سے مراد بالاتفاق جمعہ کی نماز مراد ہے۔ شانِ نزول بھی جمعہ کی نماز میں ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ

یعنی جب نماز جمعہ سے فراغت ہوجائے تو زمین میں روزی کی تلاش کے لئے پھیل جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن نماز ظہر نہیں۔ مشکوٰۃ وغیرہ میں بکثرت احادیث موجود ہیں کہ رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اور یہ بھی آیا ہے کہ جو شخص تین جمعہ متواتر چھوڑ دے اس کے دل پر مہر ہوجاتی ہے۔ نیز اوپر کی آیت بھی دلالت کرتی ہے کہ جمعہ کے دن نماز ضروری ہے۔ سب کاروبار چھوڑ کر نماز جمعہ کو حاضر ہونا چاہیے۔ پس جمعہ کے دن نماز ضروری ہوئی تو اب ظہر کا حکم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ چھ نمازیں فرض ہوں معاذ اللہ خدا ایسا نہیں کہ پچاس نمازوں کی پانچ کرکے چھ کردے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے ندا آئی۔

امضیت فریضتی وخففت عن عبادی متفق علیہ (مشکوٰۃ باب المعراج)

یعنی میں نے اپنا فرض جاری کردیا اور اپنے بندوں پر تخفیف کردی۔

اور بعض روایتوں میں مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ بھی آیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا اب یہ بات میرے نزدیک بدلی نہیں جائے گی۔ پانچ نمازوں سے کم ہوں گی اور نہ زیادہ۔

اس تمہید کے بعد اب ہر سوال کا جواب نمبروار سنئے۔

احکام میں فرق ہونے کی وجہ سے جمعہ غیر ظہر ہے۔ اور ظہر ساقط ہونے کی وجہ سے نمازِ جمعہ عین ظہر ہے۔ سنت مؤکدہ سے تحیۃ المسجد ادا ہوجاتا ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک رکوع سے سجدۂ تلاوت ادا ہوجاتا ہے تو ظہر اور جمعہ میں تو اتنا فرق نہیں۔ اِس کا جمعہ سے ساقط ہونا معمولی بات ہے۔ ظہر کے ساقط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رات دن میں صرف پانچ نمازیں فرض ہیں چھ نہیں۔ چنانچہ اُوپر تفصیل ہوچکی ہے۔ نیز وہ حدیث بھی دلیل ہے جو جواب نمبر ۱ میں آئی ہے۔

۱۔ روزانہ پانچ ہی نمازیں فرض ہیں۔ جمعہ کے دن پندرہ رکعتیں فرض ہیں اور باقی دنوں میں سترہ۔ کیونکہ جب جمعہ سے ظہر ساقط ہوگئی تو ضرور ہے کہ جمعہ کے دن پندرہ رکعتیں فرض ہوں۔ ۹-۱۰ حدیث میں ہے کہ پہلے نماز۔ دو، دو رکعت فرض ہوئی۔ پھر ہجرت کے بعد چار رکعت ہوگئی اور سفر کی نماز اِسی حالت پر رہی۔ اور خوف کی نماز ایک رکعت ہوگئی۔ بلوغ المرام میں ہے مغرب کی نماز چار رکعت نہیں ہوئی اِس لئے کہ وہ دن کے وتر ہیں۔ اور فجر کی نماز بھی چار رکعت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس میں قرأت لمبی ہے۔ نیز ہجرت سے پہلے وضو کے فرض ہونے کی کوئی دلیل نہیں جس آیت سے وضوء کی فرضیت ثابت ہوتی ہے وہ مدنی ہے۔ اِس طرح سے آہستہ آہستہ نمازوں کے احکام میں فرق پڑتا رہا۔ اِس فرق سے بعض نمازوں کے نام میں بھی فرق پڑ گیا۔ مثلاً نمازِ سفر۔ نمازِ خوف۔ نمازِ جمعہ وغیرہ۔

اب سوال میں نمازِ جمعہ کو نمازِ پنجگانہ سے الگ کرکے یوں سوال کرنا کہ نمازِ پنجگانہ پہلے فرض ہوئی یا جمعہ اس سے کیا مُراد ہے۔ اگر یہ مُراد ہے کہ نمازِ جمعہ نمازِ پنجگانہ سے الگ ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ اِس سے لازم آتا ہے کہ نمازِ خوف وغیرہ بھی الگ ہو کیونکہ معراج کی رات یہ قسمیں نہ تھیں۔ اور اگر یہ مُراد ہے کہ نمازِ جمعہ پانچ نمازوں میں داخل ہے۔ لیکن ظہر میں جمعہ کے دن کچھ تفصیل آنے کی وجہ سے جمعہ کے دن کی ظہر کو نمازِ جمعہ نام رکھ دیا تو یہ بالکل صحیح ہے لیکن اِس صورت میں پہلے پچھلے کا سوال فضول ہے۔ اگر پیچھے ہوا اور حقیقت میں ہے بھی پیچھے کیونکہ آیت جمعہ پیچھے اُتری ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ عموماً عبادات میں ایسا فرق پڑتا رہا۔ دیکھئے زکوٰۃ مکہ میں فرض ہوئی لیکن سونا۔ چاندی۔ اُونٹ۔ بکری کی تفصیل سے اَور ہر ایک کا الگ نصاب یہ سب کچھ مدینہ میں ہوا۔ پہلے محرم کا روزہ تھا۔ پھر رمضان اُترا۔ جس میں روزہ کی جگہ فدیہ (ایک مسکین کو کھانا دینے) کا بھی اختیار تھا۔ پھر اس کے بعد روزہ رکھنا لازم ہوگیا۔ اس طرح سے بہت سے احکام بدلتے رہے۔ ٹھیک اس طرح ظہر میں کچھ کمی بیشی کرکے نمازِ جمعہ ہوگئی زید کا اگر ہاتھ کٹ جائے یا کوئی جگہ اس کی سُوج جائے یا بچہ سے جوان یا بوڑھا ہوجائے تو کیا وہ کوئی اور شخص ہوجایا کرتا ہے۔ یہ کیسا فضول سوال ہے، جس کا نہ سر ہے نہ پیر ہے۔

۱۱۔ جمعہ کے دن جمعہ ہی فرض ہے لیکن اگر جمعہ نہ ملے تو ظہر پڑھے۔ مشکوٰۃ باب الخطبۃ والصلوٰۃ

میں حدیث ہے۔ جو جمعہ کی ایک رکعت پالے وہ دوسری ساتھ ملالے اور جس سے دونوں رکعتیں فوت ہوگئیں وہ چار پڑھے یا فرمایا ظہر پڑھے۔ اس کی مویدا اور روایتیں بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو نیل الاوطار وغیرہ۔

۱۲۔ یہ ہم نہیں کہتے حضرت عمرؓ۔ حضرت عائشہؓ سے مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ خطبہ دو رکعت کے قائم مقام کیا گیا ہے لیکن اس کے بعض احکام میں فرق کر دیا گیا ہے جیسے ظہر جمعہ میں فرق ہے کیونکہ دو رکعتیں ظہر کی کم کرکے ان کی جگہ خطبہ رکھنا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ سامعین کو وعظ ہو۔ اور وعظ کی اصل صورت یہ ہے کہ سامعین کی طرف منہ ہو۔ اس لئے قبلہ رُخ ہونے کی شرط اڑا دی۔ جیسے صلوۃ خوف کی بعض صورتوں میں جس طرف منہ ہو۔ اُسی طرف درست ہے۔ اس طرح سفر میں وتر اور نفل سواری پر جس طرف منہ ہو درست ہیں۔ اس طرح فجر کی نماز میں لمبی قرأت دو رکعت کے قائم مقام ہے لیکن لمبی قرأت ضروری نہیں۔ اس طرح صدقۂ فطر روزہ کی کمی اور نقصان کو پورا کرتا ہے مگر احکام الگ ہیں۔ اور صدقۂ فطر کے الگ اور نماز میں بھول کر پانچ رکعت پڑھی جائیں تو سجدہ سہو ایک رکعت کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سورہ بقر کی آخری دو آیتیں رات میں پڑھے تو قیام لیل کا کام دے سکتی ہیں۔ اسی طرح سورہ آل عمران کا آخری رکوع۔ حالانکہ قرآن مجید میں قبلہ رُخ ہونا شرط نہیں۔ غرض یہاں رائے قیاس کو کوئی دخل نہیں حکم کی تعمیل ہے جس طرح وارد ہوا اُسی طرح کرتے جانا چاہیے۔ مومن کا کام آمنا و صدقنا ہے نہ چون و چرا۔ اور اگر آپ ضرور کریدہی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی مثال آپ یوں سمجھئے کہ تھانیدار کی عدم موجودگی میں تھانیدار کا کام منشی کرتا ہے حالانکہ ویسے ان میں بڑا فرق ہے

(۱۳-۱۴-۱۵) ان تینوں نمبروں کا جواب نمبر ۱ میں آچکا ہے۔

(۱۶) جو شرائط قرآن و حدیث میں آچکے ہیں وہ بسر و چشم منظور ہیں اور ان کے فوت ہونے سے جمعہ نہیں ہوگا جیسے جماعت۔ ہاں کسی شرط کی بابت حدیث میں آجائے کہ اس کے نہ پانے کی صورت میں بھی جمعہ ہو جائے گا تو اس صورت میں جمعہ ہو جائے گا جیسے نمبر ۱ میں گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے صرف ایک رکعت پائی نہ خطبہ پایا نہ پہلی رکعت میں شامل ہوا تو وہ ایک رکعت اور ملالے گویا خطبہ فوت ہونے سے اس کے جمعہ میں فرق نہیں آیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے شافعیہ کہتے ہیں رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے حالانکہ ان کے نزدیک فاتحہ فرض ہے اور حنفیہ کے نزدیک بھی رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے حالانکہ ان کے نزدیک قیام فرض رہ جاتا ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہم تکبیر کہہ کر قیام کرکے امام کے ساتھ ملتے ہیں تو یہ حدیث کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ امام کو جس حالت میں پاؤ اس کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اس لئے اگر امام سجدہ میں ہو تو کوئی شخص رکوع کرکے سجدہ میں امام

سے جا ملے تو اس کا نہ شافعیہ اعتبار کرتے ہیں نہ حنفیہ۔

(۷) نمبر ۱ میں اس سوال کا جواب آچکا ہے کیونکہ نمبر ۱ میں جو حدیث گزری ہے وہ عام ہے۔ ایک کو بھی شامل ہے زیادہ کو بھی۔ چنانچہ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الْجُمُعَةِ فَلْيُصَلِّ اِلَيْهَا اُخْرٰى وَمَنْ فَاتَتْهُ الرَّكْعَتَانِ فَلْيُصَلِّ اَرْبَعًا اَوْ قَالَ الظُّهْرَ۔

یعنی جو جمعہ کی ایک رکعت پائے وہ ساتھ دوسری ملائے اور جس سے دونوں رکعتیں فوت ہو جائیں تو وہ چار پڑھے یا فرمایا ظہر پڑھے۔

اس حدیث میں کلمہ مَن ہے جس میں ایک بھی داخل ہے اور زیادہ بھی داخل ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں ہے۔

ومن الناس من يقول امنا بالله وباليوم الاخر وما هم بمومنين۔

یعنی بعض لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن آخرت پر لیکن حقیقت میں سب وہ ایمان والے نہیں

نوٹ:۔ جمعہ اور ظہر اور دیہات میں جمعہ کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو ہمارا رسالہ اطفاء الشمعہ ملاحظہ کریں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۲۴ مارچ ۱۹۳۳ء ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

عورت الگ جمعہ پڑھا سکتی ہے

سوال:۔ عورتیں علیحدہ کسی کے گھر کسی عورت کی امامت میں جمعہ پڑھ سکتی ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کے زمانہ میں یا بعد کسی زمانہ میں عورتوں نے عورت کی امامت میں الگ جمعہ پڑھا ہو۔

جواب:۔ جمعہ کے متعلق خاص واقعہ ملنا تو بہت مشکل ہے۔ ہاں پانچ وقتی نماز سے استدلال ہو سکتا ہے کیونکہ جب ایک نماز میں ایک چیز ثابت ہو جائے تو سب نمازیں اس میں یکساں ہوتی ہیں جب تک کوئی مانع نہ ہو مثلاً پانچ وقتی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ذکر آجائے تو یہی جمعہ۔ عیدین۔ نماز کسوف وغیرہ کے لئے کافی ہے۔ اس کے لئے الگ واقعہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ متفقہ مسئلہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بہت گڑبڑ ہوگی مثلاً رفع یدین آمین وغیرہ۔ ایک نماز میں ثابت ہو جائے تو یہ سب میں جاری ہوگا۔ نماز جمعہ وغیرہ میں ہمیں الگ دلیل

تلاش کرنے کی ضرورت نہیں یہ کم علم لوگوں کا کام ہے کہ بحثوں میں پڑجاتے ہیں۔خاص کر جمعہ تو پانچوقتی نماز میں شامل ہے کیونکہ ظہر کے قائم مقام ہے تو اس میں عورت کی امامت بدعت نہیں ہوسکتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی ع ۱۱۹

۱۱ ربیع الاخر ۱۳۷۸ھ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء

کیا اکیلے کا جمعہ ہوجاتا ہے

سوال :۔ زید کہتا ہے کہ آدمی جنگل میں یا کھیت میں سخت ضرورت کے سبب گاؤں میں حاضر نہ ہو سکتا ہو تو اپنے کھیت میں اکیلا جمعہ پڑھ لے تو فرض ادا ہوجائے گا۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

اول۔ عبداللہ بن عباس کا قول ہے۔امام شوکانی رو کشف الغمہ میں لکھتے ہیں کہ ایک آدمی کا جمعہ ہوجاتا ہے ابن عباس رضؓ سے کسی نے سوال کیا کہ اگر کوئی آدمی اکیلا اپنے کھیت میں جمعہ پڑھ لے تو کیا حکم ہے آپ نے فرمایا لاحرج ابن زبیر کے زمانہ میں عید و جمعہ اکٹھے آئے تو ابن زبیر جمعہ کو نہ آئے اکیلے پڑھ لیا۔

ابوداؤد و بخاری میں ہے کہ جمعہ کے دن بارش ہوئی تو ابن عباس رضؓ نے موذن کو کہا کہ الصلوٰۃ فی بیوتکم کہو شاید انہوں نے اپنے گھروں میں ہی جمعہ پڑھا ہو۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ وہ بکریوں والا جو پہاڑی پر رہتا تھا ہوسکتا ہے کہ وہ جمعہ اکیلا پڑھ لیتا ہو۔

واختلفوا فی مصداق لفظ الجماعۃ قال الحافظ فی فتح الباری شرح البخاری فیہ خمسۃ عشر مذہبا احدھا تصح من الواحد نقلہ ابن حزم والیہ ذھب القاشانی والحسن بن صالح ۔ الخ دلیل آیت شریفہ کفرتم بعد ایمانکم ان نعف عن طائفۃ منکم نعذب طائفۃ بانھم کانوا مجرمین۔

اس آیت میں ایک آدمی کو اللہ تعالےٰ نے جماعت فرمایا ہے۔ زید یہ دلیل پیش کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اشد ضرورت والا اپنے کھیت میں یا اکیلا آدمی ہے۔ اس کے گاؤں میں بالکل جمعہ ہوتا ہی نہیں اور دوسری جگہ نہیں سکتا تو ایسی ضرورت میں اکیلا جمعہ کی تکبیر بلند کہہ کر بطور جماعت کے پڑھ لے تو جمعہ ادا ہوجائے گا۔

عمرو کہتا ہے کہ ایک آدمی کو مطلقاً ہرگز ہرگز جمعہ جائز نہیں۔ تمام اہل اسلام کے برخلاف ہے۔ اجماع کے برخلاف ہے۔ آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھی برخلاف ہے کیونکہ حدیث میں جماعت کا لفظ آیا ہے۔ دو ہوں تو جمعہ

تا ہے اکیلا ہرگز نہیں پڑھ سکتا۔ فقط

سوال یہ ہے کہ زید و عمرو دونوں سے حق پر کون ہے۔ اکیلا جمعہ پڑھ لیوے تو جمعہ ادا ہوجاتا ہے یا نہیں۔

صدر الدین قریشی چشتی

جواب۔ مشکوۃ میں ہے۔

عن طارق بن شہاب رض قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا علی اربعۃ عبد مملوك او امراۃ اوصبی اومریض رواہ ابوداؤد وفی شرح السنۃ بلفظ المصابیح عن رجل من بنی وائل۔ (مشکوۃ باب وجوبہا)

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار کے سوا ہر مسلمان پر جماعت میں جمعہ حق واجب ہے صرف غلام عورت۔ لڑکا۔ بیمار اس حکم سے خارج ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جماعت ضروری ہے۔

امام شوکانی رحمہ نیل الاوطار میں لکھتے ہیں۔

لامستند لصحتہا من الواحد المنفرد واما من قال انہا تصح باثنین فاستدل بان العدد واجب بالحدیث والاجماع ورای انہ لم یثبت دلیل علی اشتراط عدد مخصوص وقد صحت الجماعۃ فی سائر الصلوات باثنین ولا فرق بینہا وبین الجماعۃ ولم یات نص من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بان الجمعۃ لا تنعقد الا بکذا وھذا القول ھو الراجح عندی (نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۱)

یعنی اکیلے کے جمعہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں اور جو کہتے ہیں کم از کم دو کے ساتھ جمعہ ہوجاتا ہے انہوں نے (اوپر کی) حدیث اور اجماع سے استدلال کیا ہے۔ حدیث اور اجماع دونوں سے جماعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور کسی حدیث میں عدد کی تعیین نہیں آئی۔ اور باقی نمازوں میں دو کی جماعت ہوجاتی ہے تو جمعہ میں بھی ادنیٰ درجہ سے جماعت ہوجائے گی۔ اور میرے نزدیک یہی قول راجح ہے۔

نیز امام شوکانی دراری المضیہ شرح درر البہیہ میں اور نواب صدیق الحسن روضۃ الندیہ شرح درر البہیہ میں لکھتے ہیں۔

لولاحدیث طارق بن شھاب المذکور قریبا من تقیید الوجوب علی کل مسلم بکونہ فی جماعۃ ومن عدم اقامتھا صلی اللہ علیہ وسلم فی زمنہ فی غیر جماعۃ لکان فعلھا فرادی مجزیا کغیرھا من الصواب (ص۵۹)

یعنی اگر طارق بن شہاب کی حدیث نہ ہوتی جس کو جمعہ کو جماعت میں واجب کہا ہے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ پڑھنے کا ذکر نہ ہوتا تو جیسے اور نمازیں اکیلے اکیلے ہو جاتی ہیں۔ جمعہ بھی اکیلے اکیلے جائز ہوتا مگر حدیث مذکور اور آپ کا ہمیشہ جماعت میں پڑھنا اکیلے کے جمعہ صحیح ہونے سے مانع ہے زید نے اپنے دعوے کے جتنے دلائل دئے ہیں۔ ان سے ایک بھی اس بارہ میں صریح نہیں کہ اکیلے کا جمعہ ہو جاتا ہے۔ عید جمعہ کے اکٹھا ہونے کے دن ابن زبیرؓ کے جمعہ پڑھنے کا کہیں ذکر نہیں۔ پھر صحابی کا قول فعل حدیث کے مقابلہ میں حجت نہیں۔ اسی طرح بارش کی روایت میں اور پہاڑی پر رہنے والے کی حدیث میں جمعہ پڑھنے کا کوئی ذکر نہیں پھر گھروں میں کئی آدمی ہوتے ہیں اکیلے ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

رہا ابن عباسؓ کا قول جو کشف الغمہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے امام شوکانیؒ کے نزدیک صحت کو نہیں پہنچا۔ ورنہ نیل الاوطار کی عبارت میں جماعت کی شرط پر اجماع ذکر نہ کرتے۔ پھر یہ حدیث کے خلاف ہے اس لئے بھی اس کا اعتبار نہیں۔ اس کے علاوہ کشف الغمہ میں جو ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے کا حقیقت میں جمعہ نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جو جمعہ نہ پائے وہ دو رکعت بھی پڑھ سکتا ہے اور چار بھی پڑھ سکتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک جس کو جمعہ نہ ملے اس پر چار رکعت ضروری نہیں۔ چنانچہ اصل عبارت یہ ہے۔

سئل ابن عباس عن رجل صلی الجمعۃ فی بستانہ فرادی فقال لا حرج اذا قام شعار الجمعۃ بغیرہ[ل] (کشف الغمہ ص۱۲۲)

یعنی ابن عباسؓ سے ایک شخص کی بابت سوال ہوا جو اکیلا اپنے باغ میں جمعہ پڑھے تو فرمایا کوئی حرج نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے بغیر جمعہ کا شعار قائم ہو۔ جمعہ کا شعار قائم ہونے کا مطلب یہ کہ باجماعت خطبہ کے ساتھ اس کے بغیر وہاں جمعہ ہوتا ہو تو اس صورت میں (بوجہ دوری کے باغ میں اکیلا پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔

ل یہ لفظ کتاب میں یا کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے صحیح با کے ساتھ ہے۔

اس عبارت کا مطلب صاف ہے کہ اس کی دو رکعت حقیقت میں جمعہ نہیں ورنہ اس کے بغیر جمعہ کے شعار قائم ہونے کی شرط قائم نہ کرتے۔ ابن عباسؓ نے یہ شرط اس لئے کی ہے کہ اس کے اکیلے خطبہ پڑھنے کا تو کچھ معنیٰ ہی نہیں کیونکہ خطبہ خطاب سے ہے۔ جو مخاطب کو چاہتا ہے تو صرف دو رکعت بغیر جماعت کے ہوئیں پس جب یہ دو رکعت حقیقت میں جمعہ نہ ہوئیں تو یہ کہنا کہ ابن عباس کا مذہب ہے کہ اکیلے کا جمعہ ہو جاتا ہے یہ صحیح نہ ہوا بلکہ اس کا مآل اس طرف ہوا کہ جو جمعہ نہ پا سکے وہ جمعہ کے دن کتنی رکعت پڑھے۔ ابن عباسؓ کا مذہب ہے کہ دو پڑھے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اور اکثر علماء کہتے ہیں۔ چار پڑھے اور حدیث کی رو سے یہی صحیح ہے ملاحظہ ہو (مشکوۃ باب الخطبہ)

اور زید کا یہ کہنا کہ جماعت کا استعمال ایک میں بھی ہوتا ہے یہ درست نہیں۔ جس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ ابن ماجہ وغیرہ میں حدیث ہے اثنان فما فوقھما جماعۃ۔ یعنی دو۔ پس دو سے زیادہ جماعت ہیں اور بخاریؒ نے اس پر باب باندھا ہے۔

(دوم) جماعت کا لفظ اجتماع کو چاہتا ہے۔ ایک شے کے اجتماع کا کچھ معنیٰ نہیں۔ اور آیت مذکورہ میں طائفہ کا لفظ اجتماع کو نہیں چاہتا۔ اس لئے اس کا استعمال ایک میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے اصل معنیٰ ٹکڑے کے ہیں خواہ ایک شخص ہو یا زیادہ ہوں۔

(سوم) طارق بن شہابؓ کی حدیث میں جماعت کی شرط کرنا فضول جاتا ہے۔ اگر ایک کا جمعہ ہو جاتا، تو جماعت کے لفظ کی ضرورت نہ تھی

(چہارم) طارق بن شہاب کی حدیث میں کلمہ فی ہے جس کے معنیٰ اندر کے ہیں۔ اور اندر تبھی ہو گا جب کم سے کم دو ہوں۔ گویا ایک یہ ہوا اور ایک دوسرا ہو تو دونوں کے مجموعہ سے جماعت بن گئی۔ اب ہر ایک کو اس جماعت کے اندر کہہ سکتے ہیں۔ جیسے نحوی کہتے ہیں۔ الکلام ما تضمن کلمتین۔ یعنی کلام وہ ہے جس کے اندر دو کلمے ہوں۔ حالانکہ کلام اصل میں دو کلموں سے بنتی ہے تو یہاں اندر کہنے کی وجہ یہی ہے کہ اکیلا اکیلا کلمہ دو کے مجموعے کے اندر ہے۔ پس اسی طرح اس حدیث میں سمجھنا چاہیئے۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ فرشتے اور جن شریک ہو جاتے ہیں۔ اس سے جماعت کا حکم ادا ہو جاتا ہے جیسے بعض روایتوں میں اس شخص کی نسبت اللہ کے لشکر فرشتوں، جنوں کے شامل ہونے کا ذکر آیا ہے جو جنگل میں اذان دے کر نماز پڑھے۔ ملاحظہ ہو ترغیب منذری (باب الصلوۃ فی الفلاۃ) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد ثواب جماعت ہے جیسے حدیث میں آتا ہے کہ

رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے یعنی حج کا ثواب مل جاتا ہے نہ یہ کہ حج کا ف[illegible]ض اس کے ذمہ سے اُتر گیا۔ ٹھیک اسی طرح فرشتوں کے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کا ثواب مل جاتا ہے نیز ف[illegible]شتوں جنوں کا شریک ہونا یہ ایک باطنی معاملہ ہے۔ ظاہری احکام کا تعلق اس سے نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ا[illegible]ے ساتھ ایک شخص ہو تو وہ امام کی دائیں جانب کھڑا ہوگا۔ اس خیال سے پیچھے کھڑا نہیں ہو سکتا کہ فرشتے اور جن آملیں گے۔ اسی طرح کوئی شخص اکیلا صف کے پیچھے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جماعت سے فراغت کے بعد ایک [illegible]ص مسجد میں آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم سے کوئی ہے جو ثواب حاصل کرے۔ یعنی اس کے سا[illegible] شامل ہو کر جماعت کرا دے تو حضرت ابوبکر رضہ کھڑے ہو کر شامل ہو گئے (منتقی مع نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۹)

اسی طرح اگر ہمارے احکام فرشتوں، جنوں سے تعلق رکھتے تو حضرت [illegible] کسی اور کے ساتھ شامل ہونے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رض نے شرط کی ہے کہ شعار جمعہ کسی اور سے ادا [illegible]ہو۔ اگر فرشتوں اور جنوں سے جماعت کا حکم پورا ہو جاتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی؟ اور حدیث میں بھی جماعت [illegible]رط کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ جب جن فرشتے شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے شامل ہونے سے جماعت کا [illegible]م پورا ہو جاتا ہے تو آپ کا یہ فرمانا فضول ہے کہ ہر مسلمان پر جماعت میں جمعہ واجب ہے۔ غرض جنوں، فرشتوں کا شا[illegible]نا ایک باطنی معاملہ ہے۔ ظاہری احکام کی بنا اس پر نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ کوئی شخص [illegible]یں اذان دے کر نماز پڑھے تو اس کی حرص کی وجہ سے فرشتوں، جنوں کا شامل ہونا اس کے لئے جماعت کے ثواب [illegible]بب بن جاتا ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ میں صبح کی نماز سے آفتاب نکلنے تک ذکر الٰہی [illegible]ے والوں کے ساتھ بیٹھوں تو یہ میرے نزدیک اولاد اسماعیل سے چار غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے۔ اسی طرح عص[illegible]ے مغرب تک فرمایا

(مشکوٰۃ با[illegible]ب الذکر بعد الصلوٰۃ)

حالانکہ کسی کے ذمہ غلام کا کفارہ ہو تو وہ اس ذکر سے ادا نہیں ہو سکتا۔ [illegible]ک اسی طرح فرشتوں، جنوں کے شریک ہونے سے جماعت کا ثواب مل جاتا ہے جماعت کا حکم ادا نہیں ہوتا

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ ۲۶ محرم الح[illegible] ۱۳۵۲ھ ۲۲ مئی ۱۹۳۳ء

گاؤں میں جواز جمعہ کے متعلق سوالات اور ان کے جوابات

سوال :- گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں اگر جائز ہے تو ان پر اعترا[illegible]ات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ اگر جمعہ فرض ہے تو جمعہ مکہ میں فرض ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قباء میں کیوں جمعہ نہیں پڑھا۔ آپ نے ترکِ فرض کیوں کی۔

۲۔ آپ نے بوقتِ ہجرت قباء میں چند یوم قیام کیا۔ جمعہ یہاں نہیں پڑھا بلکہ مدینہ منورہ آکر پڑھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے لئے دار السّلام یا خلیفۃ المسلمین کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ اگر جمعہ فرض ہے تو بارش کے دن ترک کی رخصت کیوں فرمائی۔ نیز جب عید کے دن جمعہ آجائے اُس دن ترکِ جمعہ کی کیوں رخصت ہے۔

۴۔ جس جگہ محدّثین تمام صحاح میں جمعہ کا باب باندھتے ہیں تو وہاں بجائے فرضیّت جمعہ کے وجوب جمعہ باب کیوں باندھتے ہیں۔ اور فرض سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ یہ مشعر ہے کہ جمعہ فرض نہیں۔

۵۔ حدیث میں آتا ہے الجمعۃ علی من آواہ اللیل اس کے بدون جمعہ نہیں۔ نیز ایک حدیث میں ہے لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع اور ایک حدیث میں ہے الجمعۃ علی من سمع النداء اگر گاؤں میں بھی آواز نہ آئے تو جمعہ ساقط ہے۔

۶۔ اگر گاؤں میں جمعہ فرض ہے تو حدیث شریف میں آیا ہے الناس یتناوبون یوم الجمعۃ او کما قال پھر مدینہ میں جمعہ کے واسطے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوگ اپنے اپنے گاؤں میں جمعہ ادا کر لیتے اور حضور علیہ السّلام نے ان کو کبھی حکم نہیں فرمایا تم گاؤں میں جمعہ ادا کر لیا کرو۔ یہاں آکر جمعہ پڑھنے کی تکلیف نہ اُٹھائیں۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع اور فتح مکہ کے وقت مکہ معظمہ میں قریباً اٹھارہ دن قیام کیا نہ آپ نے جمعہ پڑھا نہ لوگوں کو حکم دیا۔ اس کی کیا وجہ۔

جواب :۔ (۱) یہ شبہ جس روایت سے پیدا ہوا ہے اُس روایت کو حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص الحبیر میں نقل کیا ہے۔ اس کے دو جواب ہیں ایک تو اسی روایت میں مذکور ہے کہ نبی علیہ السّلام بوجہ عدم استطاعت ادا نہ فرما سکے۔ کیونکہ مکہ میں کفار کا زور تھا اور اہل اسلام کمزور تھے۔ دُوسرا جواب یہ ہے کہ مکہ میں جمعہ فرض ہونے کی روایت ضعیف ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

واختلف فی فرضیتہا فالاکثر علی انہا فرضت بالمدینۃ ومقتضی ما تقدم ان فرضیتہا بالآیۃ المذکورۃ وھی مدنیۃ وقال الشیخ ابو حامد فرضت بمکۃ وھو غریب ۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۳۵۴)

یعنی صحیح یہی ہے کہ جمعہ مدینہ منورہ میں فرض ہوا۔ اور جو شیخ ابو حامد نے کہا ہے مکہ میں فرض ہوا۔ یہ غریب اور شاذ ہے۔

۲۔ آپ نے قبا میں قیام کیا لیکن جمعہ ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ فرض ہی نہیں ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ نبی علیہ السلام پیر کے روز رونق افزاء قبا میں ہوئے اور جمعہ کے دن وہاں سے چل پڑے۔ اگر قریب کے جمعہ کو روانہ ہوئے تو چار دن ہوتے ہیں۔ اور حنفیہ کے نزدیک اگر مسافر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسافر ہی ہوتا ہے۔ اور مسافر پر جمعہ فرض نہیں۔ اور اہل حدیث کے نزدیک بھی آج کل کا ارادہ ہو تو مسافر ہی ہے۔ اگرچہ ایک ماہ یا زیادہ کیوں نہ گزر جائے۔ اس لئے نبی علیہ السلام نے اپنے کو مسافر سمجھا اور جمعہ ادا نہیں کیا۔ خصوصاً جب کہ ایک ضروری شغل میں مشغول تھے یعنی مسجد کی بنا میں۔

۳۔ کسی سبب کی وجہ سے رخصت عدم فرضیت پر دلیل نہیں۔ دیکھئے نماز ظہر، عصر، عشاء کی چار رکعت فرض ہے۔ اور سفر میں آسانی کے لئے دو رکعت فرض۔ تو کیا حضر میں بھی دو رکعت ہی فرض ہوگی۔ بارش و عیدین میں جمعہ کی رخصت بوجہ آسانی ہے نہ یہ کہ رخصت عدم فرضیت پر دلیل ہے۔

۴۔ محدثین کے نزدیک فرض واجب میں کوئی فرق نہیں حتیٰ کہ اصولیوں کے ہاں فرض واجب بسا اوقات ایک ہی ہے۔ ملاحظہ ہو تلویح حاشیہ توضیح۔ ثم المراد بالواجب ما اشتمل الفرض ایضا لان استعماله بهذا المعنیٰ شائع عندهم ص۲۱ مطبوعہ دار الاشاعت دیوبند) اس کے علاوہ محدثین کے سرتاج اپنی صحیح میں یوں تبویب فرماتے ہیں۔ باب فرض الجمعہ اور صاحب ابن ماجہ نے بھی اس طرح باب باندھا ہے۔

۵۔ حدیث الجمعة علی من آواہ اللیل اور الجمعة علی من سمع النداء یہ دونوں حقیقت ہیں۔ اور لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع حضرت علیؓ کا قول یعنی موقوف ہے جو مرفوع کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

۶۔ ایک نسخہ میں ینتابون یوم الجمعة ایک نسخہ میں الناس ینتابون الخ ہے۔ اور یہی راجح ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ لوگ پے در پے جمعہ کے دن آتے تھے یعنی کچھ اب آئے کچھ تھوڑی دیر بعد آگئے۔ لیکن آتے سب تھے۔ اور نبی علیہ السلام نے اُن کو اپنے اپنے گاؤں میں جمعہ ادا فرمانے کا حکم اس واسطے نہیں فرمایا کہ ایک مسائل دینی کی طرف اُن کا شوق زیادہ رہے گا۔ دوسرا یہ کہ تعلیم کا زمانہ تھا تو ایک نعمت عظمیٰ تھی اس واسطے لوگ جوق در جوق پے در پے جمعہ کو آتے اور اپنے قلوب انوار دینیہ سے منور کر کے واپس لوٹ آتے تھے۔

۷۔ حجۃ الوداع اور فتح مکہ میں جو آپ نے جمعہ ادا نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ مسافر تھے اور مسافر پہ جمعہ فرض نہیں۔ سکامر اور احناف کے نزدیک رعیت امام کے تابع ہے اور اہل حدیث کے نزدیک بارہ میل مسافت پر قصر جائز ہے۔ اس لئے لوگوں کو بھی نہیں دیا۔ ھذا مختصر اگر تفصیل مطلوب ہو تو ہماری کتاب اطفاء الشمعہ ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۶ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ ۹ اگست ۱۹۳۳ء

ایک شہر میں یا قریب کے دیہات میں متعدد جمعے

سوال:۔ قریہ واحد میں متعدد جگہ جمعہ پڑھنا اور خطبہ جمعہ میں تعبیر تذکیر بالقرآن والحدیث محض سورۃ قرانیہ واشعار پنجابیہ جن میں مسائل ضعیفہ موضوعہ بطرز شاعر ہوتے ہیں۔ پڑھ کر اکتفاء کرنا اور جامع مسجد جو اکبر المساجد ہے اس میں حاضر ہو کر ذکر اللہ نہ سننا یہ طریق جائز و درست ہے یا نہیں۔

اس سوال کے جواب میں مولوی عبدالقادر حصاری نے تعدد جمعہ کے عدم جواز کی جو دلیل بیان کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کے زمانہ میں جمعہ ایک جگہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اہل عوالی بھی جمعہ آپ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ لہذا ایک شہر میں یا قریب قریب دیہات میں الگ الگ جمعہ پڑھنا جائز نہیں۔ اس سے پہلے یہ لکھا ہے کہ تعامل قرون ثلاثہ کا اس امر کی تصریح ہے کہ جہاں اقامت جمعہ ہو وہاں سب کے سب مسلمانوں کی جماعت یکجا ہو کر جمعہ پڑھے جہاں دو ہوں وہاں دو پڑھیں کیونکہ الاثنان فمافوقھا جماعۃ۔ یعنی دو یا دو سے زیادہ جماعت ہیں۔ جہاں دو سے زیادہ تین یا پانچ حتیٰ کہ پچاس یا سو یا دو سو یا ہزار تک ہوں گے۔ اس جماعت پر بحالت مجموعی جمعہ فرض ہوگا۔ فرداً گروہ ہو کر اپنے گھروں اور محلوں میں پڑھنا ناجائز ہوگا۔ بلکہ سب جماعت اسلامی کو جمعہ کی مسجد دوسری مسجدوں سے ممتاز اور ایک جدا معین کرنی پڑے گی جس میں مسلمانوں کو ایک نماز پڑھنے سے پانچ سو نمازوں کا ثواب ملے گا۔ یہ نہیں کہ ہر محلہ میں جامع مسجد ہوگی کیونکہ جامع مسجد کا عطف عبادت حدیث میں محلہ کی مسجد پر ڈالا گیا ہے جو غیریت کو چاہتا ہے اور مفہوم ہوتا ہے کہ جمعہ ایک جامعین ہونا مشروع ہے اور جمعہ کے معنیٰ بھی جمع ہونے کے ہیں کہ اس روز اہل اسلام کا اجتماع خاص ہوتا ہے۔ یعنی سب یکجا جمع ہوتے ہیں نہ مثل پنجگانہ کے کہ وہ اجتماع خاص نہیں ہے (ملخص)

جواب :۔ محدث روپڑی فرماتے ہیں کہ بڑی دلیل تعددِ جمعہ کے عدم جواز کی جو آپ نے پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کے زمانہ میں جمعہ ایک جگہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اہل عوالی بھی جمعہ آپ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سو یہ دلیل اس صورت میں مکمل ہوسکتی ہے کہ فعل سے شرط ہونا ثابت ہو جائے مگر ظاہر ہے کہ فعل شرط ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ اگر شرط ہونے پر دلالت کرتا تو حضرت علی رضی کمزوروں کو مسجد میں الگ عید پڑھانے کے لئے کسی کو مقرر نہ کرتے کیونکہ اس سے پہلے کمزوروں کی رعایت سے عید دو جگہ نہیں ہوتی مگر حضرت علیؓ نے دو جگہ کر دی۔ پس ثابت ہوا کہ ایک جگہ ہونا شرط نہیں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ فعل شرط پر دلالت نہیں کرتا۔ ذی الحلیفہ مدینہ سے سات میل ہے اور بعض عوالی آٹھ میل ہیں اور چار میل تک تو کثرت سے ہیں چنانچہ عون المعبود وغیرہ میں اس کی تفصیل ہے تو اب تین صورتیں ہیں۔ اتنی دور سے جمعہ کو آنا یا تو اس لئے ہے کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں یا اس لئے کہ آٹھ میل تک تعدد جمعہ جائز نہیں یا زیادہ لوگ جمعہ پڑھنے فضیلت کے لئے آتے تھے۔ پہلی صورت صحیح نہیں کیونکہ گاؤں میں جمعہ صحیح ہے۔ اور دوسری بھی صحیح نہیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے۔

الجمعۃ علی کل من سمع النداء (ابوداؤد)

یعنی جمعہ ہر اس شخص پر ہے جو اذان سنے

اور قرآن مجید میں ہے۔

یا ایّھا الذین امنوا اذا نودی للصّلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ و ذروا البیع

یعنی اے ایمان والو جب جمعہ کے دن اذان دی جائے تو ذکر اللہ کی طرف دوڑو۔ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

اس آیت سے جمعہ کو آنا اس وقت لازم ہوتا ہے جب اذان ہو جائے۔ اگر سات آٹھ کوس سے جمعہ کو آنا ضروری ہو تو پھر صبح سے چلنا ہوگا۔ حالانکہ یہ آیت کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری جز ۲ ص ۴۸۸

پس جب پہلی دو صورتیں صحیح نہ ہوئیں تو تیسری صورت متعین ہو گئی کہ فضیلت کے لئے آتے تھے پس ثابت ہوا کہ تعدد جمعہ جائز ہے۔

نیز مسلم میں حدیث ہے۔

کان الناس ینتابون الجمعۃ من منازلھم ومن العوالی (مسلم صفحہ ۲۸۰)

یعنی لوگ اپنے گھروں سے اور عوالی سے یکے بعد دیگرے جمعہ کو آتے تھے۔

اس حدیث میں عوالی سے آنے کا الگ ذکر ہے اور گھروں سے آنے کا الگ ذکر ہے۔ گھروں سے آنے والوں میں اہلِ مدینہ بھی شامل ہیں۔ جب اہلِ عوالی کا محض فضیلت کے لئے آنا ثابت ہوا تو تمام اہلِ مدینہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیچھے آکر جمعہ پڑھنا بھی محض فضیلت کے لئے ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک شہر میں بھی تعدد جمعہ جائز ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں دو جگہ جمعہ نہیں ہوا یہ ٹھیک نہیں کیونکہ حضرت علیؓ سے تعدد جمعہ ثابت ہے۔

رسائل الارکان میں ہے۔

ولنا ما صح عن امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ امر بتعدد الجمعۃ و هذا الاثر صحیح صححہ ابن تیمیۃ فی منہاج السنۃ (رسائل الارکان صفحہ ۱۱۱)

یعنی امیر المومنین حضرت علیؓ نے تعدد جمعہ کا امر فرمایا۔ یہ روایت صحیح ہے۔ ابن تیمیہ نے اس کو منہاج السنۃ میں صحیح کہا ہے۔

نواب صاحب السراج والوہاج ملخص صحیح مسلم میں لکھتے ہیں۔

فاما تعدد الجمعات فی مصر واحد فھذہ المسئلۃ قد اشتھرت بین اھل المذاھب وتکلموا فیھا وصنف فیھا من صنف وھی مبنیۃ علی غیر اساس ولیس علیھا اثارۃ من علم قط وما ظنہ بعض المتکلمین فیھا من کونہ دلیلا علیھا ھو بمعزل عن الدلالۃ وما اوقعھم فی ھذہ الاقوال الفاسدۃ الاما زعموہ من الشروط التی اشترطوھا بلا دلیل ولا شبھۃ دلیل فالحاصل ان صلوۃ الجماعۃ صلوۃ من الصلوات یجوز ان تقام فی وقت واحد جمع متعددۃ فی مصر واحد کما تقام جماعات سائر الصلوات فی المصر الواحد ولو کانت المساجد متلاصقۃ ومن زعم خلاف ھذا کان مستند زعمہ مجرد الرای فلیس ذالک حجۃ علی احد وان کان مستند زعمہ الروایۃ فلا روایۃ فلا روایۃ ھذا ما افاد العلامۃ الشوکانی فی کتاب النیل

الجرار رحمۃ اللہ (السراج الوھاج صفحہ ۲۹۵)

یعنی ایک شہر میں تعدد جمعہ کا مسئلہ اہل مذاہب میں بہت مشہور ہے ... س میں انہوں نے بحث کی ہے۔ اور کتابیں لکھی ہیں اور یہ مسئلہ کسی بنیاد پر قائم نہیں نہ اس پر کوئی دلیل ... ہے اور جس کو بعض نے دلیل خیال کیا ہے وہ دلیل ہونے سے دُور ہے اور اس قسم کے فاسد اقوال کے ... صرف اس لئے قائل ہوئے ہیں کہ انہوں نے حسب زعم جمعہ کو کئی شرطوں سے مشروط کر رکھا ہے۔ حالانکہ اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ دلیل کا شائبہ بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جمعہ نمازوں سے ایک نماز ہے۔ اس کے جواز تعدد میں کوئی شبہ نہیں۔ جیسے باقی نمازوں کی متعدد جماعتیں جائز ہیں۔ اگرچہ مسجدیں قریب قریب ہوں اور جس نے اس کے خلاف خیال کیا۔ اگر اس کا اعتماد صرف رائے پر ہو تو یہ کسی پر حجت نہیں اور اگر کسی روایت پر اعتماد ہو تو ایسی کوئی روایت نہیں جو تعدد کو منع کرے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے السیل الجرار میں اس طرح لکھا ہے۔

نواب صاحب اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ... سب کامل کر جمعہ پڑھنا کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو اہل عوالی کو مدینہ آکر جمعہ پڑھنے کی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ پیغمبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی علیہ السلام سے براہ راست وعظ سنتے اور احکام سیکھنے کے لئے آتے تھے۔ بعد کے زمانہ میں تو بڑی وجہ فضیلت ہی بنتی ہے۔ پس نواب صاحب اور علامہ شوکانی فضیلت کی نفی نہیں کر سکتے بلکہ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک جگہ پڑھنا شرط نہیں جیسے دوسری نمازوں میں یہ شرط نہیں۔ اگر کہا جائے کہ پانچ نمازوں کا ایک جگہ ہونا یہ بھی فضیلت ہے تو پھر اہل عوالی اور مدینہ کی دوسری مسجدوں والے پانچوں نمازیں ایک جگہ کیوں نہیں پڑھتے تھے؟ تو اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ دُور دُور سے ہفتہ میں ایک دفعہ اکٹھے ہونا تو معمولی بات ہے۔ روزمرہ اور وہ بھی پانچ وقت اس طرح اکٹھے ہونا مشکل ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے اپنی نمازوں سے کچھ گھروں میں کرو (مشکوٰۃ باب المساجد) یعنی فرض مسجدوں میں پڑھو، اور نفل گھروں میں۔ اس طرح خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ محلہ محلہ بھی اذان ہو اور جماعتیں قائم ہوں چنانچہ حدیث میں ہے۔

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببناء المسجد فی الدور وان ینظف وان یطیب (مشکوٰۃ باب المساجد)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلوں میں مسجدیں بنانے اور ان کو صاف رکھنے اور خوشبو لگانے

کا ارشاد فرمایا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جمعہ کا ایک ہونا اگرچہ شرط نہیں لیکن وعظ وغیرہ کے اہتمام کے لئے سب کا ایک جگہ جمعہ پڑھنا ایک اہم امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچوقتی نماز کی جماعت نہ ملے تو اکیلے کی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن جمعہ اکیلے کا نہیں ہوتا۔ پس جب جمعہ میں وعظ وغیرہ کی خاطر جماعت کا اہتمام زیادہ ہو تو اس میں اکٹھ کی اہمیت زیادہ ہوئی۔ اس لئے اہل عوالی اور مدینے والے دُور دُور سے آکر شریک ہوتے۔ اور حضرت عمرؓ نے بھی اسی اہتمام کی وجہ سے ابُوموسیٰ رضہ وغیرہ کو لکھا کہ جمعہ کے دن اکٹھے ہو جایا کرو۔ اور اہل قباء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد نبوی میں آنے کا ارشاد فرمانا اگر صحیح ثابت ہو جائے تو اس کی وجہ بھی یہی زیادت اہتمام ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمعہ کا ایک جگہ ہونا ایک اہم امر ہے اور اس کی فضیلت بڑی ہے لیکن شرط نہیں۔ راجح مذہب یہی ہے ہاں کوئی احتیاط کرے تو الگ چیز ہے۔ واللہ الموفق

عبداللہ امرتسری از روپڑ

۱۲ شعبان ۱۳۵۳ھ ۲۹ نومبر ۱۹۳۴ء

کیا خطبہ جمعہ نماز سے چھوٹا ہونا چاہیئے

سوال:۔ ایک صحابی جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہیں تو دوسرے صحابی رضہ فرماتے ہیں کہ آج کا تمہارا خطبہ نہایت فصیح و بلیغ تھا مگر مختصر تھا۔ اگر بڑا ہوتا تو اس کو بہت طول کرتا۔ اس کے جواب میں خطیب صحابی نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خطبہ جمعہ کو مختصر کرو۔ اور نماز کو طول کرو۔ اور یہ کہ خطبہ کو مختصر کرنا خطیب کی دانائی کی علامت ہے۔ لہذا جواباً تحریر فرمائیں کہ مقدار وقت کے لحاظ سے صحیح طور سے خطبہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ اور نماز جمعہ روزانہ ظہر کی نماز کے اوقات میں ہونی چاہیے یا اس سے پہلے یا اگر دیر میں ہو تو یہ سب سنّت کے مطابق نماز ہو گی۔ اور خطبہ مختصر کے ساتھ ہی نماز کو طول کرنے کے بیان کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس سے یہ مطلب ہے کہ اگر نماز بیس پچیس منٹ کی ہو تو خطبہ اس سے دو چار منٹ چھوٹا ہونا چاہیئے یا اس کے سوا کوئی اور مطلب ہو سکتا ہے۔ آج کل اکثر جگہ اہل حدیث میں یہ طریق رائج ہے کہ جمعہ کا خطبہ قریب قریب ایک گھنٹے کے ہوتا ہے اور نماز آٹھ، یا دس منٹ میں ہو جاتی ہے۔ کیا اس قسم کا خطبہ سنّت کے مطابق ہو گا۔ اس مسئلہ کو وضاحت سے

بیان فرمائیں۔ اس سوال کا جواب مولوی عبدالرحمن مبارکپوریؒ نے جو دیا وہ حسب ذیل ہے۔

جواب:۔ احادیث صحیحہ صریحہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ مختصر پڑھتے تھے اور کسی حدیث صحیح وصریح سے خطبہ جمعہ کا طویل پڑھنا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کی نفی ثابت ہوتی ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے۔

عن جابر بن سمرة عن النبی صلی الله علیه وسلم انه کان لا یطیل الموعظة یوم الجمعة انما هی کلمات یسیرات۔

یعنی جابر بن سمرہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز خطبہ کو طویل نہیں کرتے تھے۔ اور آپ کا خطبہ جمعہ صرف چند کلمات سہل اور آسان ہوتے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے۔

قال ابو وائل خطبنا عمار فاوجز وابلغ فلما نزل قلنا یا ابا الیقظان لقد ابلغت واوجزت فلو کنت تنفست فقال انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان طول صلوة الرجل وقصر خطبته مئنة من فقهه فاطیلوا الصلوة واقصروا الخطبة۔

یعنی ابو وائل رضؓ نے کہا کہ حضرت عمارؓ نے ہم کو خطبہ دیا جو مختصر اور بلیغ تھا۔ جب وہ ممبر سے اُترے تو ہم نے کہا کہ اے ابو الیقظان آپ نے خطبہ نہایت بلیغ بیان فرمایا۔ مگر مختصر، پس اگر آپ خطبہ کو طول کئے ہوتے تو خوب ہوتا۔ تو حضرت عمارؓ نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ آدمی کا نماز کو طویل کرنا اور خطبہ کو مختصر کرنا اس کی دانائی کی علامت ہے۔ پس نماز کو طویل کیا کرو۔ اور خطبہ کو مختصر۔

یہ حدیث اگرچہ مطلق خطبہ کے بارہ میں ہے اور اس میں جمعہ کے خطبہ کی قید نہیں ہے لیکن یہ حدیث کے اطلاق سے خطبہ جمعہ کا بھی مختصر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور سائل نے جو اس حدیث کے ترجمہ میں خطبہ جمعہ کی قید لگائی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اور واضح رہے کہ حضرت عمار رضؓ کی اس حدیث مرفوع میں مطلق خطبہ اور وعظ کا مختصر کرنا اور مطلق نماز طویل کرنے کا ذکر ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ خطیب کو مطلق خطبہ جمعہ کا ہو یا غیر جمعہ کا مختصر دینا چاہیئے۔ اور مطلق نماز جمعہ کی ہو یا غیر جمعہ کی، طویل کرنی چاہیئے۔ میرے نزدیک اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ

نماز جمعہ کو بہ نسبت خطبہ جمعہ کے طویل کرنا چاہیئے اور خطبہ جمعہ کو بہ نسبت نماز جمعہ کے مختصر کرنا چاہیئے۔ نیز واضح رہے کہ اس حدیث میں اگرچہ مطلق خطبہ کے مختصر دینے کا حکم ہے مگر خاص ضرورت کے وقت طویل خطبہ دینا بھی غیر نماز جمعہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور جب جماعت میں بوڑھے۔ ضعیف۔ بیمار لوگ موجود ہوں تو امام کو نماز میں تخفیف کرنے کا حکم ہے۔ الحاصل خطبہ جمعہ کا طویل پڑھنا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کی نفی ثابت ہے۔ ہاں جابر بن سمرہ کی حدیث سے مطلق خطبہ کا متوسط ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے۔

عن جابر بن سمرة قال كنت اصلى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فكانت صلوته قصدا وخطبته قصدا۔

یعنی جابر بن سمرہ رضی فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز متوسط ہوتی تھی یعنی نہ بہت مختصر نہ بہت طویل آپ کا خطبہ بھی متوسط ہوتا تھا یعنی نہ بہت مختصر نہ بہت طویل۔

پس جابر بن سمرہ رضی کی اس حدیث کے اطلاق سے خطبہ جمعہ کا بھی متوسط ہونا ثابت ہوتا ہے جو کچھ احادیث صحیحہ وصریحہ سے ثابت ہے۔ وہ یہی ہے کہ زوال آفتاب کے بعد خطبہ شروع کرنا چاہیئے۔ اور مختصر یا متوسط خطبہ پڑھ کر نماز جمعہ پڑھنی چاہیئے۔

عبد الرحمن مبارکپوری

محدث روپڑیؒ

محدث روپڑیؒ نے فرمایا کہ مولوی عبد الرحمن صاحب نے جواب میں بہت تفصیل کی ہے۔ اور تبلایا ہے کہ خطبہ چھوٹا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ خطبہ نماز سے چھوٹا ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ عام وعظوں کی نسبت چھوٹا ہونا چاہیئے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ ہفتہ کے بعد ایک دن اسی خاطر مقرر کیا گیا ہے۔ اگر آٹھ دس منٹ پر اکتفاء کی جائے تو بہت لوگ خطبہ سے محروم رہ جائیں گے۔ کسی کے وضو کرتے کرتے خطبہ ہو جائے گا کسی کے دو رکعت پڑھتے پڑھتے خطیب فارغ ہو جائے گا۔

مسلم میں حدیث ہے کہ جب خطبہ کی حالت میں کوئی آئے دو رکعت ہلکی پڑھ لے اگر خطبہ دو رکعت سے لمبا نہ ہو۔ تو اس حکم کی تعمیل مشکل ہے۔ نیز خطبہ کے دو حصے کر کے درمیان میں بیٹھنا یہ بھی چاہتا ہے کہ خطبہ نماز سے چھوٹا مراد نہیں کیونکہ یہ بیٹھنا راحت کا ہے۔

نیز مشکوٰۃ باب الخطبہ میں حدیث ہے کہ خطبہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سرخ ہوجاتیں اور آواز بلند ہوجاتی۔ اور بہت جوش میں آجاتے اور ظاہر ہے کہ ایسا جوش آٹھ دس منٹ میں پیدا ہونا مشکل ہے نیز مسلم میں حدیث ہے۔ ابو رفاعہ کہتے ہیں۔ میں نے خطبہ میں سوال کیا کہ میں دین سے ناواقف ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ چھوڑ کر میرے پاس آئے۔ آپ کے لئے کرسی لائی گئی۔ آپ نے اس پر بیٹھ کر مجھے کچھ باتیں سکھائیں جو خدا نے آپ کو سکھائی تھیں پھر واپس آکر خطبہ پورا کیا۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ کچھ لمبا ہوتا ہے اگر آٹھ دس منٹ ہوتا تو فارغ ہوکر ابو رفاعہ رضہ کی حاجت روائی کرتے خطبہ توڑنے کی ضرورت نہ تھی۔

نیز مشکوٰۃ باب التنظیف میں حدیث ہے جب جمعہ کے دن نیند آئے تو اپنی جگہ بدل دے" اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ میں کچھ طول دے کیونکہ نیند عموماً زیادہ دیر تک بیٹھنے سے آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی مؤید دارمی کی ایک حدیث اس بارہ میں صریح آئی ہے جو مع سند مندرج ذیل ہے۔

اخبرنا محمد بن حمید ثنا تمیم بن عبدالمومن ثنا صالح بن حیان حدثنی ابن بریدۃ عن ابیہ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب قام فاطال القیام فکان لیشق علیہ قیامہ فاتی بجذع نخلۃ فحفر لہ واقیم الی جنبہ قائما للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب فطال القیام علیہ استند الیہ فاتکا علیہ فبصر بہ رجل کان ورد المدینۃ فراٰہ قائما الی جنب ذالک الجذع فقال لمن یلیہ من الناس لو اعلم ان محمدا یحمدنی فی شی یرفق بہ لصنعت لہ مجلسا یقوم علیہ فان شاء جلس ماشاء وان شاء قام فبلغ ذالک النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ائتونی بہ فاتوہ بہ فامر ان یصنع لہ ھذہ المراقی الثلث او الاربع ھی الان فی ممبر المدینۃ فوجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک راحۃ فلما فارغ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الجزع وعمد الی ھذہ التی صنعت لہ جزع الجذع فحن کما تحن الناقۃ حین فارقہ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم فزعم ابن بریدۃ عن ابیہ ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم حین سمع حنین الجذع رجع الیہ فوضع

یده علیه وقال اختران اغرسك فی المکان الذی کنت فیه فتکون کما کنت وان شئت ان اغرسك فی الجنة فتشرب من انهارها وعیونها فیحسن نبتك وتثمر فیاکل اولیاء الله من ثمرتك ونخلك فعلت فزعم انه سمع من النبی صلی الله علیه وسلم وهو یقول له نعم قد فعلت مرتین فسال النبی صلی الله علیه وسلم فقال اختار ان اغرسه فی الجنة۔

(باب اکرم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحنین المنبر)

یعنی ابن بریدہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم جب خطبہ پڑھتے تو بہت دیر کھڑے کھڑے رہتے۔ اور اس سے مشقت پاتے۔ آپ کے لئے ایک تنہ کھجور کا لایا گیا اور گڑھا کھود کر ایک طرف کھڑا کیا گیا۔ جب آپ خطبہ پڑھتے اور دیر تک کھڑے رہتے تو اس سے ٹیک لگا لیتے۔ ایک شخص مدینہ میں آیا۔ اس نے یہ حال دیکھ کر اپنے پاس کے لوگوں کو کہا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آرام کی شے کو پسند کریں گے تو میں آپ کے لئے ممبر تیار کر دوں۔ جتنی دیر چاہیں اس پر بیٹھیں اگر چاہیں کھڑے ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو اس کو بلا کر ممبر بنانے کو کہہ دیا۔ جب ممبر تیار ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تکلیف دُور ہو گئی۔ اور آپ ممبر پر بیٹھے تو تنہ آپ کی جدائی میں رو دیا جیسے اونٹنی درد سے آواز نکالتی ہے۔ آپ ممبر سے اُتر کر تنہ کے پاس آئے اور اس پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اور فرمایا دو باتوں سے ایک بات پسند کر لے۔ اگر تو چاہے تو میں تجھے وہیں گاڑ دوں گا۔ جہاں پہلے تھا اور پہلے کی طرح کھجور کا درخت ہو جائے گا اور اگر تو چاہے تو میں تجھ کو جنت میں لگا دوں۔ اور جنت کی نہروں اور چشموں سے پانی پئے گا اور بہت عمدہ اُگے گا اور پھلدار ہو جائے گا اور تیرے پھل اور کھجور سے اولیاء اللہ کھائیں گے راوی بریدہ رض کہتے ہیں تنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ بات سن کر دو مرتبہ کہا مجھے منظور ہے راوی نے حضورؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا تنہ نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ میں اس کو جنت میں لگا دوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ بہت دیر تک قیام کرتے اور خطبہ میں طول دیتے۔ پس خطبہ کے چھوٹا ہونے کا یہ معنیٰ لینا کہ خطبہ نماز سے چھوٹا ہو یہ کسی صورت صحیح نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ عام وعظوں کی نسبت خطبہ چھوٹا ہونا چاہیئے۔ عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ ۵ رمضان ۱۳۵۳ھ

کیا جمعہ فرض نہیں ہے

سوال :۔ ایک مولوی صاحب نے سوال کیا ہے کہ اگر جمعہ فرض ہوتا تو اس کی عدم ادائیگی پر قضاء لازم آتی یعنی کسی آدمی کا جمعہ رہ جاتا تو وہ جمعہ کی قضا بھی کرتا۔ حالانکہ ایسا کوئی نہیں کرتا، ظہر پڑھتا ہے معلوم ہوا کہ جمعہ فرض نہیں۔

میں نے جواب دیا کہ اس کی فرضیت کتاب اللہ وسنّت رسول اللہ واجماع اُمّت سے ہو چکی ہے۔ جو تمہارے ہی گھر کی کتابیں ثابت کر رہی ہیں۔ دوسرا اس کی فرضیت کے لئے جماعت شرط ہے جیسا کہ حدیث طارق بن شہاب رضؓ الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ موجود ہے یعنی ہر مسلمان پر جماعت میں حق و واجب ہے اور شرط و مشروط لازم و ملزوم ہوا کرتی ہیں۔ جہاں شرط وہاں مشروط۔ جیسا کہ وضو نماز کے واسطے شرط ہے۔ بلا وضو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک نفر کا جمعہ نہیں ہوتا کیونکہ جماعت کی شرط موجود ہے یہ جواب ٹھیک ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ قضاء جمعہ کے متعلق جو کچھ آپ نے جواب دیا ہے نہایت موزوں ہے۔ ایک جواب یہ ہے کہ قضا اس شئے کی ہوتی ہے جس کا بدل نہ ہو مثلاً ظہار میں روزے نہ رکھ سکے تو اس کے عوض ساٹھ مسکینوں کو کھانا دینے کا حکم ہے گویا کھانا روزوں کے قائم مقام ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس کا جمعہ رہ جائے اس کو ظہر کا حکم ہے کیونکہ ظہر اس کا بدل ہے۔ اب قضاء کی ضرورت نہیں۔ دواؤں میں بھی اگر ایک دوا نہ ملے تو بہت دفعہ اس کا بدل دوسری دوا کام دے جاتی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء

مسئلہ جمعہ قبل از زوال

سوال :۔ جمعہ قبل از زوال درست ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ اس مسئلہ میں ائمہ دین میں سے امام احمدؒ اور امام اسحاق اور ان کے بعض اتباع بدلیل مفہوم احادیث صحیحہ ومنطوق آثار صحابہ رضؓ جواز کی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ سید عبدالقادر جیلانی جمعہ کی نماز کا

قبل از زوال صحیح یا درست ہونا بدیں الفاظ ارشاد فرماتے ہیں۔

و وقتها قبل الزوال فی الوقت الذی تقام فیه صلوٰة العید (غنیه)

یعنی وقت جمعہ کا زوال سے پہلے وہی وقت ہے جس میں عید کی نماز ادا کی جاتی ہے۔

علماء اہل حدیث میں سے شیخ محی الدین مولف البلاغ المبین بحوالہ دراری المضیہ مجتہد یمانی امام شوکانی رح سے نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ اور تحقیق وارد ہوئی وہ چیز کہ دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ تحقیق جمعہ پڑھنا کفایت کرتا ہے قبل زوال کے جیسا کہ بخاری میں روایت ہے۔ انس بن مالک سے اور مثل اس کی حدیث سہل بن سعد کی ہے صحیحین میں اور ثابت ہوا بیچ صحیح کے تشریح ہے کہ تحقیق صحابہؓ نماز پڑھتے تھے جمعہ کی قبل ڈھلنے سورج کے۔ پس تحقیق گئے ہیں طرف اس بات کی احمد بن حنبل اور حق یہی ہے (البلاغ المبین ص۲۸)

سید علامہ نواب صدیق حسن خان مسک الختام میں فرماتے ہیں کہ حدیث جابر رض بروایت مسلم دلیل واضح ہے۔ امام احمد کے مذہب پر اور مولانا وحید الزمان صاحب محدث حیدرآبادی شارح صحاح سبعۃ تیسیر الباری شرح صحیح بخاری میں حدیث انسؓ اور حدیث سہل بن سعد رض کی دو دو توجیہیں بیان کرتے ہیں۔ ایک موافق مذہب امام احمدؒ کے دوسری موافق جمہور کے باب وقت الجمعہ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ ہمارے امام احمد بن حنبل رح کا یہ قول ہے کہ جمعہ زوال کے پہلے بھی درست ہے۔ عبداللہ بن مسعود رض اور ابوبکر صدیق رض اور کئی صحابہ اور سلف سے ایسا منقول ہے اور حدیث حین تمیل الشمس کی تشریح لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ آں حضرتؐ اکثر ایسا کیا کرتے مگر یہ نہیں ثابت ہوتا کہ زوال سے پہلے جمعہ درست نہیں

انوار اللغۃ حصہ دوم ص۲۷ میں لکھتے ہیں کہ حنابلہ اور بعض اہل حدیث کے نزدیک جمعہ کی نماز زوال سے پہلے بھی درست ہے اور خلفاء راشدین سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ اور حصہ پنجم ص۵ میں تحریر فرماتے ہیں کہ محققین اہل حدیث نے اس کو جائز رکھا ہے خصوصاً جب گرمی کی شدت ہو یا کوئی عذر ہو۔

زبدۃ المرام ترجمہ عمدۃ الاحکام میں جس کی تصدیق حافظ عبدالمنان صاحب محدث وزیرآبادی نے فرمائی ہے حدیث سلمہ بن اکوع رض کی تحت میں لکھا ہے کہ قبل از زوال جمعہ ادا کرنا بھی بعض کا مذہب ہے۔ امام احمد رح اور امام اسحاقؒ بھی اس طرف گئے ہیں۔ الی قولہ حدیث میں غور کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بعض جمعہ مثلاً سردو خطبہ یا ایک یا بعض اس کا ضرور قبل زوال ہوتا تھا (صفحہ ۶ کتاب مذکور)

مولوی سید محمد حسین شاہ صاحب مرحوم سر گروہ اہل حدیث کشمیر اپنی کتاب صلوٰۃ المحدثین میں لکھتے ہیں

کہ اے نمازی تجھے اختیار ہے کہ جمعہ چاہے زوال سے پیچھے پڑھ لے یا پہلے۔ اور نواب صاحب موعظۃ الحسنہ میں قبل اززوال نماز جمعہ کا ثبوت فرماتے ہیں۔ اور شوکانی صاحب نیل الاوطار ہیں اور ابن قیم رحمہ ہدیٰ میں خوب وضاحت فرماتے ہیں۔ پس انہی جیسے بزرگوں کی شہادت پر اعتماد کرکے میرے والد ماجد سلمہ اللہ نے اس کو جائز مان لیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ اب اتنے بزرگوں کو العیاذ باللہ بے عقلی یا نادانی کی طرف منسوب کرنا اہل علم و عقل سے بمراحل بعید ہے اور خلاف جمہور کا الزام دینے والا مسئول ہونے کے وقت بیسیوں مسائل میں خود ملزم ثابت ہو جائے گا (ابوالبشیر عبدالغنی الشوریانی)

محدث روپڑی ؒ

مولوی عبدالغنی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے کہ امام احمد رحمہ وغیرہ قبل اززوال جمعہ کے قائل ہیں اور بعض اہلحدیث بھی اس طرف گئے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے اور دلیل ان کی وہی روایات ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے اس لئے اگر کوئی قبل اززوال جمعہ پڑھ لے تو اس پر طعن نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اختلاف سلف کی حدود میں ہے ہاں احتیاط اسی میں ہے کہ بعد اززوال پڑھا جائے کیونکہ جمعہ فرض ہے اور فرض کا معاملہ نازک ہے اور جن احادیث سے امام احمد رحمہ وغیرہ استدلال کرتے ہیں۔ ان میں بعد اززوال کا بھی احتمال ہے اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور امام احمدؒ وغیرہ اگرچہ قبل اززوال کے قائل ہیں لیکن بعد اززوال کے بھی قائل ہیں تو گویا بعد اززوال متفقہ وقت ہے اور قبل اززوال اختلافی ہے اس لئے احتیاط بعد اززوال ہی میں ہے تاکہ فرض کی ادائیگی میں کوئی کھٹکا نہ رہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۱۲ شوال ۱۳۵۴ھ ۷ جنوری ۱۹۳۶ء

جمعہ کے متعلق حنفیہ کے بارہ سوالات اور ان کے جوابات

سوال :۔ (۱) کیا نماز جمعہ ظہر ہے یا ظہر کا بدل

جواب :۔ جمعہ ایک لحاظ سے ظہر ہے ایک لحاظ سے ظہر کا بدل ہے۔ اگر یہ لحاظ کریں کہ جمعہ میں اور باقی دنوں کی ظہر میں فرق ہے تو اس کو بدل کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ لحاظ کریں کہ بعض باتوں کے بدلنے سے اصل حکم نہیں بدلتا تو اس کو ظہر کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے سب نمازیں پہلے دو دو رکعت فرض ہوئی تھیں مدینہ میں آکر کئی چار رکعت ہو گئیں۔ اور پہلے نماز میں کلام جائز تھی پھر حرام ہو گئی۔ اسی طرح اور بہت سی باتوں

میں فرق پڑ گیا۔ مگر یہ نہیں کہا جاتا کہ معراج کی رات جو پانچ نمازیں فرض ہوئی تھیں وہ نہیں رہیں بلکہ ان کی جگہ پانچ نئی فرض ہو گئیں۔ ٹھیک اسی طرح جمعہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔ البتہ باقی دنوں میں ظہر فرض ہے۔

سوال (۲) کیا نماز جمعہ صلوٰۃ خمسہ فرلضیہ میں سے ہے یا علیحدہ مستقل نماز۔ اس کی وجہ کسی حدیث صحیح سے ثابت کرو۔

جواب:۔ مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ رات دن میں پانچ ہی نمازیں فرض ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ پانچ نمازوں میں سے ایک ہے ورنہ لازم آئے گا کہ جمعہ کے دن چھ نمازیں فرض ہوں۔

سوال (۳) نماز جمعہ فرض مطلق ہے یا مقید اس کی تعریف کسی دلیل شرعیہ سے کرو؟

جواب:۔ اگر مقید سے یہ مراد ہے کہ اس میں کوئی قید یا استثناء ہو تو سب نمازیں ایسی ہی ہیں مثلاً اللہ تعالےٰ فرماتا ہے و اقیموا الصلوٰۃ۔ اِس سے نفاس والی مستثنیٰ ہے یا یوں کہو کہ قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْن، سے بیمار مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کو قیام معاف ہے۔ اور اگر مقید سے یہ مُراد ہو کہ باقی نمازوں کی قیود اور شروط کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں تو اس لحاظ سے جمعہ میں مقید نہیں۔ کیونکہ جمعہ میں دو رکعت ہی پڑھی جاتی ہیں۔ اور ظہر وغیرہ میں چار۔ اور اگر یہ مراد ہو کہ جمعہ کی شروط گنتی میں باقی نمازوں سے زیادہ ہوں تو یہ سائل کی غلطی ہے کیونکہ اس کو مطلق مقید نہیں کہتے اس لئے کہ مطلق مقید میں داخل ہوتا ہے۔

سوال (۴) جس شخص کو نماز جمعہ با جماعت نہ مل سکے تو وہ کیا کرے۔ چار رکعت پڑھے یا دو۔ اس کی وجہ کسی حدیث صحیح سے ثابت کرو؟

جواب۔ چار پڑھے۔ کیونکہ کفایہ شرح ہدایہ اور ازالۃ الخفاء میں نقلاً من مصنف ابن ابی شیبہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ خطبہ جمعہ قائم مقام دو رکعت ظہر کے ہے۔ پس ضرور ہوا کہ جس کا جمعہ رہ جائے وہ چار پڑھے۔

سوال (۵) نماز جمعہ کا اجراء مکہ مکرمہ میں ہوا یا مدینہ منورہ میں فرض ہوا ہے اور اس نماز کا حکم باقی نمازہائے فرلضیہ کے ساتھ ہوا یا بعد میں۔ اگر بعد میں ہوا تو اس کی وجہ کسی حدیث صحیح سے ثابت کرو کہ یہ حکم بعد میں کس بنا پر صادر ہوا۔

جواب:۔ جس کو عرف میں جمعہ کہا جاتا ہے وہ مدینہ منورہ میں فرض ہوا ہے کیونکہ اس کے سب دلائل مدنی ہیں۔ آیت بھی اور احادیث بھی۔ ہاں اصل ظہر مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہو چکی تھی کیونکہ معراج کی رات پانچ نمازیں

فرض ہوئی تھیں جن میں ظہر بھی داخل ہے اس کی دو رکعت کم ہو کر جمعہ بن گیا۔

سوال (۶) اگر فرض مطلق ہے تو اس سے عورت اور صبی (بچہ) اور مریض اور مسافر اور معذور کیوں مستثنیٰ ہے باوجودیکہ یہ نماز صرف دو رکعت ہے اور جو نمازیں کہ چار چار رکعت ہیں۔ اور ہر روز پانچ دفعہ پیش آتی ہیں۔ ان میں ان کی کیوں رعایت نہیں کی گئی۔ اگر فرض مقید ہے تو اس کی تشریح اس آیت سے کی جائے جس سے اس کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔

جواب:۔ جواب نمبر۲ میں گزر چکا ہے کہ مقید سے کیا مراد ہے۔ جب مقید کا معنیٰ متعین نہ ہوا تو مطلق جو اس کے مقابل ہے اس کا معنیٰ بھی متعین نہ ہُوا پس یہ سوال قابل جواب نہیں۔ ہاں اتنا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمعہ کی قیود گنتی میں باقی نمازوں سے زیادہ ہیں۔ اور اس کے پڑھنے میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے خصوصًا جب کہ سب بستی کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ جیسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ہوتے تھے تو اس حالت میں مشقت کے علاوہ بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث میں ضعفاء کو اور ضرورت والوں کو مستثنیٰ کر دیا جن کا سوال میں ذکر ہے۔

سوال (۷) جمعہ کی فرضیت سورۃ جمعہ سے بیان ہوتی ہے لیکن مطابق تعریف لاشبہ فیہ کے چند شبہات اس میں ظاہر ہیں۔

شبہ نمبر (۱) یا ایہا الذین امنوا میں حکم عام ہے تو اس حکم سے مذکورہ اشخاص عورت وغیرہ کیوں مستثنیٰ ہے؟

شبہ نمبر (۲) اذا نودی للصّلوٰۃ من یوم الجمعۃ میں من ظہر الجمعۃ نہیں آیا۔ ظہر کی خصوصیت اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ یوم سے مراد سالم دن ہوتا ہے۔

شبہ نمبر (۳) فاسعوا الی ذکر اللہ سے مراد خدا کو یاد کرنا ہے۔ یعنی ذکر بمعنیٰ یاد کرنے کے ہے۔ چاہیئے تھا کہ فاسعوا الی صلوٰۃ الجمعہ درج ہوتا۔

شبہ نمبر (۴) وذروا البیع کا لفظ صاف ثابت کرتا ہے کہ یہ حکم صرف ان ہی نمازیوں کے واسطے تھا جو اس وقت بیع شراء کے خیال سے خدا کے ذکر کو چھوڑ کر مسجد سے نکل گئے تھے جو کہ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے تو اب ان شبہات سے معلوم ہوا کہ مطابق تعریف فرض کے یہ فرض مطلق نہ ہوا کیونکہ ہر ایک شے اپنی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔

جواب (۷) پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک حدیث سے کتاب اللہ کی تخصیص ہو

سکتی ہے۔ اس لئے عورت وغیرہ کی حدیث نے تخصیص کر دی۔ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اہل بادری بالاجماع مخصوص ہیں تو یہ آیت عام مخصوص منہ البعض ہوگئی، وظنی ہے پس حدیث سے تخصیص ہوگئی۔

دوسرے شبہ کا جواب بھی یہی ہے کہ حدیثوں میں ظہر کا وقت آگیا ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ فاسعوا الی ذکر اللہ میں صلوٰۃ کے لفظ کی ضرورت نہیں کیونکہ نودی للصلوٰۃ میں صلوٰۃ کا لفظ آچکا ہے۔

چوتھے شبہ کا جواب یہ ہے کہ خصوص مورد کا اعتبار نہیں، عموم لفظ کا اعتبار ہے۔ یہ اصولی مسئلہ ہے جس کو سائل نے سمجھا نہیں۔

رہی یہ بات کہ بیع سے کیا مراد ہے۔ سو اس کا سائل نے سوال نہیں کیا لیکن ہم جواب دے دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ ابن ماجہ وغیرہ میں روایت ہے کہ شاید کہ ایک تمہارا بکریاں لے کر مدینہ سے ایک دو میل کے فاصلہ پر جا رہے پس گھاس مشکل سے ملے۔ پھر ذرا اور دور چلا جائے۔ پس جمعہ کو حاضر نہ ہو پھر جمعہ آئے تو حاضر نہ ہو۔ یہاں تک کہ اللہ اس کے دل پر مہر کر دے۔

اس حدیث سے اور اس جیسی اور احادیث سے معلوم ہوا کہ بیع سے عام کاروبار مراد ہے صرف شان نزول کے لحاظ سے بیع کا لفظ بولا گیا ہے جیسے ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا میں شان نزول کے لحاظ سے تحصن کی شرط ذکر کر دی ہے۔

سوال (۸) اگر ایسے حکم سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہے تو اور بہت سے احکام قرآن مجید میں موجود ہیں جن پر عملدرآمد نہیں کیا جاتا۔ ہم وہ جملہ احکام مفصل بیان کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ معترض کو ان کے ماننے میں کوئی عذر نہ ہو۔

جواب:۔ اگر ایسے احکام ہوتے تو سائل ڈر کر پردہ نہ ڈالتا بلکہ ان کی تصریح کرتا۔

سوال (۹) اگر فرض مطلق ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد چند دفعہ چند مقامات پر جمعہ کیوں نہیں پڑھا۔ معاذ اللہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فریضہ نماز کو ترک کر دیتے ہرگز نہیں۔

جواب:۔ جب مطلق مقید کی مراد ہی معین نہیں تو سوال فضول ہے پھر جن شروط کے ساتھ فرض ہے۔ اگر چھوڑا ہوگا تو ان ہی میں سے کسی شرط کے نہ پائے جانے کی صورت میں چھوڑا ہوگا جیسا کہ حجۃ الوداع میں سفر کی وجہ سے ترک کیا تھا۔

سوال (۱۰) بالفرض اگر اس ملک میں نمازِ جمعہ ادا کی جائے تو اس کے بعد نماز جمعہ کیوں نہ پڑھی جائے۔ کیونکہ جمعہ نماز ظہر کا مسقط کسی طرح نہیں بن سکتا۔ جمعہ اور ظہر میں اختلاف بہت ہے۔

اوّل یہ کہ جمعہ دو رکعت ہے اور ظہر چار رکعت

دوم۔ جمعہ میں تین اذان شرط ہیں۔ اور ظہر میں دو اذان۔

سوم۔ جمعہ معذوروں کو معاف ہے اور ظہر معاف نہیں۔

چہارم۔ جمعہ میں خطبہ شرط ہے اور ظہر میں نہیں۔

پنجم۔ جمعہ قبل از زوال بھی جائز ہے۔ اور ظہر جائز نہیں۔

ششم۔ جمعہ صلوٰۃ خمسہ میں سے بروئے حدیث ایک علیحدہ نماز ہے اور ظہر علیحدہ نہیں۔

جواب:۔ بعض باتوں میں فرق ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ بالکل غیر ہو جائے۔ چنانچہ نمبر اوّل میں گزر چکا ہے۔ پھر حدیث میں ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اگر جمعہ مسقط ظہر نہ ہو تو نمازیں چھ ہو جائیں گی۔ اور اس حدیث سے مخالفت لازم آئے گی۔

سوال (۱۱) جب کہ جمعہ کی فرضیت میں شک ہے تو مشکوک نماز فرض عین کا مسقط ہرگز نہیں ہو سکتی۔

جواب:۔ جب فرضیت قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو مشکوک چہ معنی دارد۔

سوال (۱۲) آیت شریف کا مبین اگر حدیث شریف بیان کریں۔ تو اس قسم کی چند آیات مع حدیث کے ہم آپ کو بتلا سکتے ہیں جن پر آپ کا کوئی عملدرآمد نہیں۔ اگر آپ جمعہ ادا کریں گے تو باقی احکام کی تعمیل بھی آپ پر فرض ہو گی۔

جواب۔ اگر ایسی آیات مع احادیث ہوتیں تو آپ بیان کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل ایسے فقروں سے محض مفروضہ رعب ڈالنا چاہتا ہے۔ ہاتھ پلے کچھ نہیں۔ خیر اللہ معرفت دے اور ضد و عناد سے دور رکھے آمین۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۹ صفر ۱۳۵۵ھ ۔ یکم مئی ۱۹۳۶ء

خطبہ کے وقت السّلام علیکم

سوال:۔ خطیب خطبہ کر رہا ہو۔ اس حالت میں السّلام علیکم کہنا جائز ہے یا نہ؟

جواب :۔ خطبہ میں السّلام علیکم کہہ دے تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس کے جواب سے خطبہ کا سماع فوت نہیں ہوتا۔ پھر اشارہ سے بھی جواب ہو سکتا ہے۔ حالتِ وضوء میں بات چیت کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ کسی حدیث میں ممانعت نہیں آئی۔ ہاں فضول باتوں سے پرہیز چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۴ صفر ۱۳۵۶ھ ۱۶ اپریل ۱۹۳۷ء

فرضیّت جمعہ پر ایک شبہ اور اس کا جواب

سوال :۔ عن ابن مسعود ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لقوم یتخلفون عن الجمعۃ لقد هممت ان امر رجلا یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون عن الجمعۃ بیوتهم (رواہ مسلم مشکوٰۃ) یعنی میں نے ارادہ کیا کہ اپنی جگہ کسی دُوسرے شخص کو نماز پڑھانے کے لئے حکم کروں اور خود جا کر ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اِس طرح کی حدیث جماعت کے بارہ میں بھی آئی ہے۔ وہاں کہہ دیتے ہیں کہ جماعت فرض نہیں۔ اَب حدیث سے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جمعہ فرض نہیں۔ اس کا جواب تسلّی بخش لکھیں۔

ابواسحٰق ڈیروال افغانان ڈاکخانہ خاص ضلع امرتسر

جواب :۔ یتخلفون عن الجمعۃ والی حدیث مسلم باب فضل الجماعۃ میں موجود ہے۔ اور ہمارے نزدیک جمعہ جماعت دونوں فرض ہیں مگر اہم کام کے لئے فرض کا چھوڑنا جائز ہے۔ خاص کر جب اس سے مقصود اسی فرض کی تکمیل ہو۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک شخص کو پہرے پر مقرر کیا۔ وہ صرف پہرے کی وجہ سے فجر کی نماز میں شامل نہیں ہوا بلکہ بغیر سخت مجبوری کے گھوڑے کی پیٹھ پر سے نہیں اُترا۔ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو وہ آیا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُس کو خوشخبری دی کہ اس کے بعد اگر تو عمل نہ کرے تو ضرر نہیں۔ اس طرح نماز میں سکون فرض ہے لیکن بچہ کے رونے سے تشویش قلب کا خطرہ ہو تو بچہّ کو اُٹھا کر نماز پڑھ سکتا ہے بلکہ پڑھا سکتا ہے۔ جیسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی نواسی امامہ کو لے کر امامت کرائی۔ اِس طرح تعلیم کے لئے آپ نے ممبر پر نماز پڑھائی۔ اور سجدہ ممبر سے نیچے اُتر کر کیا۔ اسی طرح ایک صحابی کے ہاتھ میں گھوڑا تھا مگر نماز پڑھی حالانکہ گھوڑا ان کو کھینچے لے جا رہا تھا۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

کیا عورتیں الگ جمعہ پڑھ سکتی ہیں؟

سوال:۔ عہد نبوی میں صحابہ کرام و تبع تابعین و ائمہ دین کے زمانہ میں عورتیں مردوں سے علیحدہ ہو کر آپس میں جمعہ یا دونوں عیدوں کی نماز پڑھا کرتی تھیں یا نہیں۔ تو اب جو عورتیں مردوں سے علیحدہ ہو کر آپس میں جمعہ یا دونوں عیدوں کی نماز مردوں کی طرح خطبہ پڑھ کر پڑھتی پڑھاتی ہیں۔ ان کا یہ کام سنّت کے مطابق ہے یا نہیں؟ (دین محمد موضع سنانہ ضلع انبالہ)

جواب:۔ جمعہ کی نماز چونکہ پانچوقتی نمازوں میں داخل ہے اس لئے اس کا حکم پانچ نمازوں کا ہوگا۔ سوا ان باتوں کے جن کی خصوصیت حدیث نے کردی ہے۔ جیسے جمعہ کے لئے ضروری ہے۔ پانچوقتی نمازیں اگر جماعت نہ ملے تو اکیلا بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح جن جن باتوں کا ذکر احادیث میں آگیا ہے۔ ان میں نماز جمعہ باقی نمازوں سے ممتاز ہوگی۔ ان کے علاوہ سب باتوں میں نماز جمعہ کا حکم وہی ہوگا جو پانچ نمازوں کا ہے۔ اب پانچ نمازیں عورتوں کے لئے گھر میں بہتر ہیں۔ اگر دوسری جگہ پڑھیں تو جائز ہے خواہ کسی مرد کے ساتھ پڑھیں یا عورت کے ساتھ کیونکہ عورتوں کی امامت آپس میں صحیح ہے۔

رہا عید کا حکم تو اس کی تائید حدیث میں بہت آئی ہے تو اس لئے گھر میں نہیں پڑھنی چاہیئے بلکہ جہاں سب جاتے ہیں وہاں چلے جانا چاہیئے۔ عبداللہ امرتسری روپڑ ۸ ربیع الاخر ۱۳۵۶ھ ۔ ۱۸ جون ۱۹۳۷ء

منبر محراب کے کس طرف رکھا جائے

سوال:۔ جس وقت امام خطبہ پڑھے اُس وقت منبر کو کونسی جگہ پر رکھا جائے محراب کے عین درمیان میں یا دائیں جانب؟

جواب:۔ مسجد نبوی میں منبر کی جگہ دائیں طرف ہے، اور منبر سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ پڑھتے تھے جس کا مقام قریباً محراب کے سامنے پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب ضرورت ادھر اُدھر ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ عبداللہ امرتسری روپڑ ۸ محرم ۱۳۵۷ھ

ایک گاؤں میں تعدد جمعہ

سوال:۔ ایک گاؤں میں تین جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے۔؟

جواب:۔ گاؤں اگر اچھا قصبہ ہے اور مساجد فاصلہ پر ہیں تو تعدد کی گنجائش ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی

سے مردی ہے۔ اور اگر چھوٹا گاؤں ہے۔ تو پھر ضد لگانے۔ نفسانیت کا معاملہ ہے۔ ضد سے تعدد ٹھیک نہیں۔ بلکہ تعدد کی رخصت صرف ضرورت کی بنا پر ہے۔ مثلاً مساجد ذرا فاصلہ پر ہوں۔ ایک مسجد میں سب کی گنجائش نہ ہو کمزوروں کو وہاں پہنچنا تکلیف دہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ ویسے تعدد اور نفسانیت کی وجہ سے اچھا نہیں۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

دیہات میں جمعہ

سوال: ۔ مفتی خیر المدارس ملتان کی طرف سے ایک فتویٰ موصول ہوا ہے جو حسب ذیل ہے۔

"صورت مسئولہ میں چونکہ یہ گاؤں قریہ کبیرہ یا شہر نہیں" نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس میں ادائیگی جمعہ جائز نہیں تبلیغ کی یہ صورت کر لی جائے لیکن نماز دو رکعت جمعہ کی بجائے چار رکعت ظہر ادا کر لی جایا کرے یا روزانہ صبح کو درس قرآن شریف کر دیا جائے۔ فقط واللہ اعلم

بندہ عبدالستار نائب مفتی خیر المدارس ملتان ۲۸/۴

الجواب صحیح۔ عبداللہ عفی عنہ مفتی خیر المدارس ملتان

مہر ۔ مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان

یہ فتوائے آپ کی خدمت میں ارسال ہے مکمل حوالجات سے جواب تحریر فرمائیں۔

(مہر خدا بخش اہل حدیث لونڈہ سید)

جواب: ۔ گاؤں میں جمعہ پڑھنے کے متعلق اس قسم کا ایک سوال موضع کنگوئی تحصیل قصور ضلع لاہور کی طرف سے بھی آیا ہے۔ افسوس ہے کہ دیوبندی حضرات نے دیہات میں جمعہ بند کرنے کی مہم چلا رکھی ہے۔ ہمارے مقلد بھائیوں پر تقلید کا اثر غالب ہے۔ اس لئے مفتی خیر المدارس نے بلا دلیل ہی جواب لکھ دیا ہے تاکہ لوگ تقلید پر ہی جمے رہیں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ روشنی کا زمانہ ہے اور ہر زمانہ کم و بیش روشنی کا ہوتا ہے۔ اس لئے بغیر دلیل کے جواب لکھنا علماء کی شان کے خلاف ہے۔ ساتھ ہی ایک اور بدعت کا اضافہ کر دیا کہ ظہر بھی پڑھی جائے اور خطبہ بھی ہو جیسے آج کل شہروں میں یہ بدعت جاری ہے کہ دو خطبے پڑھتے ہیں۔ ایک پہلی اذان کے بعد اور دوسرا دوسری اذان کے بعد عربی میں۔

اللہ تعالیٰ بدعات سے بچائے اور سنت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اب گاؤں میں جمعہ پڑھنے کے جواز کے دلائل ذیل میں پڑھیئے۔

دلیل اول۔ سورہ جمعہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے

اذان دی جائے تو ذکر الٰہی کی طرف دوڑو۔ اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔ سورہ جمعہ پارہ ۲۸
یہ آیت ہر ایمان والے کو شامل ہے۔ خواہ وہ شہر میں ہو یا گاؤں میں اور خرید وفروخت سے مراد ہر قسم کا کاروبار ہے۔ کیونکہ اگر خاص خرید وفروخت ہی مراد ہو تو لازم آئے گا کہ جمعہ صرف خرید وفروخت کرنے والوں پر ہو۔ اور باقی کاروبار کرنے والے خواہ شہر میں ہوں یا گاؤں میں جیسے لوہار۔ بڑھئی۔ راج۔ مزدور کپڑا وغیرہ بننے والے کھیتی باڑی کرنے والے۔ باغات کے مالی وغیرہ یہ سب جمعہ سے سبکدوش ہوں۔

علاوہ ازیں قرآن مجید پارہ ۱۸ رکوع ۱۱ میں پانچ نمازوں اور زکوٰۃ وغیرہ کے ساتھ تجارت اور فروخت کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۤءِ الزَّكٰوةِ

یعنی اللہ تعالٰی کے بندوں کو تجارت اور خرید وفروخت ذکر الٰہی نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔

اب غور فرمائیے۔ کیا باقی نمازیں اور زکوٰۃ وغیرہ صرف شہر والوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بس اِسی طرح نمازِ جمعہ کو سمجھ لیں۔

دلیل دوم

ابوداؤد میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ الا علی اربعۃ عبد مملوک اوامرأۃ اوصبی اومریض۔

یعنی ہر مسلمان پر (خواہ وہ شہر میں ہو یا قریہ میں) جمعہ واجب ہے جماعت میں مگر چار پر واجب نہیں۔

۱۔ غلام (۲) عورت (۳) لڑکا (۴) بیمار

دوسری حدیث میں مسافر کا بھی ذکر ہے کہ اس پر بھی جمعہ نہیں۔

دلیل سوم

نسائی شریف میں ہے۔

رواح الجمعۃ واجب علی کل محتلم

یعنی ہر بالغ پر جمعہ کے لئے جانا واجب ہے۔

دلیل چہارم ۔ بخاری اور ابوداؤد میں ہے۔ ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ پہلا جمعہ مسجد نبوی کے بعد جواثا

میں پڑھا گیا ہے جو بحرین کے دیہات سے ایک گاؤں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں۔ ابن تین نے ابوالحسن اللخمیؒ سے روایت کیا ہے کہ جواثا شہر ہے۔ مگر جو نفس حدیث میں آگیا ہے وہ مقدم ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جواثا گاؤں ہو۔ اور ابوالحسن اللخمیؒ کے زمانہ میں اس کی آبادی بڑھ جانے سے یہ شہر ہو گیا ہو۔

نیز حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں لکھتے ہیں۔ جوہریؒ۔ زمخشریؒ اور ابن اثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ جواثا قلعہ کا نام ہے لیکن یہ گاؤں ہونے کے منافی نہیں (کیونکہ عرب میں اُس وقت کوئی مستقل حکومت تو تھی ہی نہیں۔ جو لوگ زیادہ محفوظ تھے اُن کے گاؤں بھی قلعوں کی شکل کے تھے۔

دلیل پنجم

بخاری شریف میں ہے کہ زریقؒ اپنی زمین میں رہتے تھے اور وہاں حبشیوں وغیرہ کی ایک جماعت بھی رہتی تھی زریقؒ نے جو شہر ایلہ کے حاکم تھے ابن شہاب زہریؒ کو جو اُس وقت وادی القریٰ میں تھے لکھ کر مسئلہ دریافت کیا کہ میں اپنی زمین میں جُمعہ پڑھوں۔ ابن شہاب زہریؒ نے اُن کو جمعہ پڑھنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ حدیث لکھی۔

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته

یعنی تم سب راعی ہو اور اپنی اپنی رعیت سے پُوچھے جاؤ گے

مطلب ابن شہابؒ کا یہ تھا کہ تو اس وقت امیر ہے۔ رعیت کی ہر قسم کی دینی و دنیوی ذمہ داری تجھ پر ہے جس سے جمعہ بھی ہے پس جُمعہ پڑھنا چاہیئے۔

دلیل ششم

فتح الباری شرح بخاری میں ہے عبدالرزاق نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ مکہ مدینہ کے درمیان پانی پر اُترے ہُوئے لوگوں کو جمعہ پڑھتے دیکھتے اور اُن پر اعتراض نہ کرتے۔

دلیل ہفتم

حافظ ابن حجرؒ تلخیص الحبیر میں لکھتے ہیں کہ ابُو رافع سے روایت ہے۔ ابُوہریرہؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا اور وہ بحرین میں تھے پس حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جَمِّعُوا حَيْثُ كُنْتُمْ۔ یعنی جہاں ہو جمعہ پڑھو۔ یعنی جمعہ کی کسی جگہ کے ساتھ خصُوصیت نہیں شہر ہو یا گاؤں سب جگہ جمعہ پڑھو جیسے قرآن مجید میں ہے۔

حيثما كنتم فولّوا وجوهكم شطر المسجد الحرام

یعنی تم جہاں ہو (نماز کے وقت) قبلہ رُخ منہ کرو۔
ابن خزیمہؒ نے اس کو روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور بیہقی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت اچھی سند والی ہے۔

دلیل ہشتم

بیہقی میں ہے۔ ولید بن مسلم کہتے ہیں میں نے لیث بن سعدؒ سے (گاؤں میں جمعہ کی بابت) سوال کیا تو فرمایا ہر شہر یا گاؤں میں جس جگہ جماعت ہو جمعہ پڑھنے کا حکم دئے گئے ہیں۔ کیونکہ اہل مصر اور گرد و نواح کے لوگ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جمعہ پڑھتے تھے۔ اور ان میں کئی صحابہؓ بھی تھے۔ لیث بن سعدؒ نے اگرچہ صحابہؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ کیونکہ تبع تابعی ہیں مگر جن لوگوں میں جمعہ ہوتا تھا۔ ان کو ملے ہیں۔ مصر کے رہنے والے ہیں نیز حنفیہ کے نزدیک مرسل تبع تابعی (جس میں تابعی اور صحابی کا ذکر نہ ہو) معتبر ہے (نور الانوار وغیرہ) اور اس میں صرف تابعی رہ کا ذکر نہیں۔ پس یہ بطریق اولیٰ معتبر ہوگی۔ اس کے علاوہ رد المختار وغیرہ میں ہے کہ مجتہد جب کسی حدیث سے استدلال کرے تو یہ حدیث کی تصحیح ہے۔ پس لیث بن سعدؒ کے استدلال کرنے سے اس حدیث کی صحت ثابت ہوگئی۔ نیز یہ روایت باقی دلائل کی تائید ہے اور تائید میں تو تبع تابعی کا اپنا قول بھی معتبر ہے چہ جائیکہ اس کو صحابہؓ کی طرف نسبت کرے۔

دلیل نہم

گاؤں میں جمعہ پڑھنے کے دلائل کتب حنفیہ میں بھی بہت ہیں۔ بطور نمونہ ایک حوالہ پڑھیئے۔ کبیری شرح منیہ میں ہے کہ یہ بات صحت کو پہنچ گئی ہے کہ ربذہ میں (جو مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے) حضرت عثمانؓ کے ایک غلام امیر تھے ان کے پیچھے دس صحابہ رضا جمعہ وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ ابن حزمؒ نے محلیٰ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے انہی دلائل پر اکتفا کی ہے ورنہ دلائل اور بھی بہت ہیں جیسے بنی سالم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمعہ پڑھنا اور حرہ بنی بیاضہ میں صحابہ رضا کا جمعہ پڑھنا اور یہ دونوں گاؤں مدینہ سے ایک ایک کوس (سوا میل) کے فاصلہ پر ہیں۔ پہلی روایت مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی نے احسن القریٰ کے صفحہ ۵ میں بحوالہ اہل سیر ذکر کی ہے۔ اور دوسری روایت مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے اوثق القریٰ کے صفحہ ۶ میں بحوالہ ابوداؤد اور مولوی ظہیر الحسن نیموی رحمہ نے جامع الآثار کے صفحہ ۱۳ میں بحوالہ ابن ماجہ ذکر کی ہے اسی طرح عمر بن عبدالعزیز رہ نے جنگل میں جمعہ پڑھا ہے اور انسؓ نے زاویہ میں نماز عید پڑھی اور زاویہ

بصرہ سے چھ میل دور ہے۔ اور عید و جمعہ کا حنفیہ کے نزدیک ایک ہی حکم ہے۔
غرض اس قسم کے دلائل بہت سے ہیں جن کی تفصیل ہماری کتاب اطفاء الشمعہ میں ہے۔

واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ ۱۷ مئی ۱۹۶۳ء

غیر عربی میں خطبہ کا ثبوت

سوال نمبر ۱۔ خطبہ جمعہ کی نسبت امام نووی اذکار صفحہ ۸۶ میں لکھتے ہیں ویشترط کونہا بالعربیۃ هکذا فی منہاج الطالبین صفحہ ۱۹ اور شیخ الاسلام زکریا انصاری متن المنہج صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں وشرط کونہما عربتین اور ان کے سوا اور علمائے شافعیہ فرماتے ہیں اور حنابلہ نے ایسا ہی لکھا ہے۔ اور جناب شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مصفی صفحہ ۱۵۳ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کا رواج عربی میں ہمیشہ سے ہے چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں

" وعربی بودن نیز بجہۃ عمل مستمر مسلین در مشارق و مغارب باوجود آنکہ در بسیارے از اقالیم مخاطبان عجمی بودند۔

اب سوال یہ ہے کہ ان عبارات سے غیر لسان عرب میں خطبہ جمعہ پڑھنا ایک فعل محدث ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

نمبر ۲۔ بہتیرے امور محدث کہے جاتے ہیں وہ اسی وجہ سے کہ وہ ازمنہ مشہود لہا بالخیر سے متوارث نہیں پس خطبہ جمعہ غیر لسان عرب میں جو ازمنہ مشہود لہا بالخیر سے متوارث نہیں اس کو کیوں محدث نہیں کہا جا سکتا

نمبر ۳۔ یہ اردو خطبہ کس وقت سے جاری ہوا۔ اور کون اس کا موجد ہے۔

نمبر ۴۔ یہ عربی خطبہ جو ہمیشہ سے جاری ہے جس کو عوام نہیں سمجھتے ہیں شرعًا ادا ہو سکتا ہے یا نہیں

نمبر ۵۔ نماز میں علاوہ دعاء ماثورہ اگر کوئی شخص اپنی زبان اردو یا فارسی میں کوئی دعا پڑھے تو یہ جائز ہے یا نہیں۔ دونوں شقوں کا جواب مدلل مطلوب ہے۔

جواب (۱)۔ ہر محدث کام بدعت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دین میں داخل ہو۔ اگر دین میں داخل نہ ہو تو وہ بدعت نہیں۔ جیسے علم معانی۔ بیان۔ عروض وغیرہ۔ دوسری شرط

ہے کہ شریعت میں اس کا ثبوت نہ ہو۔ اگر شریعت میں اس کا ثبوت ہو تو وہ بھی بدعت نہیں۔ جیسے حضرت عمرؓ نے تراویح کی بابت فرمایا۔ نعمت البدعۃ ھذہ۔ یعنی یہ اچھی بدعت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز پڑھ کر فرضیت کے خوف سے ترک کر دی تھیں۔ اسی طرح تعدد جمعہ (یعنی شہر میں کئی جگہ جمعہ پڑھنے) کی بابت صحیح مسلک یہی ہے کہ درست ہے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایک ہی جگہ ہوتا رہا متعدد جگہ نہیں ہوا۔ اسی طرح خطبہ جمعہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اگر کہا جائے کہ حضرت علیؓ سے تعدد جمعہ کی بابت مروی ہے کہ انہوں نے تعدد جمعہ کا حکم کیا۔ چنانچہ ابن تیمیہ علیہ الرحمہ نے منہاج السنہ میں ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ محدث نہ رہا۔ بخلاف خطبہ کے غیر عربی ہونے کی کونسی روایت ہے تو جواباً عرض ہے کہ خطبہ جمعہ غیر عربی میں ہونے کی بابت ارشادِ نبویؐ موجود ہے۔ مسلم وغیرہ میں حدیث خطبہ جمعہ میں ہے۔

یقراء القرآن ویذکر الناس (منتقی)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو وعظ کرتے

اور ظاہر ہے کہ افہام (سمجھانا) نہ ہو تو وعظ ہی نہیں۔

اِس کے علاوہ مسلم اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ کرتے تو آنکھیں سُرخ ہو جاتیں، غصہ سخت ہو جاتا۔ اور آواز بلند ہو جاتی۔ گویا کہ آپ فوج دشمن سے ڈرنے والے ہیں۔ جو کہتا ہے صبح کو لوٹا تمہیں شام کو لوٹا تمہیں۔

اِسی بنا پر نواب صاحب روضۃ الندیہ کے صفحہ ۹ میں لکھتے ہیں۔

ثم اعلم ان الخطبۃ المشروعۃ ھی ما کان یعتادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ترغیب الناس وترھیبھم فھذا فی الحقیقۃ روح الخطبۃ الذی لاجلہ شرعت واما اشتراط الحمد للہ او الصلوۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او قراءۃ شیٔ من القران فجمیعہ خارج عن معظم المقصود من شرعیۃ الخطبۃ۔ انتہی۔

یعنی مشروع خطبہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ لوگوں کو رغبت دیتے اور ڈراتے۔ پس یہ درحقیقت خطبہ کی جان ہے جس کی خاطر خطبہ کا حکم ہوا۔ اور خدا کی تعریف

کی شرط اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درُود کی شرط اور قرآن مجید پڑھنے کی شرط اصل مقصودِ خطبہ سے خارج ہے جب اصل مقصود ہی لوگوں کو وعظ ہے تو مخاطب لوگوں کی زبان کا لحاظ ضروری ہُوا بلکہ خود خطبہ کا لفظ بھی اسی کو چاہتا ہے۔ کیونکہ مخاطب سمجھتا نہ ہو تو اس کو مخاطب کرنے کے کچھ معنے ہی نہیں بعض لوگ جو خطبہ کو نماز پر قیاس کرتے ہیں۔ اور دلیل اس کی حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کرتے ہیں جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ۔ انما جعل الخطبة مكان الركعتين یعنی خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے، تو یہ ان کی غلطی ہے۔ کیونکہ ایک شے کا دُوسرے کے قائم مقام ہونا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر طرح اس کے حکم میں ہو جائے مثلاً بلوغ المرام میں حدیث ہے کہ نماز پہلے دو دو رکعت فرض ہوئی تھی۔ جب آپ نے ہجرت کی تو چار رکعت ہو گئی مگر سفر کی بدستور دو رکعت ہی رہی اور مغرب کی تین رکعت رہی کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور فجر کی دو رہی کیونکہ اس میں قرأت لمبی ہے دیکھئے اس حدیث میں لمبی قراءۃ کو دو رکعت کے قائم مقام قرار دیا ہے حالانکہ دو رکعت جو زیادہ ہوئی ہیں وہ فرض ہیں اور فجر میں کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں بلکہ خود حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کیساتھ پڑھائی ہے ٹھیک اسی طرح خطبہ کو سمجھ لینا چاہئیے کہ ہر حکم میں دو رکعت کے قائم مقام نہیں بلکہ بعض باتوں میں ہے ۔ مثلاً ضروری ہونے میں نماز کی طرح ہے ۔ یعنی خطبہ کے بغیر نماز جمعہ نہیں ہو سکتی یا جیسے نماز میں دوسرے سے بات چیت منع ہے اور کوئی فضول حرکت جائز نہیں اسی طرح خطبہ سننے کے وقت کسی سے کوئی بات چیت نہیں کر سکتا نہ کوئی اور فضول حرکت کر سکتا ہے یا جیسے نماز میں وضو ضروری ہے اسی طرح خطبہ میں با وضو بیٹھنا چاہئیے تاکہ امام کے فارغ ہونے کے بعد وضو کرتے کراتے جمعہ نہ رہ جائے یا یہ مطلب کہ دو رکعت سے لمبا نہ ہو یا یہ مطلب کہ ثواب میں خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے یعنی ظہر کی نسبت جو دو رکعت کی کمی ہو گئی ہے ان کا ثواب خطبہ سے حاصل ہو جاتا ہے ۔ غرض ساری باتوں میں خطبہ دو رکعت کے قائم مقام نہیں اگر ایسا ہوتا تو جو شخص خطبے میں شامل نہیں ہوا بلکہ نماز میں آکر ملا اس کا جمعہ نہ ہونا چاہئیے بلکہ چار پڑھے کیونکہ اس کا خطبہ جو دو رکعت کے قائم مقام ہے رہ گیا ہے ۔ حالانکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص جمعہ کی پہلی رکعت میں مل جائے اس کا جمعہ ہو جاتا ہے بلکہ دوسری رکعت پوری پالے تو بھی ایک ہی اور اٹھ کر پڑھے گا نہ تین ۔ پس معلوم ہوا کہ خطبہ ساری باتوں میں دو رکعت کے قائم مقام نہیں نیز اگر ایسا ہوتا تو خطبہ کے ساتھ کسی کو یا خطیب کو کسی کے ساتھ بات چیت جائز نہ ہوتی حالانکہ یہ صریح احادیث کے خلاف ہے

۱ ۔ بخاری مسلم وغیرہ میں حدیث ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے ایک اعرابی آیا

اس نے کہا یا رسول اللہ (قحط سالی سے مال ہلاک ہو گئے۔ رستے بند ہو گئے۔ بارش کی دعا کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے ہاتھ اٹھائے اور بارش کی دعا کی۔ ایک ہفتہ تک برابر بارش ہوتی رہی دوسرے جمعہ پھر وہی یا دوسرا اعرابی آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے کہا یا رسول اللہ (کثرت بارش سے) مال ہلاک ہو گئے اور رستے بند ہو گئے۔ دعا کیجئے اللہ تعالےٰ بارش بند کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ اے اللہ اردگرد برسا ہم پر نہ برسا اور ساتھ ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرتے جدھر جدھر اشارہ کرتے بادل پھٹتا جاتا یہاں تک کہ مدینہ ایسا ہو گیا جیسے تاج میں ہوتا ہے یعنی مدینہ خالی تھا اور اردگرد بادل تھا۔

(ب) نیز بخاری ومسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ خطبہ پڑھ رہے تھے اس حال میں ایک صاحب (حضرت عثمانؓ) آئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا یہ کونسی گھڑی ہے یعنی اتنی دیر کر کے کیوں آئے۔ عثمانؓ نے کہا کہ میں ایک کام میں تھا اور اس سے فارغ ہو کر گھر میں نہیں پہنچا کہ اذان سُنی۔ پس وضو کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ دوسرا قصور ہے کہ وضو پر کفایت کی۔

(ج) ترمذی۔ نسائی اور ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے حسن حسین رضی اللہ عنہما آئے۔ ان پر سُرخ کرتے تھے۔ چلتے اور ٹھوکریں کھاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر سے اُتر کر ان کو اٹھا کر اپنے آگے رکھ لیا۔ پھر کہا اللہ تعالےٰ نے سچ فرمایا انما اموالکم واولادکم فتنۃ ترجمہ یعنی تمہارے مال اور اولاد تمہارے لئے فتنہ ہیں۔ میں ان دونوں کو ٹھوکریں کھاتا دیکھ کر صبر نہیں کر سکا یہاں تک کہ میں نے اپنی بات درمیان میں چھوڑ کر ان کو اٹھا لیا۔

(د) مسلم وغیرہ میں ہے ابو رفاعہ کہتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ خطبہ پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یا رسول اللہ (صلعم) ایک شخص مسافر ہے اپنے دین کے متعلق سوال کرتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اس کا دین کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ چھوڑ کر میرے پاس آئے۔ پھر ایک کرسی لائی گئی مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کے پائے لوہے کے تھے۔ آپ اس پر بیٹھ کر مجھے ان باتوں سے سکھاتے رہے جو آپ کو اللہ تعالےٰ نے سکھائی تھیں۔ پھر (مجھ سے فارغ ہو کر) واپس آکر اپنا خطبہ پورا کیا۔

تلخیص الحبیر کے صفحہ ۱۳۵ میں ہے۔

البیہقی من طریق عبد الرحمان بن کعب ان الرھط الذین بعثھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی ابی الحقیق بخیبر لیقتلوہ فقتلوہ فقدموا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو قائم علی المنبر یوم الجمعۃ فقال لھم حین راھم افلحت الوجوہ فقالوا افلح وجھک یا رسول اللہ قال اقتلوہ قالوا نعم فدعا بالسیف الذی قتل بہ وھو قائم علی المنبر فسلہ فقال اجل ھذا طعامہ فی ذباب سیفہ الحدیث قال البیہقی مرسل جید وروی عن عروۃ نحوہ ثم رواہ من طریق ابن عبداللہ ابن انیس عن ابیہ قال بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی ابن ابی الحقیق نحوہ انتھی

یعنی بیہقی نے عبدالرحمان بن کعب کے طریق سے روایت کیا ہے کہ جس جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں ابن ابی الحقیق (یہودی) کے قتل کے لئے بھیجا تھا اُس جماعت نے اس کو قتل کیا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ جمعہ کے دن منبر پر آئے جب آپ نے اُن کو دیکھا تو فرمایا چہرے کامیاب ہوگئے۔ اُنہوں نے کہا یا رسول اللہ آپ کا چہرہ کامیاب ہو۔ پس فرمایا کیا تم نے اس کو قتل کر دیا؟ کہا ہاں۔ پس منبر پر کھڑے تلوار۔ پھر تلوار میان سے نکال کر فرمایا ہاں تم نے اس کو قتل کر دیا تلوار کی دھار پر اس کا کھانا لگا ہوا ہے۔ بیہقی نے کہا یہ حدیث مرسل ہے کھری ہے۔ اور عروہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے پھر عبداللہ بن انیس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ابن ابی الحقیق کی طرف بھیجا۔

(و) بخاری ومسلم میں ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص (سلیک غطفانی) جمعہ کے دن آیا اور آپ خطبہ پڑھ رہے تھے۔ وہ بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا کھڑا ہو اور دو رکعت ہلکی پڑھ۔

(ح) ابُوداؤد ونسائی ومسند احمد میں ہے کہ ایک شخص لوگوں کی گردنوں پر سے گذرتا ہوا آگے آرہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا بیٹھ جا تونے ایذا دی۔ اور مسند احمد میں ہے تونے ایذا دی اور دیر کی (منتقیٰ)

(ز) بخاری ومسلم وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ کی طرف نکلتے پہلے نماز پڑھتے پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور لوگ اپنی اپنی جگہ پر ہوتے پس اُن کو وعظ کرتے اور

وصیت کرتے اور حکم دیتے اگر کسی لشکر بھیجنے کا ارادہ کرتے یا کسی اور شئے کا حکم دینا ہوتا تو فرما دیتے پھر لوٹ جاتے یہ سات روایتیں ہیں اس قسم کی اور بھی بہت ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ کا حکم نماز کا نہیں بلکہ عام وعظوں کی طرح ایک وعظ ہے جو ہر زبان میں درست ہے۔ اس میں ہر قسم کی بات چیت ہو سکتی ہے اس کو درمیان چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کر کے پھر پورا کر سکتے ہیں۔ ابورفاعہ کو آپ نے خطبہ چھوڑ کر دین سکھایا۔ حسن حسین رضی اللہ عنہما منبر سے اترے اور لا کر آگے بٹھا لیا۔ صرف اتنی بات ہے کہ خطبہ جمعہ کی بابت تاکید بہت آئی ہے کہ سامعین توجہ سے سنیں اور کوئی فضول حرکت نہ کریں تاکہ کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ کان میں وعظ کی آواز پڑھے جس سے دل نرم رہیں اگر ایسا نہ ہو تو دل مردہ ہو جائیں یہی وجہ ہے کہ خطبہ عیدین کے لئے اتنی تاکید نہیں آئی پس جب خطبہ عام وعظوں کی طرح ایک وعظ ہے۔ صرف خطبہ جمعہ میں ایک خاص وجہ سے سننے کی تاکید ہے اور خطبہ عیدین میں یہ بھی نہیں تو پھر اس کو نماز پر قیاس کرنا کیوں کر صحیح ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک بات ہے کہ جب لشکر وغیرہ بھیجنے کا کام خطبہ میں درست ہے تو یہ مخاطب لوگوں کی زبان میں ہی ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربی زبان کی پابندی ضروری ہے۔ غرض نماز پر خطبہ کا قیاس بالکل صحیح نہیں کیونکہ خطبہ خطاب ہے اور خطاب پر پابندی زبان کی اصل مقصود کو فوت کرتی ہے جو خطاب سے مقصود ہوتا ہے یعنی سامعین کو اپنی بات پہنچانا۔ برخلاف نماز کے کہ وہ خطاب نہیں بلکہ مقصود اس سے خدا کا ذکر اور قراءۃ قرآن پاک ہے۔ چنانچہ مسلم وغیرہ میں حدیث ہے۔

ان هذه الصلوٰة لا يصلح فيها شئ من كلام الناس انما هي التسبيح والتكبير وقراءة القرآن۔

یعنی نماز میں بات چیت درست نہیں (یہاں تک کہ چھینک لینے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا بھی جائز نہیں)

کیونکہ نماز صرف تسبیح تکبیر قراءۃ قرآن ہے یعنی اصل مقصود یہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں جو قرآن مجید پڑھا جاتا ہے تو اس حیثیت سے نہیں پڑھا جاتا کہ وہ مقتدیوں کو خطاب ہے بلکہ اس طرح سے پڑھا جاتا ہے کہ جیسے کسی کو محبوب کا کلام پیارا معلوم ہوتا ہے وہ اس کا ورد کرتا ہے یا جیسے پڑھنے والے سے خدا باتیں کرتا ہے اور وہ اپنے کو ان کا مصداق سمجھتا ہے جس سے اس کے دل میں رقت اور نرمی پیدا ہوتی ہے بعض احادیث میں جو بعض نمازوں کی بابت خاص خاص سورتوں کے پڑھنے کا ذکر آیا

ہے جیسے جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۃ سجدہ اور سورۃ دہر اور جمعہ کی نماز میں سورہ ھل اتاك یا سورہ جمعہ اور سورہ منافقون اور عیدین کی نماز میں سورۃ ق اور سورہ اقتربت اور سورہ اعلیٰ اور سورہ ھل اتاك اور جمعرات کو مغرب کی نماز میں قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد تو اس کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے پڑھنے سے پڑھنے والے کے اعتقاد کی اصلاح ہے یا اس کو رقت اور نرمی زیادہ پیدا ہوتی ہے اور اس کے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور اس سے مقتدیوں پر بھی خاص اثر پڑتا ہے اور نماز میں بھی خشوع خضوع بڑھتا ہے اور دل زیادہ لگتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص نماز سے باہر امام کی قرات سن لے تو اس کی بھی یہی حالت ہوگی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ نماز سے اصل مقصود کیا ہے دوسرے کو وعظ ہے یا اپنی حالت کی اصلاح ظاہر ہے کہ اپنی حالت کی اصلاح ہے برخلاف خطبہ کے کہ اس میں دوسرے کو وعظ خطاب مقصود ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں بعض سرّی نمازوں کی بابت اور بعض نوافل کی بابت بھی خاص سورتوں آیتوں کا ذکر آیا ہے حالانکہ وہاں دوسرے سے تعلق نہیں جیسے مشکوٰۃ باب القراءۃ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر میں سورۃ واللیل اذا یغشیٰ پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے سورۃ سبح اسم ربك الاعلیٰ آتی ہے اور فجر کی سنتوں میں آیت قولوا امنا باللہ وما انزل الینا اور آیت قل یا اھل الکتاب تعالوا پڑھا کرتے تھے تو گویا یہ ایسا ہوگیا جیسے نماز کے علاوہ خاص خاص وقتوں میں اپنی اصلاح کے لئے خاص خاص آیتوں اور خاص خاص سورتوں کے پڑھنے کا ذکر آیا ہے جیسے سوتے وقت آیۃ الکرسی اور سورہ سجدہ، سورہ ملک اور وہ سورتیں جن کے شروع میں سبح یا یسبح ہے اور جمعہ کے دن سورۃ کہف سورۃ ہود اور سورۃ آل عمران وغیرہ اور ہر روز شروع دن میں سورہ یٰس اور ہر رات آخر رکوع آل عمران اور سورۃ واقعہ وغیرہ وغیرہ۔ پس نماز اور خطبہ کی اصل غرض دیکھتے ہوئے کوئی شخص خطبے کو نماز کا حکم نہیں دے سکتا۔ اور نہ نماز کو خطبے کا حکم دے سکتا ہے بلکہ نماز کی ہیئت ہی وعظ کی ہیئت کے خلاف ہے۔ چنانچہ گذر چکا ہے کہ خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں سرخ ہوجاتیں اور بہت جوش اور بہت غصہ میں آجاتے اور آواز بلند ہوجاتی جیسے کوئی دشمن کی فوج سے ڈراتا ہے کہ تمہیں صبح کو لوٹ لیا یا شام کو لوٹ لیا۔ نماز کی حالت ایسی نہیں بلکہ وہ عاجزی اور انکساری کی حالت ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں عبداللہ بن شخیر سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کے پیٹ میں ہنڈیا کے پکنے کی آواز تھی اور ایک روایت میں ہے میں نے آپ کو نماز پڑھتے دیکھا آپ کے سینہ کی آواز چکی کی آواز تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ادھر ادھر گردن

موڑنا دیکھنا منع ہے نیز نماز کی ہیئت قیام اور نیچے اُوپر ہونا اور مقتدیوں کا اس میں امام کی تابعداری کرنا یہ بھی وعظ کے خلاف ہے کیونکہ خطبہ اور دیگر وعظ کلام میں سامعین کی ایسی حالت ہوتی جیسے کسی کے سر پر پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ اس کو پکڑنا چاہتا ہو چنانچہ مشکوٰۃ میں براء بن عازب سے روایت ہے

جلسنا حوله كان على رؤسنا الطير

یعنی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھ گئے گویا کہ ہمارے سر پر پرندے ہیں پھر عذاب قبر کا حال سنایا۔

خلاصہ یہ کہ خطبہ عام وعظوں کی طرح ایک وعظ ہے خواہ جمعہ کا ہو یا عیدین کا ہو خطیب کو اس میں کلام وغیرہ جائز ہے۔ زبان کی پابندی اس میں ضروری نہیں کیونکہ خطبہ کی غرض کے خلاف بلکہ خطبہ کے لفظ کے خلاف ہے کیونکہ خطبہ خطاب ہے جو سامعین کی زبان میں ہوتا ہے۔ نماز پر اس کو قیاس کرنا غلط ہے۔ کیونکہ نماز مناجات ہے خطبہ مناجات نہیں۔ خطبہ کی ہیئت عام وعظوں کی سی ہے۔ نماز کی اس طرح نہیں۔ خطبہ میں کلام وغیرہ جائز ہے۔ نماز میں جائز نہیں۔ صرف خطبہ جمعہ کے سننے کی تاکید آئی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی کھیتی کو پانی ملتا رہے تاکہ خشک نہ ہو جائے۔

اعتراض

اگر کہا جاوے کہ غیر عربی میں خطبہ پڑھنا خیر قرون کے خلاف ہے چنانچہ سائل نے شاہ ولی اللہ صاحب سے نقل کیا ہے کہ ہمیشہ سب جگہ خطبہ عربی میں ہوتا رہا اور جو بات خیر قرون کے خلاف ہو اس کے بدعت ہونے میں کیا شبہ ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ خیر قرون کے خلاف اس وقت ہوتا جب خیر قرون سے کسی کا اس پر فتوےٰ نہ ہوتا۔ جب خیر قرون سے بعض اس طرف گئے ہیں کہ خطبہ غیر عربی درست ہے چنانچہ امام ابوحنیفہ رح صاحب کا یہی مذہب ہے اور امام شافعی رح کے مذہب میں دو وجہیں ہیں۔ ایک جائز ہونے کی اور ایک ناجائز ہونے کی تو اس کو خیر قرون کے خلاف نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کو خیر قرون کے اختلافی مسائل سے سمجھ کر دلائل سے راجح مرجوح کا فیصلہ کریں گے سو دلائل کی رُو سے راجح یہی ہے کہ غیر عربی میں درست ہے۔ علامہ زبیدی شرح احیاء العلوم میں لکھتے ہیں۔

وهل يشترط كون الخطبة كلها بالعربية وجهان الصحيح اشتراطه فان لم يكن من يحسن العربية خطب بغيرها ويجب عليهم التعليم

والاعضوا ولا جمعة (شرح احیاء العلوم ص۲۲۶ جلد۳)

یعنی خطبہ کے عربی ہونے کی بابت دو وجہیں ہیں (ایک یہ کہ عربی میں ہونا شرط ہے دوسری یہ کہ شرط نہیں) صحیح یہ ہے کہ شرط ہے پس اگر کوئی اچھی طرح عربی نہ جانے تو غیر عربی میں خطبہ پڑھے اور لوگوں پر عربی کا سیکھنا واجب ہے ورنہ گنہگار ہو جائیں گے اور ان کا جمعہ نہیں۔

شرح احیاء العلوم کے دوسرے مقام میں ہے۔

قال الرافعي وهل يشترط ان تكون الخطبة كلها بالعربية وجهان والصحيح اشتراطه فان لم يكن فيهم من يحسن العربية خطب بغيرها وقال اصحابنا ان الخطبة بالفارسية وهو يحسن العربية لا يجزيه (شرح احیاء العلوم جلد۳ ص۲۳۰)

یعنی رافع کہتے ہیں کہ خطبے کے عربی ہونے میں دو وجہیں ہیں (ایک یہ کہ عربی میں شرط ہے دوسری یہ کہ شرط نہیں) صحیح یہ ہے کہ شرط ہے، پس اگر کوئی ٹھیک عربی نہ جانتا ہو تو اس کو کافی نہیں ہوگا۔

ان دونوں عبارتوں میں امام شافعیؒ کے مذہب میں دو وجہیں بتلائی ہیں (ایک عربی میں ضروری ہونے کی اور ایک غیر ضروری ہونے کی) مذہب میں وجہ سے فقہاء کی مراد یہ ہوتی ہے کہ صریح قول امام کا اس بارے میں کوئی نہیں، امام کے اقوال سے یہ بات سمجھی جاتی ہے، کبھی امام کے اقوال سے دو باتیں سمجھی جاتی ہیں تو وہ مذہب میں دو وجہیں ہو جاتی ہیں۔ جیسے خطبہ کے عربی ہونے اور نہ ہونے کی بابت دو وجہیں ہیں۔ شرح احیاء العلوم میں اگرچہ عربی میں ضروری ہونے کی وجہ کو صحیح کہا ہے لیکن درحقیقت صحیح دوسری ہے چنانچہ اوپر دلائل سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ خطبہ غیر عربی میں درست ہے پس جب امام شافعیؒ کے مذہب میں یہ ایک وجہ ہوئی تو اس کو خیر قرون کے خلاف نہیں کہہ سکتے، کیونکہ امام شافعی تبع تابعین سے ہیں اور تبع تابعین خیر قرون سے ہیں۔

رد المختار میں ہے۔

لم يقيد الخطبة بكونها بالعربية اكتفاء بما قدمه في باب صفة الصلوٰة من انها غير شرط ولو مع القدرة على العربية عنده خلافا لهما حيث شرطاها الا عند العجز كالخلاف في الشروع في الصلوٰة (رد المختار جلد اول ص۵۹۰)

یعنی مصنف نے خطبہ کے عربی میں ہونے کی قید نہیں لگائی کیونکہ باب صفۃ الصلوٰۃ میں گذر چکا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں خواہ عربی پر قادر ہی ہو۔ برخلاف صاحبین کے کیونکہ اُن کے نزدیک

عربی میں ہونا شرط ہے مگر عربی سے عاجز ہو تو پھر صاحبین کے نزدیک بھی غیر عربی میں جائز ہے۔ جیسے شروع[1] نماز (تکبیر تحریمہ) میں امام ابوحنیفہ صاحبؒ اور ان کے شاگردوں کا اختلاف ہے کہ عربی میں جائز ہے یا نہیں (ایسے ہی یہ اختلاف ہے)

امام ابوحنیفہ صاحبؒ کی بابت بعض کا خیال تو تابعی ہونے کا ہے لیکن تبع تابعین سے ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں تو جب ان کا فتوائے خطبہ کے غیر عربی ہونے کی بابت موجود ہے تو اس کو خیر قرون کے خلاف کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ پس یہ سلف کے اختلافی مسائل سے ہوا۔ جس کا فیصلہ دلائل کے رُو سے یہی ہے کہ خطبہ غیر عربی میں درست ہے چنانچہ اُوپر تفصیل ہو چکی اور جو لوگ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ صاحبؒ کے نزدیک درست تو ہے لیکن مکروہ ہے۔ تو یہ غلط ہے کیونکہ وہ صرف اس بناء پر کہتے ہیں کہ خیر قرون سے کسی نے غیر عربی میں پڑھا نہیں۔ ورنہ امام ابوحنیفہ سے کراہت کی تصریح منقول نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ خیر قرون میں غیر عربی میں کسی نے پڑھا نہیں اس میں بھی شبہ ہے کیونکہ جب فتوائے دیا گیا ہے تو قرین قیاس یہی ہے کہ کسی نے عمل کے لئے سوال کیا ہوگا کیونکہ خیر قرون میں تکلف نہیں تھا کہ فرضی صورتیں گھڑا کریں اور نہ ان کی یہ شان تھی بلکہ واقعات پیش آنے کی صورت میں بھی بہت ان سے ایسے تھے کہ احتیاط کرتے اور مسئلہ نہ بتاتے اور ایک دوسرے کا سہارا لیتے۔ یعنی یہ چاہتے کہ کوئی دوسرا مسئلہ بتلا دے چنانچہ اعلام الموقعین وغیرہ میں اس قسم کی روایتیں بہت ہیں۔ پس صرف صراحۃً نقل نہ ہونے سے عمل کی نفی سمجھ لینا اور جو بات قرین قیاس ہو اس کو نظر انداز کر

---

[1] امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ساری نماز ہی فارسی (وغیرہ) میں جائز ہے چنانچہ ہدایہ وغیرہ میں ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم ہے۔ فارسی وغیرہ میں ترجمہ قرآن نہیں کیونکہ قرآن عربی ہے۔ فارسی وغیرہ اس لئے امام ابوحنیفہ کا یہ قول قابل تسلیم نہیں اس لئے صاحب ہدایہ نے اس قول سے امام ابوحنیفہ صاحب کا رجوع صاحبین کے قول کی طرف نقل کر کے لکھا ہے وعلیہ الاعتماد یعنی اس امر پر اعتماد ہے لیکن رجوع کی روایت چونکہ صحت کو نہیں پہنچی اس لئے صیغہ تمریض (ضعف) کے ساتھ ذکر کی ہے چنانچہ لکھا ہے ویروی رجوعہ یعنی امام ابوحنیفہ صاحب کا رجوع روایت کیا جاتا ہے۔ اور اعتماد اس پر اس لئے ظاہر کیا ہے کہ پہلا قول دلیل کی رو سے قابل تسلیم نہیں اسی طرح باقی اذکار نماز کی بابت امام ابوحنیفہ کا قول قابل تسلیم نہیں کیونکہ خطبہ کے غیر عربی ہونے کی بابت تو حدیث ویذکر الناس وغیرہ آئی ہے بلکہ خود خطبہ کا لفظ اسی کو چاہتا ہے نماز کی بابت کوئی حدیث نہیں آئی نہ اس کا لفظ اس کو چاہتا ہے۔

دینا یہ مناسب نہیں۔ اس کے علاوہ جب ایک بات کی بابت خیر قرون میں فتوے ہوگیا اور فتوے میں کراہت کا ذکر نہ آیا تو صرف عمل نہ ہونے سے کراہت سمجھنا ڈبل غلطی ہے۔ دیکھئے تراویح باجماعت پر حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں عمل نہیں ہوا پھر حضرت عمر رض کی شروع خلافت میں بھی عمل نہیں ہوا۔ اس کے بعد ہوا۔ اسی لئے حضرت عمر رض نے اس کو بدعت کہا۔ چنانچہ گذر چکا ہے اور تعدد جمعہ پر حضرت علی رض کی خلافت تک عمل نہیں ہوا۔ چنانچہ یہ بھی گذر چکا ہے۔ اور علاوہ خطبہ جمعہ اور خطبہ عیدین کے بھی غیر عربی میں وعظ پر عمل خیر قرون میں صحیح سند سے مروی نہیں ہوا۔ اسی طرح خیر قرون میں کسی نے کوئی تصنیف غیر عربی میں نہیں کی۔ نہ کسی نے تفسیر غیر عربی میں لکھی نہ کوئی اور دینیات کی کتاب غیر عربی میں لکھی بلکہ خیر قرون کے بعد بھی مدت تک غیر عربی میں تصنیف کرنے کا ثبوت نہیں ملتا جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عربی کا اس وقت زور تھا کیونکہ سلطنت اسلامی تھی۔ دین و دنیا سب کچھ عربی میں تھا۔ زور اور کثرت میل جول سے اتنا اثر ضرور ہوگیا تھا کہ اگر غیر عرب عربی بولنے پر قادر نہ تھے تو اکثر کچھ کچھ سمجھ لیتے تھے اس لئے غیر عربی میں تصنیف کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ پس یہی وجہ بعینہ خطبہ وغیرہ کی ہوسکتی ہے۔ اور ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ امام جمعہ اور عیدین عموماً اس وقت امیر ہوتے تھے تو ان کے خیال میں خطبہ عربی میں بہتر یا ضروری ہو تو اس وجہ سے وہ عربی میں پڑھتے رہے۔ اور جن کے نزدیک مخاطب کا لحاظ رکھنا مناسب تھا ان کو امیر بننے کا اتفاق نہ ہوا یا یہ وجہ ہو کہ عربی زبان کی اُس وقت ابھی پُوری حفاظت نہیں ہُوئی تھی اس لئے حتی الوسع وہ غیر عربی سے دُور رہتے تھے تاکہ عربی کا زور ہو کر اس کی پُوری حفاظت ہو جائے اور اس کے ہر قسم کے قواعد بن جائیں چنانچہ ایسا ہی ہُوا اگر اُن کی توجہ ملکی زبانوں کی طرف رہتی تو آج ہمیں عربی زبان کے قواعد اور اس کی حفاظت کا یہ نظارہ نصیب نہ ہوتا جو دیکھ رہے ہیں کہ خدا کے فضل سے کوئی زبان قواعد میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ جو کچھ تھوڑے بہت قواعد دوسری زبانوں کے تیار ہوئے اس کی خوشہ چینی میں ہُوئے غرض اس قسم کے بہتیرے وجوہ اس وقت خطبہ کے عربی میں پڑھنے کے ہوسکتے ہیں جو اس وقت نہیں پس غیر عربی میں اس وقت کسی نے خطبہ نہیں پڑھا تو کوئی حرج نہیں عمل کا اصل جو ہمارے ہاتھ میں موجود ہے یعنی فتوے اس سے سب عقدے حل ہوسکتے ہیں۔

دُوسرا ثبوت یا تائید

جو لوگ خطبہ کے غیر عربی میں ہونے کے قائل نہیں عاجز ہونے کے وقت وہ بھی قائل ہیں یعنی اگر عربی میں قائل نہ ہو تو غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے چنانچہ کچھ عبارتیں اُوپر گذر چکی ہیں کچھ اور ملاحظہ ہوں۔

کشاف القناع میں ہے۔

(ولا تصح الخطبة بغير العربية مع القدرة) عليها بالعربية (كقراءة) فانها لا تجزئ بغير العربية وتقدر (وتصح) الخطبة بغير العربية (مع العجز) عنها بالعربية لان المقصود بها الوعظ والتذكير وحمد الله والصلوٰة على رسول الله صلى الله عليه وسلم بخلاف لفظ القرآن فانه دليل النبوة وعلامة الرسالة ولا يحصل بالعجمية (غير القراءة) فلا تجزئ بغير العربية لما تقدم (فان عجز عنها) اى عن القراءة (وجب بدلها) قياسا على الصلوٰة (كشاف القناع عن متن الاقناع للشيخ منصور بن ادريس الحنبلى جلد اول ص۳۴۵)

یعنی باوجود قدرت کے خطبہ غیر عربی میں صحیح نہیں جیسے قراءۃ القرآن (خطبہ میں) غیر عربی میں صحیح نہیں اور عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں خطبہ غیر عربی میں صحیح ہے کیونکہ خطبہ سے مقصود وعظ ونصیحت کرنا اللہ کی تعریف کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا ہے۔ بخلاف قرآن کے کہ وہ غیر عربی میں درست نہیں کیونکہ لفظ قرآن کے نبوت کی دلیل ہیں اور رسالت کی علامت ہیں۔ اور عربی زبان سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ پس قراءۃ غیر عربی میں کفائت نہیں کرے گی۔ پس اگر قرأت سے عاجز ہوجائے تو اس کے عوض ذکر واجب ہوگا جیسے نماز میں قرأت سے عاجز ہوجائے تو اس کے عوض میں ذکر واجب ہوتا ہے۔

شرح منتہی الارادات میں ہے۔

(وهى) اى الخطبة (بغير العربية) مع القدرة (كقراءة) فلا يجوز وتصح مع العجز غير القراءة فان عجز عنها وجب بدلها ذكر (شرح منتهى الارادات ص۲۵۰ للشيخ منصور بن يونس بهوتى الحنبلى جلد ا)

یعنی عربی میں قدرت ہونے کی صورت میں غیر عربی میں خطبہ جائز نہیں جیسے قرأت جائز نہیں اور عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں خطبہ غیر عربی میں جائز ہے قرأت جائز نہیں۔ قرأت کے عوض ذکر واجب ہوگا۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ خطیب جب عربی پر قادر نہ ہو تو خطبہ غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے۔ اور

اس میں شُبہ نہیں کہ آج کل عموماً خطیبوں کو اتنی لیاقت نہیں کہ عربی میں تقریر یا تحریر کرسکیں پس غیر عربی میں جائز ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ کسی کا بنا ہُوا خطبہ یاد کرلیں یا دیکھ کر پڑھ لیں تو اس کی بابت عرض ہے کہ اگر کسی کا بنا ہوا یاد کر کے پڑھ لینا یا دیکھ کر پڑھ لینا درست ہے تو غیر عربی میں بطریق اولیٰ درست ہے کیونکہ دُوسرے کا یاد کر کے سنانا یا دیکھ کر سنانا اس کی بابت تو خیر قرون میں نہ کسی کا عمل ثابت ہے نہ فتویٰ۔ اور غیر عربی میں پڑھنے کی بابت اگر عمل صراحتہً منقول نہیں ہوا تو فتویٰ تو ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن مجید کافی وعظ ہے لیکن اُوپر کی عبارتیں دلالت کرتی ہیں کہ عربی پر قادر نہ ہونے کی صورت میں قرآن کے علاوہ باقی خطبہ غیر عربی میں جائز ہے۔ تو اس باقی خطبہ سے عام وعظ مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن خود عام وعظ ہے تو قرآن کے علاوہ غیر عربی میں جائز کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی پس اس سے مُراد خاص وعظ ہوگا یعنی جہاں کوئی رہتا ہے اُن لوگوں میں جیسی کوئی خرابی دیکھتا ہے اُس کے موافق خطبہ کرتا ہے تاکہ اُن کی اصلاح ہو کر وہ خرابی دُور ہو جائے۔ اور ایسی خرابیاں بے شمار ہوتی ہیں اور حسبِ موقعہ اُن کی اصلاح کے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے لوگوں کے بارہ ماہ کے بنے ہُوئے خطبے یا صرف قرآن پڑھنا کافی نہیں ہو سکتا پس جب قرآن کے علاوہ خطبہ میں خاص وعظ مراد ہے تو وہ عموماً خطیب ملکی زبان ہی میں کر سکتے ہیں تو غیر عربی میں خطبے سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ امام نووی شرح مسلم میں حدیث یقرأ القران ویذکر الناس میں لکھتے ہیں۔

فیہ دلیل للشافعی فی انہ یشترط فی الخطبۃ الوعظ والقراءۃ قال الشافعی لا یصح الخطبتان الابحمد اللہ تعالٰی والصلٰوۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والوعظ وھذہ الثلاثۃ واجبات فی الخطبتین وتجب قراءۃ ایۃ من القران فی احدیھما علی الاصح ویجب الدعا للمؤمنین فی الثانیۃ علی الاصح (نووی شرح مسلم طبع مصر جلد ۲ ط ۲۸)

یعنی اس حدیث میں امام شافعی کی دلیل ہے کہ خطبہ میں وعظ اور قراءۃ قرآن شرط ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں خطبے الحمد للہ اور درود اور وعظ کے بغیر صحیح نہیں ہوتے اور یہ تینوں اشیاء دونوں خطبوں میں واجب ہیں اور ایک آیت دونوں خطبوں سے ایک میں واجب ہے (خواہ پہلے خطبہ میں پڑھ لے یعنی بیٹھنے سے پہلے یا دوسرے میں یعنی بیٹھ کر کھڑا ہونے کے بعد) امام شافعی کے اس قول سے بھی اس بات کی تائید ہوگئی کہ خطبہ میں وعظ الگ ہے قرآن مجید الگ ہے پس حسب موقعہ وعظ مراد ہوگا جو

ملکی زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔

تیسرا ثبوت یا تائید

یہ بات ظاہر ہے کہ خطبہ کا تعلق جیسے خطیب سے ہے ویسے ہی سامعین سے ہے۔ اگر بالفرض کوئی سننے والا نہ ہو تو خطبہ نہیں ہوگا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کسی کو اس پر اختلاف نہیں جو عربی میں پڑھنے کے قابل ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے جن کی عبارتیں اُوپر گذر چکی ہیں مثلاً ہم نے ایک دو کتابوں کی عبارت[1] حاشیہ میں نقل کردی ہے۔ پس جب خطیب عربی نہ جاننے کی صورت میں غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے تو سامعین کے ناواقف ہونے کی صورت میں بھی غیر عربی میں جائز ہونا چاہیئے مثلاً دو چار پائے سامنے بٹھا کر کوئی شخص خطبہ پڑھے تو یہ خطبہ نہیں کیونکہ چار پاؤں کے کانوں تک صرف آواز پہنچتی ہے سمجھتے نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس خطبہ کو سمجھ لینا چاہیئے جو بالکل عربی سے ناواقف لوگوں کے سامنے پڑھا جاتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۳ ذیقعدہ ۱۳۵۰ھ ۱۱ مارچ ۱۹۳۲ء

دو سوال اور اُن کا جواب

مولوی محمد علی صاحب ابوالمکارم ساکن متونا تھ بھجن ضلع اعظم گڑھ نے دو شبہ اور پیش کئے ہیں۔ ایک شبہ

---

[1] کشاف القناع میں تیسری شرط جمعہ میں ہے الثالث حضور اربعین فاکثر من اهل القرية بالامام ولو كان بعضهم خرسا اوصما لانهم من اهل الوجوب (ولا) تصح (ان كان الكل كذالك) اى خرسا اوصما اما اذا كانوا كلهم خرسا مع الخطيب فلفوات الخطبة صورة ومعنى فيصلون ظهرا وان كانوا صما فلفوات المقصود من سماع الخطبة وعلم من ذالك انهم ان كانوا خرسا الا الخطيب اوكانوا صما الا واحدا يسمع صحت جمعتهم (كشاف القناع جلد اول ص۳۴۵)

شرح منتهى الارادات میں ہے (الثالث حضورهم) اى الاربعين من اهل وجوبها الخطبة والصلوٰة (ولو كان فيهم خرسا) والخطيب ناطق (او) كان فيهم (صم) لوجود الشروط (لاكلهم) اى ان كانوا كلهم خرسا حتى الخطيب اوكانوا كلهم صما لم تصح جمعتهم لفوات الخطبة صورة فى الاولى و فوات المقصود منها فى الثانية۔ شرح منتهى الارادات جلد اول ص۲۸۲۔

یہ ہے انہوں نے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا فتویٰ سے میری تشفّی نہیں ہوئی۔ میری تشفی کی صورت یہ ہے کہ جو فتویٰ خود میں نے لکھ کر بذریعہ رجسٹری آپ کے پاس بھیجا ہے اس پر بحث کرکے بھیج دیں۔ اور ایک صورت تشفی کی یہ ہے کہ آپ سابقین اہل حدیث سے اُردو خطبہ کا جواز ثابت فرمائیں۔ آخر جماعت اہل حدیث تو ایک زمانہ سے چلی آتی ہے لہٰذا آپ اس جماعت کے چند اشخاص کے نام تحریر فرماویں اور ان سے اس مسئلہ کو ثابت فرمائیں۔ اگر سابقین اہل حدیث سے غیر عربی میں پڑھنا ثابت نہیں تو کیوں اُن کا قول قابل عمل نہیں۔ کیا اتباع سلف وخلف کوئی چیز نہیں۔

خاکسار ۱۲۹۵ھ سے لے کر ۱۳۰۲ھ تک کامل ڈیڑھ برس تک جناب میاں صاحب کی خدمت میں رہا۔ آپ کے صاحبزادے مولوی شریف حسن ہمیشہ خطبہ عربی میں پڑھا کرتے تھے اور اُس وقت تک کوئی جھگڑا اور اختلاف اس مسئلہ میں نہ تھا۔ خدا جانے کون اس کا موجد ہے۔ دہلی کے بزرگان دین جیسے جناب شاہ ولی اللہؒ و مولانا عبدالعزیزؒ۔ مولانا محمد اسماعیل وغیرہم سے بھی غیر عربی میں پڑھنا ثابت نہیں بلکہ مصفّٰی میں تو شاہ صاحب نے صاف تحریر فرما دیا ہے کہ اس کا پڑھنا عربی میں ہمیشہ سے مروج ہے۔ اور ایسا ہی جناب نواب سیّد محمد صدیق نے بدور الاہلہ میں تحریر فرمایا ہے۔

سوال دوم :۔ امام نووی اذکار ص۲۱ میں لکھتے ہیں :۔

باب نهى العالم وغيره ان يحدث الناس بما لا يفهمونه قال الله تعالى وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم

اور خطبہ جمعہ کی نسبت کتاب مذکور کے ص۵۶ میں لکھتے ہیں :۔

ويشترط كونها بالعربية ۔

امام نوویؒ کے ان قولوں میں مطابقت کی کیا صورت ہے۔

جواب نمبر اوّل

عالمانہ اور منصفانہ بات تو یہ ہے کہ جس بات کی بابت سلف میں اختلاف ہو اُس کی بابت دلیل سے فیصلہ کیا جائے جو جانب دلیل کی رو سے راجح وہ پہلے خواہ ائمہ مجتہدین سے کسی کا مذہب اس مسئلہ کی نسبت معلوم ہو یا نہ اہل حدیث کا اصل مذہب یہی ہے چنانچہ حافظ ابن حجر فتح الباری میں جمعہ فی القریٰ کی

بابت لکھتے ہیں

فلما اختلف الصحابة وجب الرجوع الی المرفوع

یعنی جب صحابہ کا اختلاف ہوا تو مرفوع کی طرف رجوع واجب ہوا

مگر آپ باوجود اس کے مصر ہیں کہ کسی اہل حدیث کا مذہب بتلائیں۔ سو لیجئے امام شافعی سرکردہ اہلحدیث ہیں ان کے مذہب میں ایک وجہ جواز غیر عربی کی بھی ہے اور میں نے اس فتویٰ میں لکھا تھا کہ دلیل کی رو سے راجح یہی ہے تو سامعین اہل حدیث سے بھی ثبوت بھی ہوگیا پھر تردد کے کیا معنی ؟

رہے امام مالکؒ ۔ امام احمدؒ ۔ امام بخاریؒ اور دیگر محدثین تو ان سے نہ جواز کا قول منقول ہے نہ عدم جواز کا بلکہ سکوت محض ہے پس غیر عربی میں پڑھنے کو ان کے مخالفین کہہ سکتے ہیں یہ تو متقدمین اہل حدیث کا ذکر ہوا۔

اب متاخرین اہل حدیث لیجئے ۔ جن کا زمانہ ہم سے زیادہ قریب ہے ۔ امام شوکانی رح پھر نواب صدیق حسنؒ یہ دونوں بزرگ خطبہ ہی کو جمعہ کے لئے شرط نہیں کہتے چہ جائیکہ عربی ہونا شرط ہو ملاحظہ ہو دراری المغیثہ اور روضۃ الندیۃ ۔ حضرات مولانا نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے کا ان کی زندگی میں خطبہ عربی میں پڑھنا تو اس وقت ذکر کرتے جب کوئی یہ کہتا کہ کسی نے عربی میں پڑھا ہی نہیں اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے جو آپ نے عمل مستمر نقل کیا ہے تو اول تو اس کی بابت اطمینان نہیں کیونکہ سلف میں جب اس کی بابت فتویٰ ہو چکا ہے تو قرین قیاس یہی ہے کہ کسی نے عمل کی غرض سے فتویٰ پوچھا ہے چنانچہ اس کی تفصیل پہلے فتویٰ میں ہم نے کردی ہے ۔ دوسرے اگر عمل نہ ہوا ہو تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں ۔ اور اس کے وجوہات بھی معقول ہیں چنانچہ ان کا ذکر بھی فتویٰ میں کردیا گیا ہے ۔

جواب نمبر دوم

اس بات پر سب متفق ہیں کہ اگر سماع نہ ہو تو خطبہ نہیں مثلاً سارے بہرے ہوں تو اس کو خطبہ نہیں کہہ سکتے۔ جو عربی ہونے کی شرط کرتے ہیں وہ بھی اس کے قائل ہیں چنانچہ بعض عبارتیں ہم فتویٰ میں نقل کر چکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سماع سے مقصود فہم ہے اگر فہم نہ ہو تو بھی خطبہ نہیں کہہ سکتے چنانچہ اس کا بیان یہی فتویٰ میں ہو چکا ہے ۔ پس اب یہ تو بعید ہے کہ امام نوویؒ کے نزدیک خطبہ جمعہ میں فہم شرط نہ ہو۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ امام نوویؒ کے خیال میں ایک آدھ کا فہم کافی ہو اور عموماً ایسے مجمع ایک آدھ سے خالی نہیں ہوتے ۔ خاص کر

امام نووی کے زمانہ میں کیونکہ اُس وقت علم کا زور تھا۔ اس بنا پر امام نوویؒ نے خیر قرون کی عملی حالت سے متاثر ہوتے ہوئے خطبہ جمعہ کے عربی ہونے کی شرط کر دی لیکن ہم نے اپنے فتویٰ میں لکھ دیا ہے کہ خیر قرون کی عملی حالت میں شبہ ہو کیونکہ جب فتویٰ ہو چکا ہے تو قرین قیاس یہی ہے کہ فتویٰ عمل کی غرض سے پوچھا گیا ہے چنانچہ فتویٰ میں اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔ دوسرے اس عمل کے کئی ایک وجوہات بھی ہیں اور اس کے نظائر بھی ہیں پس ایسی حالت میں عمل سے شرطیت پر استدلال صحیح نہیں اس کی بھی بقدر ضرورت فتویٰ میں تفصیل ہو چکی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

خطبہ جُمعہ کی اذان کی جگہ

سوال:۔ کیا خطبہ جمعہ کی اذان خطیب کے سامنے کہنی چاہیئے۔

جواب:۔ اذان سے مقصود اعلان ہے خواہ پہلی ہو یا خطبہ کی پس جو جگہ اعلان کے لئے زیادہ مناسب ہے وہاں ہونی چاہیے۔ اگر امام کے سامنے موزوں جگہ ہو تو سامنے دی جائے ورنہ کوئی اور جگہ موزوں دیکھ لی جائے خواہ مسجد کے اندر ہو یا باہر خواہ دائیں طرف ہو یا بائیں طرف۔ مسجد نبوی میں سامنے موزوں جگہ تھی۔ اس لئے سامنے ہوتی تھی جگہ کی تعیین کو اذان میں داخل کرنا اذان کی منشاء کے خلاف ہے۔ اسی طرح کوئی کہنے والا کہہ دیگا کہ تم نے امام کے سامنے ہونے کی شرط کی ہے ہم یہ شرط کرتے ہیں کہ مسجد کے دروازہ پر ہو۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں مسجد کے دروازے پر ہوتی تھی۔ اگر مسجد کا دروازہ سامنے نہ ہو تو اس صورت میں مشکل پڑے گی۔ ایک اور اُٹھے گا اور کہے گا کہ منارہ پر ہونی چاہیئے کیونکہ امام مالکؒ سے روایت ہے۔

انه فی زمنه صلّی اللہ علیه وسلّم لم یکن بین یدیه بل علی المنارة۔

یعنی آپ کے زمانہ میں اذان آپ کے سامنے نہ تھی بلکہ منارہ پر تھی۔

امام مالک کی مُراد سامنے کی نفی کرنے سے یہ ہے کہ مسجد کے اندر نہ تھی جو عام طور پر نماز پڑھنے کی جگہ ہے اور نہ دوسری روایتوں میں سامنے ہونے کی تصریح ہے تو حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کا دروازہ سامنے تھا۔ اور وہیں منار تھا۔ اس پر اذان ہوتی تھی تو اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اذان کے لئے یہ تینوں شرائط ضروری ہیں سامنے بھی ہو۔ دروازہ پر بھی اور منار پر بھی ہو۔ ایک اور اُٹھے گا وہ اس سے بھی زیادہ

تنگی کرنا ہوا کہ دے گا کہ ان باتوں کے ساتھ یہ بھی ایک شرط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں منبر سے جتنے فاصلے پر اذان ہوتی تھی اتنے ہی فاصلے پر اب ہونی چاہیئے۔ مثلاً منبر ایسی جگہ ہو یا جائے کہ فاصلہ اس سے کم و بیش نہ ہو بلکہ کوئی منارکی بلندی کے اندازہ کی بھی پابندی کرنے لگ جائے گا۔

غرض اس طرح سے خصوصیتیں پیدا کرنی شروع کردیں تو احکام میں بہت تنگی ہوجائے گی بلکہ ان پر عمل بھی ناممکن ہوجائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر حکم کے حسب حال کوئی خصوصیت ہو۔ اذان سے مقصود جب اعلان ہے تو خصوصیت کی جگہ کس طرح سمجھ لی جائے۔ ہاں سجارہ کے متعلقات تو بیں ہونی ضروری ہے تاکہ لوگ اِس طرف آئیں۔ اور اونچی جگہ بھی اس کے حسب حال ہے کیونکہ آواز دُور ہوجاتی ہے اسی بنا پر امام ابن الحاج مکیؒ مدخل میں لکھتے ہیں۔

ان السنة فی اذان الجمعة اذا صعد الامام علی المنبر ان یکون المؤذن علی المنار۔

یعنی مسنون طریق اذان جمعہ میں یہ ہے کہ جب امام منبر پر چڑھے تو موذن منار پر ہو۔

اس عبارت میں دو خصوصیتیں ذکر کی ہیں، ایک منار پر ہونا ایک امام کے منبر کے چڑھنے کے وقت ہونا اس طرح موذن کا بلند آواز ہونا یا خوش آواز ہونا وغیرہ۔ اس قسم کی تمام خصوصیات اذان کے حسب حال ہیں۔ اگرچہ واجبات نہیں مگر کسی نہ کسی طریق سے اذان کے لئے مفید شے ہیں لیکن امام کے سامنے ہونا اور دروازہ پر ہونا یا دائیں بائیں ہونا یا اتنے فاصلہ پر ہونا یا اندر ہونا یہ تو کوئی ایسی اشیا نہیں جو اذان کے حسب حال ہوں تو پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ شرع میں معتبر نہیں۔ دیکھئے حج خاص کر مواضع سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس میں ہوتا ہی یہ ہے کہ کسی جگہ گذرنا اور کسی جگہ ٹھہرنا۔ کسی جگہ دوڑنا کسی جگہ چلنا کسی جگہ کچھ پڑھنا وغیرہ۔ اس میں اپنے وطن کو واپسی کے وقت محصبؔ[1] وغیرہ کے نزول میں صحابہؓ کا اختلاف ہے تو اذان وغیرہ جس کو جگہ سے تعلق نہیں کسی طرح فیصلہ ہوسکتا ہے کہ اندر ہے یا باہر آگے ہے یا دائیں بائیں وغیرہ بسا اوقات عمارت کی رو سے ایک جگہ موزوں ہوتی ہے دوسری جگہ میں دوسری۔ پس صرف مسجد نبویؐ میں سامنے ہونے سے یہ مراد

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت منیٰ کے پاس مقام محصب (جس کو ابطح وغیرہ بھی کہتے ہیں) میں اترے تھے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ کو مدینہ کی طرف لوٹنے میں آسانی تھی اس لئے وہاں اترے تھے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں اس میں اترنا سنت ہے (مشکوٰۃ باب الخطبہ یوم النحر)

لیناکہ سب جگہ ایسا ہی چاہیئے ڈبل غلطی ہے اور اسرارِ حکم شرعیہ سے کوسوں دور ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۹ جمادی الثانی ۱۳۸۰ھ ۹ دسمبر ۱۹۶۰ء

علماء کی تقاریر ٹیپ ریکارڈ کرنا

سوال:۔ آج کل ایک مشین کے ذریعہ علماء کرام کی تقاریر ٹیپ ریکارڈ کی جاتی ہیں۔ پھر یہ ٹیپ شدہ تقاریر علماء کی موجودگی میں یا بعد وفات عام کو سنائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ ناجائز بلکہ شرک ہے اور گانے بجانے کے مشابہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ تقریر کو ٹیپ ریکارڈ کرنا اور پھر آگے لوگوں کو سنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔؟

جواب:۔ شرک کفر والی اس میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ رہا جواز عدم جواز اس میں بھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ناجائز ہے کیونکہ نیک چیز کا کسی آلہ کے ذریعہ ٹیپ ریکارڈ کر کے آگے پہنچانا بظاہر یہ اچھی چیز ہے اگر اس آلہ کو نیکی میں استعمال کیا جائے تو پھر اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں مگر چونکہ وہ آلہ برے ریکارڈ کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ تردد رہتا ہے۔ ہاں قرآن وسنّت کے مطابق تقریر کو ٹیپ ریکارڈ کر کے لوگوں کو سنانا مفید اور اچھا ہے۔ اس کو منع کہنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ سردست اس مسئلہ پر اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ حالات کے تحت تفصیل پھر کسی موقع پر خدا کو منظور ہوا تو ہو جائے گی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

سجدہ تلاوت

سوال:۔ سجدہ تلاوت اللہ اکبر کہہ کر کرنا چاہیئے۔ نیز سجدہ کے بعد سلام پھیرنا چاہیئے یا نہیں؟

جواب:۔ اسی باب میں ہے کہ سجدہ جاتے وقت اللہ اکبر کہنے کا ذکر ہے لیکن اٹھتے وقت اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھانا مجھے کسی روایت میں یاد نہیں مگر جاتے وقت اللہ اکبر کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھتے وقت بھی کہنا چاہیئے۔ کیونکہ نماز کے سجدہ میں اس طرح ہے۔ باقی سلام پھیرنا کسی روایت میں نہیں آیا۔

جو لوگ (حنفیہ وغیرہ) سجدہ کو نماز کا بڑا رکن سمجھ کر اس کا حکم نماز کا سمجھتے ہیں۔ جیسے سجدہ تلاوت باوضو ہو کر

کرنا قبلہ رُخ ہونا تواُن کے نزدیک سلام بھی پھیرنا چاہیئے۔
لیکن میرے نزدیک احتیاط اسی میں ہے کہ سلام پھیر لیا جائے تو اچھا ہے اور وضو کر لینا بھی بہتر ہے تاکہ اختلاف سے نکل جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲ اگست ۱۹۶۲ء

سوال :۔ سجدہ تلاوت میں کونسی دعا پڑھی جائے؟

محمد الیاس موضع دھوپی والا تحصیل اوکاڑہ ضلع منٹگمری

جواب :۔ سجدہ تلاوت کی دعاء

(۱) سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ

یعنی میرے چہرہ نے اُس ذات کے لئے سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا اور اس میں کان۔ آنکھ اپنی قدرت اور تصرف سے پیدا کئے۔

(۲) اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا اَجْرًا وَحُطَّ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا عِنْدَكَ ذُخْرًا وَ تَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ

یعنی اے اللہ میرے لئے اس کے عوض اجر لکھ اور اس کے سبب میرے گناہ معاف کر دے اور اس کو مجھ سے قبول کر جیسا کہ تو نے اس کو داؤد علیہ السّلام سے قبول فرمایا۔

اس کے علاوہ جو عام سجدہ میں دعائیں تسبیحات وغیرہ پڑھی جاتی ہیں وہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۳ اگست ۱۹۶۲ء

سورج گرہن چاند گرہن کی نماز کا بیان

گرہن کس طرح لگتا ہے

سوال :۔ چاند کو جو گرہن لگتا ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ برج کی آڑ میں آجاتا ہے اور جو چیز آڑ میں آجاتی ہے وہ نظر نہیں آتی۔ چاند یا سورج اگر آڑ میں آجاتا ہے نظر آتا رہتا ہے اس کے متعلق کیا تحقیقات ہے؟

صدرالدین امام مسجد بھگیاڑسی ڈاکخانہ منڈی وار برٹن ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ قدیم فلاسفہ کا یہی خیال ہے کہ ایک ستارہ دوسرے ستارہ کے سامنے آنے سے گرہن لگتا ہے اور سورج بھی ایک قسم کا ستارہ ہے چونکہ صاف شفاف ہوتا ہے اس لئے سامنے آنے سے نور میں فرق پڑتا ہے۔ نشان بدستور نظر آتا ہے۔ یہ قدیم فلاسفہ کا خیال ہے۔ اوران کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کے لئے ایک حساب اور اندازہ مقرر ہے۔ حقیقتِ حال خدا کو معلوم ہے۔

وفاء الوفاء الی دار المصطفیٰ میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جب منبر نبوی شام میں لے جانا چاہا تو سورج کو گرہن لگ گیا۔ اس لئے رُک گئے۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حساب کے ساتھ ضروری نہیں بلکہ آگے پیچھے بھی ہو جاتا ہے۔ حدیث میں صرف اتنا آیا ہے کہ سورج۔ چاند خدا کی نشانیوں سے دو نشانیاں ہیں۔ کسی کی حیات و موت سے گرہن نہیں ہوتیں۔ لیکن خدا اپنے بندوں کو ان کے ساتھ ڈراتا ہے۔ سو ہمیں اتنا ہی ایمان رکھنا چاہیئے اگر فلاسفہ کا خیال صحیح ہو تو یہ نشانی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ جو ظاہری اسباب کے تحت علم طبعی یا سائنس کے موافق ہو رہا ہے وہ بھی قدرتِ الٰہی کے نشانات ہیں۔ مثلاً رات اور دن۔ سورج چاند۔ آسمان و زمین وغیرہ جو کچھ ہے نشانات ہیں۔ حیات جو خوشی کا باعث ہے۔ اور موت جو ڈر کی شے ہے یہ بھی نشانات ہیں ؎

وفی کل شئی لہ ایۃ   تدل علیٰ انہ واحد

یعنی ہر ایک چیز میں نشانی ہے جو توحید الٰہی کی دلیل ہے

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ ۲۳ اگست ۱۹۳۵ء

صلوٰۃ کسوف میں رکوع کی تعداد

سوال:۔ صلوٰۃ کسوف (گرہن کی نماز) کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک میں ایک ہی دفعہ اتفاق پڑا۔ مگر اس کے متعلق احادیث مختلف ہیں۔ کسی میں چار رکوع کسی میں دو کسی میں تین رکوع آتے ہیں۔ ان کی تطبیق کیسے ہو سکتی ہے۔

(ابو اسحٰق دیرو وال افغانان ضلع امرتسر)

جواب:۔ کسوف کی بابت تین طرح سے موافقت کرتے ہیں۔
۱۔ ایک یہ کہ کسوف کئی دفعہ ہوا ہے۔ چنانچہ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔
۲۔ دُوسری صورت ترجیح کی ہے۔ یعنی متفق علیہ روایت پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ مقابلہ کے وقت متفق علیہ روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ جیسے حافظ ابن حجرؒ نے شرح نخبہ میں لکھا ہے۔ متفق علیہ روایت میں دو رکوع کا بیان ہے۔
۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نیا واقعہ تھا لوگ سُن سُن کر یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ جس نے دو رکوع پائے اُس نے دو ذکر دیئے۔ جس نے تین پائے اُس نے تین ذکر کر دیئے۔ جو ابتدا میں شامل ہوا۔ اُس نے پانچ رکوع ذکر کئے ایک رکوع صراحۃً کسی نے ذکر نہیں کیا۔ یا تو ایک رکوع پانے کا اتفاق نہیں ہوا یا ہوا لیکن اس سے آگے روایت کا اتفاق نہیں ہوا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۱ صفر ۱۳۵۶ھ ۲۳ اپریل ۱۹۳۷ء

صلوٰۃ تسبیح

سوال:۔ کیا صلوٰۃ تسبیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا خیر قرون سے کوئی اثر ملتا ہے اگر کوئی با جماعت ادا کرتا ہے تو وہ بدعتی ہے؟ اور جو باجماعت جواز کے قائل ہیں ان کے دلائل کو بھی ملحوظ رکھ کر فیصلہ فرمائیں۔

حافظ عبدالغفور
مدرس مدرسہ دارالحدیث جامع اہل حدیث جہلم

جواب:۔ صلوٰۃ تسبیح کے متعلق مشکوٰۃ وغیرہ میں ضعیف حدیث آئی ہے۔ اور ضعیف حدیث کے متعلق محدثین امام احمدؒ وغیرہ کا فیصلہ ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث معتبر ہے۔ حلال وحرام میں اس کا اعتبار نہیں چونکہ تسبیح نماز کچھ فضائل اعمال کی قسم سے ہے۔ اس لئے اس پر عمل جائز ہے لیکن اس کا اہتمام کرنا یہاں تک کہ جماعت سے ادا کرنا اور جماعت کی طرف دعوت دینا یہ بدعت ہے جو عمل جس حالت پر آئے تو اس سے اس کا مرتبہ بڑھانا نہیں چاہیئے۔ اس کے علاوہ جو تسبیحات پڑھی جاتی ہیں ان کی گنتی تنہا پڑھنے میں ہوتی ہے۔ جماعت کے ساتھ پڑھنے میں کمی بیشی ہونے کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے۔ مسنون طریقہ تسبیحات کا آہستہ کہنا ہے۔ چنانچہ ہر نماز میں آہستہ کہی جاتی ہیں۔ اس صورت میں امام کو کیا پتہ کہ میری تسبیحات

کے ساتھ مقتدیوں کی تسبیحات پوری ہوگئی ہیں۔اور پھر مقتدیوں میں بھی کوئی جلدی پڑھنے والا ہوتا ہے۔ کوئی آہستہ کسی کی زبان موٹی ہوتی ہے۔وہ بہت دیر میں پوری کرتا ہے بلکہ اس صورت میں جبر ہو تب بھی حساب پورا ہونا مشکل ہے۔ خاص کر جو لوگ امام سے دور ہیں۔ جہاں آواز پہنچنی مشکل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ نماز تسبیح میں جماعت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ فقط

عبداللہ امرتسری روپڑی ۳۰ صفر ۱۳۸۳ھ ۲۲ جولائی ۱۹۶۳ء

نماز عیدین کا بیان

عورتوں کا عیدگاہ میں جانا

سوال:۔ کیا عورتوں کا عیدگاہ میں جانا ضروری ہے؟

جواب:۔ اُم عطیہ فرماتی ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے حکم دیا گیا کہ حیض والیوں، پردہ والیوں کو بھی عیدین میں نکالیں تاکہ مسلمانوں کی دعاء اور جماعت میں شامل ہو جائیں۔ لیکن حائضہ عورت نماز کی جگہ سے الگ رہے۔ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ! بعض وقعہ ہم سے کسی کے پاس چادر نہیں ہوتی تو فرمایا اس کی سہیلی اپنی چادر سے اُس کو پہنا دے (مشکوٰۃ)

اس سے ظاہر ہے کہ عورتیں ضرور عیدین میں پردے کے ساتھ شامل ہوں لیکن خوشبو وغیرہ نہ لگائیں۔ اور زینت بھی ظاہر نہ کریں۔ یہ سنّت بھی متروک ہے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

نماز کا خطبہ سے پہلے ہونا اور منبر کا عیدگاہ میں نہ ہونا

سوال:۔ خطبہ سے پہلے نماز پڑھنی چاہیئے یا خطبہ کے بعد اور عیدگاہ میں منبر لے جانا کیسا ہے۔؟

جواب:۔ ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید اضحٰی اور عید فطر میں نکلتے۔ پہلے نماز پڑھتے پھر لوگوں کی طرف متوجّہ ہوتے اور لوگ اپنی اپنی نماز کی جگہ بیٹھے ہوتے۔ اگر کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو بھیج دیتے یا کوئی اور حاجت ہوتی تو اس کا حکم دیتے اور کہتے صدقہ کرو۔ صدقہ کرو۔ صدقہ کرو

زیادہ صدقہ کرنے والی عورتیں ہوتیں۔ پھر فارغ ہو جاتے۔ مروان کے زمانہ تک یہی حال رہا۔ جب مروان برسرِ اقتدار آیا تو میں مروان کے ساتھ نکلا۔ یہاں تک کہ ہم عیدگاہ میں پہنچے۔ کثیر بن الصلت نے مٹی اور اینٹ سے منبر بنایا ہوا تھا۔ مروان نے مجھ سے ہاتھ چھڑا کر منبر کی طرف جانا چاہا۔ میں نے اس کو نماز کی طرف کھینچا۔ اور میں نے کہا نماز شروع کرنے کا حکم کہا گیا ہے۔ مروان نے کہا اے ابوسعید! جو باتیں تو جانتا ہے وہ چھوڑی گئیں میں نے کہا جو میں جانتا ہوں اس سے بہتر تم نہیں لا سکتے پھر ابوسعید چلے گئے (مشکوٰۃ)

اس حدیث سے کئی مسائل معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ نماز خطبہ سے پہلے ہے۔ دوسرا یہ کہ عیدگاہ میں منبر خلافِ سنّت ہے۔ تیسرا یہ کہ مجمعوں میں چندہ وغیرہ کی تحریک جائز ہے۔ چوتھا یہ کہ خطبہ میں وقتی ضروریات لشکر وغیرہ کے بھیجنے کا پروگرام بھی مرتب ہو سکتا ہے۔ پانچواں یہ کہ خواہ کتنا بڑا شخص ہو۔ اگر وہ خلاف سنّت کرے تو اس پر انکار کرنا ضروری ہے۔ چھٹا یہ کہ نماز عید باہر کسی میدان میں پڑھنی چاہیئے۔ ہاں اگر بارش وغیرہ کا عذر ہو تو مسجد میں بھی پڑھنی جائز ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

تعاقب

حضرت محدّث روپڑی رح نے لکھا ہے کہ عیدگاہ میں منبر سنت کے خلاف ہے۔ اس استدلال پر مولوی سفیر الدین نے حسب ذیل تعاقب کیا ہے۔

آپ نے مذکورہ بالا ابوسعید خدری رض کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ عیدگاہ میں منبر خلافِ سنّت ہے اس کے متعلّق خیال یہ ہے کہ عیدگاہ میں منبر لے جانا مسنون طریقہ ہے۔ چنانچہ بروایت ابی داؤد شرح عون المعبود جلد ثالث ص۵۶ میں ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ شَهِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَضْحٰی وَالْمُصَلّٰى فَلَمَّا قَضٰى خُطْبَتَهٗ نَزَلَ مِنْ مِنْبَرِهٖ۔

اس حدیث کی شرح میں مولانا شمس الحق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

فِيْهِ ثُبُوْتُ وُجُوْدِ الْمِنْبَرِ فِي الْمُصَلّٰى وَاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَخْطُبُ عَلَيْهِ۔

یعنی اس حدیث سے عیدگاہ میں منبر کا ثبوت ملتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر خطبہ دیتے تھے

جواب

یہ حدیث جس میں منبر کا ذکر ہے ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی مطلب ہے جو جابرؓ سے روایت کرتا ہے۔ اس نے جابرؓ سے سنا نہیں (عون المعبود جلد ۳ صفحہ ۵) پس یہ روایت منقطع ہوئی جو ضعیف کی قسم ہے اور ممکن ہے منبر سے مراد یہاں اونچی جگہ ہو۔ چنانچہ ابوداؤد وغیرہ کی ایک حدیث میں حرف نزل ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اترے اس پر عون المعبود میں لکھا ہے وَیَدُلُّ عَلٰی اَنَّ خُطْبَتَہٗ کَانَتْ عَلٰی شَیْءٍ عَالٍ (عون المعبود جلد اول صفحہ ۴۴۴) یعنی یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کا خطبہ کسی بلند شے پر تھا۔ اس طرح سے سب احادیث میں تطبیق ہو جائیگی۔ اگر منبر نکالنا مسنون ہوتا تو مروان پر صحابہ کے عام مجمع میں انکار نہ ہوتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

نمازِ عید کا مسجد میں ادا کرنا

سوال :۔ نمازِ عید مسجد میں پڑھنی جائز ہے۔؟

جواب :۔ حضرت ابوہریرہ رضہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بارش ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید مسجد میں پڑھائی۔ (مشکوٰۃ) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کی نماز میدان میں پڑھنی چاہیئے۔ البتہ اگر بارش وغیرہ کا عذر ہو تو عید کی نماز مسجد میں پڑھنی جائز ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑ ۸ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ ۱۵ اپریل ۱۹۳۲ء

نماز سے پہلے خطبہ

سوال :۔ آج کل بعض مولوی نمازِ عید سے پہلے خطبہ بیان کرتے ہیں۔ کیا نمازِ عید سے پہلے تلاوتِ قرآن۔ کوئی وعظ خطبہ اور نعت وغیرہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب :۔ نمازِ عید سے پہلے خطبہ خلافِ سنّت ہے۔ حدیث میں خطبہ نماز عید کے بعد آیا ہے۔ پہلے خطبہ پڑھنا مروان نے جاری کیا تھا۔ جس پر ابوسعید خدری رضہ نے سخت انکار کیا۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب صلوٰۃ العیدین نعت یا تلاوت قرآن مجید یا پھر وعظ یہ سب خطبہ میں شامل ہیں۔

عبداللہ امرتسری ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ ۲۶ مئی ۱۹۶۱ء

عید اور جمعہ کا اجتماع باعثِ رحمت ہے یا زحمت

سوال :۔ عید اور جمعہ ایک دن آجائیں تو اس کو بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ عام لوگوں میں

مشہور ہے کہ دو خطبوں کا ایک دن اکٹھے ہونا زحمت اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے اور یہ دن بڑا بھاری ہوتا ہے خصوصاً حاکمِ وقت پر اس کا بہت زیادہ بوجھ ہوتا ہے ؟ لوگوں کا یہ خیال کہاں تک درست ہے ۔ ؟

محمد ابراہیم خطیب جامع اہل حدیث موضع انگلا ضلع گوجرانوالہ

جواب :۔ اس خیال کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ۔ ایسا خیال کرنے والوں نے شاید یہ سمجھا ہو کہ عید اور جمعہ ایک دن آجائیں تو دونوں کا پڑھنا ضروری ہے ۔ اس سے عید کی خوشی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور حاکم وقت کو عید اور جمعہ دونوں کا باقاعدہ انتظام کرنا ہوتا ہے اور یہ زحمت کا باعث ہے ۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس لحاظ سے عید اور جمعہ کا اجتماع بے برکتی کا نہیں بلکہ زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے ۔ عید کے دن جمعہ کی معافی شریعت نے صرف اس لئے دی ہے کہ جمعہ نہ پڑھنے والا گنہ گار نہ ہو ورنہ دونوں کی ادائیگی یقیناً زیادتی اجر کا باعث ہے ۔ اگر زحمت سے مراد یہ ہو کہ عید اور جمعہ کا اکٹھا ہونا ہی بے برکتی کا باعث ہے تو یہ خیال بھی شرعی لحاظ سے نہ صرف بے اصل اور بے ثبوت ہے بلکہ احادیث نبوی کے صریح خلاف ہے

حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک میں عید اور جمعہ ایک ہی دن اکٹھے آگئے تو آپ نے صحابہ رضؓ سے فرمایا ۔

اِجْتَمَعَ عِيْدَانِ فِيْ يَوْمِكُمْ هٰذَا (ابن ماجه)

تمہارے لئے آج کے دن دو عیدیں اکٹھی ہو گئی ہیں

عید خوشی کے دن کو کہتے ہیں ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا یہ مطلب تھا کہ آج تمہارے لئے دو خوشیاں ہیں ۔ عید اور جمعہ ۔

اس حدیث سے ثابت ہوا ۔ عید اور جمعہ کا ایک دن میں اجتماع زیادہ برکت اور خوشی کا باعث ہے نہ کہ نحوست اور بے برکتی کا دور اس زمانہ میں حاکم وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات عالی تھی تو کیا (معاذ اللہ) نبی علیہ السلام کے لئے یہ چیز نحوست اور بے برکتی کا باعث ہو سکتی ہے ۔ ایسا خیال بالکل غلط اور وہم فاسد ہے ۔

اس قسم کے بیہودہ خیالات لوگ زمانہ جاہلیت میں رکھتے تھے چنانچہ مشکوٰۃ باب اعلان النکاح فصل اول میں حضرت عائشہ رضؓ سے حدیث ہے جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے ۔

لوگ ماہ شوال کو اچھا نہیں سمجھتے حالانکہ میرا نکاح اور میری رخصتی دونوں کام ماہ شوال میں ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب کون تھی؟ اس بنا پر عائشہ صدیقہ رضا اپنی قریبی عورتوں کی رخصتی ماہ شوال میں کیا کرتی تھی تاکہ لوگوں کے دلوں سے یہ خیال فاسد ختم ہو جائے۔

آج کل بعض لوگ ماہ محرم میں کوئی خوشی کا کام نہیں کرتے۔ یہ خیال بھی ایسا ہے جیسے ماہ شوال کی نسبت زمانہ جاہلیت کا خیال تھا۔ ایسی توہم پرستی شریعت محمدیہ میں جائز نہیں۔ اہل اسلام کو ایسے خیالات سے پرہیز چاہیئے۔ رہی یہ بات کہ شرعی اعتبار سے کوئی دن یا کوئی وقت نحوست اور بے برکتی کا باعث ہو سکتا ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ کوئی دن یا کوئی وقت ایسا نہیں۔ ہاں کسی قوم کے لحاظ سے جو خدا تعالےٰ کی طرف سے عذاب میں آ جائیں۔ وہ دن منحوس ہوتا ہے جس میں وہ ہلاک ہوں جیسے قرآن مجید میں قوم عاد کی بابت ارشاد ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِیْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (سورۃ حم سجدہ ۲)

یعنی ہم نے قوم عاد پر نحوست کے دنوں میں ہوا بھیجی تاکہ ہم ان کو زندگی میں ذلت کا عذاب چکھائیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ چیز عام نہیں بلکہ صرف اس قوم کے لئے ہے جو عذاب الٰہی سے اُس دن عذاب میں ہلاک ہوا اُس کو عام لوگوں کے لئے منحوس سمجھنا شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر یہ چیز عام ہوتی تو اللہ تعالےٰ منحوس دنوں کا ہمارے لئے تعین فرما دیتا تاکہ ہم ان سے پرہیز رکھتے۔ کسی دن کا یقین نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ فی نفسہ کوئی دن یا کوئی وقت نحوست کا باعث نہیں بلکہ اس آیت سے کسی دن کو منحوس سمجھنے کی تردید ہوتی ہے کیونکہ سورہ الحاقہ میں ہے۔

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ

یعنی قوم عاد پر عذاب الٰہی کی ہوا سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی

اگر یہ دن سب کے لئے منحوس ہوتے تو پھر ہفتہ میں خیر و برکت کا کوئی دن باقی نہ رہتا کیونکہ ہفتہ کے کل سات دن ہی ہوتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۰ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ - ۲۶ مئی ۱۹۶۱ء

عورت عید کی نماز پڑھا سکتی ہے

سوال :۔ عیدین کی نماز علیحدہ ہو کر کسی عورت کی امامت میں پڑھ سکتی ہیں یا نہیں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ثابت نہیں تو کیا آپ کے بعد کسی زمانہ میں ثابت ہے کہ عورتوں نے عیدین کی نماز علیحدہ پڑھی ہو۔

محمدؐ اسماعیل ولد حاجی علی محمد چک 85/5.R ہارون آباد (بہاولپور)

جواب :۔ عورتوں کی علیحدہ امامت کا مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کے متعلق کوئی واقعہ نہ ملے تو اس سے اس کا عدم جواز یا بدعت ہونا لازم نہیں آتا۔ دیکھئے پانچ وقتی نمازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک عورت اُم ورقہ رضہ کو علیحدہ امامت کی اجازت دی تھی۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے اور حضرت عائشہ رضہ بھی رمضان میں امامت کراتی تھی۔ چنانچہ فتح القدیر شرح ہدایہ میں اس کی تفصیل ہے مگر اس چیز کا عام رواج نہیں ہوا۔ اسی بناء پر حنفیہ کا خیال ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ چنانچہ صاحب فتح القدیر نے باوجود حنفی ہونے کے اس کی تردید کی ہے۔ پس جب پانچ وقتی نماز یا تراویح کا یہ حال ہے کہ عام رواج نہیں ہوا تو اس بناء پر عیدین کے متعلق خاص واقعہ ملنا تو بہت مشکل ہے۔ ہاں پانچ وقتی نماز سے استدلال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب ایک نماز میں ایک چیز ثابت ہو جائے تو سب نمازیں اس میں یکساں ہوتی ہیں جب تک کوئی مانع نہ ہو۔ مثلاً پانچ وقتی نماز جوتہ کے ساتھ پڑھنے کا ذکر آ جائے تو یہی نماز عیدین، جمعہ، نماز کسوف کے لئے کافی ہے۔ اس کے لئے الگ واقعہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن

سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹۔ ۱۱ ربیع الآخر ۱۳۷۸ھ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء

نماز عیدین کی تکبیرات

سوال :۔ نماز عیدین میں کتنی تکبیرات کہی جاتی ہیں اور ان کا محل کیا ہے۔

جواب :۔ (۱) کثیر بن عبداللہ اپنے باپ سے وہ اس کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین میں پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے سات تکبیریں کہیں اور دوسری میں قرأت سے پہلے پانچ کہیں (مشکوٰۃ)

۲۔ جعفر بن محمدؒ سے مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ابوبکرؓ، عمرؓ نے عیدین میں اور نماز استسقاء میں پہلی رکعت میں سات دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہیں اور خطبہ سے پہلے نماز پڑھی اور قرأت بلند آواز سے پڑھی (مشکوٰۃ)

اس میں اختلاف ہے کہ پہلی رکعت میں سات تکبیریں تکبیر تحریمہ کے ساتھ مراد ہیں یا تکبیر تحریمہ کے بغیر لیکن ظاہر حدیث سے دوسری صورت ظاہر ہوتی ہے۔ ہاں حضرت عائشہ رضؓ سے دارقطنی میں حدیث ہے سوی تکبیرۃ الافتتاح یعنی رکوع کی تکبیروں کے سوا۔ لیکن اس کی اسناد ضعیف ہے۔

چونکہ صریح صحیح دلیل کسی طرف نہیں۔ اس لئے اس میں تشدد نہ کرنا چاہیئے۔ کوئی تکبیر تحریمہ اور تکبیر رکوع کے سوا سات پانچ کہے یا اس کے ساتھ ابن عبدالبر کہتے ہیں۔ پہلا امام شافعی رحؒ کا مذہب ہے دوسرا امام مالکؒ کا۔ تحفۃ الاحوذی ص ۳۳۶۔ سعید بن عاصؓ کہتے ہیں۔ میں نے ابوموسیٰ رضؓ اور حذیفہ رضؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید اضحیٰ اور فطر میں کس طرح کہتے تھے۔ ابوموسیٰ رضؓ نے کہا جیسے جنازہ پر چار تکبیریں کہتے ہیں۔ اس طرح چار کہتے تھے حذیفہ رضؓ نے تصدیق کی کہ ابوموسیٰ رضؓ نے سچ کہا۔

مگر اس حدیث کی اسناد میں عبدالرحمٰن بن ثوبان راوی ضعیف ہے۔ اور دوسرا راوی ابوعائشہ ہے وہ مجہول ہے۔ سات پانچ والی روایت کی کئی سندیں ہیں۔ وہ حسن کے درجہ سے کم نہیں۔ اس لئے راجح یہی ہے کہ پہلی رکعت میں سات تکبیریں کہے اور دوسری میں پانچ کہے اور کہے بھی قرأت سے پہلے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

نماز عید سے پہلے کچھ کھانا

سوال:۔ نماز عید سے پہلے کچھ کھانا چاہیے یا بغیر کچھ کھائے نماز عید کے لئے جانا چاہیئے۔

جواب:۔ بریدہ رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر میں کھائے بغیر نہیں نکلتے تھے حضرت انسؓ کی روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن چند کھجوریں کھائے بغیر نہیں نکلتے تھے اور عید الاضحیٰ میں پڑھنے سے پیشتر نہیں کھاتے تھے (مشکوٰۃ)

عید فطر کے دن نماز سے پہلے کھجوریں کھانے میں یہ حکمت ہے کہ روزے کا شبہ نہ ہو کیونکہ پہلے سارا مہینہ

روزوں کا گذرا ہے۔ نیز خالی پیٹ میٹھی شے معدہ اور نظر کو طاقت دیتی ہے۔ خاص کر کھجوروں میں اور بہت سی خصوصیات ہیں۔ جن سے بعض احادیث میں بھی آتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص مدینہ کی عجوہ قسم کھجوریں سات عدد ہر روز صبح کھائے تو اُس کو زہر اور جادو نقصان نہیں دیگا۔ اور طاق کھانے میں حکمت یہ ہے کہ خدا یاد آجائے۔ حدیث میں ہے انّ اللہ وتر یحب الوتر۔ اللہ تعالےٰ طاق ہے اور طاق کو دوست رکھتا ہے۔

عید الاضحیٰ میں بعد کھانے میں یہ حکمت ہے کہ کھانے پینے کے شغل میں نماز کی تاخیر ہو کر کہیں قربانی میں زیادہ دیر نہ ہوجائے۔ کیونکہ قربانی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ بعض علماء نے یہ حکمت بھی بیان کی ہے کہ قربانی کا گوشت برکت والی شئے ہے اس لئے یہ پیٹ میں پہلے جانا چاہیئے اور قربانی چونکہ نماز کے بعد ہے۔ اس لئے کھانا بھی بعد کو مسنون ہے یہی وجہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید الاضحیٰ بہت جلد پڑھتے تھے یعنی تھوڑا سورج اُوپر آتا تو پڑھ لیتے۔

مسند احمد میں حدیث ہے۔

ولا یاکل یوم الاضحی حتی یرجع فیاکل من اضحیتہ (منتقی)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید اضحیٰ میں نہ کھاتے یہاں تک کہ آئیں۔ نماز سے فارغ ہو کر قربانی کا گوشت کھاتے۔ عبد اللہ امرتسری روپڑی

۸ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ ۱۵ اپریل ۱۹۳۲ء

عید کے دو خطبے

سوال:۔ عید میں ایک ہی خطبہ ہے یا جمعہ کی طرح دو خطبے پڑھے جائیں۔

جواب:۔ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی طرح عید کے بھی دو خطبے پڑھے ہوں۔ البتہ ابن ماجہ میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر یا عید الاضحیٰ میں نکلے پس آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا۔ پھر بیٹھ گئے پھر اُٹھے۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اس میں اسماعیل بن مسلم راوی ہے اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ نیز اس میں ابو البحر راوی ہے وہ بھی ضعیف ہے۔

بزار بن سعد بن ابی وقاص رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز بغیر اذان اور اقامت کے پڑھی اور دو خطبے دیئے اور دونوں کے درمیان بیٹھ کر فصل کیا۔ ہیثمیؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں مجہول الحال راوی ہیں۔

ابن مسعود سے مروی ہے کہ سنّت طریقہ یہ ہے کہ عیدین کے دو خطبے پڑھے جائیں اور دونوں کے درمیان بیٹھا جائے۔ لیکن نوویؒ نے خلاصہ میں کہا ہے کہ یہ قول بھی ضعیف اور غیر متصل ہے۔

دو خطبہ کی روایتیں اگرچہ ضعیف ہیں مگر جمعہ پر قیاس سے اس مسئلہ کی تائید ہوتی ہے کہ عیدین کے جمعہ کی طرح دو خطبے پڑھے جائیں۔

تکبیرات کا محل

سوال:۔ تکبیرات عیدین پہلی رکعت میں الحمد شروع کرنے سے پہلے اور سبحانک اللھم پڑھنے سے بعد ادا کرنی چاہیں یا سبحانک اللھم پڑھنے سے پہلے تکبیر اولی کے ساتھ ادا کرنی چاہیں اس کا جواب صحیح حدیث سے تحریر فرمائیں۔

جواب:۔ حدیث میں عیدین کی تکبیریں قرأت سے پہلے کہنے کا ذکر آیا ہے۔ بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیدین کی تکبیریں سبحانک اللھم کے بعد ہیں۔ ورنہ قرأت سے پہلے کی بجائے سبحانک اللھم سے پہلے کا ذکر ہوتا۔ لیکن اگر کوئی پہلے کہہ لے تو بھی حرج نہیں۔ کیونکہ حدیث میں صراحت کسی جانب نہیں آتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

کیا حاجی مکہ معظمہ میں نماز عید پڑھے

سوال:۔ کیا مکہ میں حاجیوں کے لئے عید پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ حضرت جابر رضؓ کی لمبی حدیث میں ہے۔

اتی الجمرۃ التی عند الشجرۃ فرماھا بسبع حصیات یکبر مع کل حصاۃ منھا مثل حصی الخذف رمی من بطن الوادی ثم انصرف الی المنحر فنحر ثلثا وستین بدنۃ بیدہ (مشکوۃ باب قصۃ حج الوداع صـ۲۱۶)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس جمرہ کے پاس آئے جو درخت کے قریب ہے۔ اس کو چھوٹے سات کنکر مارے جو دو انگلیوں سے مارے جاتے ہیں۔ پھر قربان گاہ کی طرف لوٹے پس تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے قربان کئے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاجی پر نمازِ عید نہیں۔ اگر نمازِ عید ہوتی تو آپ جمروں سے فارغ ہو کر نمازِ عید پڑھ کر قربانی کرتے کیونکہ قربانی نمازِ عید کے بعد ہوتی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

تکبیراتِ عیدین و تکبیراتِ جنازہ کے ساتھ رفع الیدین

سوال :۔ ہمارا معمول ہے کہ ہم اہلحدیث نمازِ عیدین کی تکبیروں کے ساتھ رفع یدین کرتے ہیں لیکن اس سال نمازِ عید الفطر کے موقع پر ایک مولوی صاحب نے خطبہ میں بیان کیا کہ تکبیرات عیدین میں رفع الیدین کرنے اور نہ کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس کی وضاحت فرمائیں نیز تکبیرات کے درمیان کوئی ذکر کرنا بھی ثابت ہے یا نہیں۔

محمد ابراہیم بوریوالا ضلع ملتان

جواب :۔ مغنی ابن قدامہ میں ہے۔

روی ان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم کان یرفع یدیہ مع التکبیر قال احمد اما اری ان ھذا الحدیث یدخل فیہ ھذا کلہ وروی عن عمر رضی اللہ عنہ انہ کان یرفع فی کل تکبیرۃ فی الجنازۃ وفی العید رواہ الاثرم ولا یعرف لہ مخالف فی الصحابۃ۔ انتہی۔

یعنی روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رح فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ہر نماز کی تکبیر کو شامل ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جنازے میں اور عیدین میں ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اس کو اثرم نے روایت کیا ہے اور صحابہ کرام رض سے اس مسئلہ میں حضرت عمر رض کا خلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں۔

حضرت عمر رض کے اس عمل کو بیہقی نے بھی جلد ۳ صفحہ ۲۹۳ میں روایت کیا ہے۔ لیکن اس میں ایک

ابن لہیعہ ضعیف ہے۔

نیز ابوداؤد۔ دارقطنی۔ بیہقی میں بقیہ کے واسطے سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کی طرف کھڑے ہوتے تو ہر تکبیر میں رکوع سے پہلے ہاتھ اٹھاتے یہانتک کہ نماز پوری ہو جاتی۔ حافظ ابن حجرؒ تلخیص الحبیر میں لکھتے ہیں کہ امام ابن المنذر اور امام بیہقی نے اس حدیث سے تکبیرات عیدین میں ہاتھ اٹھانے پر استدلال کیا ہے کیونکہ یہ حدیث عام ہے اور بقیہ کی موافقت ابن اخی الزہری نے بھی کی ہے۔ بقیہ راوی ضعیف ہے لیکن ابن اخی الزہری کی موافقت سے اس کی تلافی ہوگئی۔ (دارقطنی ص۱۰۸)

عیدین کی تکبیروں کے درمیان ذکر کرنے کے متعلق صرف حضرت جابرؓ کی ایک روایت ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن جابر قال مضت السنة ان يكبر والصلوة في العيدين سبعا وخمسا يذكر الله مابين كل تكبيرتين (اخرجه البيهقي جلد۳ ص۲۹۲)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ اس بارہ میں سنت گذر چکی ہے کہ عیدین میں سات اور پانچ تکبیریں ہیں۔ اور ہر دو تکبیروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔

اس روایت کی سند میں بعض راویوں کے حالات معلوم نہیں۔ اگرچہ یہ روایت ضعیف ہے لیکن علماء کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ہلکے درجہ کی ضعیف روایت پر فضائل اعمال میں عمل درست ہے جب کہ اس کے خلاف کوئی صحیح روایت نہ ہو۔ اور ذکر کوئی معین نہیں۔

سبحان الله والحمد لله لا اله الا الله والله اكبر پڑھے یا کوئی اور ذکر کرے سب صحیح ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

نماز عید مسجد میں پڑھنی چاہیئے یا میدان میں

سوال:۔ ہمارے یہاں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ عید کی نماز مسجد میں پڑھنی چاہیئے یا میدان میں فریقین نے اپنے اپنے دلائل بیان کئے جو حسب ذیل ہیں۔

زید کے دلائل۔ کھلے میدان میں نماز عید ادا کرنی مسنون ہے۔ کسی عذر یا خوف بارش وغیرہ کے بغیر

مسقف مسجد میں عید پڑھنا درست نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کھلے میدان میں عید پڑھتے رہے۔ لہٰذا میدان میں نماز عید پڑھنی مسنون و افضل ہے۔

بکر کے دلائل

میدان میں بعض وقت نجاست بھی ہوتی ہے۔ جب مسجد (جو مسقف ہو یا غیر مسقف) کافی سے زیادہ جگہ کی گنجائش ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میدان میں نمازیں پڑھی جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میدان میں نماز عید گزارنا صرف اس وجہ سے تھا کہ مسجد نبوی میں جگہ کی تنگی تھی۔ اور قرب و جوار کے لوگوں کا اجتماع صلوٰۃ عیدین کے لئے کثیر ہوتا تھا۔ اس لئے حضور نے میدان میں نماز عید ادا کی۔ ورنہ جس مسجد میں ایک رکعت پر پچاس ہزار رکعتوں اور دو رکعتوں پر ایک لاکھ رکعتوں کا ثواب ملتا ہو۔ حضور اپنے صحابہ کو اتنے کثیر ثواب سے ہرگز محروم نہ فرماتے۔ اگر صلوٰۃ عیدین میدان ہی میں پڑھنا افضل ہوتا تو وہ اہلِ مکہ کو حکم فرماتے کہ مسجد حرام میں نماز عید نہ پڑھا کرو۔ بلکہ بیرون شہر میدان میں جایا کرو۔ نہ خلافتِ راشدہ میں ممانعت ہوئی۔ نہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے نو سالہ عہد خلافت میں ایسا حکم ہوا۔ آج تک مسجد حرام میں صلوٰۃ عیدین برابر ادا کی جا رہی ہیں۔

محاکمہ بین الفریقین

جواب:۔ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ وغیرہ کے مابین اس میں اختلاف ہے۔
امام شافعیؒ کہتے ہیں ——— مسجد فراخ ہو تو مسجد بہتر ہے۔ دلیل یہی دیتے ہیں جو بکر نے دی ہے۔ یعنی مکہ شریف کے لوگ باہر نہیں نکلتے ——— اور امام مالکؒ وغیرہ کہتے ہیں۔ میدان افضل ہے۔ اور اس پر دو دلیلیں دیتے ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عید کی نماز میدان میں پڑھی ہے۔ اور جس کام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشگی کریں وہ مقام افضلیت سے نہیں اتر سکتا۔

۲۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ میدان کی طرف نکلے اور فرمایا۔

لَوْلَا أَنَّهُ السُّنَّةُ لَصَلَّيْتُ فِي الْمَسْجِدِ (سبل السلام ۱۶۱)

یعنی اگر میدان کی طرف نکلنا مسنون نہ ہوتا تو میں نماز مسجد میں پڑھتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ باہر پڑھنے کی وجہ یہ بیان کرنا کہ مسجد نبوی تنگ تھی یہ کسی روایت میں نہیں آیا صرف مکہ کی حالت دیکھ کر یہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ مکہ کے باہر نزدیک کوئی فراخ میدان نہیں یہ اہل مکہ کے لئے معقول عذر ہے۔ اس لئے اہل مکہ کی حالت دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر نماز پڑھنے کی وجہ مسجد کی تنگی بیان کرنا درست نہیں۔

اس کے علاوہ جمعہ میں ہجوم کم نہیں ہوتا تھا مگر باوجود اس کے جمعہ آپ مسجد ہی میں پڑھتے رہے۔ رہا بکر کا یہ کہنا کہ مسجد نبوی میں پچاس ہزار نماز کا ثواب ہے اگر مسجد کی تنگی کی وجہ نہ ہوتی تو اتنے بڑے ثواب سے کیوں محروم رہتے؟

اس کی بابت عرض ہے کہ بعض دفعہ اور وجوہات پیدا ہو جاتی ہیں جن سے غیر بہتر عمل بہتر ہو جاتا ہے مثلاً مسجد سب جگہوں سے بہتر ہے مگر نفل نماز گھر میں افضل ہے جس میں اہل مدینہ بلکہ اہل مکہ بھی داخل ہیں۔ پھر حضرت علی کا ارشاد مذکور اس بارہ میں صاف ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی تسلی بخش دلیل نہیں جس کی بنا پر ہم صحابی رضہ سے آگے بڑھیں۔ پس صحیح اسی کو ہے کہ عید کی نماز باہر پڑھی جائے۔ ہاں اگر کوئی عارضہ ہو جیسے سوال میں ذکر ہے کہ میدان میں نجاست ہے تو پھر کوئی حرج نہیں مسجد میں پڑھ لی جائے مگر نجاست ایسی ہو کہ صاف نہ ہو سکے۔ اگر صاف ہو سکے تو میدان بہتر ہے۔ ہاں زید کا یہ کہنا کہ مسجد میں درست نہیں یہ بے دلیل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے حضرت علی رضہ نے افضلیت ہی سمجھی ہے۔ چنانچہ "لولا انہ السنۃ لصلیت فی المسجد" کے لفظ سے واضح ہے۔ نیز سبل السلام میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد ہے واستخلف من یصلی لضعفۃ الناس فی المسجد۔ یعنی حضرت علی کمزور یعنی عورتوں اور بوڑھوں وغیرہ کے لئے ایک خلیفہ مقرر کیا جو ان کو مسجد میں نماز پڑھائے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ سب باہر جاتے تھے۔ نیز یہ کسی کا مذہب نہیں جو زید نے اختیار کیا ہے۔ صرف افضلیت اور غیر افضلیت میں اختلاف ہے۔ جواز عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔ پس زید کا مذہب سلف کے بالکل خلاف ہے۔ البتہ باوجود عذر نہ ہونے کے نماز عید ہمیشہ مسجد میں پڑھنا، اس میں مکروہ کی صورت ضرور پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں بلا وجہ افضلیت کا ہمیشہ ترک کرنا ہے۔

چنانچہ شاہ جیلانی رح کا ارشاد ہے۔

وَالْاَوْلٰی اَنْ تُقَامَ فِی الصَّحْرَاءِ وَتُکْرَہُ فِی الْجَامِعِ اِلَّا لِعُذْرٍ (غنیہ)

یعنی عید کی نماز جنگل میں پڑھنی چاہیئے اور جامع مسجد میں بلا عذر عید پڑھنی مکروہ ہے
عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۹ مارچ ۱۹۶۲ء

عید اور جمعہ اکٹھے آجائیں تو نماز ظہر کا حکم

سوال :۔ عید کے دن جمعہ کی رخصت ہے تو کیا نماز ظہر بھی معاف ہے یا صرف جمعہ کی رخصت ہے
ہمارے ہاں دو صاحب علم بزرگوں کے ارشادات اس سلسلہ میں جداگانہ ہیں۔
ایک صاحب فرماتے ہیں۔
عید کے دن صرف جمعہ کی رخصت ہے نماز ظہر پڑھنی ضروری ہے۔
دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔
جمعہ ظہر کے قائم مقام ہے جب عید کے دن جمعہ معاف ہے تو نماز ظہر بھی معاف ہونی چاہیئے۔
اس مسئلہ میں صحیح راہنمائی فرمائی جائے۔

(محمد سعید لیپروری)

جواب :۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانہ میں عید اور جمعہ اکٹھے آگئے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے عید پڑھائی
اس کے بعد عصر تک گھر سے نہیں نکلے۔
اس واقعہ سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے عید کے دن نماز ظہر بھی نہیں پڑھی۔ لیکن
یہ ایک خاص واقعہ ہے۔ اور یہ اصول مسلمہ ہے کہ وقائع الاعیان لا یحتج بھا علی العموم یعنی خاص
واقعہ سے عام استدلال نہیں ہوسکتا۔ اس میں احتمال ہے کہ شاید گھر میں اکیلے یا باجماعت نماز پڑھ لی ہو اور
مسجد میں آکر نمازیوں کے ساتھ باجماعت نماز اس لئے نہ پڑھی ہو کہ عام طور پر جو لوگ پیچھے آتے ہیں اور خطبہ نہیں
سنتے ان کو اشتباہ نہ پڑے کہ جمعہ پڑھا گیا ہے۔ یا ممکن ہے گھر سے نہ نکلنے کی کوئی اور وجہ ہے۔ اس قسم کے
بعض استدلال اور بھی ہیں جو تسلی بخش نہیں۔ اور معاملہ فرض کا ہے اس لئے احتیاطاً نماز ظہر پڑھنی چاہیئے۔
رہی یہ بات کہ جمعہ ظہر کے قائم مقام ہے جب جمعہ معاف ہے تو نماز ظہر بھی معاف ہونی چاہیئے۔ یہ الٹا
استدلال ہے کیونکہ قائم مقام کے جانے سے اصل آجاتا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ
مشکوٰۃ میں حدیث ہے جو شخص جمعہ کی ایک رکعت پائے وہ دوسری ساتھ ملائے۔ اور جس کو ایک رکعت

بھی نہ ملے وہ ظہر پڑھے۔

اس بنا پر جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں جیسے عورت، مسافر، غلام وغیرہ ان کو نماز ظہر پڑھنے کا حکم ہے پس معلوم ہوا کہ قائم مقام یعنی جمعہ کے جانے سے نماز ظہر کی نفی نہیں ہوتی۔ پس عید اور جمعہ ایک دن اکٹھے آجائیں تو ایسی صورت میں جمعہ کی رخصت ہے پڑھے یا نہ لیکن اگر جمعہ نہ پڑھے تو ظہر ضرور پڑھنی چاہیئے۔ بہتر جمعہ پڑھنا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی رخصت دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا۔

وانا مجمعون انشاء اللہ۔

یعنی ہم جمعہ پڑھیں گے۔ انشاءاللہ

نوٹ: اس مسئلہ میں دو فریق اور ہیں۔ ایک فریق کہتا ہے جمعہ کے دن اصل جمعہ فرض ہے، اور ظہر اس کا بدل ہے۔ اس لئے اگر جمعہ معاف ہوا تو ظہر بھی معاف ہے۔ لیکن مشکوٰۃ کی مذکورہ بالا حدیث اس کی تردید کرتی ہے۔ اس میں جمعہ نہ ملے تو ظہر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جن پر جمعہ فرض نہیں اُن کو ظہر پڑھنے کا حکم ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ صدیقہ سے روایت ہے کہ ظہر کی دو رکعت کم کر کے اُن کے قائم مقام خطبہ کر دیا گیا ہے یہ صاف دلیل ہے کہ نماز ظہر اصل ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے۔

ظہر احتیاطی

دوسرا فریق کہتا ہے کہ جمعہ کے دن دو فرض ہیں۔ جمعہ اور ظہر اس بنا پر وہ جمعہ کے بعد ظہر بھی پڑھتے ہیں۔ اس کا نام احتیاطی رکھتے ہیں۔ یہ مذہب بھی غلط ہے کیونکہ قرآن مجید میں نماز جمعہ ہونے کے بعد کاروبار کے لئے جانے کی رخصت دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض۔

اس کے علاوہ تعامل خیر القرون بھی اس کے خلاف ہے۔ اس میں سے کسی سے بھی جمعہ کے بعد نماز ظہر پڑھنا ثابت نہیں۔

خلاصہ یہ کہ پہلے مذہب کو بہرصورت ترجیح ہے۔ یعنی جمعہ قائم مقام ظہر ہے۔ اگر کسی وجہ سے جمعہ نہ پڑھے تو نماز ظہر ضرور پڑھنی چاہیئے۔

خلاصہ یہ کہ عید کے بعد جمعہ کے لئے بھی حاضری ضروری ہوتی تو عید کی خوشی میں رکاوٹ اور بے لطفی سی پیدا ہو جاتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۳ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ ۔ ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء

صدقہ فطر

صاعِ نبویؐ

سوال :۔ صاع نبویؐ کے متعلق زید کہتا ہے کہ وہ پانچ رطل اور ثلث (تہائی) رطل کا ہے انگریزی حساب کے وزن سے ایک رطل نصف سیر ہے۔ اس حساب سے صاع کا وزن دو سیر ساڑھے گیارہ چھٹانک ہے لیکن مولوی عبدالغنی خانپوری ہوشیارپوری فرماتے ہیں کہ مولوی احمد اللہ صاحب دہلوی نے جو صاع مدینہ منورہ سے حاصل کیا ہے وہ سوا دو سیر کا ہے۔ نیز وہ مدینہ سے ایک مُد جو صاع کا چوتھائی ہے ساتھ لائے ہیں جن سے لائے ہیں وہ صاحب سند بھی لکھ دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ صاع بالکل ٹھیک ہے۔ اس بارہ میں پوری تحقیق سے فیصلہ فرمائیں۔

مولوی عبدالرحیم فیروزپوری بحکم مولوی عبدالغنی

مہتمم مدرسہ خانپور۔ ۲۴ رمضان ۱۳۵۶ھ

جواب :۔ یہی مُد جو مولوی احمد اللہ صاحب لائے ہیں، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی مرحوم کے وقت میں ایک صاحب لائے تھے۔ جو باسند تھا۔ پانی سے اس کا اندازہ کیا گیا۔ قریباً سوا دو سیر ہوا۔ اس وجہ سے مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم بھی سوا دو سیر ہی کے قائل تھے۔ میرا اُس وقت طالب علمی کا زمانہ تھا اس لئے میرا بھی یہی اعتقاد ہوگیا۔ لیکن بعد کو جب علم پر حاوی ہوا تو یہ خیال تبدیل ہوگیا۔ جس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ علوم الحدیث مقدمہ ابن صلاح جو اُصولِ حدیث میں اصل الاصول کتاب ہے اس کے صفحہ ۷ میں لکھا ہے کہ ائمہ محدثین کے بعد اسناد کے سلسلہ کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ بُعدِ زمانہ کی وجہ سے رُوات میں شرائط صحت کا علم مشکل ہے اور ابن صلاح ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۴۳ھ میں وفات پائی ہے۔ جب چھٹی ساتویں صدی میں سلسلہ اسناد کا یہ حال ہے تو اب چودھویں صدی میں اس سے دوگنا بُعد ہوگیا ہے۔ اس وقت سلسلہ اسناد کے اعتماد پر مُد کا ہم کیا فیصلہ کرسکتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ امام شافعیؒ دوسری صدی کے امام ہیں جو بالکل سلف کے قریب زمانہ میں ہوئے ہیں وہ صاع مدنی کا اندازہ پانچ رطل اور تہائی رطل بتاتے ہیں۔ کیا ان کا اعتبار کریں یا آج کل کے اہل مدینہ کا؟ اس کے

علاوہ صاع کا اندازہ اگر پانی سے کیا جائے تو اس کا وزن اور ہے۔ اگر جَو سے کیا جائے تو اور ہے۔ گندم سے کیا جائے تو اور ہے۔ کھجور سے کیا جائے تو اور ہے بلکہ کھجور کا آپس میں ایک وزن نہیں، کیونکہ کھجوریں مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ کوئی وزنی کوئی ہلکی، کوئی بڑی کوئی چھوٹی۔ اس طرح اور جنسوں کا بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے امام شافعیؒ کے بتائے ہوئے وزن پر اعتماد کرنا عین احتیاط ہے، کیونکہ وہ بہت قریب کے زمانہ میں ہوئے ہیں اس وقت سلف کے دستور العمل میں چنداں تغیر نہیں آیا تھا جو بعد میں آگیا۔ پس قرین قیاس یہی ہے کہ انہوں نے صاع کا اندازہ اسی شئے سے کیا جس سے سلف کے زمانہ میں عام طور پر دستور تھا۔ پس احتیاط اسی میں ہے کہ صاع کا اندازہ پانچ رطل اور تہائی رطل قرار دیا جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۰ رجب ۱۳۵۶ھ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۷ء

انگریزی حساب سے صاع کا اندازہ

سوال:۔ صاع میں بہت اختلاف رہتا ہے۔ عراقی حجازی کے علاوہ صرف حجازی کے قول میں اہلحدیث علماء کا مختلف خیال ہے جو رسالوں، اخباروں، کتابوں میں مذکور ہے۔ کوئی سوا دو سیر۔ کوئی اڑھائی سیر۔ کوئی دو سیر گیارہ چھٹانک بتاتا ہے۔ ایک وزن قائم نہیں کیا گیا۔ اس بارہ میں فیصلہ فرمائیں۔

جواب:۔ صاع مدینہ کا معتبر ہے اور اس کا صحیح اندازہ پانچ رطل اور تہائی رطل ہے۔ اور رطل کا مشہور اندازہ آدھ سیر ہے۔ اس حساب سے صاع دو سیر پختہ انگریزی دس چھٹانک تین تولہ چار ماشے ہوتا ہے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ صاع کا اندازہ مختلف چیزوں سے لگایا گیا ہے صرف کھجوروں سے اگر صاع کے وزن کا اندازہ کیا جائے تو بھی ایک وزن قائم نہیں رہتا۔ کیونکہ کھجوریں بعض ہلکی ہوتی ہیں۔ بعض وزنی اور بعض بڑی ہوتی ہیں۔ بعض چھوٹی۔ اس وجہ سے وزن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ پانچ رطل اور تہائی رطل یہ امام شافعیؒ کا اندازہ ہے جو سلف سے زمانہ قریب میں ہے۔ اس لئے یہی قول راجح ہے۔ رہا صاع عراقی وغیرہ جو امام ابو حنیفہؒ وغیرہم کا قول ہے سو وہ صحیح نہیں، کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ صاع مدینہ کا اور وزن اہل مکہ کا معتبر ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ نے بھی امام شافعیؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے اس سے زیادہ اس بارہ میں کہا جا سکتا ہے۔ اس کی تفصیل مولوی عبدالرحیم کے مندرجہ استفسار میں بھی ہو چکی ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

صدقۂ فطر نقدی کی صورت میں

سوال:۔ صدقۂ فطر میں نقد قیمت دینا درست ہے یا نہیں۔ اگر درست ہے تو آپ کے پاس اس کی دلیل کیا ہے۔؟

جواب:۔ صدقۂ فطر میں قیمت دینے کا کوئی حرج نہیں۔ بخاری شریف باب العرض فی الزکوٰۃ میں ہے

قال معاذ لاهل اليمن ائتونی بعرض ثیاب خمیص اولبیس فی الصدقة مکان الشعیر والذرة اهون علیکم وخیر لاصحاب النبی صلی الله علیه وسلم

یعنی حضرت معاذؓ نے اہل یمن کو کہا کہ بجائے جَو اور جوار کے باریک کپڑے اور عام پہننے کے کپڑے صدقہ میں ادا کرو۔ یہ تمہارے لئے آسان ہے اور اصحاب رسول کے لئے زیادہ فائدہ مند۔

اِس روایت میں اگرچہ انقطاع ہے لیکن امام بخاریؒ جیسے محدّث کا اس سے استدلال کرنا اس کو تقویت دیتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات میں مصرف کی حاجت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے قیمت ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگرچہ یہ روایت زکوٰۃ کے بارہ میں ہے۔ لیکن جیسے صدقۂ فطر میں آیا ہے کہ فلاں فلاں شئے کا صاع دو۔ اِس طرح زکوٰۃ میں ہے۔ فلاں فلاں شئے سے فلاں فلاں شئے دو۔ پس زکوٰۃ میں قیمت کی طرف عدول جائز ہوا۔ تو صدقۂ فطر میں بھی جائز ہوا۔ فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ نیز صدقۂ فطر کی غرض حدیث میں یہ آئی ہے کہ اَغْنُوْهُمْ فِیْ هٰذَا الْیَوْمِ (دار قطنی) یعنی عید کے دن غرباء کو بے پرواہ کرو۔

اِس سے بھی معلوم ہوا کہ غرباء کی ضروریات کو مدِّنظر رکھ کر غلّہ کے حساب سے نقدی قیمت دی جا سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ حضرت معاویہؓ نے نصف صاع گندم کو دُوسری اشیاء کے صاع کے برابر قرار دیا اور ظاہر ہے کہ نصف صاع وزن میں تو باقی اشیاء کے صاع کے برابر نہیں۔ لہٰذا مراد قیمت ہوگی۔ اِس سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ غلہ کے حساب سے نقد دینا بھی جائز ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

گندم کا نصف صاع کا تقرر

سوال:۔ صدقۂ فطر گندم کا جو نصف صاع مقرر ہوا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ہوا

یا بعد میں بیان فرمائیں۔

جواب:۔ بعض حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصف صاع کا ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب صدقۃ الفطر) مگر ان میں کچھ کلام ہے۔ پوری تسلّی بخش نہیں۔ اور بخاری وغیرہ حدیثوں میں تصریح ہے کہ نصف صاع معاویہؓ کی رائے تھی۔ اس وقت سے لوگوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ ابوسعید خدریؓ اور عبداللہ بن عمرؓ وغیرہم اس کے خلاف رہے۔ پس احتیاط اسی میں ہے کہ گیہوں کا بھی پورا صاع دے تاکہ اختلاف سے نکل جائے۔ ہاں کوئی زیادہ تنگ دست ہو تو شاید خدا اس کا نصف صاع ہی قبول کر لے مگر پوری تسلّی نہیں۔ نیز گیہوں کھانے والے کی تنگی کا بھی شبہ ہے کیونکہ جس کو تنگی ہو وہ سستی جنس مکی یا جوار وغیرہ پر گذارا کرتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

عید کا چاند دیکھنے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنا

سوال:۔ صدقہ فطر عید الفطر یعنی شوال کا چاند دیکھ کر ادا کرنا چاہیئے یا چاند دیکھنے سے پہلے بھی ادا ہو سکتا ہے۔

جواب۔ مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن میں بخاری کی حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر پر حضرت ابوہریرہ رضؓ کو پہرہ دار مقرر کیا تھا۔ دو روز چور آتا رہا۔ ابوہریرہ رضؓ اس کو گرفتار کرتے مگر اس پر ترس کھا کر چھوڑ دیتے۔ تیسرے روز پھر آیا۔ اس سے ابوہریرہؓ نے سختی کی اور کہا میں تجھے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاؤں گا۔ آخر چور نے یہ وظیفہ بتایا کہ رات کو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کر شیطان قریب نہیں آئے گا۔ اس پر ابوہریرہؓ نے اس کو چھوڑ دیا۔

صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ کو کہا کہ تجھے معلوم ہے تین راتوں سے تیری بات کس سے ہو رہی ہے۔ یہ شیطان تھا اور وہ جھوٹا ہے لیکن وظیفہ اس نے ٹھیک بتایا ہے۔

یہ حدیث کا خلاصہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ فطر جمع ہوئے کو تین دن یا زیادہ ہو گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جمع ہونا عید سے پہلے تھا کیونکہ صدقہ فطر کی غرض حدیث میں یہ آئی ہے کہ مساکین کو عید کے دن در بدر پھرنے سے مستغنی کر دیا جائے۔ اس لئے حکم ہے کہ صدقہ فطر عید سے پہلے ادا کر دیا جائے تاکہ

مساکین بھی اپنی عید کی تیاری کرکے عید پڑھنے جائیں۔ پس ثابت ہوا کہ چاند دیکھنے سے پہلے صدقہ فطر ادا ہو سکتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

نادار اور غریب روزہ دار پر صدقہ فطر کا حکم

سوال:۔ ایک شخص اتنا غریب ہے کہ صدقہ فطر ادا کرنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے متعلق کیا حکم ہے۔؟

عبدالرحمٰن حصاری

جواب:۔ حدیث میں ہے کہ غنی بھی صدقہ فطر ادا کرے اور غریب بھی ادا کرے۔ غنی کے متعلق فرمایا اللہ تعالےٰ اس کو گناہ سے پاک کر دے گا۔ اور غریب کے متعلق فرمایا کہ گناہ سے پاک ہونے کے علاوہ اللہ تعالیٰ اس کا صدقہ اس سے زیادہ لوٹائے گا جتنا اس نے دیا (مشکوٰۃ باب صدقۃ الفطر) یعنی کسی کے دل میں ڈال دے گا جو اس کو دے جائے گا۔

پس اس حدیث کی رو سے غریب پہلے ہی سے کوشش کرے تاکہ موقع پر ادا کر سکے۔ جس کی بہتر صورت یہ ہے کہ اپنی خوراک سے تھوڑا تھوڑا جمع کرتا رہے اور اگر کوئی بالکل ایسا غریب ہو کہ وہ اپنی خوراک میں فاقہ کشی کرتا ہے تو آیت کریمہ لا یکلف اللہ نفسًا الّا وسعھا کے تحت وہ معذور ہے اور فقہاء نے جو شرط کی ہے کہ صدقہ فطر اس پر ہے جو نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو۔ یہ اس حدیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ نصاب کا مالک فقیر نہیں۔ اور اس حدیث میں فقیر کو بھی صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

منقول اخبار تنظیم یکم مارچ ۱۹۶۳ء

مسجد کے خادم پر صدقہ فطر صرف ہو سکتا ہے

سوال:۔ مسجد میں خادم مقرر کئے جاتے ہیں، ان کی پانی ڈالنے۔ میت نہلانے۔ مسجد کی صفائی کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اس پر ان کو اُجرت ملتی ہے۔ شادی۔ موت یا فصل کے موقع پر کچھ اناج اور گھروں میں سے دو وقت روٹی ملتی ہے۔ بعض لوگ عید کے موقع پر ان کو صدقہ فطر دیتے ہیں۔ کیا ان کو صدقہ فطر دینا جائز ہے؟۔

جواب:۔ اُجرت پر میت کو نہلانے کا جو رواج پڑ گیا ہے یہ حدیث کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ زیادہ قریبی آدمی نہلائے۔ اب لوگوں نے بعض ایسے آدمی مقرر کر دیئے ہیں۔ جن کا کام سوائے مردہ نہلانے کے اور کچھ نہیں۔ انا للہ۔ رہی مسجد کی خدمت پانی وغیرہ اُجرت پر بھرنا تو اس کا کوئی حرج نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قربانی پر قصاب کی اُجرت اور قرآن مجید کی طباعت وکتابت پر اُجرت۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کتابت قرآن کی بابت اُجرت کا سوال ہوا تو فرمایا کوئی حرج نہیں۔ وہ نقوش کا عوض لیتے ہیں۔ مشکوٰۃ باب الکسب وطلب الحلال

لیکن صدقہ فطر ان کو اس کے عوض دینا جائز نہیں کیونکہ وہ زکوٰۃ کی طرح الگ فرض ہے۔ کسی شے کی اُجرت نہیں بنتا جو لوگ ان کو صدقہ فطر اس کے عوض دیتے ہیں۔ وہ صدقہ فطر نہیں لگتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۰ رجب ۱۳۵۷ھ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء

فطرانہ کا مصرف کونسا بہتر ہے
گاؤں کے لوگ یا اسلامی مدرسہ

سوال:۔ ایک شخص کہتا ہے کہ فطرانہ کے دانے اسلامی مدرسہ کو دینا بہتر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ گاؤں میں غریبوں کو دینا بہتر ہے۔ پہلا دلیل یہ دیتا ہے کہ گاؤں کے غریبوں کے پاس ایک یا دو یا دس بیگہ زمین ہے۔ مدرسہ کے پاس کوئی زمین نہیں۔ اس کا ثواب زیادہ ہے۔ دوسرا یہ دلیل دیتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین۔ جواب قرآن وحدیث سے دیں کہ کس کو دینے میں ثواب زیادہ ہے۔

جواب:۔ اس بارہ میں کئی باتیں دیکھنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ گاؤں کے مسکین اگر ایسے غریب ہوں کہ مدرسہ سے بھی غربت میں بڑھ کر ہیں یہاں تک کہ بھوکے رہتے ہیں تو پھر وہ زیادہ حقدار ہیں۔ ورنہ مدرسہ زیادہ حقدار ہے۔

دوم یہ کہ گاؤں کے مسکینوں کی دینداری کیسی ہے اگر پورے پابند شریعت ہوں تو پھر ان کو کچھ دینا چاہیئے ورنہ نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگ عشر نہیں دیتے۔ اس لئے مدرسہ غریب رہتا ہے ورنہ مدرسہ بھی امیر ہو جائے

اور گاؤں کے لوگوں کی بھی ضرورتیں پوری ہوجائیں خدا توفیق دے۔ آمین

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۲ نومبر ۱۹۴۲ء

بچہ کی طرف سے صدقہ ادا کرنے میں کیا حکمت ہے،

سوال:۔ اسلام میں بچہ کی طرف سے صدقۃ الفطر کیوں فرض ہوا۔ جب کہ بچہ عملاً صیام کا مکلّف نہیں۔

جواب:۔ حدیث میں صدقہ فطر کی دو وجہیں آئی ہیں۔ روزوں کی طہارت۔ طعمہ مسکین۔ دوسری وجہ بچہ کے صدقہ فطر میں جاری ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۷ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ ۔ ۱۴ جون ۱۹۴۰ء

صدقہ فطر مسجد یا اس کے متعلقات پر صرف ہوسکتا ہے

سوال:۔ کیا صدقہ فطر مسجد کے غسل خانوں اور وضو والی سبیل پر خرچ ہوسکتا ہے۔

نواب دین ولد احمد دین ساکن لدھے والا ورکاں ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ صدقہ غرباء اور مساکین کا حق ہے اور وقف سے امیر غریب سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے صدقہ فطر مسجد اور اس کے غسل خانوں یا وضو والی سبیل پر صرف نہیں ہوسکتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۴ شوال ۱۳۸۳ھ ۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۴ء

عید کے دن پیدا ہونے والے بچہ کا صدقہ فطر

سوال:۔ جو بچہ رمضان میں یا عید کے دن پیدا ہو یا مسافر جو کسی کے گھر آیا ہو ان کا صدقہ دیا جائے یا نہیں؟

جواب:۔ جو بچہ عید کا چاند چڑھنے سے پہلے پیدا ہو۔ اس کا صدقہ فطر ادا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ حدیث میں صاف الفاظ ہیں کہ غلام۔ آزاد، مرد۔ عورت۔ چھوٹا۔ بڑا جو مسلمان ہو سب کی طرف سے صدقہ فطر ضروری ہے

اور دوسری حدیث میں اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ۔

زکوٰۃ الفطر طھرۃ للصائم من اللغو والرفث وطعمۃ للمساکین

یعنی صدقہ فطر روزے کے لئے لغو اور بے ہودہ باتوں سے طہارت اور مساکین کے لئے کھانا

بچہ کی طرف سے صدقہ فطر کی ایک وجہ ہے مساکین کے لئے کھانا۔ اور بڑے کی طرف سے صدقہ فطر کی دو وجہیں ہیں۔ ایک روزے کی طہارت، دوسرے مساکین کے لئے کھانا۔ اور جو بچہ عید کے دن پیدا ہو۔ اُس پر صدقہ فطر نہیں۔ کیونکہ فطر کے معنیٰ افطاری کے ہیں وہ افطاری کے بعد پیدا ہوا ہے۔ صدقہ فطر اس کی طرف سے ضروری ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

امام احمدؒ کے مذہب کے مطابق ادا کر دیا جائے تو مستحب ہے۔ واجب نہیں ہے۔ جو بچہ پیٹ میں ہو امام احمدرح اُس کی طرف سے بھی صدقہ فطر ادا کرنے کو مستحب کہتے ہیں۔ (نیل الاوطار)

رہا مسافر کا صدقہ فطر تو وہ خود ادا کرے۔ میزبان پر اُس کا صدقہ فطر نہیں۔ بعض لوگوں کو حدیث ادوا صدقۃ الفطر عمن تعولون سے شبہ پڑتا ہے کہ مہمان یا مسافر کا صدقہ بھی گھر والوں (میزبانوں) کے ذمہ ہے کیونکہ اس حدیث کا معنیٰ ہے صدقہ فطر اس کی طرف سے ادا کرو جس کی تم سرپرستی کرتے ہو۔ سرپرستی میں مہمان اور مسافر بھی آجاتا ہے کیونکہ ان کا کھانا گھر والوں کے ذمہ ہے لیکن یہ استدلال صحیح نہیں۔ اول تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار جلد۲ میں اس کی تصریح ہے۔ دوسرے سرپرستی سے مراد یہ ہے کہ اس کا عیال ہو۔ چنانچہ دوسری روایت میں اس کی جگہ عمن تعول کا لفظ ہے یعنی ان کی طرف سے صدقہ فطر ہے جو عیال ہوں۔ (دارقطنی)

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ

قربانی کا بیان

قرض یا اُدھار لے کر قربانی کرنا

سوال :۔ قربانی کا جانور اُدھار لے کر قربانی کریں تو جائز ہے یا نہیں ۔ منیر الدین احمد

جواب:۔ ادھار قربانی کا کوئی حرج نہیں۔ جیسے اور ضرورتیں انسان ادھار سے پوری کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ایک ضرورت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے دینی کام ادھار سے کئے ہیں۔

مشکوٰۃ باب الافلاس میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے چالیس ہزار قرض اٹھایا ہے اور مشکوٰۃ باب الربا میں ہے کہ آپ کو ایک مرتبہ اونٹوں کی ضرورت ہوئی تو ایک ایک اونٹ دو دو کے عوض لیا۔ اور حضرت عمرؓ دینی ہی ضرورتوں کی وجہ سے بڑے مقروض ہوگئے تھے۔ چنانچہ فتح الباری میں ان کی شہادت کے واقعہ میں مذکور ہے قربانی تو ایک معمولی اُدھار ہے اس میں کیا حرج ہے۔ ہاں اگر اُدھار لینے کے بعد اپنے قرضخواہ کو تنگ کرے اور وقت مقررہ پر ادا کرنے میں سستی کرے تو اس سے عبادت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لئے جو قرض نیک کام کے لئے لیا جائے اُس کی ادائیگی میں خصوصیت سے احتیاط چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۸ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ ۔ ۲۰ جنوری ۱۹۳۹ء

عیدالاضحیٰ کی نماز سے قبل ناخن کتروانا یا حجامت بنوانا

سوال:۔ اگر کوئی شخص قبل عیدالاضحیٰ کے صبح سورج نکلتے ناخن کتروالے یا حجامت بنوائے تو جائز ہے یا نہیں۔؟

جواب:۔ حجامت قربانی کے بعد مسنون ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

ولاتحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ۔

یعنی قربانی حلال ہونے سے پہلے سر نہ مونڈو۔

دوسری جگہ قربانی کا ذکر کرکے فرمایا۔

ثم لیقضوا تفثھم۔ یعنی قربانی کے بعد میل کچیل پوری کریں۔

مشکوٰۃ باب فی الاضحیہ میں حدیث ہے کہ آپ نماز عید پڑھ کر فارغ ہوئے تو قربانیوں کا گوشت دیکھا جو نماز سے فارغ ہونے سے پہلے ذبح کی گئی تھیں۔ فرمایا جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا وہ اس کی جگہ اور ذبح کرے ــــــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر حاجیوں سے تقدیم و تاخیر ہو جائے تو معاف نہیں ہاں معاملہ طاقت سے باہر ہو جائے تو بحکم لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا معاف ہو سکتا ہے جیسے مکمل

حجامت بنوانے کے بعد قربانی یاد آئی تو اب دوبارہ حجامت بس کی بات نہیں۔ اس لئے جس حالت میں ہے قربانی کر دے۔ خدا قبول کرنے والا ہے مگر یہ اس صورت میں ہے کہ قربانی سے پہلے حجامت حرام ہو۔ اگر حرام نہ ہو تو پھر حجامت کے بعد قربانی کرنے میں مستحب کا خلاف ہے قربانی میں کوئی خلل نہیں لیکن نیل الاوطار جلد ۴ صفحہ ۲۴۴ میں حرمت کو ترجیح دی ہے۔ اس لئے حتی الوسع قربانی سے پہلے حجامت بنوانے میں احتیاط چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ

ذی الحجہ کا چاند چڑھنے کے بعد قربانی کے جانور کی اُون اُتارنا یا دُودھ دھونے کا مسئلہ

سوال:۔ قربانی کا جانور جو خاص قربانی کے واسطے خریدا جائے اور ذی الحجہ کے چاند میں اس کی اُون بالکل صاف کی جائے یعنی مُنڈی جائے تو جائز ہے یا نہیں۔ پشم اتارنے میں کوئی حرج ہے یا نہیں۔

صدرالدین امام مسجد بھگیاڑی ضلع شیخوپورہ

جواب:۔ ترغیب وترہیب میں ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا عَمِلَ اٰدِمِیٌّ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهَا لَتَاْتِیْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ مِنَ الْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا۔

یعنی حضرت عائشہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بقر عید کے دن آدم کے بیٹے نے کوئی عمل نہیں کیا کہ قربانی سے زیادہ اللہ تعالےٰ کو پیارا ہو۔ اور قربانی قیامت کے دن سینگوں بالوں کھروں سمیت آئے گی۔ اور خون زمین پر پڑنے سے پہلے خدا کے پاس قبولیت کے مقام میں پہنچتا ہے پس قربانیوں کے ساتھ دل سے خوش رہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کے بال نہیں کاٹنے چاہئیں۔ جیسے سینگ وغیرہ۔ کیونکہ قیامت کے دن قربانی ان اشیاء کے ساتھ آئے گی۔ ہاں اگر قربانی کا جانور بہت مدت پہلے کا خریدا ہوا ہو۔ اور اون اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ جانور کو تکلیف ہو تو پھر کاٹنے میں کوئی حرج نہیں مگر بقر عید کے دن سے اتنی پہلے کاٹے کہ

بقر عید کے دن تک کافی بڑھ جائے تاکہ اس حدیث کے مطابق ہوجائے۔ اِس صورت میں کاٹنے سے اِس حدیث کی مخالفت نہیں ہوگی۔ اور قربانی کا جانور تکلیف سے بھی محفوظ رہے گا۔ اور جو اُون اتاری جائے وہ صدقہ کر دینی چاہیئے کیونکہ قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے قربانی کی کوئی شئے استعمال کرنا شبہ سے خالی نہیں جو قربانی مکہ شریف میں بھیجی جاتی ہے۔ اس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ اگر رستہ میں رہ جائے تو اس کو ذبح کر دو۔ اور لوگوں کے لئے چھوڑ دو۔ تم اور تمہارے ساتھیوں سے کوئی نہ کھائے۔ (مشکوٰۃ باب الھدی)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شئے للہ ہوجائے وہ وقت سے پہلے استعمال نہ کرنی چاہیئے۔ ہاں لاچاری کی حالت میں سواری کی اجازت ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کے اسی باب میں ہے۔

اِرْکَبْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اِذَا اُلْجِئْتَ اِلَیْهَا حَتّٰی تَجِدَ ظَهْرًا۔

یعنی قربانی کے جانور پر سواری کے لئے مجبور ہوجائے تو سواری کرے حتی کہ اور سواری مل جائے۔

قربانی کا دودھ

اِسی بنا پر امام مالک رحمہ وغیرہم قربانی کے دودھ کی اجازت بھی نہیں دیتے۔

نیل الاوطار جلد ۴ میں ہے۔

واختلفوا ایضا فی اللبن اذا احتلب منه شیئا فعند العترة والشافعیة والحنفیة یتصدق به فان اکله تصدق بثمنه وقال مالک لا یشرب من لبنه فان شرب لم یغرم۔

یعنی قربانی کے دودھ میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ اہل بیت۔ شافعیہ۔ حنفیہ کہتے ہیں۔ جب کچھ دودھ دھوئے تو صدقہ کر دے۔ اگر کہیں پی ہوگیا تو اس کی قیمت صدقہ کرے۔ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ پینے کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص پی لے تو اُس پر کچھ تاوان نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ذبح سے پہلے قربانی کی کوئی شئے اپنے استعمال میں نہ لائے۔ ذبح کے بعد استعمال میں لاسکتا ہے۔ گوشت کھاسکتا ہے۔ چمڑا استعمال کرسکتا ہے اور اُون وغیرہ چمڑے سے علیحدہ کرکے کوئی شئے بنانی چاہیئے تو بنا سکتا ہے لیکن اُن میں کسی شئے کو فروخت کرکے پیسے کھانے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ حدیث میں چمڑوں وغیرہ کے فروخت کرنے سے صراحۃً منع فرمایا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۴ صفر ۱۳۵۳ھ ۷ جون ۱۹۳۴ء

قربانی کے جانور کی عمر

سوال: صحیح مسلم کی حدیث لَاتَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً میں لفظ مُسِنّہ کے لغوی اور شرعی معنی کیا ہیں۔ بعض عالم کہتے ہیں کہ مسنہ کے معنی دو دانت والا جانور ہے۔ برس دو برس کی کوئی قید نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دو برس کا ہو کر جو تیسرے سال میں لگا ہو۔ علاوہ ازیں کہ دانت ہوں یا دانت نہ ہوں۔ ان دونوں میں سے کونسا قول اَز رُوئے تحقیق صحیح وقابلِ قبول ہے۔

جواب: مجمع البحار میں ہے۔

والمسنة تقع على البقرة والشاة اذا اثنيا ويثنيان فى السّنة الثالثة وليس معنى اسنانها كبرها كالرجل المسن ولكن معناه طلوع سنها فى السنة الثالثة (جلد ۳ ص۱۳۵)

یعنی مسنہ کا لفظ گائے بکری دونوں پر بولا جاتا ہے جب کہ دانت نکالیں۔ اور گائے بکری دونوں تیسرے سال میں دانت نکالتی ہیں اور اُن کے مسنّہ ہونے سے عمر کا بڑا ہونا مراد نہیں۔ جیسے کہتے ہیں فلاں آدمی مُسِن ہے یعنی بڑی عمر کا ہے بلکہ گائے بکری کے مسنّہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تیسرے سال میں اُن کے دانت نکلیں۔

نہایہ میں ہے۔

البقرة والشاة يقع عليهما اسم المسن ويثنيان فى السنة الثالثة وليس معنى اسنانها كبرها كالرجل المسن ولكن معناه طلوع سنها فى السنة الثالثة (جلد ۲ ص۱۸۲)

اِس عبارت کا ترجمہ اور مطلب بھی وہی ہے جو اُوپر مجمع البحار کی عبارت کا گزرا ہے۔

صحاح جوہری میں ہے۔

الثنى الذى يلقى ثنيه يكون ذالك فى الظلف والحافر فى السنة الثالثة وفى الخف فى السنة السادسة وفى المحكم الثنى من الابل الذى القى ثنيه وذالك فى السادسة ومن الغنم الداخل فى السنة الثانية تيسا كان او كبشا وفى التهذيب البعير اذا استكمل الخامسة وطعن فى السادسة فهو ثنى وهو ادنى ما يجوز فى سن الابل فى الاضاحى وكذالك من البقر والمعزى فاما الضان فيجوز منها

الجذع فی الاصناحی وانما سمی البعیر ثنیا لانہ القی ثنیتہ۔

(تاج العروس جلد ۱۰ صفحہ ۶۲)

ثنی اس کو کہتے ہیں جو اپنے دانت ڈال دے۔ بکری اور گھوڑا تیسرے سال میں ہوتا ہے۔ اونٹ چھٹے سال میں ہوتا ہے۔ اور محکم میں ہے۔ ثنی اونٹوں سے اس کو کہتے ہیں جو سامنے کے دانت ڈال دے اور جو چھٹے سال میں ہوتا ہے اور بکری میں دوسرے سال میں ہوتا ہے بکرا ہو یا دنبہ اور تہذیب میں ہے اونٹ جب پانچ سال ختم کرکے چھٹے سال میں قدم رکھتا ہے تو وہ ثنی ہے اور اس سے کم عمر کا اونٹ قربانی میں جائز نہیں۔ ہاں دنبہ جائز ہے خواہ وہ جذع ہو یعنی ثنی نہ ہوا ہو اور اونٹ وغیرہ کو ثنی اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے سامنے کے دانت ڈال دئے۔

فتح الباری میں ہے۔

وحکی ابن التین عن الداؤدی ان المسنۃ التی سقطت اسنانہا للبدل قال اھل اللغۃ المسن الثنی الذی یلقی ویکون فی ذات الخف فی السنۃ السادسۃ وفی ذات الظلف والحافر فی السنۃ الثالثۃ وقال ابن فارس اذا دخل ولد الشاۃ فی السنۃ فھو ثنی ومُسِنّ (جز ۳ صفحہ ۳۲۸)

ابن التین نے داؤدی سے نقل کیا ہے کہ مسنہ وہ ہے جس کے سامنے کے دانت دوسرے دانت اُگنے کی خاطر گر جائیں۔ اہل لغت کہتے ہیں جو اپنے سامنے کے دانت ڈال دے اور یہ اونٹ میں چھٹے سال میں ہوتا ہے۔ اور بکری گائے میں تیسرے سال۔ اور ابن فارس کہتے ہیں جب بکری کا بچہ سال میں داخل ہو جائے جس کو ثنی بھی کہتے ہیں اور مسنہ بھی۔

ثنی وہ ہے جو سامنے کے دانت ڈال دے اور بکری۔ دنبہ گائے میں تیسرے سال ہوتا ہے اور اونٹ میں چھٹے سال۔

محکم میں ہے ثنی اونٹوں سے وہ ہے جو سامنے کے دانت ڈال دے اور یہ چھٹے سال میں ہوتا ہے اور بکری دنبہ سے دوسرے سال میں ہوتا ہے اور تہذیب میں ہے کہ اونٹ جب پانچ سال پورے کرکے چھٹے میں داخل ہو تو ہوتا ہے۔

ان عبارتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مسنہ (ثنی) اس کو کہتے ہیں جس کے دانت نکلیں۔

بغیر دانت نکلے مسنہ یا ثنی کہنا صحیح نہیں۔

دوسرے یہ کہ سالوں کی تعیین ملکوں کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ ان عبارتوں میں کہیں کہا ہے۔ گائے بکری تیسرے سال دانت نکالتی ہیں۔ کہیں کہا ہے۔ گائے بکری دوسرے سال دانت نکالتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں بکری کے دانت دوسرے سال میں نکل آتے ہیں۔ اور اسی بنا پر امام احمدؒ وغیرہ نے دوسرے سال میں مسنہ یا ثنی کہا ہے اور امام شافعی رحؒ وغیرہم نے تیسرے سال (عون المعبود جلد ۳)

پس اصل یہی ہے کہ دو دانت نکلے بغیر قربانی نہ کیا جائے۔ خواہ جانور سال سے اُوپر ہو اور خواہ کتنا موٹا تازہ ہو۔ ورنہ قربانی شکی ہوگی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۶ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ - ۲۲ مارچ ۱۹۳۴ء

قربانی میں شرکت

سوال :۔ گائے یا اونٹ کا ایک حصہ گھر کے تمام افراد کی طرف سے کافی ہوگا یا نہیں؟ اس بارہ میں کوئی نص صریح ہے تو بیان فرمائیں۔

حافظ محمد علی

جواب :۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَاہُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ عَلَیَّ بَدَنَۃً وَاَنَا مُوْسِرٌ وَلَا اَجِدُھَا فَاَشْتَرِیْھَا فَاَمَرَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّبْتَاعَ سَبْعَ شِیَاہٍ فَیَذْبَحُھُنَّ (رواہ احمد و ابن ماجۃ ، منتقی)

یعنی ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے کہا میرے ذمہ ایک بدنہ اونٹ یا گائے کی قربانی) ہے اور میں صاحب وسعت ہوں، لیکن بدنہ میسر نہیں جو خرید لوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات بکریاں خرید کر ذبح کر دے۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک گائے یا اُونٹ سات بکریوں کے قائم مقام ہے۔ اور اِس حدیث میں اگرچہ ضعف ہے کیونکہ اس میں عطاء خراسانی راوی ہے جو ابن عباس رضؓ سے روایت کرتا ہے۔ اس کی ابن عباس رضؓ سے ملاقات نہیں لیکن ابن عباس رضؓ کا فتوی اس حدیث کے موافق ہے۔ اس لئے یہ حدیث قوی ہوگئی۔

مسند احمد میں شعبہؒ سے روایت ہے۔

قال سمعت ابا جمرة الضبعی قال تمتعت فنهانی ناس عن ذالك فاتیت ابن عباسؓ فسالته عن ذالك فامرنی بها قال ثم انطلقت الی البیت فنمت فاتانی آت فی منامی فقال عمرة متقبلة وحج مبرور قال فاتیت ابن عباس فاخبرته بالذی رایت فقال الله اکبر الله اکبر سنّة ابی القاسم صلی الله علیه وسلّم و قال فی الهدی جزور او بقرة او شاة او شرك فی دم (جلد اوّل ص۲۴۱)

یعنی شعبہؒ کہتے ہیں۔ میں نے ابا جمرہ سے سنا۔ اس نے کہا میں نے حج تمتع کیا۔ یعنی عمرہ کرکے حلال ہو کر پھر حج کا احرام باندھا۔ لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا۔ میں ابن عباسؓ کے پاس آیا اور پوچھا تو انہوں نے مجھے اس کا امر فرمایا۔ میں بیت اللہ میں پہنچا۔ وہاں مجھے نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں۔ ایک شخص مجھے کہتا ہے عمرہ مقبول ہے اور حج اخلاص والا ہے۔ میں ابن عباسؓ کے پاس آیا اور ان کو یہ خواب سنایا تو انہوں نے خوشی میں یا تعجب کے طور پر دو دفعہ اللہ اکبر کہا اور پھر کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت ہے اور قربانی کے بارہ میں فرمایا۔ ایک اونٹ ہے یا گائے یا بکری ہے یا اونٹ گائے میں حصہ ہے۔

اونٹ میں شرکت

ابن عباس رضؓ کے اس فتویٰ میں ایک حصہ کو بکری کے قائم مقام ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ جمہور کا مذہب ہے کہ اونٹ۔ گائے سات بکری کے قائم مقام ہے۔ صرف اختلاف اس میں ہے کہ اونٹ دس کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ امام اسحٰق بن راہویہ وغیرہ فرماتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ دوسرے کہتے ہیں نہیں ہو سکتا۔ نیل الاوطار میں ہے۔

استدل به من قال عدل البدنة سبع شیاه وهو قول الجمهور وادعی الطحاوی وابن رشد انه اجماع ویجاب عنهما بان الخلاف فی ذالك مشهور حكاه الترمذی فی سننه عن اسحٰق بن راهویه وكذا فی الفتح وقال هو احدی الروایتین عن سعید بن المسیب والیه ذهب ابن خزیمة (جلد ۴ ص۱۳۳)

جو اونٹ گائے کو سات بکریوں کے برابر کہتے ہیں۔ وہ ابن عباس رضؓ کی حدیث مذکور سے استدلال

کرتے ہیں۔ اور جمہور کا قول یہی ہے۔ اور طحاوی اور ابن رشد نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اونٹ میں اختلاف مشہور ہے۔ ترمذی نے سنن میں اسحٰق بن راہویہ سے اس کو نقل کیا ہے کہ اونٹ دس کی طرف سے کافی ہے) فتح الباری میں بھی اس طرح ہے۔ نیز فتح الباری میں ہے کہ سعید بن مسیب سے بھی ایک روایت دس کی ہے اور ابن خزیمہ بھی اس طرف گئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس میں شبہ نہیں کہ اُونٹ اور گائے کا ایک حصّہ ایک بکری کا قائم مقام ہے۔ اب بکری کا حکم سُنیئے۔

عن عطاء بن یسار قال سالت ابا ایوب الانصاری کیف کانت الضحایا فیکم علی عھد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال کان الرجل فی عھد النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یضحی بالشاۃ عنہ وعن اھل بیتہ فیاکلون ویطعمون حتی تباھی الناس فصار کما تری۔ رواہ ابن ماجۃ والترمذی وصححہ۔

وعن الشعبی عن ابی سریحۃ حملنی اھلی علی الجفاء وبعد ما علمت من السنۃ کان اھل البیت یضحون بالشاۃ والشاتین والان یبخلون جیراننا رواہ ابن ماجۃ (منتقی)

علی بن یسار کہتے ہیں۔ میں نے ابوایوب انصاری سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں تم میں قربانیاں کس طرح ہوتی تھیں۔ فرمایا آپؐ کے زمانہ میں ایک بکری ایک شخص سے اور اس کے اہل بیت سے کافی ہوتی تھی۔ خود کھاتے اور کھلاتے یہاں تک کہ لوگ فخر کرتے۔ مگر اب یہ حالت ہے جو تو دیکھتا ہے۔ اور شعبیؒ ابی سریحہ رض سے روایت کرتے ہیں کہ سنت مان لینے کے بعد میرے اہل نے مجھے بے وقوفی پر آمادہ کیا۔ ایک گھر والے ایک (کبھی) دو بکریاں قربانی کرتے۔ اب ہمارے ہمسائے ہمیں بخیل بتاتے ہیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ ایک بکری ایک گھر کی طرف سے کافی ہے اور ایک حصہ بھی ایک بکری کے قائم مقام ہے۔ پس وہ بھی ایک گھر کی طرف سے کافی ہوگا۔ اس کے علاوہ ترمذی وغیرہ میں حدیث ہے۔ علی کل اھل بیت فی کل عام اضحیۃ۔ یعنی ہر گھر والوں پر سال میں ایک قربانی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اُونٹ گائے کا ایک حصہ ایک قربانی ہے۔ پس وہ ایک گھر والوں

کی طرف سے کافی ہوگا۔

نیز مشکوٰۃ وغیرہ میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ہم سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے عیدالاضحیٰ آگئی۔ ہم سات گائے میں شریک ہوئے اور دس اونٹ میں۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ سفر میں ایک گھر کے سات سات آدمی بعید ہیں۔ اور یہ کسی روایت میں نہیں کہ انہوں نے گھر والوں کی طرف سے الگ قربانی کی۔ بلکہ اگر الگ کر سکتے تو شرکت کی ضرورت نہ تھی۔ پس اس سے بھی ثابت ہوا کہ اونٹ۔ گائے کا ایک حصہ ایک بکری کا حکم رکھتا ہے اور بکری کی طرح ایک گھر والوں کے لئے کافی ہے۔

مشکوٰۃ وغیرہ میں جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ گائے بھی سات کی طرف سے ہے اور اونٹ بھی سات کی طرف سے ہے۔ یہ ارشاد آپؐ کا عام ہے۔ اس میں ایک گھر کے سات آدمی کی شرط نہیں، پس جیسے یہ عام ہے ویسے عام ہی رہنا چاہیئے۔

نیز مشکوٰۃ وغیرہ میں جابرؓ سے روایت ہے کہ حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں امر فرمایا کہ اونٹ گائے میں سات سات شریک ہوں۔ نیز جابر کہتے ہیں کہ عمرہ حدیبیہ میں ہم نے ستر قربانیاں کیں ہر ایک میں سات سات شریک تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مختلف گھروں کے سات سات شریک ہوئے کیونکہ ستر گھر اور ہر گھر کے ذمہ وار سات سات آدمی حضر میں بھی بعید ہیں۔ سفر میں کس طرح تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ اونٹ گائے کا ایک حصہ ایک بکری کے قائم مقام ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۱ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء

قربانی میں سب حصہ داروں کا اہل توحید ہونا

سوال :۔ گائے اور اونٹ کی قربانی میں جب سات آدمی شریک ہوں تو ان سب شرکاء کا مسلمان ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ساتوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے تو اگر ایک کافر مشرک۔ قبر پرست وغیرہ چھ مسلمانوں کے ساتھ قربانی میں شامل ہو جائے تو قربانی قبول ہو جائے گی یا نہیں۔

عبدالقادر حصاری خطیب جامع اہلحدیث چک ۲۵۱ ای۔بی ضلع منٹگمری

جواب :۔ جان ایک سے چاہیئے تھا کہ ایک گائے ایک ہی کی طرف سے قربانی ہو۔ کیونکہ قربانی خون بہانے کا نام ہے۔ گوشت کے حصول کا نام قربانی نہیں۔ وہ تو انسان خود ہی کھالیتا ہے اور جان بکری دنبہ۔ گائے، اُونٹ کی ایک ہے۔ پس سات کے قائم مقام ہونا اللہ تعالےٰ کی مہربانی ہے۔ اِس لئے شریک بھی ایک ہی قسم کے ہونے چاہئیں یعنی سب مسلمان ہوں مشرک نہ ہوں۔ اور سب کی نیت قربانی کی ہو نہ ان میں سے کسی کی نذر کی یا عقیقہ وغیرہ کی۔ اِس لئے عقیقہ کے سات حصّے ہونے میں شُبہ ہے۔ کیونکہ عقیقہ کے متعلق حدیث میں صراحت نہیں آئی۔ اور قربانی کے متعلق صراحت آگئی ہے کہ سات کی طرف سے ہو سکتی ہے

خلاصہ یہ کہ جو بات شریعت میں قیاس کے خلاف ہو وہ اسی مقام پر بند رہتی ہے کیونکہ جب علت معلوم نہیں تو اس کا حکم دوسری جگہ کس طرح جاری ہو سکتا ہے "

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۲ صفر ۱۳۸۴ھ ۔ ۳ جولائی ۱۹۶۴ء

گائے اونٹ میں بغیر سفر کے حضر میں شرکت کا مسئلہ

سوال :۔ گائے اونٹ میں بغیر سفر کے حضر میں سات شخصوں کا اشتراک کس دلیل سے ثابت ہے۔

عبدالقادر حصاری

جواب :۔ منتقیٰ باب " ان البدنۃ من الابل والبقر عن سبع شیاہ و بالعکس" میں یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتاہ رجل فقال ان علی بدنۃ وانا موسر ولا اجدھا فاشتریھا فامرہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبتاع سبع شیاہ فیذبحھن - رواہ احمد وابن ماجۃ۔

یعنی ابن عباس رض سے روایت ہے کہ ایک شخص رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اُس نے کہا میرے ذمہ بدنہ یعنی قربانی ہے اور میں غنی ہوں اور بدنہ نہیں ملتی کہ میں اس کو خرید لوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات بکریاں خرید کر ذبح کرو۔ اس کو احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اِس حدیث میں سفر کی کوئی شرط نہیں مطلق ہے۔ امام شوکانی رحمہ اس پر لکھتے ہیں کہ ابن ماجہ کی اسناد منقطع ہے۔ فرماتے ہیں۔ ولیشھد لصحتہ ما فی صحیح مسلم من حدیث جابر قال نحرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الحدیبیۃ البدنۃ عن سبعۃ والبقرۃ عن سبعۃ۔

اور اس کی صحت کی شاہد جابرؓ کی وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ کے سال اونٹنی سات کی طرف سے ذبح کی اور گائے بھی سات کی طرف سے ذبح کی۔

اِس حدیث میں اگرچہ حدیبیہ کے سال کا ذکر ہے مگر امام شوکانی نے اس قید کا لحاظ نہیں کیا۔ اور اس کو ابن عباسؓ کی حدیث کا شاہد قرار دیا۔ اور نہ کسی اور نے سفر کی شرط لگائی ہے کیونکہ فعل سے شرط ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ یہ صرف جدت پسند لوگوں کا اختراع ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۵ صفر ۱۳۸۴ھ ، ۲۶ جون ۱۹۶۴ء

بھینسے کی قربانی کا مسئلہ

سوال :۔ کیا بھینسا (کٹا) قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ قرآن مجید پارہ ۸ رکوع ۴ میں ہے بھیمۃ الانعام کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ دنبہ۔ بکری۔ اونٹ۔ گائے بھینس۔ اِن چار میں نہیں۔ اور قربانی کے متعلق حکم ہے بھیمۃ الانعام سے ہو۔ اس بنا پر بھینس کی قربانی جائز نہیں۔ ہاں زکوٰۃ کے مسئلہ میں بھینس کا حکم گائے والا ہے جیسے گائے تیس راس ہو جائیں اور وہ باہر چرتی ہوں اُن کا چارہ قیمتًا نہ ہو اُن میں ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی۔ اس طرح بھینس میں جب ان کی گنتی تیس ہو وہ باہر چرتی ہوں اُن کا چارہ قیمتًا نہ ہو تو ایک سال بچہ یا بچی زکوٰۃ ہے۔

(مؤطاء امام مالک باب ما جاء فی صدقۃ البقرۃ)

یاد رہے کہ بعض مسائل احتیاط کے لحاظ سے دو جہتوں والے ہوتے ہیں اور عمل احتیاط پر کرنا پڑتا ہے اُمّ المؤمنین سودہ رضہ کے والد زمعہ کی لونڈی سے زمانہ جاہلیت میں عتبہ بن ابی وقاص نے زنا کیا۔ لڑکا پیدا ہوا جو اپنی والدہ کے پاس پرورش پاتا رہا۔ زانی مرگیا۔ اور اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص کو وصیت کر گیا کہ زمعہ کی لونڈی کا لڑکا میرا ہے اس کو اپنے قبضہ میں کر لینا۔ فتح مکہ کے موقع پر سعد بن ابی وقاص نے اس لڑکے کو پکڑ لیا اور کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔

زمعہ کے بیٹے نے کہا یہ میرے باپ کا بیٹا ہے۔ لہٰذا میرا بھائی ہے۔ اس کو میں لُوں گا۔
مقدمہ دربارِ نبوی میں پیش ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الولد للفراش وللعاهر الحجر (مشکوٰۃ باب اللعان فصل اول)

یعنی اولاد بیوی والے کی ہے اور زانی کے لئے پتھر ہیں (یعنی وہ ناکام ہے اور اس کا حکم سنگسار کیا جاتا ہے۔

بچہ سودہ کے بھائی کے حوالہ کر دیا جو حضرت سودہ رضؓ کا بھی بھائی بن گیا۔ لیکن سوؓدہ کو حکم فرمایا اس سے پردہ کرے۔ کیونکہ اس کی شکل و صورت زانی سے ملتی جلتی تھی جس سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ زانی کے نطفہ سے ہے اس مسئلہ میں شکل و صورت کے لحاظ سے تو پردہ کا حکم ہوا اور جس کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس کے لحاظ سے اس کا بیٹا بنا دیا۔ گویا احتیاط کی جانب کو ملحوظ رکھا۔ ایسا ہی بھینس کا معاملہ ہے اس میں بھی دونوں جہتوں میں احتیاط پر عمل ہوگا۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں احتیاط ہے اور قربانی نہ کرنے میں احتیاط ہے اس بنا پر بھینسے کی قربانی جائز نہیں اور بعض نے جو یہ لکھا ہے کہ الجاموس نوع من البقر (یعنی بھینس گائے کی قسم ہے یہ بھی اسی زکوٰۃ کے لحاظ سے صحیح ہو سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بھینس دوسری جنس ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۴ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ - ۱۷ اپریل ۱۹۶۴ء

قربانی سے پہلے جانور کی اُون اتاری جائے تو اس کے استعمال کی صورت

سوال:۔ قربانی کے جانور کی اُون اتار کر اپنے استعمال میں لا سکتا ہے یا اس کا خیرات کرنا ضروری ہے

مولوی عبدالرحمٰن چک نمبر ۳۰ ڈاکخانہ جمیس آباد ضلع تھرپارکر (سندھ)

جواب:۔ قربانی کی کوئی چیز قربانی سے پہلے استعمال نہیں کر سکتا۔ اُون اولاً تو پہلے اتارنی نہیں چاہیئے اگر کسی مجبوری کی بنا پر اتاری جائے تو خیرات کر دے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو قربانی مکہ نہ پہنچ سکے اور راستہ میں رہ جائے تو اس کو ذبح کر کے مسکینوں کے حوالہ کر دے نہ خود کھائے اور نہ اس کے ساتھی کھائیں۔
اس حدیث سے معلوم ہوا قربانی وقت سے پہلے قربانی کی کوئی چیز ذاتی ضرورت میں استعمال نہیں کر سکتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۴ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ ۱۷ اپریل ۱۹۶۴ء

قربانی کا جانور خرید کر خریدار کا اس میں اپنا حصہ رکھنا

سوال :- ایک شخص بیس روپے سے قربانی کے لئے جانور خرید کر لایا۔ اس میں ایک حصہ اپنا رکھ لیا اور باقی چھ حصہ بقیمت تیس روپے باقی چھ حصہ داران کے پاس فروخت کر دیئے۔ اپنی قربانی بھی کر لی۔ اور فائدہ دنیاوی بھی اٹھا لیا یہ جائز ہے یا نہیں۔

جواب :- قربانی نام ہے اللہ تعالےٰ کے لئے خون بہانے اور جان دینے کا اور یہ شے واحد ہے اس کے حصے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ ایک شخص کی نیّت گوشت کی ہو اور چھ شخصوں کی نیّت قربانی کی ہو تو کسی کی قربانی نہیں ہوگی۔ کیونکہ خون بہانے اور جان دینے کی تقسیم نہیں ہو سکتی محض اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے خلاف قیاس ایک شئے کو سات کے قائم مقام کر دیا ہے۔ اور جو بات خلاف قیاس ہوتی ہے وہ اپنے محل پر بند رہتی ہے۔ اب جو شخص قربانی کا جانور خریدتا ہے اگر خریدنے کے وقت اس کی نیّت اس میں حصہ رکھنے کی نہ تھی بلکہ خیال تھا کہ یہ سارا جانور منافع پر فروخت کر دوں گا پھر اس کی قیمت پڑ گئی مثلاً بیس روپیہ کو خریدا تھا۔ تیس روپیہ قیمت پڑی چھ یا سات حصے پورے ہو گئے۔ ابھی مجلس سے جدا نہیں ہوئے کہ اس کا خیال ہوا کہ ایک حصہ میں رکھ لوں یہ تو ایسا ہی ہے جیسے سات شخص ایک جانور خرید کر قربانی کریں یا ایک شخص کے گھر کا جانور تھا اس میں ایک حصہ اپنا رکھ لیا اور اگر خریدنے کے وقت یا خریدنے کے بعد سودا ہونے سے پہلے اس کی نیت اس جانور میں حصہ رکھنے کی ہو گئی تو اس کے حصہ پر منافع نہ ہوا۔ اور چھ حصوں پر منافع ہوا تو یہ تقسیم کی صورت پیدا ہو گئی اس لئے یہ درست نہ ہوگی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالےٰ خالص عمل کو قبول کرتا ہے۔ اس شخص کی نیّت میں خلوص نہیں کیونکہ پہلے سے اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میرے حصے کے ٹکے مجھ پر نہ پڑیں دوسروں سے وصول کروں۔ گویا ظاہر باقی حصوں پر منافع لگاتا ہے اور درحقیقت اپنا فروخت کرتا ہے۔ پس ایسے شخص کے عمل میں خلل آگیا۔ اس لئے ناجائز ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

یکم ربیع الاول سنہ ۱۳۵۳ھ - ۱۴ جون سنہ ۱۹۳۴ء

امام سے پہلے قربانی کرنا

سوال :۔ مصفیٰ شرح موطا میں ہے لایضحی قبل انصراف الامام ۔ یعنی امام کے لوٹنے سے پہلے قربانی نہ کرو۔ اس میں حدیث ہے کہ ابا بردہ رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی قربانی سے پہلے اپنی قربانی کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو دوبارہ قربانی کرنے کا حکم دیا۔ عون المعبود میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ امام کی قربانی سے پہلے قربانی کی جائے تو ہوتی ہے یا نہیں۔ فیض الباری میں ہے کہ امام مالکؒ کا قول ہے کہ امام سے پہلے قربانی نہیں ہوتی۔ اور باقی اُمت کا اجماع ہے کہ اگر عید کے بعد قربانی کی جائے تو منظور ہو جاتی ہے۔ امام نے قربانی کی ہو یا نہ کی ہو۔ غرض یہ ہے کہ جب یہ حدیث موجود ہے تو پھر یہ اختلاف کیوں ہوا۔ اور اس میں سے معتبر کونسی بات ہے۔

جواب :۔ ابو بردہ والی روایت کئی کتابوں میں آئی ہے اس کے اکثر الفاظ اسی طرح نقل کئے ہیں کہ اُس نے نماز عید سے پہلے قربانی کرلی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو نماز عید کے بعد اور قربانی کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اور پہلی کی بابت فرمایا کہ یہ گوشت کی بکری ہے قربانی نہیں لیکن چونکہ نماز عید امام کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نماز عید کے بعد متصل مصلی عید ہی میں قربانی کر دیا کرتے تھے (خواہ تعلیم کے لئے کی ہو یا مصلی عید میں کرنی سنّت ہو) اس بنا پر بعض روایتوں نے ابو بردہؓ کے نماز سے پہلے قربانی کرنے کو یوں بیان کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے قربانی کی۔ اور اس سے بعض علماء کو دھوکا ہو گیا کہ امام سے پہلے قربانی نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ ابو بردہ رضؓ کی سب روایتوں ملا کر مطلب بنایا جائے تو کوئی اختلاف نہیں رہتا اور مطلب صاف ہے کہ نماز سے پہلے قربانی نہیں ہوتی بعد کرنی چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

یکم ربیع الاوّل ۱۳۵۳ھ ۔ ۱۴ جون ۱۹۳۴ء

قربانی کے جانور کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اُس کی قربانی کا مسئلہ

سوال :۔ ایک شخص نے قربانی کا جانور خرید رکھا ہے۔ سال بھر پہلے اس کی تقدیراً ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کی قربانی جائز ہے نہیں؟

جواب:۔ لنگڑے کی قربانی سے حدیث میں ممانعت آئی ہے۔ اس لئے جائز نہیں۔ ہاں قربانی کے وقت کو پہنچ کر لنگڑا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔ ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ یعنی اپنے سر نہ منڈاؤ یہاں تک کہ قربانی اپنے حلال ہونے کی جگہ یا حلال ہونے کے وقت کو پہنچ جائے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی جب حلال ہونے کے وقت کو پہنچ جائے تو وہ ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا وہ ہو ہی گئی۔ اگرچہ دیدہ دانستہ قربانی ذبح ہونے سے پہلے سر منڈانا جائز نہیں لیکن کوئی غلطی سے منڈا لے تو قربانی میں خلل نہیں آتا۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب الحلق صفحہ ۲۳۲ میں صراحۃً آیا ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ قربانی وقت کو پہنچ کر کی ہوئی کے شمار میں ہے۔ پس ایسی حالت میں اس میں کوئی عیب پیدا ہو جائے تو اس کا کوئی حرج نہیں مثلاً عید پڑھنے کے بعد سینگ یا ٹانگ ٹوٹ جائے یا آنکھ پھوٹ جائے تو یہ قربانی کو مضر نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ذبح کے وقت گرانے سے یا دبانے سے کوئی نقصان پہنچ جائے۔

بعض کا خیال ہے کہ جب جانور قربانی کے لئے نامزد ہو جائے تو پھر عیب پیدا ہونے کا کوئی حرج نہیں۔ لیکن اول تو اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ دوم لازم آتا ہے کہ زیادہ بیمار ہو کر ذبح تک نوبت پہنچ جائے تو قربانی ہو جائے حالانکہ وقت سے پہلے قربانی کا کوئی بھی قائل نہیں نیز جو لوگ حج کو قربانیاں ساتھ لے جاتے ہیں اگر کوئی قربانی رستہ میں رہ جائے تو اس کو ذبح کر کے لوگوں کے لئے یعنی مساکین کے لئے چھوڑ دے اور یہ اس کے رفقاء سے کوئی نہ کھائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وقت سے پہلے قربانی نہیں بلکہ صدقہ ہے اگر قربانی ہوتی تو نہ مساکین کے لئے خاص ہوتی اور نہ اس کو اور اس کے رفقاء کو رکاوٹ ہوتی یہی وجہ ہے کہ اگر ضروری قربانی ہو تو اس کے عوض اس کو اور کرنی پڑتی ہے۔ اگر نفلی ہو تو پھر وہی کافی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے۔ کیونکہ نفلی محض زیادہ ثواب حاصل کرنے کی خاطر کی جاتی ہے۔ سو ثواب خدا تعالےٰ دے دیتا ہے جیسے رمضان میں عمرہ کرنے سے حج کا ثواب مل جاتا ہے مگر حج کا فرض ادا نہیں ہوتا۔ اس طرح وقت سے پہلے قربانی کا ثواب مل جاتا ہے قربانی نہیں ہوتی۔

نیز بہت لوگ چھوٹی عمر کا جانور لے کر قربانی کے لئے نامزد کر دیتے ہیں تو کیا باوجود چھوٹی عمر کے وہ قربانی سمجھ لیا جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ پس صحیح یہ ہے کہ وقت سے پہلے قربانی نہیں ہوتی اور جب قربانی نہ ہوئی تو اس میں جو عیب پیدا ہوا وہ قربانی بننے سے پہلے پیدا ہوا۔ پس وہ ایسا ہو گیا جیسے قربانی خریدنے سے پہلے عیب ہو۔

اگر کہا جائے کہ جانور قربانی کے لئے نامزد کرنے سے قربانی نہیں بنتا تو پھر نامزد کرنے کے بعد اپنے کسی

اور مصرف میں اس کا استعمال جائز ہونا چاہیئے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نامزد کرنے کے بعد یہ جانور معلق ہو جاتا ہے۔ اگر قربانی تک پہنچ گیا تو قربانی بن گیا۔ اگر ورے اس کے دن پورے ہوگئے تو صدقہ بن گیا جیسے ابھی حدیث سے معلوم ہوا۔ اس لئے اس کو اپنے کسی اور مصرف میں نہیں لاسکتا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۰ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ ۴ مارچ ۱۹۳۶ء

قربانی کے جانور میں کان اور سینگ کی شرط

سوال: ۔ حدیث میں ہے قربانی کے جانور کے کان، سینگ صحیح سالم ہوں لیکن بعض علماء کہتے ہیں کان آدھے سے کم کٹا ہو یا سینگ آدھے سے کم ٹوٹا ہو تو قربانی میں کوئی حرج نہیں۔ کیا یہ کہنا صحیح ہے۔

شیخ محمد یعقوب نیو کلاتھ مارکیٹ لائل پور

جواب: ۔ ہاں صحیح ہے حضرت علیؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعضب القرن والاذن۔ جانور قربانی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے سعید بن مسیبؒ سے اس کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے فرمایا اعضب سے مراد نصف یا نصف سے زیادہ کان کٹا یا سینگ ٹوٹا ہے۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس جانور کا آدھا یا آدھے سے زیادہ سینگ ٹوٹا یا کان کٹا ہو وہ قربانی کرنا منع ہے۔ آدھے سے کم ہو تو پھر گنجائش ہے لیکن حکم کٹے ہوئے کان کا ہے اگر کان چرا ہوا ہو یا اس میں سوراخ ہو تو پچھ کان کے خواہ کسی حصہ میں ہو۔ ایسا جانور ذبح کرنا شبہ سے خالی نہیں۔ اس لئے اس میں احتیاط چاہیئے۔ بہتر یہی ہے کہ بالکل صحیح سالم اور باشرائط ہو تاکہ قربانی ایسا عمل شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ تھن مراسدم کٹی۔ دانت ٹوٹا یا پیٹھ ایک طرف جھکی ہو تو کوئی حرج نہیں۔

نوٹ:۔ سینگ کا خول (ٹوپی) اُتر جائے تو جائز نہیں۔ کیونکہ ٹوپی سینگ پر ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ٹوٹے ہوئے کے حکم میں ہوگا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۸ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ۔ یکم مئی ۱۹۶۲ء

قربانی کے دنوں میں عورت کنگھی کر سکتی ہے

سوال:۔ قربانی کے دنوں میں عورت کنگھی کرے یا نہ؟

جواب:۔ حدیث میں ہے کہ جس شخص کی نیت قربانی کی ہو وہ حجامت نہ کرائے (خواہ مرد ہو یا عورت) اور ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص قربانی نہ کر سکے وہ بھی حجامت نہ کرائے اس کو بھی قربانی کا ثواب ملے گا۔ کنگھی کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں کنگھی میں تھوڑے بہت بال اکھڑتے ہیں۔ اس لئے احتیاط بہتر ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۹ محرم ۱۳۶۰ھ ۶ فروری ۱۹۴۱ء

قربانی کا جانور عید سے پہلے مر جائے یا ذبح کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال:۔ اگر قربانی کا جانور یوم النحر سے ایک دن پہلے بقضاء الٰہی مر جائے یا مرتے ہوئے کو ذبح کر لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ شریف قربانیاں بھیجیں۔ اور جس کے ساتھ بھیجیں اس کو کہا کہ جو ان سے رہ جائے اُسے ذبح کر کے چھوڑ دے۔ تو اور تیرے ساتھیوں سے کوئی نہ کھائے (مشکوٰۃ باب الہدی) اس حدیث کی شرح میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ صدقہ ہے اس لئے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو منع کیا ہے مطلب آپؐ کا یہ تھا کہ اس کو مساکین کے حوالہ کر دو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کا جانور وقت سے پہلے مساکین کا حق ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید سے فارغ ہوتے ہی قربانیوں کا گوشت دیکھا تو فرمایا جس نے نمازِ عید سے پہلے ذبح کیا ہے وہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے (مشکوٰۃ)

اس سے معلوم ہوا کہ جس کا قربانی کا جانور عید سے پہلے مر جائے یا مرتے وقت ذبح کر لیا جائے اس کو نئی قربانی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ قربانی عید کے بعد ہوتی ہے پہلے نہیں ہوتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۴ صفر ۱۳۵۷ھ ۱۵ اپریل ۱۹۳۸ء

قربانی پہلے دن افضل ہے یا سارے دن برابر ہیں

سوال :۔ قربانی پہلے دن کرنی افضل ہے لیکن اگر قربانی موجود ہو تو اس خیال سے دوسرے تیسرے یا چوتھے دن قربانی کرے کہ اگر میں نے آج ہی قربانی کر دی تو گوشت خراب ہو جائے گا کیونکہ پہلے دن بہت لوگ قربانی کرتے ہیں۔ گوشت لینے کوئی نہیں آتا۔ قربانی باری باری کریں تاکہ گوشت کام آجائے مثال کے طور پر ایک گاؤں میں اٹھارہ قربانیاں ہیں اور ایک ہی دن قربانی کریں تو لوگوں سے گوشت کھایا نہیں جاسکتا۔ اگر روزانہ چار چار یا پانچ پانچ کرتے رہیں تو گوشت کئی دن کھایا جاسکتا ہے۔ اب جو گوشت کی نیت سے دوسرے تیسرے یا چوتھے روز قربانی کرے گا کیا اس کو افضلیت کا درجہ ملے گا یا نہیں یا قربانی پہلے ہی دن افضل ہے گوشت خراب ہو یا نہ۔ مولوی محمد ادریس چک ۱۸۱ خلیل پورہ براستہ پکا انا۔

جواب :۔ قربانی پہلے دن افضل ہے باقی دنوں میں جائز ہے۔ اگر جواز کے ساتھ کوئی اور چیز مل جائے تو باقی دنوں میں بھی افضل ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ نیت ہو کہ گوشت غریبوں میں تقسیم کیا جائے تاکہ ان کی کئی دن گذر اوقات ہو جائے یا تیرہ تاریخ کو قربانی اس نیت سے کرے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تیرہ تاریخ کو بھی قربانی صحیح ہے تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے دنوں میں بھی وہی فضیلت ہو جو پہلے دن میں ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جائز پر عمل کرنے میں بھی فرض واجب کا ثواب ملتا تھا کیونکہ آپؐ کے ذمہ تبلیغ ہے جو قول سے بھی ہوتی ہے اور فعل سے بھی ہوتی ہے۔ تبلیغ کی فضیلت مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ثواب فرض واجب کے برابر ہو جاتا تھا۔ اس اصول سے قربانی کے باقی دن پہلے دن کے برابر ہو سکتے ہیں پس صورت مسئولہ کو اس طرح سمجھ لیں۔ اور اگر محض اپنا ہی مفاد پیش نظر ہو تو انما الاعمال بالنّیات کی بنا پر باقی دنوں میں قربانی جائز تو ہو سکتی ہے مگر افضل نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ اہلحدیث چوک دالگراں لاہور ۴ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ۔ ۱۷ اپریل ۱۹۶۴ء

قربانی کے دن

سوال :۔ کتنے دن قربانی ہو سکتی ہے۔ با دلائل بیان فرمائیں۔

جواب :۔ قربانی دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ تیرہ چار دن ہیں۔ منتقی میں ہے

عن سلیمان بن موسیٰ عن جبیر بن مطعم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

كل ايام التشريق ذبح رواه احمد وهو للدارقطني من حديث سليمان بن موسىٰ عن عمرو بن دينار وعن نافع بن جبير عن جبير عن النبي صلى الله عليه وسلم نحوه۔

یعنی سلیمان بن موسیٰ نے جبیر بن مطعمؓ سے روایت کی ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تمام کے تمام تشریق کے دن قربانی کے ہیں۔ اور یہ حدیث دارقطنی میں سلیمان بن موسیٰ نے عمرو بن دینار سے اور نافع بن جبیر سے انہوں نے جبیر سے۔ اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی حدیث بیان کی ہے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ایام تشریق قربانی کے دن ہیں۔ اور عید کے دن کے علاوہ گیارہ۔ بارہ۔ تیرہ تین دن ہیں تو گویا قربانی تیرہ تاریخ تک جائز ہے۔ اس حدیث کے متعلق خیر المدارس کے مفتی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے۔ اور اس کے ثبوت میں بحوالہ نیل الاوطار علامہ ابن قیم کی عبارت نقل کی ہے۔ لا يثبت وصله۔ یعنی اس حدیث کا موصول ہونا ثابت نہیں۔ مگر مفتی صاحب نے یہاں خیانت کی ہے۔ ابن قیم کی جرح تو نقل کر دی مگر اس کا جواب نقل نہیں کیا امام شوکانی نے لکھا ہے

ويجاب عنه بان ابن حبان وصله وذكر في صحيحه كما سلف

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن حبان نے اس حدیث کو موصول ذکر کیا ہے اور اپنی صحیح میں اس کو روایت کیا ہے اس کے علاوہ ابن القیم نے زاد المعاد جلد اول میں تیرھویں تاریخ کو قربانی کے جواز کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ حدیث ادخار (جس میں تین دن سے زیادہ گوشت کا ذخیرہ کرنا منع تھا) سے تیرھویں تاریخ کو ذخیرہ کرنا ثابت ہو گیا تو تیرھویں کو قربانی کی ممانعت بھی نہ رہی۔

اور حضرت علی رضہ کا یہ قول بھی اس کا موید ہے کہ قربانی کے دن عید کا دن ہے اور تین دن اس کے بعد ہیں حسن بصری رح۔ عطاء بن ابی رباح۔ امام اوزاعی۔ امام شافعی رح کا بھی یہی مذہب ہے۔

خلاصہ یہ کہ جبیر بن مطعم کی حدیث قابل عمل ہے۔ خاص کر جب اس کے راوی ابن جریج بھی ہیں جو نہایت ثقہ ہیں۔ اور ابن قیم نے لکھا ہے کہ منیٰ کے دنوں میں قربانی کا مسئلہ دو مختلف سندوں سے مروی ہے۔ جو ایک دوسری کو تقویت دیتی ہیں۔ ایک جبیر بن مطعم کی روایت ہے اور دوسری اسامہ بن زید کی روایت ہے جو بواسطہ عطاء جابر سے روایت کرتے ہیں تو گویا جبیر بن مطعم کی حدیث کو جابر رضہ کی حدیث سے بھی تقویت پہنچ گئی پس یہ مسئلہ

پتہ ہو گیا کہ تیرھویں تک قربانی جائز ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۰ ذیقعدہ ۱۳۸۳ھ ۱۰ اپریل ۱۹۶۴ء

چرم قربانی مساجد کی تعمیر اور فرش میں لگ سکتے ہیں

سوال: ۔ چرم قربانی کی قیمت اگر مساجد کی تعمیر و فرش وغیرہ میں لگائی جائے تو یہ درست ہے یا نہیں۔

عبدالحمید جابالی دار العلوم عربیہ شکراوہ ڈاکخانہ پنگواں ضلع گوڑگانواں

جواب: ۔ قربانی کے چمڑے مساجد کی تعمیر وغیرہ میں نہیں لگ سکتے کیونکہ قربانی کے چمڑے قربانی کے گوشت کا حکم رکھتے ہیں۔ اور ایک حدیث میں ہے۔ من باع جلد اضحیتہ فلا اضحیۃ لہ (ترغیب ترہیب ۱۸۹) جس نے قربانی کا چمڑہ فروخت کیا اس کی قربانی نہیں۔ پس جیسے گوشت فروخت کر کے اس کی قیمت مسجد وغیرہ میں نہیں لگ سکتی۔ یہی حکم قربانی کے چمڑے کا ہے۔ ہاں قربانی کا گوشت اور اس کا چمڑہ صدقہ کرنا ثابت ہے چنانچہ مشکوٰۃ وغیرہ میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضہ کو گوشت اور چمڑے جھولیں وغیرہ کے صدقہ کرنے کا امر فرمایا۔ اب جس پر صدقہ کیا ہے وہ جو مرضی ہو کرے۔ خود کھائے۔ بیچے یا کسی اور استعمال میں لائے۔ اگر یہ فروخت کر کے قیمت مسجد میں دینا چاہے تو اس کا کوئی حرج نہیں کیونکہ جس پر صدقہ ہو وہ اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے اور اس کا حکم پہلا نہیں رہتا بلکہ بدل جاتا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں بریرہؓ کی حدیث ہے جو گوشت بریرہ رضہ پر صدقہ ہوا تھا اس کی نسبت آپؐ نے فرمایا کہ یہ بریرہؓ پر صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے گویا جس پر صدقہ ہوا۔ اس کی ملک میں آنے کے بعد اس کا حکم صدقہ کا نہیں رہتا۔ ٹھیک اس طرح قربانی کو سمجھ لینا چاہیئے قربانی وہیں تک قربانی ہے جب تک صدقہ نہیں کی۔ جب صدقہ کر دی تو اب اس کا حکم وہی صدقہ والا ہے یعنی جیسے صدقہ مسکین کی ملک میں ہو جاتا ہے۔ اور وہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے خواہ کھائے یا بیچے صدقہ کی طرح قربانی کا حکم ہے ——— خلاصہ یہ کہ صاحب قربانی کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں مسکین جو مرضی ہے کرے اگر اتفاقیہ صاحب قربانی نے قربانی کا چمڑہ فروخت کر لیا ہو تو اس کی قیمت اس کو کھانی جائز نہیں۔ جیسے قربانی کا گوشت فروخت کر کے پیسے کھانے جائز نہیں کیونکہ اس میں قربانی کی بے حرمتی ہے اور اس صورت میں قربانی قربانی نہیں رہتی بلکہ قصائی کی بکری کی طرح گوشت کی بکری بن جاتی ہے۔ اور نہ یہ پیسے مسجد پر لگ سکتے ہیں۔ کیونکہ مسجد میں بھی اس کا حق برابر کا ہے تو گویا وہ پیسے پھر اس کے استعمال میں آئے۔ پس سوا اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو صدقہ کرے ہاں اگر چمڑا قربانی فروخت کئے بغیر مسجد میں استعمال کر لیا جائے جیسے مسجد کے کوئیں کا ڈول بنا لیا جائے یا نماز

کے لئے مصلی بنالے تو اس کا کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے گوشت خود کھاتا ہے اور کھلاتا ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۳ جمادی الاول ۵۷ھ ۲۲ جولائی ۱۹۳۸ء

قربانی کا جانور بلا وجہ فروخت کرنا

سوال: دو بکریاں قربانی کی نیت سے لائی جائیں۔ ایک قربانی کر دی جائے۔ اور دوسری بلا کسی عیب کے ارادۃً واپس کر دی جائے۔ اس کی قربانی نہ کی جائے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ یا اگر اس جانور کی قیمت کے برابر رقم کسی مدرسہ، مسجد، یتیم خانہ وغیرہ کار خیر میں دے دی جائے تو کیا قربانی کے حق سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ اور اس کا ثواب قربانی کے ثواب کے برابر ہو سکتا ہے؟ (منشی یوسف اینڈ سنز برہان پوری پی)

جواب: حدیث میں ہے۔

عن حکیم بن حزام ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معه بدینار لیشتری له به اضحیة فاشتری کبشا بدینار وباعه بدینارین فرجع فاشتری اضحیة بدینار فجاء بها وبالدینار الذی استفضل من الاخری فتصدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالدینار فدعا له ان یبارک له فی تجارته۔ رواہ الترمذی وابوداؤد (مشکوٰۃ باب الشرکة)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم بن حزام کو قربانی خریدنے کے لئے ایک دینار دے کر بھیجا۔ اس نے ایک دینار سے ایک دنبہ خرید کر اُس کو دو دینار سے فروخت کر دیا پھر ایک دینار سے ایک دنبہ خرید لیا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دینار اور ایک دنبہ لے کر آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینار صدقہ کر دیا اور اس کے لئے تجارت میں برکت کی دعا کی۔

منافع کا یہ دینار آپ ﷺ نے اس لئے صدقہ کر دیا کہ یہ اُس قربانی کے دینار سے حاصل ہوا تھا۔ جس کے قربانی میں صرف کرنے کی نیت کر چکے تھے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ جس شے کی نیت للہ ہو جائے وہ گھر میں صرف نہیں ہو سکتی۔ قربانی کا وقت چونکہ گذر گیا اب ویسے صدقہ کر دے اور اپنی کوتاہی کی بابت خدا سے معافی مانگے۔ مشکوٰۃ باب الہدی میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ قربانیاں دے کر ایک شخص کو مکہ معظمہ بھیجا۔ اس شخص نے کہا یا رسول اللہ جو جانور راستہ میں رہ جائے اُس کو کیا کروں؟ فرمایا ذبح کر کے اس کی نعلین خون میں رنگ کر اسکے۔ منہ کے

ایک طرف ڈال دے (تاکہ لوگ قربانی سمجھ کر کھالیں) تو اور تیرے ساتھیوں سے کوئی نہ کھائے۔ چونکہ یہ جانور قربانی کے لئے متعیّن ہو چکا تھا۔ اس لئے نہیں کہا کہ فروخت ہو سکے تو فروخت کردے ورنہ ذبح کردیں جو جانور قربانی کے لئے متعین ہو جائے وہ فروخت نہ کرنا چاہیئے اور یہ بات ظاہر ہے کہ قربانی سے پہلا وقت اور بعد کا وقت اس بات میں یکساں ہے کہ دونوں قربانی کے وقت نہیں۔ پس جیسے قربانی کے وقت سے پہلے جانور کو ذبح کرکے لوگوں کے لئے چھوڑ دینے کا حکم ہے خود یا اس کے ساتھی نہیں کھا سکتے۔ اسی طرح بعد کو کرنا چاہیئے جانور ذبح کرکے لوگوں میں تقسیم کردے، نہ خود کھائے، نہ اپنے دوستوں کو کھلائے۔ اگر قربانی کا جانور غلطی سے فروخت کرلیا ہے تو اس کے پیسے صدقہ کردے۔ عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ ۱۲ محرم ۱۳۵۶ھ

باپ کو قربانی کی کھال دینا

سوال:۔ ایک شخص کا باپ محتاج وغریب ہے۔ وہ شخص قربانی کی کھال اپنے باپ کو دیتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب:۔ باپ کو صدقہ کے طور پر تو نہیں دے سکتا۔ کیونکہ باپ اگر تنگ ہے تو اس کا خرچ بیٹے کے ذمہ ہے۔ ہاں ہدیہ کے طور پر باپ کو دے سکتا ہے۔ اور اس کے لئے غریب ہونے کی شرط نہیں

عبداللہ امرتسری روپڑی

غیر مذاہب والے کو قربانی کا گوشت دینا

سوال:۔ قربانی کا گوشت غیر مذاہب کے فقیر لوگ مانگنے آتے ہیں۔ ان کو قربانی کا گوشت دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ قربانی کا گوشت غیر مذاہب والے کو سوال کی صورت میں دے سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے واما السائل فلا تنھر (سائل کو جھڑک) اگر سوال نہ کرے تو ویسا دینا اچھا نہیں۔ حدیث میں ہے لدیا کل طعامك الا تقی (مشکوۃ) یعنی تیرا کھانا پرہیزگار ہی کھائے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۹ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ ۲۰ مئی ۱۹۳۸ء

امام مسجد کو قربانی کی کھالیں دینا

سوال:۔ امام مسجد کو قربانی کی کھالیں دینا جائز ہے یا نہیں۔ باقر کھوکھر دادو طور چک ۴۲۷

جواب :۔ امام اگر مسکین ہو تو اس حیثیت سے چمڑہ قربانی ۔عشر وغیرہ اس کو لگ سکتا ہے اگر عوض سمجھ کر دیا جائے تو نہیں لگ سکتا ۔مثلاً دوسری جگہ دینے سے اُس کے امامت چھوڑ دینے کا خطرہ ہو۔ اگر اس وجہ سے اُس کو دیا جائے تو وہ امامت کا عوض ہے ۔پس اس امامت میں نہ دینا چاہیئے ۔خواہ مسکین ہی ہو کیونکہ چمڑے قربانی کا فروخت کرنا یا کسی شئے کے عوض دینا منع ہے ۔

ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

من باع جلد الاضحية فلا اضحية له رواه البيهقى ر رحمة المهداة فصل دبع مشكوة باب الهدى)

یعنی جو قربانی کا چمڑہ فروخت کرے اس کی قربانی نہیں ہوتی ۔

اور مشکوٰۃ کے اس باب میں ہے ۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں قربانیوں کے گوشت ان کے چمڑے جھولیں سب صدقہ کردوں ۔اور قصاب کو ان میں سے کچھ نہ دوں ۔فرمایا ہم ان کو اپنے پاس سے دیں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کا گوشت چمڑہ کسی شئے کی اُجرت میں نہ دینا چاہیئے اور امامت کے عوض تو کوئی اور شئے بھی لینی دینی جائز نہیں تو قربانی کے چمڑے وغیرہ امامت کے عوض لینے دینے دو وجہوں سے نا جائز ہوئے ۔

ایک اس وجہ سے کہ امامت کے عوض کچھ لینا دینا درست نہیں ۔دوم قربانی کے چمڑے وغیرہ ۔کسی چیز کا عوض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔پس اب امام کو چمڑے وغیرہ دینے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی کہ جیسے عام مسکینوں کو دئے جاتے ہیں اس طرح اس کو دے سکتے ہیں ۔اس کی کوئی خصوصیت نہیں ہونی چاہیئے ۔مثلاً اگر وہ امام ہو تو اس کو دیا جائے اگر امام نہ ہو تو اس کو نہ دیا جائے ۔اس قسم کا دینا عوض شمار ہوتا ہے ۔اس طرح اگر یہ خیال ہو کہ نہ دیا تو امامت چھوڑ دے گا یا ناراض ہوجائے گا ۔تو اس حالت میں دینا بھی عوض ہے ۔غرض حتی الوسع اس معاملہ میں احتیاط برتنی چاہیئے ۔ایسا نہ ہو کہ قربانی ہی ضائع ہو جائے ہاں ایک صورت جواز کی نکل سکتی ہے وہ یہ کہ امام بچے بھی پڑھائے اور گاؤں میں بیت المال ہو جس میں عشر زکوٰۃ چمڑے قربانی کے اور دیگر صدقات وخیرات جمع ہوتے ہوں اور اس بیت المال سے تعلیم پر نہ امامت پر اس کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی جائے تو اس طریق سے لینا شرعاً درست ہے کیونکہ یہ اُجرت تعلیم ہے

کو اُجرت امامت۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ
۱۴ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ ۵ مئی ۱۹۳۹ء

قربانی کے گوشت کی تقسیم

سوال:۔ قربانی کے گوشت کی تقسیم کا کیا حکم ہے چونکہ ہماری طرف یہ رواج ہے کہ گوشت کے تین حصے کر کے دو حصے صاحب قربانی کو دیا جاتا ہے اور ایک حصہ سردار اپنے پاس رکھتا ہے۔ بایں کیف جب کل بستی والے کا جمع ہو جاتا ہے۔ تب سردار جمع شدہ گوشت کو بستی کے امراء و غرباء پر برابر تقسیم کرتا ہے اب ایک شخص کہتا ہے کہ یہ تقسیم کی صورت جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر اور حدیث کلوا وتصدقوا وادخروا یعنی کھاؤ صدقہ کرو اور جمع کرو سے تین حصے کرنا ثابت ہو۔ مگر صورتِ مذکورہ اس کے خلاف ہے کیونکہ جمع شدہ حصہ کو اگر تم نے صدقہ کیا تو پھر واپس کیوں کیا۔ اگر صدقہ نہیں کیا تو حدیث کے خلاف ہے۔

جواب:۔ اس طرح تقسیم کرنے کا کوئی ثبوت نہیں اس کو ہمیشہ کے لئے مقرر کر لینا جیسے ایک شرعی حکم ہوتا ہے۔ بدعت ہے اور اپنا دیا ہوا واپس لینا صدقہ کی صورت میں حرام ہے۔ اور بقیہ صدقہ کے سردار کو کوئی حق نہیں کہ لے۔ کیونکہ وہ بیت المال کے متولی ہونے کی حیثیت سے لیتا ہے اور بیت المال اس مجموعہ کا نام ہے جو شرعی طور پر لیا جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی
۱۲ محرم ۱۳۵۶ھ۔ ۲۶ مارچ ۱۹۳۷ء

قربانی کے چمڑے صدقہ کرنا

سوال:۔ قربانی کے چمڑے صدقہ کئے جائیں یا فروخت کئے جائیں۔؟

جواب:۔ منتقی میں حضرت عائشہ سے حدیث ہے وہ فرماتی ہیں۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر کچھ لوگ باہر سے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو فرمایا۔ تین دن سے زیادہ قربانیوں کا گوشت ذخیرہ نہ کرو۔ تین دن کے بعد باقی صدقہ کر دو۔ جب دوسرا سال آیا تو لوگوں نے کہا۔ یا رسول اللہ ہم قربانیوں کی کھالوں

سے مشکیں بناتے، ان میں چربی پگھلا کر ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اس کہنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ لوگوں نے کہا۔ آپ نے تین دن سے زیادہ قربانیوں کا گوشت کھانے کی ممانعت کر دی ہے۔ فرمایا لوگ باہر سے آئے تھے۔ ان کی خاطر میں نے یہ حکم دیا تھا۔ اب بے شک تین دن سے زیادہ کھاؤ۔ ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو۔

نیز منتقی میں قتادہ بن نعمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور فرمایا میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ تین دن سے زیادہ قربانیوں کا گوشت نہ کھاؤ تاکہ تم سب کو پہنچ جائے اور اب میں تمہارے لئے تین دن سے زیادہ حلال کرتا ہوں پس جب تک چاہو کھاؤ اور صدقہ کرو اور ان کے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور فروخت نہ کرو۔ اور اگر دوسرا کوئی تمہیں قربانی کا گوشت کھلائے تو جیسے چاہو کھاؤ کم یا زیادہ ہر طرح سے اجازت ہے۔

پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کے گوشت اور چمڑے کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زیادہ گوشت قربانی سے منع فرمایا تو صحابہؓ نے چمڑوں کی مشکیں بنانی بھی ترک کر دیں اگر قربانی کا چمڑہ گوشت کا حکم نہ رکھتا تو وہ مشکیں بنانی ترک نہ کرتے جیسے گوشت سے نہی ہے۔ چمڑے سے نہی ہے۔ اس طرح گوشت کے صدقہ کا ارشاد چمڑے کے صدقہ کا ارشاد ہے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ جس کو صدقہ دیا ہے وہ فروخت کرے گا تو جواب یہ ہے کہ کوئی حرج نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں بطور ہدی (قربانیاں) دی تھیں ان کے چمڑے وغیرہ صدقہ کر دیئے تھے۔ چنانچہ دوسری حدیث میں ہے۔ کہ چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور ان کو فروخت نہ کرو۔ اور چونکہ چمڑے عموماً دینے کی شے ہیں، گھر رکھنے کی شے نہیں، کیونکہ اگر کوئی گھر فائدہ اٹھاتا ہے تو رنگ کراٹھاتا ہے اور رنگنا ہر شخص جانتا نہیں۔ پھر رنگنے کی محنت بھی کافی ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا تھا کہ شاید چمڑوں کو فروخت کر کے فائدہ اٹھانا ناجائز ہو اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑوں کی بابت خصوصیت کے ساتھ فرمایا کہ ان سے ویسے فائدہ اٹھاؤ فروخت نہ کرو۔ ورنہ اس فرمانے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ جب گوشت کے فروخت کرنے سے نہی کر دی تو اس سے چمڑوں کا فروخت کرنا بھی منع ہو گیا۔ چنانچہ صحابہؓ نے تین دن سے زیادہ گوشت رکھنے کی نہی میں چمڑوں کو بھی داخل سمجھا اور اس لئے ان کی مشکیں بنانی ترک کر دیں۔ نیز گوشت کے فروخت کرنے سے اس لئے منع فرمایا کہ قربانی کی بے حرمتی ہو کر قصاب کی بکری کی طرح نہ ہو جائے۔ سو یہی وجہ چمڑے کی ممانعت کے لئے کافی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہوئی کہ چمڑے کی بابت آپ نے الگ نہی فرمائی۔ یہی کہ چمڑے عموماً دینے

کی شے ہے۔ اس سے فروخت کے جواز کا شبہ ہوتا تھا۔ پس ثابت ہوا چمڑوں سے فائدہ اٹھانے کا ارشاد اور فروخت سے ممانعت اس بناء پر نہیں کہ ان کو صدقہ نہ کرنا چاہیئے یا ان کا حکم حج عمرہ کی قربانی کا نہیں بلکہ مقصود صرف مذکورہ شبہ کا دفعیہ ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۶ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ۔ ۲۲ مارچ ۱۹۳۴ء

قربانی کے چمڑے آہستہ آہستہ مساکین پر خرچ کرنا

سوال:۔ کیا جماعت قربانی کے چمڑے سال بھر آہستہ آہستہ مساکین پر خرچ کرسکتی ہے؟

جواب:۔ انفرادی طور پر تھوڑا تھوڑا خرچ کرنا درست نہیں۔ جماعتی بیت المال میں جمع کروا دیا جائے تو پھر جماعت کو اختیار ہے جس طرح چاہے خرچ کرے کیونکہ چمڑا فروخت کر دیا جائے تو اس کی قیمت قربانی کرنے والا گھر نہیں رکھ سکتا۔ اگر تھوڑا تھوڑا خرچ کرنے کی صورت میں خدانخواستہ پہلے مرگیا تو اس کے ذمہ بوجھ رہ گیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ یک لخت دے خواہ بیت المال میں دے یا کسی مسکین کو دے۔ بہرحال اپنے قبضہ سے نکال دے چنانچہ زکوٰۃ کی بابت بھی یہی مسئلہ ہے کہ اس کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

قربانی کے چمڑوں سے مبلّغین و مدرسین کو تنخواہ دینا

سوال:۔ کیا انجمن اسلامیہ بوجہ غربت مدرس مدرسہ اسلامیہ کی تنخواہ یا غریب اور نادار طلبا کی کتب اور خوراک وغیرہ یا جلسہ ہائے علماء میں قربانی کے چمڑوں کو خرچ کرنے کا شرعاً مجاز رکھتی ہے۔ اور مبلّغین کو بطور ہدیہ کے چمڑے ہائے قربانی دیئے جا سکتے ہیں؟

سائل محمد عبدالرحمٰن

سیکرٹری انجمن اہلحدیث ابین والہ ڈاکخانہ دھرمکوٹ۔ ضلع فیروزپور

جواب:۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا الآیۃ اس آیت سے پہلے صدقات کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ صدقات ان فقیروں کے لئے ہیں جو خدا کے راستے میں بند ہیں۔ زمین میں سفر نہیں کرسکتے۔ یعنی تجارت وغیرہ نہیں کرسکتے کیونکہ سفر کرنے سے دین کا کام بند ہوجاتا ہے۔ حدیث میں قربانی کے چمڑوں کی بابت صدقہ کرنے کا حکم آیا ہے اور اس آیت میں صدقات کے مستحق

یہ لوگ بتائے ہیں جو فی سبیل اللہ محصور ہیں۔ ان میں طالب علم۔ مدرسین۔ مبلّغین بھی شامل ہیں۔ سوال کی صورت میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان پر قربانی کے چمڑے لگ سکتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ ۶ جون ۱۹۲۶ء

جنازہ کا بیان

تلقین میّت[1]

سوال:۔ کیا مردہ کو دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر تلقین کرنی درست ہے؟ امام شوکانی نے جو اس کو بدعت کہا ہے۔ اور مطلقاً احادیث ضعیفہ کو متروک العمل قرار دینا محدّثین میں سے یہ کس کا مذہب ہے۔ حالانکہ محدّثین صحاح ستّہ کئی جگہ احادیث ضعیفہ پر باب باندھتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات حدیث مردود المعانی ہوتی ہے اور مقبول المعانی ہوتی ہے۔

جواب:۔ حدیث تلقین کی بابت صاحب سبل السلام لکھتے ہیں۔

ویتحصل من کلام ائمۃ التحقیق انہ حدیث ضعیف والعمل بہ بدعۃ ولا یغتر بکثرۃ من یفعلہ (سبل السّلام ص۲۰۳)

یعنی ائمہ محققین کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور بہت لوگوں کے فعل سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر دنیا بھیڑ چال ہے۔

امام عراقی کہتے ہیں۔ الفاظ جرح کے پانچ درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ راوی مطعون کے حق میں کہا جائے کذّاب یہ راوی بہت جھوٹا ہے یا کہا جائے وضاع یعنی اپنی طرف سے حدیثیں بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ راوی کو کہا جائے متہم بالکذب۔ اس راوی کو کذب کی تہمت لگی ہے یا یوں کہیں

[1] یعنی میت کو دفن کر کے اس کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کو منکر نکیر کے جوابات کی تلقین کرنا (یاد دہانی کرانا)

متہم بالوضع اس راوی کو حدیثیں وضع کرنے کی تہمت لگی ہے یا یوں کہیں ھالک۔ یا یوں کہیں متروک یا یوں کہیں ساقط۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ راوی کو کہیں مردود الحدیث یا کہیں ضعیفا جدا یا یہ کہیں واہ۔ ان قسموں سے نہ تو احتجاج کیا جاتا ہے اور نہ ہی استشہاد و اعتبار (تائید) میں ان کی حدیث لی جاتی ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ راوی کو کہا جائے ضعیف الحدیث یا یُوں کہا جائے منکر الحدیث یا اس طرح کہا جائے مضطرب الحدیث۔

پانچواں درجہ یہ ہے کہ راوی کو کہا جائے وفیہ ضعف یا اسی طرح کہا جائے وھو سیّئ الحفظ یا یوں کہا جائے لیس بالقوی یا یوں کہا جائے ھو لین یا اس کو ایسا کہیں فیہ أدنی مقال ان پچھلے دو درجوں کی حدیث اخذ بھی کی جاتی ہے اور اعتبار و استشہاد کے واسطے اس میں نظر بھی کی جاتی ہے۔

شیخ ابن الہمام تحریر فرماتے ہیں جو حدیث راوی کے فسق کے سبب ضعیف ہو وہ متعدد سندوں سے قبل احتجاج نہیں ہو سکتی (حاشیہ شرح نخبہ)

حدیث تلقین چونکہ اخیر کے دو درجوں سے نہیں اس لئے اس پر عمل بدعت ہے۔ اگر یہ کچھ قابل عمل ہوتی تو خیر قرون میں اس پر کیوں عمل نہیں ہوا۔ کیا اس وقت حاجت نہ تھی یا کوئی مردہ دفن نہ ہوتا تھا یا ان کو اس پر عمل کا شوق نہ تھا۔ جب یہ سب باتیں مفقود ہیں تو اس حدیث کی حقیقت واضح ہے کہ یہ بالکل ساقط ہے قابل عمل نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ ۔ ۳ مئی ۱۹۲۹ء

خاوند اور بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا

سوال:۔ ایک عورت مرگئی۔ اس کو اس کے خاوند نے غسل دیا۔ باوجودیکہ اس کی قریبی عورتیں اس مجمع میں موجود تھیں۔ ایسی موجُودہ صورت میں اس کے خاوند کا اس عورت کو غسل دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔؟

جواب:۔ خاوند بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حضرت علی رضؓ نے غسل دیا تھا۔

منتقی میں ہے۔

عَنْ عَائِشَۃَ رضـ قَالَتْ رَجَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ جَنَازَۃٍ بِالْبَقِیْعِ وَاَنَا اَجِدُ صُدَاعًا فِیْ رَاْسِیْ وَاَقُوْلُ وَارَاْسَاہُ فَقَالَ بَلْ اَنَا وَارَاْسَاہُ مَا ضَرَّکِ لَوْمُتِّ قَبْلِیْ لَغَسَّلْتُکِ وَکَفَّنْتُکِ ثُمَّ صَلَّیْتُ عَلَیْکِ وَدَفَنْتُکِ رواہ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَۃَ وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّھَا کَانَتْ تَقُوْلُ لَوِاسْتَقْبَلْتُ مِنَ الْاَمْرِ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا غَسَّلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا نِسَاءُہٗ رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ وَقَدْ ذَکَرْنَا اَنَّ الصِّدِّیْقَ اَوْصٰی اَسْمَاءَ زَوْجَتَہٗ اَنْ تُغَسِّلَہٗ فَغَسَّلَتْہُ۔ (باب ماجاء فی غسل احد الزوجین للاخر)

یعنی عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک شخص کے جنازہ سے لوٹے اور میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اور میں ہائے ہائے کر رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ بلکہ میرے سر میں درد ہوتا ہے۔ اگر تو مجھ سے پہلے مر جاتی تو میں تجھے غسل دیتا اور کفن دیتا۔ پھر تجھ پر نماز جنازہ پڑھتا اور تجھے دفن کرتا۔

نیز عائشہ رضؓ سے روایت ہے فرماتی تھیں۔ اگر ہمیں پہلے خیال آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو آپ کی بیویوں کے سوا کوئی غسل نہ دیتا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضـ نے وفات کے وقت اپنی بیوی اسماء کو وصیت کی کہ وہ غسل دے۔ پس اُس نے حضرت ابوبکر صدیق رضہ کو غسل دیا۔

نیل الاوطار میں ہے۔

فِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الْمَرْاَۃَ یُغَسِّلُھَا زَوْجُھَا اِذَا مَاتَتْ وَھِیَ تُغَسِّلُہٗ قِیَاسًا وَبِغُسْلِ اَسْمَاءَ لِاَبِیْ بَکْرٍ کَمَا تَقَدَّمَ وَعَلِیٌّ لِفَاطِمَۃَ کَمَا اَخْرَجَہُ الشَّافِعِیُّ وَالدَّارَقُطْنِیُّ وَاَبُوْنُعَیْمٍ وَالْبَیْھَقِیُّ بِاِسْنَادٍ حَسَنٍ وَلَمْ یَقَعْ مِنْ سَائِرِ الصَّحَابَۃِ اِنْکَارٌ عَلٰی عَلِیٍّ وَاَسْمَاءَ فَکَانَ اِجْمَاعًا (جلد ۳ ص۲۵)

یعنی اس میں دلیل ہے کہ مرد اپنی عورت کو غسل دے سکتا ہے اور عورت بھی اسی دلیل سے خاوند کو غسل دے سکتی ہے کیونکہ خاوند بیوی کا ایک پردہ ہے۔ جیسے مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے۔ عورت مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ نیز اسماء حضرت ابوبکر رضہ کی بیوی نے حضرت ابوبکر رضہ کو غسل دیا اور حضرت علی رضہ

نے حضرت فاطمہ رضہ کو غسل دیا۔ اور صحابہ رضؓ سے کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ پس اس پر صحابہؓ کا اجماع ہوگیا کہ خاوند بیوی ایک دُوسرے کو غسل دے سکتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بیٹا ماں کو غسل دے سکتا ہے؟

سوال :۔ والدہ کی میت کو اس کے بیٹے نے غسل دیا۔ باوجودیکہ اس کے بیٹے کی بیوی موجُود تھی۔ ایسی صورت میں بیٹے کا ماں کو غسل دینا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟

جواب :۔ سبل السّلام میں ہے۔

واما فی الاجانب فانه اخرج ابوداؤد فی المراسيل من حديث ابی بکر بن عياش عن محمد بن ابی سهل عن مكحول قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم اذا ماتت المراءة مع الرجال ليس فيهم امراءة غيرها والرجل مع النساء ليس معهن رجل غيره فانهما ييمّمان ويدفنان وهما بمنزلة من لا يجد الماء انتهٰى محمد بن ابی سهل هذا ذكره ابن حبان فی الثقات وقال البخاری لا يتابع علی حديثه وعن علی عليه السلام قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تبرز فخذك ولا تنظر الی فخذ حيي ولا ميت رواه ابوداؤد وابن ماجة وفی اسناده اختلاف (ص۱۹۳)

یعنی مکحول ؒ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ جب عورت مرجائے اور کوئی دوسری عورت وہاں نہ ہو یا مرد مرجائے اور کوئی دوسرا مرد وہاں نہ ہو تو تیمم کرکے دفن کر دئے جائیں۔ اور حضرت علی رضہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ اپنی ران ننگی نہ کر اور کسی کی ران کی طرف نہ دیکھ خواہ زندہ ہو یا مردہ۔

اِس سے معلُوم ہوا کہ خاوند بیوی کے سوا کوئی مرد عورت کو اور کوئی عورت مرد کو غسل نہ دے۔ جس شخص نے ماں کو غسل دیا ہے۔ اُس نے بہت بُرا کیا

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۲۸ محرم ۱۳۵۳ھ - ۵ مئی ۱۹۳۴ء

شیعہ واہلِ بدعت کا جنازہ

سوال :۔ شیعہ اور دیگر اہلِ بدعت کا جنازہ جائز ہے یا نہیں ۔؟

جواب :۔ شیعہ کے کئی فرقے ہیں ۔ایک زیدی کہلاتے ہیں ۔ وہ حضرت ابوبکرؓ و دیگر صحابہؓ کو گالی نہیں دیتے ۔ نہ ان کو منافق کہتے ہیں بلکہ صرف حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ و دیگر صحابہؓ پر فضیلت دیتے ہیں۔ تو ایسے شیعہ کافر نہیں ۔ اُن کا جنازہ اگر کوئی پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں لیکن پڑھنا اچھا نہیں کیونکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی نفرت نہیں رہتی بلکہ ان کو اچھا سمجھنے لگ جاتے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ کے لئے مقروض کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے ۔ زیدی شیعہ تو اس سے کئی درجہ بُرے ہیں ۔ ان کا جنازہ بطریق اولیٰ نہ پڑھنا چاہیئے ۔ اور جو شیعہ حضرت ابوبکرؓ وغیرہ کو گالی دیتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں ان کا ایمان منافقانہ تھا تو ایسے شیعہ کافر ہیں ۔ اور کافروں کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے ۔

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَھُمَا عَلَی الْکَافِرِیْنَ (المص رکوع ۶)

یعنی کافروں پر اللہ تعالےٰ نے جنت حرام کر دی ہے

اسی طرح مشرک کی بابت فرمایا ہے ۔

اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ (سورہ مائدہ رکوع ۲)

یعنی جو شرک کرے اس پر اللہ تعالےٰ نے جنت حرام کر دی ۔

جب جنت حرام ہے تو نمازِ جنازہ کاہے کے لئے ہوگی ۔

دوسری آیت میں ہے ۔

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْا اُوْلِیْ قُرْبٰی مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۔ (پارہ ۱۱ رکوع ۳)

یعنی نبی کے لئے اور ایمان والوں کے لئے لائق نہیں کہ مشرکوں کی بابت بخشش مانگیں ۔ خواہ ان کے رشتہ دار ہوں جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ دوزخی ہیں ۔

اس آیت میں مشرکوں کے لئے بخشش نہ مانگنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ دوزخی ہیں ۔ یعنی ان کو دوزخ سے کسی وقت نجات نہیں ۔ پس جس شخص کی کسی وقت نجات کی اُمید نہ ہو اس کے لئے بخشش کی دعا کرنی

منع ہے۔ اور شیعہ مذکور چونکہ کافر ہے اس لئے اس کی نجات کی بھی اُمید نہیں۔ پس اس کی بابت بھی بخشش کی دعا منع ہے۔

حدیث میں ہے۔

اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَاِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ۔ رواہ احمد و ابوداؤد (مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

یعنی تقدیر سے انکار کرنے والے اس اُمّت کے مجوسی ہیں۔ اگر بیمار ہو جائیں تو ان کی بیمار پرسی نہ کرو۔ اگر مر جائیں تو ان کے کفن دفن اور جنازہ میں حاضر نہ ہو۔

جیسے تقدیر کے منکروں کو اس حدیث میں اس اُمّت کے مجوس قرار دیا ہے۔ اس طرح شیعہ کو ایک اور حدیث میں اس اُمّت کے نصاریٰ قرار دیا ہے۔ مشکوٰۃ باب مناقب علی رضؓ میں حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت علی رضؓ کو فرمایا۔ تیری ہی عیسیٰ علیہ السّلام کی مثال ہے۔ یہود نے اس سے بغض رکھا یہاں تک کہ اُن کی ماں پر بہتان باندھا۔ اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی یہاں تک کہ ان کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا جو اس کے لائق نہ تھا۔ یعنی ایک بغض میں ہلاک ہو گئے ایک محبّت میں۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا مجھ سے محبّت میں افراط کرنے والا بھی ہلاک ہو جائے گا اور مجھ سے بغض رکھنے والا بھی ہلاک ہو جائے گا۔ جس کو میرا بغض بہتان پر آمادہ کرتا ہے۔ سو یہ پیشگوئی پوری ہو گئی۔ خارجی حضرت علی رضؓ سے بغض رکھتے ہیں گویا کہ وہ اس اُمّت کے یہود ہیں۔ اور شیعہ محبّت میں افراط کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کی محبّت کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضؓ سے بغض رکھتے ہیں تو گویا کہ اس اُمت کے نصاریٰ ہوئے۔ پس جیسے قدریہ کا جنازہ جائز نہیں کیونکہ وہ اس اُمت کے مجوس ہیں۔ اس طرح شیعہ اور خارجیہ کا بھی جنازہ جائز نہیں۔ کیونکہ وہ اس اُمّت کے یہود و نصاریٰ ہیں۔ جس امام نے جنازہ پڑھا ہے اُس کو امامت سے معزول کر دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس نے ایک کافر کا جنازہ پڑھ دیا۔

عبداللہ امرتسری ازروپڑ ضلع انبالہ

۲۱ محرم ۱۳۵۲ھ

بے نماز اور اس کی اولاد کا جنازہ

سوال ۔ کیا بے نماز اور اس کی اولاد کا جنازہ جائز ہے ؟

جواب :۔ اس باب کی وضاحت نماز کے بیان میں ہوچکی ہے ۔

خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ

سوال :۔ ایک حاجی پانچوقت کا نمازی ہے ۔جماعت کا پابند ۔شکل وصورت میں پورا مذہبی انسان اُس نے خودکشی کے خیال سے لٹک کر جان دے دی ۔کیا اُس کی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے ؟

جواب :۔ اس کے متعلق چند احادیث درج ہیں ۔

مسلم میں ہے ۔

(۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِمَشَاقِصَ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ (فصل رابع مشکوٰۃ باب المشی بالجنازہ)

جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک شخص کا جنازہ لایا گیا ۔جس نے تیر کے پھل سے یا چاقو سے خودکشی کرلی ۔آپؐ نے اس کا جنازہ نہیں پڑھا ۔

(۲) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدّٰى فِيْهَا خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ تَحَسّٰى سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَسَمُّهٗ فِيْ يَدِهٖ يَتَحَسَّاهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهٗ فِيْ يَدِهٖ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِيْ بَطْنِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا ۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ کتاب القصاص)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں (پہاڑ) سے گرے گا ۔جو زہر پی کر خودکشی کرے اُس کا زہر اُس کے ہاتھ میں ہوگا ۔ہمیشہ جہنم میں اس کو گھونٹ گھونٹ پیئے گا ۔اور جو شخص کسی ہتھیار سے خودکشی کرے وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا ہمیشہ جہنّم میں اپنے پیٹ میں گھونپے گا ۔

(۳) وعنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَّذِيْ يَخْنُقُ نَفْسَهٗ يَخْنُقُهَا فِي النَّارِ وَالَّذِيْ يَطْعَنُهَا يَطْعَنُهَا فِي النَّارِ (حوالہ مذکور)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کرے وہ جہنم میں اپنا گلا گھونٹے گا

اور جو برچھی وغیرہ گھونپ کر خودکشی کرے وہ جہنّم میں برچھی وغیرہ گھونپے گا۔

(۴) وعن جندب عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کان فیمن کان قبلکم رجل بہ جرح فجزع فاخذ سکینا فحز بہا یدہ فما رقاء الدم حتی مات قال اللہ بادرنی عبدی بنفسہ فحرمت علیہ الجنۃ۔ متفق علیہ۔ (حوالہ مذکور)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا گذشتہ لوگوں سے ایک شخص کے زخم تھا۔ اس سے بیقرار ہوگیا، چاقو لے کر اپنا ہاتھ کاٹ دیا۔ خون بند نہ ہوا یہاں تک کہ وہ مرگیا۔ خداتعالےٰ نے فرمایا میرے بندے نے اپنی جان تلف کرنے میں مجھ سے جلدی کی۔ پس میں نے اس پر جنّت حرام کردی۔

(۵) وعن جابر ان الطفیل بن عمرو الدوسی لما ہاجر النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم الی المدینۃ ہاجر الیہ وہاجر معہ رجل من قومہ فمرض فجزع فاخذ مشاقص لہ فقطع بہا براجمہ فشخبت یداہ حتی مات فراٰہ الطفیل بن عمرو منامہ وہیئتہ حسنۃ وراٰہ مغطیا یدیہ فقال ما صنع بک ربک فقال غفر لی بہجرتی الی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلّم فقال مالی اراک مغطیا یدیک قال قیل لی لن نصلح منک ما افسدت فقصہا الطفیل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اللھمّ ولیدیہ فاغفر رواہ مسلم حوالہ مذکور۔

جابرؓ فرماتے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو طفیل بن عمرو دوسی رضؓ نے اور اُس کے ساتھ ایک اور شخص نے بھی ہجرت کی وہ بیمار ہوکر بے چین ہوگیا۔ چاقو لے کر اپنی انگلیاں جوڑوں سے کاٹ دیں۔ خون نے جوش مارا۔ یہاں تک کہ وہ مرگیا۔ طفیل ابن عمرو رضؓ نے اس کو خواب میں اچھی ہیئت میں دیکھا۔ پُوچھا خدا نے تیرے ساتھ کیا کیا۔ کہا میری ہجرت کی برکت سے خدا نے معافی دے دی۔ طفیل بن عمرو نے کہا تو نے اپنے ہاتھ کیوں ڈھانپے ہوئے ہیں۔ کہا خدا کی طرف سے مجھے کہا گیا ہے کہ جو تو نے خود بگاڑا ہے اُس کو ہم ٹھیک نہیں کریں گے

طفیل نے یہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیان کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے اللہ! اس کے ہاتھوں کو بھی بخش دے۔

یہ پانچ احادیث ہیں پہلی چار سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے لئے بخشش نہیں۔ نہ اس کا جنازہ پڑھنا چاہیئے۔ پانچویں حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی معافی ہوسکتی ہے۔ اس بناء پر اس کی نماز جنازہ بھی درست ہے۔ کیونکہ نماز جنازہ میں میّت کے لئے معافی وغیرہ ہی کی درخواست ہوتی ہے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ گناہ بہت بڑا ہے جس کی سزا یہی ہے کہ ہمیشہ جہنم میں اس عذاب میں مبتلا رہے جس سے اس نے اپنی جان تلف کی ہے۔ اللہ تعالےٰ کسی عمل کی برکت سے معافی دے دے تو علیحدہ بات ہے ورنہ سزا یہی ہے۔ اور اسی تنبیہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ چنانچہ پہلی حدیث میں ذکر ہے حالانکہ وہ مسلمان ہے۔ اسلام سے خارج نہیں۔ اور مسلمان پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے مگر تنبیہ کے لئے آپ نے نہیں پڑھی۔ اس طرح جس مقروض نے ادائیگی قرض کے لئے مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا نہ ہوسکے اس کی بھی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ حالانکہ وہ بھی بالاتفاق مسلمان ہے۔ پس شخص مذکور فی السوال پر بڑا آدمی پرہیزگار متقی۔ عالم فاضل جس کے نماز جنازہ نہ پڑھنے سے تنبیہ ہوجائے نماز جنازہ نہ پڑھے اور باقی لوگ پڑھ لیں یا کوئی بھی نہ پڑھے تاکہ زیادہ تنبیہ ہوجائے۔ اس طرح مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنا یہ بھی نماز جنازہ کی طرح بطور تنبیہ ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ آخر مسلمان ہے۔ چنانچہ اُوپر معلوم ہوچکا ہے۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم اہلحدیث روپڑ ضلع انبالہ

۲۲ شعبان ۱۳۵۵ھ

بچہ کو غسل اور اس کی نماز جنازہ اور شہید کو نہ غسل اور نہ نماز جنازہ

سوال:- بچہ بھی قبل بلوغ معصوم ہوتا ہے۔ اور شہید بھی گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے۔ بچہ کو غسل دیا جاتا ہے اور اس کا جنازہ بھی پڑھا جاتا ہے مگر شہید کو نہ غسل دیا جاتا ہے اور نہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کا سبب اور اس میں فرق کیوں ہے؟

(حافظ جان محمد برنالہ ریاست پٹیالہ)

جواب :۔ شہید نے چونکہ اپنے عمل سے یہ درجہ پایا ہے۔ اس لئے اُس کی بزرگی وعظمت ظاہر کرنے کے لئے اس کا جنازہ نہیں پڑھا جاتا۔ بچہ نے اپنے عمل سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ بلکہ خدا نے اپنے فضل سے اس سے قلم اٹھایا ہوا ہے کہ اُس کے گناہ نہیں لکھے جاتے اس لئے اس کا جنازہ پڑھتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ ۵ محرم ۱۳۵۶ھ

خسرے کے جنازہ کا حکم

سوال :۔ اگر میت خسرہ ہو۔ اُس کی نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے یا ناجائز۔ کیا امام نماز جنازہ پڑھائے یا نہ۔ اگر پڑھائے تو امام کیا دعا پڑھے؟

جواب :۔ خسرہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک پیدائشی اور ایک بناوٹی۔ بناوٹی اگر اپنے پیشے سے توبہ کرے تو اس کے نمازِ جنازہ میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں مرد ہوتا ہے۔ جس نے عورت کی شکل بنا کر سوال کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اگر بغیر توبہ مر گیا تو دیکھا جائے اور معلوم کیا جائے کہ نماز کا پابند تھا تو اس صورت میں بھی نماز جنازہ ہو جاتی ہے لیکن تنبیہ کے طور پر نہ پڑھی جائے۔ تو مناسب ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقروض کی اور خودکشی کرنے والے کی اور ماعز کی جس نے زنا کیا تھا نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

اور اگر بناوٹی خسرہ نماز نہیں پڑھتا تھا تو پھر بالکل نماز جنازہ نہ پڑھنی چاہیئے کیونکہ بے نماز کافر ہے۔

اگر خسرہ پیدائشی ہے تو اس کی حالت دیکھی جائے کہ مرد سے زیادہ مشابہ ہے یا عورت سے جس سے زیادہ مشابہ ہو اس کا حکم رکھتا ہے۔ اگر مرد سے زیادہ مشابہ ہو تو مرد والی دعائیں پڑھی جائیں، اور جنازہ پڑھانے کے وقت امام اس کے سر کے برابر کھڑا ہو یا اس کے درمیان میں اگر خسرہ عورت سے زیادہ مشابہ ہو تو عورت والی دُعائیں اور جنازہ پڑھنے کے وقت امام اُس کے درمیان میں کھڑا ہو یا سرین کے برابر۔ کیونکہ جدھر کو ترجیح ہو اُدھر ہی کا حکم ہونا چاہیئے۔ اگر مرد عورت والی علامتیں برابر ہوں تو پھر اختیار ہے۔ امام جونسی دُعائیں چاہے پڑھے کیونکہ دونوں طرف برابر ہیں، ہاں وراثت کے مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ مرد سمجھا جائے یا عورت۔ راجح مذہب یہی ہے کہ آدھا حصہ اس کو مرد کا دیا جائے اور آدھا عورت کا چنانچہ کتب وراثت میں اس کی تفصیل ہے۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۳ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ ۔ ۸ فروری ۱۹۳۵ء

ولدالحرام کے جنازہ کا حکم

سوال :۔ ایک آدمی کے گھر دو عورتیں بے نکاح ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک کے گھر زنا کا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ چار پانچ ماہ کی عمر پاکر مرگیا۔ امام مسجد کو جنازہ کے لئے بلایا گیا۔ امام مسجد نے جواب دیا کہ میں اس کا جنازہ نہیں پڑھتا تاکہ اس کو کچھ عبرت حاصل ہو۔ لوگ امام مسجد کو ملامت کرتے ہیں کہ پاک جان کا جنازہ نہیں پڑھا۔ اب سوال یہ ہے کہ امام لائق ملامت ہے یا نہیں ؟

صدر دین امام مسجد گھیاٹی۔ ڈاکخانہ منڈی واربٹن ضلع شیخوپورہ

جواب :۔ بچہ معصوم ہے۔ معصوم کا جنازہ پڑھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قصور ماں باپ کا ہے۔ ماں باپ کو تنبیہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ اُن کا بھانڈا پھیک دیا جائے مگر اب امام کو بھی ملامت نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کی نیت بھی نیک تھی لیکن آیندہ کے لئے آگاہ رہنا چاہیئے کہ ظلم کسی کا ہو اور زیادتی کسی پر ہو۔ یہ مناسب نہیں۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ - ۲۳ اگست ۱۹۳۵ء

مردہ بچہ کے جنازہ کا حکم

سوال :۔ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تو اُس بچہ کی نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں۔ ایسے بچہ کو کفن دینا۔ غسل دینا چاہیئے یا نہیں۔ ایسے بچہ کو قبرستان میں دفن کرنا چاہیئے یا قبرستان سے باہر دفن کرنا چاہیئے۔

(اے۔ ای۔ پٹیل افریقہ)

جواب :۔ مشکوٰۃ میں ہے۔

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرَّاكِبُ يَسِيْرُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ يَمْشِيْ خَلْفَهَا وَاَمَامَهَا وَعَنْ يَمِيْنِهَا وَعَنْ يَسَارِهَا قَرِيْبًا مِنْهَا وَالسِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَيُدْعٰى لِوَالِدَيْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ ۔ رواہ ابوداؤد وَفِيْ رِوَايَةِ اَحْمَدَ وَالتِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ وَابْنِ مَاجَةَ قَالَ الرَّاكِبُ خَلْفَ الْجَنَازَةِ وَالْمَاشِيْ حَيْثُ شَاءَ مِنْهَا وَالطِّفْلُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَفِيْ

الْمَصَابِيحِ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ زِيَادٍ (مشکوٰۃ باب المشی بالجنازۃ الخ صنٖ۱۳۸)

یعنی مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ سوار جنازے کے پیچھے چلے اور پیادہ کو اختیار ہے خواہ پیچھے چلے یا آگے یا دائیں بائیں، نزدیک اور کچہ بچہ جو پورے دنوں سے پہلے گر جائے اس پر نماز پڑھی جائے۔ اور اُس کے والدین کے لئے بخشش و رحمت کی دعا کی جائے۔ ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے۔ اور مسند احمد، ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے کہ سوار جنازے کے پیچھے چلے اور پیادہ جہاں چاہے اور لڑکے پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔"

یہ حدیث بظاہر عام معلوم ہوتی ہے کہ بچہ خواہ زندہ پیدا ہو یا مرا ہوا ہر صورت میں اُس پر نماز پڑھی جائے لیکن دوسری حدیث میں شرط آئی ہے کہ آواز کرے تو نماز جنازہ پڑھی جائے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کے اسی باب صنٖ۱۴۱ میں ہے۔

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الطِّفْلُ لَا يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَلَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ حَتّٰى يَسْتَهِلَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَلَا يُوْرَثُ۔

جابرؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ لڑکا جب تک آواز نہ کرے، نہ اُس پر نماز جنازہ پڑھی جائے نہ وہ کسی کا وارث ہوگا نہ اُس کا کوئی وارث ہوگا۔"

نیل الاوطار میں ہے۔

وَيَدُلُّ عَلَى اعْتِبَارِ الْاِسْتِهْلَالِ حَدِيْثُ جَابِرٍ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ وَابْنِ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيِّ بِلَفْظِ اِذَا اسْتَهَلَّ السِّقْطُ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَوَرِثَ (نیل الاوطار جلد۳ صنٖ۴۸)

یعنی آواز کے شرط ہونے پر جابرؓ کی حدیث دلالت کرتی ہے جس کو ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کچہ بچہ آواز کرے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے اور وہ وارث بھی ہوگا۔"

اِس حدیث میں اسماعیل بن مسلم ایک راوی ضعیف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اور بہت سے شامل ہیں۔ چنانچہ تلخیص الحبیر کے صنٖ۱۵۱ میں حافظ ابن حجرؒ نے اور نیل الاوطار جلد ۳ کے صنٖ۴۸ میں امام شوکانیؒ نے بحوالہ ترمذی وغیرہ ذکر کیا ہے اس لئے اس کا ضعف نقصان نہیں دیتا۔ اور اسی لئے حاکمؒ نے کہا ہے کہ یہ

حدیث بخاری مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص الحبیر کے صفحہ ۱۵۰ میں کہا ہے کہ یہ حاکم رح کا وہم ہے کیونکہ اسماعیل بن مسلم کے ساتھ روایت کرنے میں اگرچہ اور بہت سے شامل ہیں لیکن اسماعیل بن مسلم کا اُستاد ابوالزبیر بکی اس میں بخاری کی شرط پر نہیں (کیونکہ یہ تیسرے درجہ کا مدلّس ہے۔ چنانچہ طبقات المدلّسین کے صفحہ ۲ میں حافظ ابن حجر رح نے اس کی تصریح کی ہے) اور اس نے جابرؓ سے کلمہ عن کے ساتھ روایت کی ہے۔ یعنی عَنْ جَابِرٍ (روایت کرتا ہوں میں جابرؓ سے) کہا ہے اور سَمِعْتُ جَابِرًا (سنا میں نے جابر رضؓ سے) نہیں کہا۔ اور مدلّس جب عن کے ساتھ روایت کرے تو وہ معتبر نہیں ہوتی۔ پس اس بناء پر یہ روایت معتبر نہ ہوئی۔ مگر بعض اور احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لائق استدلال ہوگئی۔ چنانچہ نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۲۹ اور تلخیص الحبیر کے صفحہ ۱۵۰ میں ہے۔

وَفِي الْبَابِ عَنْ عَلِيٍّ اَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ فِي تَرْجَمَةِ عَمْرِو ابْنِ خَالِدٍ وَهُوَ مَتْرُوكٌ وَمِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ رِوَايَةِ شَرِيْكٍ عَنِ ابْنِ اِسْحَاقَ عَنْ عَطَاءٍ عَنْهُ وَقَوَّاهُ ابْنُ طَاهِرٍ فِي الذَّخِيْرَةِ وَقَدْ ذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ مِنْ قَوْلِ الزُّهْرِيِّ تَعْلِيْقًا (في باب اذا استهل الصبي فمات هَلْ يُصَلّٰى عَلَيْهِ) وَوَصَلَهُ ابْنُ اَبِي شَيْبَةَ)

یہ عبارت تلخیص الحبیر کی ہے۔ اور نیل الاوطار کی عبارت بھی اسی کے قریب ہے۔

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ اس بارے میں حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ ابن عدی نے اس کو عمرو بن خالد رضؓ کے حالات میں ذکر کیا ہے لیکن عمرو بن خالد متروک ہے۔ یعنی بہت ضعیف ہے اور اس بارے میں ابن عباسؓ کی حدیث بھی ہے۔ اس کو بھی ابن عدی نے شریک کی روایت سے اس نے ابن اسحاق سے اُس نے عطاء سے اُس نے ابن عباسؓ سے ذکر کیا ہے اور ابن طاہر نے ابن عباس رضؓ کی حدیث کو ذخیرہ میں قوی کہا ہے اور بخاریؒ نے بھی اس کو زہری کا قول بنا کر بغیر اسناد کے ذکر کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اس کو با اسناد ذکر کیا ہے "

اِن احادیث کے علاوہ بعض اور احادیث بھی ہیں جن سے یہ مسئلہ پختہ ہو جاتا ہے کہ بچہ آواز کرے تو اس کا جنازہ پڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ نیل الاوطار کے صفحہ ۲۸ اور تلخیص الحبیر کے صفحہ ۱۵۰ میں ہے۔

وَقَدْ اَخْرَجَ الْبَزَّارُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا اِسْتِهْلَالُ الصَّبِيِّ الْعُطَاسُ

اِسْنَادُہٗ ضَعِیْفٌ۔

یعنی بچہ کی آواز چھینک ہے اس کی اسناد ضعیف ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی اسناد کو اگرچہ ضعیف کہا ہے لیکن اُوپر کی احادیث کو اس سے تقویت ہوگئی۔ کیونکہ ضعیف مل کر حسن کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ کتب اصول شرح نخبہ وغیرہ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور چھینک سے مراد آواز کا ادنیٰ درجہ ہے۔ ورنہ کسی اور طرح آواز ہو۔ وہ بھی کافی ہے۔ اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔ وہ کہتے ہیں جب بچہ آواز کرے تو اس کا جنازہ پڑھا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری کی جزء۵ ص۶۹ باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور نیل الاوطار کے مقام مذکور میں ہے کہ مقصود آواز سے چیخ، چھینک حرکت ہے۔ جس سے حیات معلوم ہو۔ اور صاحب نیل الاوطار کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی کہا ہے کہ مقصود آواز سے علامت حیات ہے آواز چونکہ اکثر اور واضح ہے۔ اس لئے اس کا ذکر کر دیا۔ پس جب کوئی ایسی علامت پائی جائے جس سے بچہ کی حیات معلوم ہو تو اُس کا جنازہ پڑھنا پڑے گا اور وہ وارث بھی ہوگا۔ پھر اس کی وراثت اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگی پس جب اُس کا جنازہ بھی ہوا۔ اور وہ وارث بھی ہوا تو باقی کفن دفن بھی اس کا بڑوں کی طرح ہونا چاہیئے اس میں کسی کو اختلاف نہیں، صرف سعید بن جبیر، عبداللہ بن عباس رضہ کے شاگرد کہتے ہیں کہ لڑکا جب تک بالغ نہ ہو۔ اُس وقت تک اُس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ اور کہا گیا ہے کہ جب تک بچہ نماز نہ پڑھے اُس وقت تک اُس کی نماز جنازہ نہیں۔

حافظ ابن حجر رہ نے فتح الباری جزء ۵ ص۶۹ باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه میں یہ دونوں قول ذکر کئے ہیں مگر یہ صریح احادیث کے خلاف ہیں۔ اُوپر کی احادیث کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے بچوں کا جنازہ ثابت ہوتا ہے۔ مشکوٰۃ میں سعید بن مسیّب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں۔ میں نے ابُوہریرہؓ کے پیچھے معصوم بچہ کی نماز جنازہ پڑھی۔ میں نے ان سے سنا کہ وہ اس کے حق میں عذاب قبر سے پناہ کی دعا کرتے۔

الرحمة المهداة فصل رابع مشکوٰۃ ص۸ میں ہے۔ عمار مولی حارث بن نوفل کہتے ہیں میں ایک عورت اور اس کے بچے کے جنازے کو حاضر ہوا۔ بچہ امام کے نزدیک رکھا گیا۔ اور عورت بچہ سے قبلہ کی جانب رکھی گئی۔ پس دونوں پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور لوگوں میں ابو سعید خدریؓ۔ ابن عباسؓ۔

ابو قتادہ رضہ۔ ابوہریرہ رضہ۔ دیگر جلیل القدر صحابہ موجود تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ اس طرح متعدد میتوں کو آگے پیچھے رکھ کر اگر مردوں کے ساتھ عورت ہو تو اُس کو مردوں کے آگے قبلہ کی جانب رکھ کر اکٹھی نماز جنازہ پڑھنا سنّت ہے۔ یعنی ارشادِ نبوی ہے۔ نسائی اور ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے۔ نیز الرحمۃ المہداۃ کے اسی صفحہ میں ابن عباس رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرزند ارجمند ابراہیم جب فوت ہوئے تو آپ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی اور فرمایا ان کے لئے جنّت میں دایہ دودھ پلانے والی ہے۔ (یعنی یہ رضاعت کے دنوں میں فوت ہوگئے۔ اس لئے ان کی رضاعت جنت میں پوری کی جائے گی) اور اگر زندہ رہتے تو صدیق نبی بن جاتے اور ان کے ماموں یعنی (قبطی لوگ) آزاد ہو جاتے اور آیندہ کو قبطی غلام نہ بنایا جاتا۔ روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے۔"

غرض اس قسم کی روایتیں بہت ہیں۔ جن میں بچوں پر نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے۔ پس سعید بن جبیر کا قول اور اس کے ساتھ کا قول دونوں غلط ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں جب بچہ پیٹ میں چار ماہ کا ہو جائے تو پھر خواہ مرا ہوا پیدا ہو، اُس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیئے۔ کیونکہ جب چار کے بعد بچہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ مرا ہوا پیدا ہو تو وہ میت شمار ہوگا۔ پس اس کا غسل (نماز جنازہ وغیرہ) باقاعدہ ہونا چاہیئے۔ امام شافعیؒ وغیرہ کا یہی مذہب ہے۔ اور امام ابن تیمیہؒ مصنف منتقیٰ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ مگر ترجیح اسی کو ہے کہ جب زندہ باہر نکلے تب نماز جنازہ وغیرہ ہونی چاہیئے ورنہ نہیں چنانچہ اُوپر کی روایت سے واضح ہو چکا ہے۔ تفصیل نیل الاوطار وغیرہ میں ملاحظہ ہو۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۲۶ ربیع الاوّل ۱۳۵۴ھ۔ ۲۸ جون ۱۹۳۵ء

تکبیر جنازہ کے ساتھ رفع الیدین

سوال:۔ تکبیر جنازہ کے ساتھ رفع الیدین کرنی چاہیے یا نہیں؟

جواب:۔ مغنی ابن قدامہ میں ہے۔

روی ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ مع التکبیر قال احمد اما انا فاری ان الحدیث یدخل فیہ ھذا کلہ وروی عن عمر رضی اللہ عنہ انہ

كان يرفع فی كل تكبيرة فی الجنازة وفی العيد رواه الاثرم ولا يعرف له مخالف فی الصحابة انتهى -

یعنی روایت کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے تھے ۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ہر نماز کی تکبیروں کو شامل ہے ۔ اور حضرت عمر رضہ سے روایت ہے کہ وہ جنازے میں اور ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے تھے ۔ اس کو اثرم نے روایت کیا ہے ۔ اور صحابہ رضہ سے حضرت عمر رضہ کا اس مسئلہ میں کوئی خلاف کرنے والا معلوم نہیں ۔

حضرت عمر رضہ کے اس فعل کو بیہقی نے بھی جلد ۴ صـ۲۹۳ میں روایت کیا ہے لیکن اس میں ابن لہیعہ راوی ہے جو ضعیف ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ تکبیراتِ جنازہ میں رفع الیدین کرنی چاہیے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بلند آواز سے نماز جنازہ

سوال :۔ جنازہ بلند آواز سے پڑھنا شریعت محمدیہ میں جائز ہے یا نہیں ؟

جواب :۔ جنازہ بلند آواز سے پڑھنا جائز ہے ۔ مسلم جلد اول صـ۳۱۱ میں حدیث ہے ۔

عوف بن مالک رض نے بیان کیا ۔ صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی جنازۃ فحفظت من دعائه وهو يقول اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ - الخ

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جہری آواز سے جنازہ پڑھا ہے ۔ اس کا انکار حدیث کا انکار ہے ۔

یوسف ابراہیمی مدرس مدرسہ دارالعلوم امرتسر

بتائیدِ محدّث روپڑی رح

غائبانہ جنازہ

سوال :۔ نجاشی رضہ کے سوا کسی اور شخص کا بھی جنازہ غائب پڑھا گیا ہے ؟ اگر پڑھا گیا ہے تو کس شخص کا ۔ کیونکہ حضور صلعم کے زمانہ میں کئی صحابہ رضہ بھی تو دیگر ممالک میں فوت ہوئے تھے تو ان کا جنازہ کیوں نہیں

پڑھا گیا۔

خیردین امام مسجد اہلحدیث لوہاراں ریاست مالیر کوٹلہ

جواب :۔ جنازہ غائب کی بابت بہت اختلاف ہے۔ حنفیہ وغیرہ کے علاوہ بہت اہل حدیث بھی اس کے قائل نہیں۔ نجاشی رضہ کی حدیث کی بابت کہتے ہیں کہ وہ غیر ملک میں فوت ہوا۔ اُس کے والی وارث کفار تھے۔ ظاہر یہی ہے کہ وہاں اُس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کا جنازہ مدینہ میں پڑھا۔ خطابی ؒ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اور رویانی نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ ابوداؤد نے اس پر باب باندھا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح اور محقق مقبلی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ اور ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد۔ طیالسی۔ ابن قانع۔ طبرانی۔ ضیا مقدسی میں حذیفہ رضہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان اخاکم مات بغیر ارضکم فقوموا فصلوا علیہ۔

یعنی تمہارا بھائی تمہاری غیر زمین میں مرگیا۔ اٹھو۔ اس کی نماز جنازہ پڑھو

اس حدیث میں تمہاری غیر زمین میں مرنے کا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ وہاں اس کا جنازہ نہیں ہوا۔ اس لئے تم پڑھو۔ اور قوموا کی فا بھی اس پر دلالت کرتی ہے کیونکہ یہ فا تفریع کی ہے۔ یعنی غیر ملک میں مرنا یہ اس جنازہ کا سبب اسی بنا پر ہے کہ وہاں جنازہ نہیں ہوا۔

نجاشی کے واقعہ کے تین اور بھی جواب دئے گئے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ آپ کے لئے زمین لپیٹی گئی یہاں تک کہ میت آپ کے سامنے ہوگئی۔ یہ جواب ابن عربی نے مالکیہ سے نقل کیا ہے مگر اس کا ثبوت کوئی نقل نہیں کیا۔

(۲) دوسرا یہ جواب دیا گیا کہ درمیان سے پردہ اٹھایا گیا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میت سامنے نظر آ گئی۔ حافظ ابن حجر ؒ نے کہا ہے شاید اس جواب کی بناء ابن عباس ؓ کی اس روایت پر ہو جو واحدی نے اسباب النزول میں بلا سند ذکر کی ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں

کشف للنبیؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم عن سریر النجاشی حتی راہ وصلی علیہ

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے لئے نجاشی رضہ کی چارپائی سے پردہ دور کیا گیا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اس کو دیکھا۔ اور جنازہ پڑھا۔

ابن حبان نے بھی عمران بن حصین رض سے ایک روایت نقل کی ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

فقاموا وصفوا خلفه وهم لا يظنون الا ان جنازته بين يديه۔

یعنی صحابہ رض کھڑے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف باندھی۔ اور وہ یہی گمان کرتے تھے کہ جنازہ آپ کے سامنے ہے۔

اور ابی عوانہ نے بھی بطریق ابان وغیرہ سے اس نے یحییٰ سے اس قسم کی ایک روایت کی ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں۔

فصلينا خلفه ونحن لا نرى الا ان الجنازة قدامنا

یعنی ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جنازہ پڑھا اور ہم یہی دیکھتے تھے کہ جنازہ ہمارے سامنے ہے۔

(۳) تیسرا جواب نجاشی کے واقعہ کا یہ دیا جاتا ہے کہ یہ نجاشی کا خاصہ ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ نجاشی رض کے سوا کسی اور کا جنازہ نہیں پڑھا۔ حالانکہ بہت سے صحابہ رض مختلف جگہ فوت ہوتے رہے۔ اگر جنازہ غائب عام طور پر جائز ہوتا تو کسی نہ کسی کا ضرور نقل ہوتا لیکن اس پر اعتراض پڑتا ہے کہ معاویہ بن معاویہ لیثی کا جنازہ غائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا ہے وہ مدینہ میں فوت ہوا۔ آپ اُس وقت تبوک میں تھے ابن عبدالبر نے اس کو استیعاب میں ذکر کیا ہے۔ نیز عبدالبر نے ابو امامہ باہلی سے معاویہ بن مقرن کی بابت اور انس رض سے معاویہ بن معاویہ مزنی کی بابت اس قسم کی روایتیں کی ہیں۔ پھر کہا ہے کہ ان سب کی سندیں قوی نہیں۔ اور حافظ ابن حجر رح نے بھی نجاشی کا خاصہ کہنے والوں پر اعتراض کیا ہے کہ معاویہ بن معاویہ لیثی کا جنازہ آپ نے پڑھا ہے۔ اور مجموعہ طرق کے لحاظ سے اس واقعہ کو قوی بتایا ہے۔ اور ذہبی رح کہتے ہیں کہ صحابہ رض میں معاویہ بن معاویہ ہم کوئی شخص نہیں جانتے۔ اور ابن قیم کہتے ہیں کہ معاویہ بن معاویہ کے جنازہ کی روایت صحیح نہیں۔ اس کی اسناد میں علاء بن یزید راوی ہے جس کی بابت ابن المدینی نے کہا ہے کہ یہ کذاب ہے۔

غرض جنازہ غائب کی بابت اس قسم کے اختلافات ہیں۔ میری کسی طرف تسلی نہیں۔ اس لئے میں نہیں پڑھا کرتا۔ ہاں پڑھنے والوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کیونکہ معاملہ بین بین ہے۔ اس لئے جو جانب کسی کو راجح معلوم ہو۔ اس پر عمل کر سکتا ہے۔ اور جو کچھ میں نے تفصیل کی ہے۔ یہ نیل الاوطار جلد ۳ ص ۲۸۵ میں موجود ہے

اور دیگر شرح و متون میں بھی اس کی کافی تفصیل ہے مگر خلاصہ سب کا یہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۱۶ جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء

متعدد مرتبہ جنازہ

سوال:۔ اہلحدیث کا معمول ہے کہ اکثر ایک جنازہ متعدد بار پڑھتے ہیں۔ اور احناف اس سے انکار کرتے ہیں بلکہ دوسری مرتبہ جنازہ پڑھنے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرون ثلاثہ میں کسی شخص کا جنازہ دوسری دفعہ نہیں پڑھا گیا۔ اور حضور صلعم کا جنازہ خلافت قائم ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے پڑھا دیا پھر کسی نے نہیں پڑھا۔ پس یہ دوبارہ جنازہ پڑھنا بدعت ہے۔ لہٰذا بتایا جائے کہ حضور صلعم کے زمانہ میں کسی کا جنازہ دو یا تین مرتبہ سامنے رکھ کر پڑھا گیا ہو۔ جیسا کہ آج کل اہلحدیث کا معمول ہے کہ جو لوگ جنازہ سے رہ جاتے ہیں وہ فوراً دوبارہ جنازہ پڑھ لیتے ہیں۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد بھی کسی نے پڑھایا ہے یا نہیں؟

(خیر دین امام مسجد اہلحدیث لوہاراں ریاست مالیر کوٹلہ)

جواب:۔ مشکوٰۃ میں ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِقَبْرٍ دُفِنَ لَیْلًا فَقَالَ مَتٰی دُفِنَ هٰذَا قَالُوا الْبَارِحَۃَ قَالَ اَفَلَا اٰذَنْتُمُوْنِیْ قَالُوْا دَفَنَّاہُ فِیْ ظُلْمَۃِ اللَّیْلِ فَکَرِھْنَا اَنْ نُّوْقِظَکَ فَقَامَ فَصَفَفْنَا خَلْفَہٗ فَصَلّٰی عَلَیْہِ

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ امْرَاَۃً سَوْدَاءَ کَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ اَوْ شَابٌّ فَفَقَدَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَ عَنْھَا اَوْ عَنْہُ فَقَالُوْا مَاتَ قَالَ اَفَلَا کُنْتُمْ اٰذَنْتُمُوْنِیْ قَالَ فَکَاَنَّھُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَھَا اَوْ اَمْرَہٗ فَقَالَ دُلُّوْنِیْ عَلٰی قَبْرِہٖ فَدَلُّوْہُ فَصَلّٰی عَلَیْھَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ ھٰذِہِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَۃٌ ظُلْمَۃً عَلٰی اَھْلِھَا وَاِنَّ اللّٰہَ یُنَوِّرُھَا لَھُمْ بِصَلَاتِیْ عَلَیْھِمْ۔ متفق علیہ ولفظہ لمسلم (مشکوۃ باب المشی بالجنازۃ)

یعنی ابن عباس رضؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک (میت کی) قبر کے پاس سے گزرے جو رات کو دفن کی گئی۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ شخص کب دفن کیا گیا۔ صحابہ رضؓ نے کہا۔ آج رات۔ فرمایا مجھے کیوں خبر نہ دی۔ صحابہؓ نے کہا۔ ہم نے اس کو اندھیرے میں دفن کیا آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ پس آپ کھڑے ہوئے اور ہم نے بھی آپ کے پیچھے صف باندھی پس اس پر نماز پڑھی۔ اور ابوہریرہ رضؓ سے ایک روایت ہے۔ ایک حبشیہ یا جوان مرد جو مسجد کو جھاڑو دیتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ پایا ———— تو آپؐ نے اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ فرمایا مجھے تم نے خبر کیوں نہ دی؟ ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں لوگوں نے گویا اس کا معاملہ چھوٹا سمجھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے اس کی قبر بتاؤ انہوں نے قبر بتائی تو آپ نے قبر پر جاکر نماز جنازہ ادا کی۔ پھر فرمایا کہ قبریں اندھیرے سے بھری ہوئی ہیں۔ میرے نماز جنازہ پڑھنے سے، خدا ان کو روشن کر دیتا ہے۔

اس قسم کی کئی روایتیں آئی ہیں جن میں قبر پر نماز جنازہ کا ذکر ہے۔ اور بعض روایتوں میں مہینہ کی مدت بھی آئی ہے یعنی ایک ماہ بعد قبر پر جنازہ پڑھا (منتقی فتح الباری جز ۵)

پس جب قبر پر نماز جنازہ ثابت ہوگیا تو جب میت قبر سے باہر ہو اس وقت بطریق اولےٰ ثابت ہوگیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ میرے نماز جنازہ پڑھنے سے خدا اُن کی قبروں میں نور کر دیتا ہے مگر یہ اُن لوگوں کی ڈبل غلطی ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کے جنازہ میں چالیس آدمی توحید والے شریک ہو جائیں خدا ان کی سفارش ان کے حق میں قبول کرے گا (مشکوٰۃ باب المشی بالجنازۃ) تو کیا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ چالیس سے کم جنازہ نہ پڑھیں۔

نیز زکوٰۃ کے بارہ میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

خذ من اموالھم صدقۃ۔ ان کے مالوں سے صدقہ لے تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم تاکہ اس صدقہ کے ذریعہ تو ان کا ظاہر و باطن پاک کرے اور ان کے لئے دعا کر بیشک تیری دعا ان کے لئے تسلی ہے۔

توکیا اس کا یہ مطلب ہے کہ زکوٰۃ لینا آپؐ کا ہی خاصہ ہے کیونکہ آپؐ کی دُعا ان کے لئے تسلی ہے کسی اور کی نہیں۔ حضرت ابوبکر رضؓ کی خلافت میں جو لوگ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی یہی آیت پیش کر کے کہا تھا کہ زکوٰۃ کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات تک تھا۔ اب نہیں۔ اس پر حضرت ابوبکر رضؓ نے تلوار اٹھائی۔ سو اس قسم کے دلائل سے خاصہ ثابت ہوا نہیں کرتا بلکہ کوئی واضح دلیل چاہیئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صحابہؓ نے بھی نماز جنازہ پڑھی۔ اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ نہیں بلکہ عام ہے۔

اب رہا یہ استدلال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ حضرت ابوبکر رضؓ کے بعد کسی نے نہیں پڑھا۔ اوّل تو نہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوبارہ جنازہ جائز نہیں۔ کیونکہ جنازہ فرض کفایہ ہے۔ جب کچھ لوگ پڑھ لیں تو فرض ذمّہ سے اُتر گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوبارہ منع ہے۔ جب مذکورہ بالا روایتوں سے دوبارہ ثابت ہو گیا تو جو پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے۔

دوسرے حضرت ابوبکرؓ کے جنازہ پڑھانے کی روایت قابل استدلال نہیں کیونکہ یہ روایت صحت کو نہیں پہنچی۔ نیل الاوطار میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ میں امام کون بنایا گیا۔ پس کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر امام تھے۔ یہ روایت ایسی سند سے مروی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ وہ صحیح نہیں۔ اور اس اسناد میں ایک راوی حرام ہے جو بہت ضعیف ہے۔ اور ابن دحیہ کہتے ہیں۔ یہ روایت قطعاً باطل ہے کیونکہ اس کے راوی ضعیف ہیں۔ اور اسناد بھی منقطع ہے۔ یعنی اسناد میں راوی گرا ہوا ہے نیز دحیہ نے کہا ہے کہ بات صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں نے اکیلے اکیلے نماز جنازہ پڑھی ہے۔ امام شافعیؒ نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر امام نہ بننے کی وجہ آپ کی عظمت اور بزرگی ہے نیز ہر ایک اس چیز کی رغبت رکھتا تھا۔ اس لئے کسی ایک کو امام نہیں بنایا گیا۔ دحیہ کہتے ہیں کہ آپؐ پر تیس ہزار اشخاص نے نماز پڑھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر کی امامت کا کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ آپؐ پر کسی نے امامت نہیں کرائی۔ منتقی میں ہے۔

عن ابن عباس قال دخل الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارسالا یصلون علیہ حتی اذا فرغوا ادخلوا النساء حتی اذا فرغن ادخلوا الصبیان ولم یؤم

الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احمد رواہ ابن ماجۃ۔

یعنی ابن عباس رضہ سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لوگ تھوڑے تھوڑے داخل ہوتے اور نماز جنازہ پڑھتے۔ جب (مرد) فارغ ہو گئے تو انہوں نے عورتوں کو داخل کیا جب عورتیں فارغ ہو گئیں تو لڑکوں کو داخل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی نے امامت نہیں کرائی۔

اس حدیث کو بیہقی رحمہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ نے اس کی اسناد کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس میں حسین بن عبداللہ بن ضمیر راوی ضعیف ہے۔ نیل الاوطار میں ہے کہ اس بارہ میں مسند احمد میں بھی روایت ہے ابی عسیب کہتے ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ کو حاضر ہوا (آخر وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر نماز جنازہ کس طرح پڑھیں۔ فرمایا تھوڑے تھوڑے داخل ہوئے۔ اس طرح تلخیص میں ہے۔ جابر اور ابن عباس رضہ سے طبرانی میں بھی اس طرح مروی ہے۔ اس کی اسناد میں عبدالمنعم بن ادریس ایک راوی ہے جو کذاب ہے۔ اور بزار نے کہا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ اور عبداللہ بن مسعود رضہ سے مستدرک حاکم میں کمزور اسناد کے ساتھ اور نبیط بن شریط سے بیہقی میں بھی (اسی طرح) مروی ہے۔ اور امام مالک رحمہ نے اس کو بصیغہ بَلَغَنِیْ (مجھے پہنچا) ذکر کیا ہے۔

شمائل ترمذی میں ہے۔

قالوا یا صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایصلی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نعم قالوا کیف قال یدخل قوم فیکبرون ویصلون ویدعون ثم یخرجون حتی یدخل الناس (باب ما جاء فی وفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔)

یعنی لوگوں نے حضرت ابوبکر رضہ کو کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ فرمایا ہاں۔ لوگوں نے کہا کس طرح؟ فرمایا ایک قوم داخل ہو تکبیر کہیں۔ نماز پڑھیں۔ دعا کریں پھر نکل جائیں یہاں تک کہ اس طرح سارے لوگ داخل ہوں۔

ملا علی قاری حنفی شرح شمائل میں لکھتے ہیں جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

حضرت علی فرماتے ہیں آپ پر کوئی امامت نہ کرائے۔ کیونکہ آپ عین حیات اور عین ممات دونوں حالتوں میں امام ہیں۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح وصیت کی۔

اور اسی وجہ سے آپؐ کے دفن میں تاخیر ہوئی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر نماز جنازہ جائز نہیں۔ تاکہ یہ سلسلہ جاری ہو کر آپ کی پوجا تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ پہلے متفرق طور سے آپؐ پر فرشتوں نے نماز پڑھی۔ پھر آپ کے اہل بیت نے پھر متفرق طور پر لوگوں نے۔ پھر اخیر میں امہات المومنین رضؓ نے۔ شرح مواہب میں خصائص کے بیان میں حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت علی رضؓ کی اوپر کی روایتیں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

فکان الناس یدخل رسلا فرسلا فیصلون صفاصفا لیس لهم امام رواہ ابن سعد

یعنی تھوڑے تھوڑے لوگ آپ پر داخل ہوتے۔ پس قطار باندھ کر بغیر امام کے نماز پڑھتے۔ روایت کیا اس کو ابن سعد نے۔

شیخ عبدالرؤف مناوی شرح شمائل میں لکھتے ہیں جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے۔

یعنی حاکم نے مستدرک میں اور بزارؒ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اہل کو حضرت عائشہ رضؓ کے گھر میں جمع کیا۔ تو اہل نے کہا آپ پر کون جنازہ پڑھے گا تو فرمایا جب تم مجھے غسل دے کر میری چارپائی پر رکھو تو اندر سے نکل جاؤ۔ کیونکہ پہلے مجھ پر جبرئیلؑ نماز پڑھیں گے پھر میکائیل علیہ السلام پھر اسرافیل علیہ السلام پھر ملک الموت (عزرائیل علیہ السلام) مع اپنے لشکر کے پھر تم فوج فوج داخل ہوؤ اور نماز پڑھو اور سلام بھیجو۔

اس حدیث کے سارے راوی ثقہ ہیں صرف عبدالملک مجہول ہے۔

اس قسم کی روایتیں بے شمار ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کے جنازہ پر امامت نہیں ہوئی بلکہ ویسے ہی تھوڑے تھوڑے داخل ہو کر نماز جنازہ پڑھتے رہے ان کا کوئی امام نہیں تھا۔ اگرچہ ان بعض روایتوں میں کچھ ضعف ہے مگر کثرت طرق کی وجہ سے حسن کے درجہ کو پہنچ سکتی ہیں بلکہ شمائل ترمذی حدیث اکیلی ہی حسن کے درجہ کی ہے اور شرح مواہب میں ابن کثیر سے نقل کیا ہے هذا امر مجمع علیه۔ یعنی اس پر اجماع ہے۔ پس جب اجماع ہوا تو کوئی شبہ نہ رہا۔

نیل الاوطار جلد ۳ کے صفحہ ۲۶ میں ابن عبدالبر سے بھی اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگرچہ نیل الاوطار میں اس کے بعد ابن دحیہ کا اس پر اعتراض نقل کیا ہے کہ ابن عبدالبر کا اس کو اجماعی کہنا صحیح نہیں کیونکہ ابن القصار نے اس پر اختلاف ذکر کیا ہے کہ آپؐ پر نماز جنازہ پڑھی گئی یا صرف دعا کی گئی۔ پھر اکیلے اکیلے پڑھی گئی یا باجماعت لیکن

اس میں شبہ نہیں کہ اختلاف اقل قلیل ہے قریباً سارے مورخین نے آپ پر نماز جنازہ نقل کی ہے۔ نہ فقط دعا اور نماز جنازہ بھی اکیلے اکیلے بغیر امام کے اور اُوپر کی روایات سے بھی نماز جنازہ ہی ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ تکبیر کا ذکر ہے۔ اور لوگوں کا حضرت ابوبکر رضہ سے دریافت کرنا اَیصلی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ کیا آپ پر صلوٰۃ پڑھی جائے؟ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز جنازہ ہی مراد ہے کیونکہ ویسے تو التحیات وغیرہ میں ہمیشہ آپؐ پر درود پڑھا جاتا ہے یہ کوئی شبکی شئے نہیں۔ شبہ جنازہ میں ہی ہو سکتا ہے۔ جیسے آپ کے ننگا کر کے غسل دینے میں اور آپؐ کے مقامِ دفن میں شبہ ہوا۔ اس طرح جنازہ میں شبہ ہوا۔ آخر غسل آپ کو کپڑوں سمیت دیا گیا اور دفن آپؐ وہیں ہوئے اور جنازہ اکیلے اکیلے پڑھا گیا۔

اُوپر کی روایات اور سب مورخین کا اتفاق یہ دونوں مل کر اس بات کا کافی ثبوت ہیں۔ اول تو اُوپر کی روایات ہی کافی تھیں لیکن مؤرخین کا قریباً اتفاق ان کا مؤید ہو گیا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ سے اس بات پر استدلال کرنا کہ متعدد جنازہ جائز نہیں یہ بالکل غلط ہے بلکہ اس واقعہ سے متعدد جنازہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور اسی واسطے ابن حجر رح وغیرہ نے اس واقعہ کو متعدد جنازہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ شرح شمائل صفحہ مذکورہ میں ملا علی قاری رح لکھتے ہیں۔

قال ابن حجر فیه ان تکریر الصّلوٰة علی المیت لا باس بها۔

یعنی اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ میت پر متعدد جنازہ کا کوئی حرج نہیں۔

اگرچہ اس کے بعد ملا علی قاری نے کہا ہے کہ یہ آپؐ کا خاصہ ہے مگر قبر پر آپؐ کا جنازہ پڑھنا تبلا رہا ہے کہ خاصہ نہیں۔ ہاں اکیلے اکیلے پڑھنا بے شک خاصہ ہے کیونکہ باوجود جماعت ہو سکنے کے حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت علی رضہ نے جماعت کی اجازت نہیں دی۔ اور اکیلے اکیلے پڑھنے کا ارشاد فرمایا بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اخیر وقت اس کی وصیت فرمائی۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ خاصہ ہے۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۱۲ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ - ۱۶ اگست ۱۹۳۵ء

قبرستان میں جنازہ

سوال:۔ قبرستان میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب :۔ عن ابی ھریرۃ ان امراۃ سوداء کانت تقم المسجد او شاب ففقدھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسال عنھا او عنہ فقالوا مات قال افلا اذنتمونی قال فکانھم صغروا امرھا او امرہ فقال دلونی علی قبرہ فدلوہ فصلی علیھا

(مشکوٰۃ باب المشی بالجنازۃ)

یعنی ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک حبشیہ یا جوان مرد مسجد کو جھاڑو دیتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ پایا۔ آپؐ نے اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے کہا وہ مر گیا ہے۔ فرمایا مجھے تم نے خبر کیوں نہیں دی۔ ابوہریرہ رضؓ کہتے ہیں لوگوں نے گویا اس کا معاملہ چھوٹا سمجھا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اس کی قبر بتاؤ۔ انہوں نے قبر بتائی تو آپؐ نے قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔ پھر فرمایا یہ قبریں اندھیرے سے بھری ہیں میرے نماز جنازہ پڑھنے سے خدا ان کو روشن کر دیتا ہے۔

اس حدیث سے قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو گیا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

مسجد میں نماز جنازہ

سوال :۔ کیا مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔

جواب :۔ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا حنفیہ منع کہتے ہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک جائز ہے۔ راجح یہی ہے۔ کیونکہ سہل رضؓ اور سہیل رضؓ کا جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں پڑھا ہے اور کوئی صحیح روایت اس کے خلاف نہیں آئی۔ (عون المعبود شرح ابی داؤد جلد ۳)

عبداللہ امرتسری از روپڑ

۲ رمضان ۱۳۵۴ھ ۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۵ء

میت کو دفن کر کے قبر پر دعا کرنا

سوال :۔ میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے ثابت ہے یا نہیں؟ (تاج الدین موضع بڈھا گورایہ ضلع گوجرانوالہ)

جواب: میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعاء کرنے کی حدیث مشکوٰۃ وغیرہ میں موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اسْتَغْفِرُوا لِاَخِيْكُمْ ثُمَّ سَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيْتِ فَاِنَّهُ الْاٰنَ يُسْاَلُ۔

(مشکوۃ باب اثبات عذاب القبر)

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دفن میت سے فارغ ہو کر قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے دعا بخشش کرو۔ اور اس کے لئے بارگاہ ایزدی میں ثابت قدمی کی درخواست کرو۔ وہ اس وقت سوال کیا جاتا ہے۔

لیکن عام طور پر لوگ دعاء اس کو سمجھتے ہیں جس میں ہاتھ اٹھائے جائیں۔ حالانکہ دعاء ہاتھ اٹھائے اور بغیر ہاتھ اٹھائے دونوں صورتوں میں ہوتی ہے۔ مثلاً نماز کے اندر۔ سجدہ میں اور بین السجدتین اور بعض دفعہ قیام میں بلا ہاتھ اٹھائے دعا ہوتی ہے۔ اس طرح قبر پر اختیار ہے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے یا بغیر ہاتھ اٹھائے ہاں ہاتھ اٹھانا آداب دعا سے ہے اس لئے اٹھانا بہتر ہے مگر لازم نہ سمجھے۔ اور اگر کوئی ہاتھ نہ اٹھائے تو اس پر اعتراض نہ کرے جیسے فرضوں کے بعد کی دعا میں کوئی ہاتھ نہ اٹھائے تو ناواقف لوگ اعتراض کرتے ہیں

عبداللہ امرتسری روپڑی

۴ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ

لحد کو پکی اینٹوں یا پکے برتنوں سے بند کرنا

سوال: میت کو لحد میں رکھ کر بجائے کچی اینٹوں کے لحد کو مٹی کے پکے ہوئے برتنوں سے بند کرنا جائز ہے یا نہیں۔

جواب: چونکہ انسان کچی مٹی سے پیدا ہوا ہے اس لئے لحد میں اور قبر پر پختہ اینٹیں نہ لگائی جائیں قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔

یعنی ہم نے مٹی سے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں نکالیں گے

اسی لئے دفن کے وقت یہ آیت پڑھی جاتی ہے پس لحد کو پکے برتنوں سے بند کرنا نا جائز ہے۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۲۶ محرم ۱۳۵۶ھ - ۹ اپریل ۱۹۳۷ء

میّت کو نکال کر دوسری جگہ دفن کرنا

سوال :۔ چوہدری صاحب فوت ہوگئے ہیں۔ ان کی وصیّت کے مطابق ان کو ایسی جگہ دفن کیا گیا ہے کہ وہ جگہ قبرستان سے علیحدہ ہے۔ بلکہ ان کے مہمان خانہ کے پاس ایک کونہ میں جگہ ہے۔ صندوق میں بند کرکے ان کو دفن کیا گیا ہے۔ اب ہمارا ارادہ ہے کہ مرحوم کو اس جگہ سے نکال کر مسجد کے قریب دفن کریں تاکہ وہاں پر ہر نمازی مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرے۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیا جب صندوق نکالیں تو میّت کو دوبارہ غسل دیں یا اس طرح بند کا بند دوسری قبر میں دفن کردیں۔

جواب :۔ بہتر تو یہی ہے کہ جس طرح مرحوم سپرد خاک ہوگئے ہیں اسی طرح رہنے دیں جن کو مرحوم کے ساتھ ہمدردی ہے اُن کی دُعائیں دُور سے بھی پہنچیں گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جہاں کوئی ہو اُس کا درود مجھے پہنچتا ہے۔ دعا اور درود کا ایک ہی حکم ہے۔ ہاں اگر نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیئے جائیں تو گنجائش ہے۔ حضرت جابرؓ کے والد عبداللہ جنگ احد میں شہید ہوگئے۔ اور ایک دوسرے شخص کے ساتھ دفن کئے گئے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں۔ میرا دل برداشت نہ کرسکا کہ میرے والد دوسرے کے ساتھ دفن رہیں۔ تقریباً چھ ماہ بعد نکال کر دوسری جگہ دفن کردیئے۔ اُن کی لاش اسی طرح صحیح وسالم تھی صرف کان میں ذرا سا اثر تھا۔ یہ حدیث بخاری شریف کتاب الجنائز میں ہے۔ اِس سے گنجائش ملتی ہے کہ میت دوسری جگہ دفن کردی جائے مگر ایک خطرہ ہے کہ کہیں میت پھٹ نہ گئی ہو۔

صندوق میں دفن کرنے کا رواج ٹھیک نہیں۔ مسنون طریقہ خیر قرون میں براہ راست مٹی میں دفن کرنے کا تھا۔ خیر ہوچکا سو ہوچکا آئندہ محتاط رہنا چاہیئے۔

غسل، کفن، جنازہ کی دوبارہ ضرورت نہیں۔ چنانچہ جابرؓ وغیرہ کی روایت وغیرہ میں دوبارہ کفن

وغیرہ کا ذکر نہیں۔ ہاں اگر کفن مٹی نے کھا لیا ہو تو صرف کفن دوبارہ ضروری ہے۔ غسل جنازہ ضروری نہیں۔ اگر کوئی غسل دے دے تو منع بھی نہیں۔ اسی طرح جنازہ کا حکم ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۵ جمادی الثانی ۱۳۸۰ھ۔ ۲۵ نومبر ۱۹۶۰ء

ماتم پرسی کے وقت فاتحہ خوانی

سوال:۔ کسی کے مرجانے کے بعد جو دعا، فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور ماتم پرسان ماتم والے کے گھر جا کر دعا یا فاتحہ پڑھ کر اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور مردہ کی روح کو ثواب بخشتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں:۔

عبداللہ گوجر

جواب:۔ مسند احمد میں جریر بن عبداللہ بجلی سے روایت ہے۔

كنا نعد الاجتماع الى اهل الميت وصنعة الطعام بعد دفنه من النياحة

یعنی اہل میت کی طرف جمع ہونا نیز کھانا تیار کرنا ہم نوحہ سمجھتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل میت کے گھر میں جمع ہونا نوحہ یعنی رونے پیٹنے میں داخل ہے۔ نیز پہلے روز یا تیسرے روز یا ساتویں روز یا چالیسویں روز یا ششماہی یا سالانہ جو کھانا پکتا ہے یہ بھی نوحہ میں داخل ہے اور ابوداؤد میں حدیث ہے۔

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم النائحة والمستمعة

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی پر لعنت کی ہے

اب جو لوگ اہل میت کے گھر میں صبح و شام یا تیسرے روز یا کسی اور دن میں ماتم پرسی یا فاتحہ کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ان کو اس بات سے توبہ کرنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا یہ فعل نوحہ میں داخل ہو کر لعنت کا باعث ہو جائے۔ ثواب حاصل کرتے کرتے عذاب میں گرفتار ہو جائیں اور آیت کریمہ یحسبون انهم یحسنون صنعا کے نیچے آ جائیں۔ یعنی سب سے زیادہ ٹوٹے والے ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی فاتحہ خوانی کا کوئی ثبوت نہیں۔ نہ خیر قرون میں یہ کام ہوا۔ پس یہ بدعت ہوا اور حدیث میں ہے کل بدعة ضلالة

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲ شعبان ۱۳۸۰ھ ۳۰ جنوری ۱۹۶۱ء

منہدم قبر کی مرمت

سوال :۔ قبر اگر گر جائے تو اور مٹی ڈال کر درست کر دینی چاہیئے یا نہیں اور کچی مٹی سے لیپ دینی چاہیئے یا نہیں۔

جواب :۔ بظاہر اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ لحد پر جو اینٹیں چنی جاتی ہیں وہ زائد مٹی ہوتی ہے جو قبر کی مٹی کے علاوہ ہے۔ باقی لپائی کی بجائے مسنون طریقہ چھڑکاؤ ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ بس اس پر اکتفا کرنی چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور۔ ۲ شعبان ۱۳۸۰ھ

خسف شدہ بستی میں دفن کا حکم

سوال :۔ خسف شدہ بستی جو کہ بصورت ٹیلہ اونچان موجود ہو وہاں گورستان بنانا جائز ہے۔

جواب :۔ جہاں ثمود ہلاک ہوئے وہاں سے جلدی گزر جانے کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بیان کی ہے کہ کہیں تمہیں بھی وہ عذاب نہ پہنچے جو ان کو پہنچا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی جگہ غضب الٰہی کی جگہ ہے۔ پس ان میں دفن کرنا ٹھیک نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

قبر پر قرآن مجید پڑھنا اور مزار پر نذر و نیاز چڑھانا

سوال :۔ کیا مزار پر نذر نیاز چڑھانا اور قبر پر قرآن مجید پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب :۔ نذر نیاز قبر پر چڑھانا اور اس کا کھانا حرام ہے۔ خواہ میوہ ہو یا کوئی اور شے۔ قرآن مجید میں ہے وما اھل بہ لغیر اللہ۔ جو غیر اللہ کی تعظیم کے لئے نامزد کی جائے وہ حرام ہے۔

قبر پر قرآن مجید پڑھنا

رہا قرآن مجید قبر پر پڑھنا سو اس کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت۔ ایک یہ کہ جیسے آج کل رواج ہے کہ قبر پر مجاور بن کر پڑھتے ہیں نیز سال کے بعد

عرس کرتے ہیں، دُور دراز سے لوگ جمع ہوتے ہیں، اور قرآن مجید پڑھتے ہیں اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں اور حدیث میں ہے۔

من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھو ردٌ (مشکوٰۃ باب الاعتصام)

یعنی جو شخص ہمارے دین میں نئی بات پیدا کرے جو اس سے نہیں وہ مردود ہے

دُوسری صُورت

یہ ہے کہ کوئی خاص طریق مقرر نہ کرے بلکہ جب اتفاق پڑے عام طور پر قبروں کی زیارت کرے اور اس وقت قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخش دے، اس میں اختلاف ہے، امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ امام شافعی رح اور امام مالکؒ اس کے قائل نہیں۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں بحوالہ شرح الصدر سیوطیؒ نے لکھا ہے۔

اختلف فی وصول ثواب القرآن للمیت فجمهور السلف والائمة الثلاثة علی الوصول وخالف فی ذالک امامنا الشافعی رح (مرقاۃ جلد ۲ ص۳۸۲)

یعنی میت کو قرآن مجید کا ثواب پہنچنے میں اختلاف ہے، جمہور سلف اور تین امام پہنچنے کے قائل ہیں اور ہمارے امام شافعیؒ اس کے قائل نہیں۔

ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے۔

اختلف العلماء فی العبادات البدنیة کالصوم والصلوٰۃ وقراءۃ القران والذکر فذهب ابوحنیفة وجمهور السلف الی وصولها والمشهور من مذهب الشافعیؒ ومالک عدم وصولها۔

یعنی عبادات بدنیہ کے ثواب پہنچنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رح اور جمہور سلفؒ پہنچنے کی طرف گئے ہیں۔ اور امام شافعی رح اور امام مالکؒ کے مذہب میں نہ پہنچنا مشہور ہے۔

ان عبارتوں میں امام احمد رح اور امام ابوحنیفہ رح اور جمہور رح کا مذہب ثواب کا پہنچنا بتلایا ہے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مذہب نہ پہنچنا بتایا ہے۔ اور امام مالکؒ کے دو قول نقل کئے ہیں، پہلی عبارت میں پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ دُوسری میں نہ پہنچنے کا امام احمد رح اور امام ابُوحنیفہ کے موافق بعض احادیث بھی آئی ہیں۔

اوّل حدیث:۔ ابومحمد سمرقندی رح نے فضائل قل ھو اللہ احد میں حضرت علی رضؓ سے مرفوع

روایت کیا ہے کہ جو شخص قبروں کے پاس سے گزرے اور قل ھو اللہ گیارہ بار پڑھ کر اس کا ثواب مُردوں کو بخش دے تو مُردوں کی گنتی کے برابر اس کو ثواب دیا جائے گا۔

دوم احادیث ۔ ابوالقاسم سعد بن زنجانی رحہ نے اپنے فوائد میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کیا ہے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو شخص قبرستان میں جائے۔ پھر سورہ فاتحہ قل ھو اللہ احد اور الھاکم التکاثر پڑھ کر کہے کہ یا اللہ! میں نے جو تیرا کلام پڑھا ہے۔ اس کا ثواب اس قبرستان کے مومن اور مسلمان مُردوں کو بخش دیا۔ تو وہ مُردے اللہ تعالےٰ کے پاس اس کی سفارش کریں گے۔

سوم حدیث ۔ عبدالعزیز خلال رحؒ کے شاگرد نے حضرت انس رضؓ سے روایت کیا ہے، رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو شخص قبرستان میں داخل ہو، پھر سورۃ یٰس پڑھے تو اللہ تعالےٰ مردوں پر تخفیف کرتا ہے اور مُردوں کی تعداد کے برابر اس کو نیکیاں ملتی ہیں۔

چہارم حدیث ۔ قرطبی رحؒ نے اپنے تذکرہ میں حضرت انس رضؓ سے مرفوع روایت کیا ہے کہ جب کوئی مومن آیت الکرسی پڑھے اور اس کا ثواب مُردوں کو بخشے تو اللہ تعالےٰ مشرق اور مغرب کی ہر قبر میں نور داخل کرتا ہے اور اُن کی خوابگاہ کو وسیع کرتا ہے۔ اور پڑھنے والے کو ساٹھ نبی کا ثواب دیتا ہے۔ اور ہر میت کے مقابلہ میں اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔ اور ہر میت کے مقابلہ میں اس کے واسطے دس نیکیاں لکھتا ہے۔

پنجم حدیث ۔ دارقطنی میں ہے کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ان کی زندگی میں نیکی کیا کرتا تھا۔ اُن کے مرنے کے بعد ان سے کس طرح نیکی کروں؟ آپ نے فرمایا۔ مرنے کے بعد یہ نیکی ہے کہ اپنی نماز کے ساتھ ان کے واسطے بھی نماز پڑھ اور اپنے روزہ کے ساتھ ان کے لئے بھی روزہ رکھ۔

تبصرہ

پہلی چار حدیثوں میں قرآن مجید کے ثواب پہنچنے کا ذکر ہے۔ اور پانچویں میں دیگر بدنی عبادات (نماز روزہ) کے ثواب پہنچنے کا بیان ہے۔ بعض اور روایات بھی آئی ہیں مگر سب ضعیف ہیں صحیح کوئی نہیں ہے۔

امام نووی رحؒ نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ محمد بن احمد مروزی رحؒ نے کہا ہے۔ میں نے امام احمد بن حنبل رحؒ سے سنا ہے فرماتے تھے۔ جب تم لوگ قبرستان میں جاؤ۔ تو سورہ فاتحہ۔ قل اعوذ برب الفلق۔ قل اعوذ برب الناس اور قل ھو اللہ احد پڑھو۔ اور اس کا ثواب مُردوں کو بخشو۔ مُردوں کو ثواب پہنچے گا۔

امام سیُوطی رحؒ نے قرأت قرآن کی روایتیں ذکر کر کے لکھا ہے۔ اگرچہ یہ ضعیف ہیں۔ لیکن ان کا مجموعہ بتاتا

ہے کہ ان کی کچھ اصل ہے۔

امام سیوطیؒ نے ان کے مجموعہ پر حسن یا صحیح ہونے کا حکم اس لئے نہیں لگایا کہ ان میں ضعف زیادہ ہے اگر ضعف تھوڑا ہوتا تو مجموعہ مل کر حسن یا صحیح کے درجہ کو پہنچ جاتا خیر ان پر عمل سے روکا نہیں جاتا خاص کر جب کہ امام بھی اس طرف گئے ہیں، چنانچہ اوپر امام احمد بن حنبل رح وغیرہ سے نقل ہو چکا ہے۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے۔ اس میں دفن کے وقت سر کی طرف شروع آیات سورہ بقر اور پاؤں کی طرف اخیر آیات بقر کی پڑھنے کا ذکر آیا ہے، اگرچہ یہ روایت بھی ضعیف ہے، مگر مذکورہ بالا روایات کی موید ہے بہر صورت عمل میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف بھی معتبر ہے مگر عمل کا کوئی طریق اپنی طرف سے مقرر نہ کرنا چاہیئے۔ جیسے آج کل مروج ہے کہ قبروں پر مجاور بن کر یا گھروں میں یا مسجدوں میں حلقے باندھ کر پیسوں یا بغیر پیسوں کے پڑھا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت نہیں۔ خاص کر پیسے لے کر ختم کرنا اور اس کا ثواب پہنچانا یہ کسی کا مذہب نہیں بلکہ یہ پیٹ کے بندوں کا اختراع ہے۔ نہیں تو دوسرے کو اس سے کیا فائدہ؟ بلکہ اس طرح پیسے لینے دینے گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمدؒ نے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے پناہ مانگی ہے۔ جو تراویح میں پیسے لے کر سناتا ہے۔ اور حسن بصری رح فرماتے ہیں کہ اس کے پیچھے نماز ہی نہیں ہوتی۔ اور عبداللہ بن مبارک رح سے بھی اس کے قریب۔ مروی ہے۔ ملاحظہ ہو قیام اللیل ص۱۰۳۔

غرض مروجہ طریق ایصالِ ثواب۔ کا طریق نہیں۔ ایصالِ ثواب کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو صرف وہی ہو سکتی ہے۔ جس کا ذکر بعض روایات میں آیا ہے۔ جیسے اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۱ شعبان ۱۳۶۹ھ

دُرود شریف

سوال :۔ جب درود شریف پڑھا جاتا ہے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص آپ کی قبر شریف کے پاس خود سُنتے ہیں؟ اگر نہیں سنتے تو کیسے سُنتے ہیں؟

جواب :۔ یہ حدیث صحیح نہیں۔ ملاحظہ ہو ابن کثیر زیر آیت کریمہ انّ اللہ وملئکۃ یصلون علی النبی۔ (پ ۲۲ ع ۱۳) ضعیف۔ حدیث مسائل اعتقادیہ میں معتبر نہیں ہوتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

شہداء کی زندگی

سوال :۔ جب شہید زندہ ہیں تو اُن کے زندہ ہونے کی کیا نوعیت ہے ؟

جواب :۔ شہداء کی زندگی کی نوعیت حدیث میں ہے کہ پرندوں کی شکل میں ان کے ارواح جسموں میں داخل کئے جاتے ہیں ۔ اور وہ جنت کی سیر کرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ اہلحدیث لاہور

۵ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ ۔ ۱۹ اپریل ۱۹۶۴ء

قبر میں سوال جواب کی کیفیت

سوال :۔ کیا قبر میں سوال وجواب کے وقت آں حضرتؐ کا وجود مبارک میت کے سامنے ہوتا ہے ؟ اِس سوال کی تفصیل یہ ہے کہ قبر میں میت سے یہ سوال کیا جاتا ہے مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیْ بُعِثَ فِیْکُمْ یہ شخص جو تم میں مبعوث ہوا ہے وہ کیا ہے ؟ وہ جواب دیتی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ یعنی محمد اللہ کا رسول ہے ۔ یہ حدیث پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مردہ کے سامنے لائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے ما ھذا الرجل الذی بعث فیکم کیونکہ لفظ ہذا سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت وہاں موجود ہوتے ہیں ۔ اور اگر اس لفظ ہذا کا کوئی دوسرا معنی ہے تو وہ بیان فرما دیجئے ۔

(اے ۔ ای ۔ پٹیل از جوہانسبرگ افریقہ)

جواب ۔ اس سوال کا جواب مولوی محمد نا نا سملاکی نے یہ دیا ہے ۔

لفظ ہذا اس مذکر موجود شے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے موضوع ہے جو قریب ہو ۔ عام اس سے کہ مذکر حقیقی ہو یا حکمی اور موجود خارجی ہو یا ذہنی ۔ روایت مذکورہ فی السوال نیز دیگر روایات مختلفہ فی الباب کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے اوصاف ذکر کئے جاتے ہیں اور پھر اشارہ کر کے کہا جاتا ہے ۔ اگر بندہ مومن ہے تو تمام اوصاف کو سن کر جواب دے دیگا ۔ عبداللہ ورسولہ ۔ پس لفظ ہذا سے مراد نبی کریم صلعم ہیں ۔ اور بعضوں نے روایت مذکورہ فی السوال کی بنا پر یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آنحضرتؐ کا چہرہ مبارک

مکشوف ہوتا ہے اور مکشوف ہونے کے بعد کہا جاتا ہو ماتقول فی ھذا الرجل مگراس بارہ میں کوئی صریح روایت نہیں۔ لی و ھذہ بشارۃ عظمی للمومن وما ذالک علی اللہ بعزیز واللہ سبحانہ و تعالی اعلم۔ ۲۹/۷/۵

حدیث شریفہ میں ہذا کے ساتھ الذی بعث بھی آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول مبعوث سے سوال ہوتا ہے۔ یعنی جو شخص تم میں رسول کرکے بھیجا گیا تھا۔ اس کو کیا کہتے ہو۔ ھذا کے ساتھ جب الذی آئے تو وہاں موجود مراد نہیں ہوتا مگر موصول مع صلہ کی طرف کلام کا رخ ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ من ھذا الذی ھو جند لکم اسی قسم سے ہے جن لوگوں نے کہا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل دکھائی جاتی ہے۔ یہ اُن کا اپنا خیال ہے جس کے ذمہ دار وہی ہیں۔

اس کا فیصلہ آپ فرمائیے۔ (اے۔ ای پٹیل)

جواب:۔ ھذا کی وضع محسوس مبصر مذکر کے لئے ہے جو قریب ہو۔ یہ اس کا حقیقی معنی ہے۔ اس معنی کی بنا پر ترجیح اسی کو ہے کہ میت کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان سے حجاب اُٹھ جاتا ہے اور میت کو آپ کا وجود باجود قریب نظر آنے لگتا ہے۔ پھر "ہذا" کے ساتھ سوال ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ مکشوف ہونے پر کوئی دلیل نہیں یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ دلیل یہی ہذا کا لفظ ہے۔ جب اس کا حقیقی معنی یہی ہے تو مکشوف ماننا پڑے گا تاکہ حقیقی معنی بن سکے کیونکہ حقیقی معنی مقدم ہے۔ جب تک حقیقی معنی بن سکے مجازی نہیں لیا جا سکتا اور یہ کہنا کہ جب ہذا کے ساتھ الذی ہو تو کلام کا رُخ موصول مع صلہ کی طرف ہوتا ہے۔ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں قرآن مجید میں ہے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ۔

اے محمدؐ! کفار جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں۔ کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا (برائی سے) ذکر کرتا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے ہے۔ پھر الذی بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موصول میں ضروری نہیں کہ کلام کا رُخ موصول مع صلہ کی طرف ہو۔ ہاں اگر خارجی دلیل سے ثابت ہو کہ شے سامنے نہیں تو اس صورت میں کلام کا رُخ صلہ کی طرف ہو سکتا ہے۔ جیسے آیت کریمہ اَمَّنْ ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ جُنْدٌ لَّکُمْ، میں ایسا ہی ہے۔ چونکہ خدا کی ذات دنیا میں کسی کے سامنے نہیں اور نہ کوئی خدا

کی ذات کو دنیا میں دیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا نے فرمایا لن ترانی (پ ۹) یعنی اے موسےٰ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا۔ اس لئے اس آیت میں ہذا کا رُخ موصول مع صلہ کی طرف ہے۔ اور حدیث هٰذا الذی بعث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی روئیت سے کوئی مانع نہیں۔ درمیان سے پردہ مکشوف ہو کر روئیت ہو سکتی ہے۔ پس اس میں کلام کا رُخ موصول مع صلہ کی طرف نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ الذی بعث کے یہ معنی کرنے کہ "جو تم میں رسول بنا کر بھیجا گیا ہے" یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ جواب کی عبارت ہے "وہ خدا کا رسول ہے" تو جواب فضول گیا اس لئے الذی بعث کے معنی جو تم میں رسول بنا کر بھیجا گیا نہ کرنے چاہئیں بلکہ اس کے معنی "جو تم میں اٹھایا گیا یا پیدا کیا گیا" کئے جائیں۔ شاید کہا جائے کہ پہلے معنی (جو تم میں رسول بنا کر بھیجا گیا) لینے کی صورت میں یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ جو تم میں رسول بنا کر بھیجا گیا۔ کیا تم اس کو رسول مانتے ہو۔ مومن جواب دے گا کہ وہ خدا کا رسول ہے۔ اور کافر کوئی جواب نہیں دے گا اور یہ مطلب صحیح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کیا کافر اس لئے جواب نہیں دے گا کہ اس کو جواب کا علم نہیں ہوگا یا اس لئے جواب نہیں دے گا کہ وہ انکار پر اَڑ جائے گا۔

پہلی صورت تو ٹھیک نہیں کیونکہ سوال سے اس کو علم ہو چکا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے تو پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جواب کا اس کو علم نہیں۔ اور دوسری صورت بھی ٹھیک نہیں کیونکہ عذاب کے وقت اڑی کیا؟ نیز احادیث میں صاف آیا ہے کہ کافر کہے گا ھاہ ھاہ لا ادری (یعنی ہائے ہائے مجھے پتہ نہیں) ۔ یہ بے علمی کا اظہار رہتا رہا ہے کہ پہلے معنی (جو تم میں رسول بنا کر بھیجا) ٹھیک نہیں۔ اگر کہا جائے کہ کشوف مراد لینا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا ہے۔ ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وجود کرنا تو مفید ہو سکتا ہے کیونکہ وہ پہچان سکتے ہیں جنہوں نے نہیں دیکھا ان کے سامنے آپ کا وجود کرنا کیا فائدہ؟ نیز جن کافروں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے جیسے ابوجہل وغیرہ تو وہ پہچان کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کا رسول ہے۔ ان کے ہاہ۔ ہاہ لا ادری کہنے کا کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو نہیں دیکھا وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وجود باجود کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ خدا کا رسول ہے۔ کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن جب کہے گا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں تو منکر نکیر کہیں گے تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں تو وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی۔ پس ان پر ایمان لایا اور ان کی تصدیق کی یعنی اللہ کی کتاب میں جو ان کے اوصاف یا ان کا حلیہ

بتایا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر مومن فراستِ ایمانی سے اندازہ کرے گا کہ یہ وہی رسول ہیں جن پر میں ایمان لایا ہوں رہے کفار جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شکل مبارک سے واقف ہیں آپ کی رسالت سے واقف نہیں کیونکہ ان کو ایمان نہیں۔ اگر بالفرض وہ دنیا میں رسالت سے واقف بھی ہوں تو بھی ایمان نہ لانے کی وجہ سے ناواقفوں میں اُٹھتے ہیں۔ پس ترجیح اسی کو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مکشوف ہو کر سامنے ہوتے ہوں۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

تعاقب

مولوی عبدالجلیل سامرودی نے اخبار محمدی دہلی اور اہل سنّت والجماعت امرتسر میں محدث روپڑی کے فتویٰ پر تعاقب کیا جو حسب ذیل ہے۔

آپ نے اپنی تحقیق کا نتیجہ یہ ظاہر فرمایا کہ پس ترجیح اسی کو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکشوف ہو کر سامنے ہوتے ہیں۔ تعجب ہے کہ موصوف ایک امر مرہوم کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اگر کتب احادیث کو کھول کر ملاحظہ فرماتے تو اس ترجیح کو مرجوح قرار دیتے۔ دیکھئے صحیح البخاری "باب المیت یسمع خفق النعال" میں بروایت انس رضؓ ملاحظہ ہو بلفظ فیقولان له ماکنت تقول فی هذا الرجل محمد صلی الله علیه وسلم لفظ باب عذاب القبر (فی هذا الرجل) لمحمد صلی الله علیه وسلّم۔ اسی حضرت انسؓ کی روایت سے ابن مردویہ نے بلفظ فی هذا الرجل الذی کان بین ایدیکم الذی یقال له محمد کما فی شرح الصدور ص۴۲ الدر المنثور ص۸۱ جلد ۴۔ مسند احمد میں حضرت اسماء رضؓ سے ص۳۵۳ جلد ۶ میں بلفظ ماتقول فی هذا الرجل قال ای رجل قال محمد نیز دیکھو شرح الصدور ص۵۷ کتاب الروح ص۴۲ الدر المنثور ص۹۵ ج ۴ طبرانی کبیر کے لفظ فیقال له رجل یقال له محمّد ماهو انتهی دیکھو کنز العمال ص۹۵ ج ۸ ابن کثیر ص۹۵ ج ۵ میں بروایت ابن جریر ابوہریرہ سے اور خود ابن جریر ص۱۲۳ ج ۱۳ مستدرک حاکم ص۳۸۰ ج ۱۔ بلفظ ارئیت هذا الرجل الذی کان فیکم ما تقول فیه وما تشهد به علیه فیقول امحمد فیقال له نعم الخ لفظ مستدرک فیقول ای رجل فیقولون الرجل الذی کان فیکم قال فلا یهتدی فیقولون محمد الحدیث۔ یہ روایتیں ببانگِ دہل بتلا رہی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر میں مکشوف ہو کر سامنے ہونا کسی اجنبی کا مقولہ ہے۔ محدّثین کا ہرگز اعتقاد نہیں۔ آپ کا بذاتِ خود مکشوف ہو کر سامنے ہونا

لغو محض ہے۔ اگر کوئی نص نبوی سے بالتنصیص ثابت ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود مکشوف ہو کر سامنے ہوتے ہیں تو مع حوالہ کتاب ظاہر فرمائیں۔ والا اس خیال شنیع سے رجوع فرمائیں۔

(ابو عبدالکبیر محمد عبدالجلیل السامرودی محمدی ۱۵ دسمبر ۳۵ء واہل سنت والجماعت ۱۶ دسمبر ۳۵ء)

جواب

مذہب اہلحدیث وہی ہے جو حدیث سے سمجھا جائے، اور حدیث سے ترجیح اسی کو ثابت ہوتی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں کیونکہ ہذا کا لفظ اس بارہ میں صاف ہے۔

مولوی عبدالجلیل کے پیش کردہ دلائل ہمارے مؤید ہیں، کیونکہ سب میں ہذا کا لفظ موجود ہے۔ صرف ایک میں نہیں، سو وہ سوال کی الگ صورت ہے۔ ہماری بحث صرف اس سوال میں ہے جو ھذا کے ساتھ ہے، شاید مولوی عبدالجلیل نے خیال کیا ہوگا کہ قبر میں سوال سب سے ایک طرز پر ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال ہو تو اور ڈبل غلطی ہے، کیونکہ احادیث میں سوال کی چار صورتیں آئی ہیں۔ ایک ھذا الرجل (معرفہ) کے ساتھ خواہ اس کے ساتھ آپ کا نام یا کوئی صفت ہو یا نہ دوم رجل (نکرہ) کے ساتھ اس میں نام صفت کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے رجل یقال لہ محمد ما ھو۔ سوم مَن کے ساتھ جیسے مَنْ نَّبِیُّکَ یا مَنِ الرَّسُوْلُ الَّذِیْ بعث الیکم چھارم۔ شہادت کے ساتھ جیسے ماشھادتک ۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر جلد ۵ ص۲۹۵۔ ص۲۹۶۔

آخر الذکر تین سوالوں سے تو ہماری بحث نہیں کیونکہ ان میں سوال ہی ایسی طرز کے ساتھ ہے جس کا کشف سے کوئی تعلق نہیں، صرف پہلے سوال سے بحث ہے، اس میں کشف ہے یا نہیں، ظاہر یہی ہے کہ کشف ہوتا ہے کیونکہ لفظ ہذا اسی کو چاہتا ہے۔ اس سوال میں کئی طرح کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض سوال میں محمد کا لفظ ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالجلیل کی پیش کردہ عبارات سے پہلی اور تیسری عبارات میں ہے اور بعض میں نہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالجلیل کی پیش کردہ عبارات سے دوسری اور چھٹی عبارت میں نہیں۔ چھٹی میں تو ظاہر ہے کیونکہ اگر سوال میں لفظ محمد ہوتا تو میت اَمُحَمَّدٌ یا اَیُّ رَجُلٍ کے ساتھ سوال کیوں کرتی۔ اور دوسری عبارت میں فی ھذا الرجل لمحمد ہے، یعنی منکر نکیر ھذا الرجل سے محمد کی طرف اشارہ کرتے ہیں پس لمحمد منکر نکیر کے سوال میں نہیں بلکہ منکر نکیر کے سوال میں ھذا الرجل کا مشار الیہ تبلایا گیا ہے۔ خواہ تبلانیوالے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یا کوئی راوی ہو۔

تفسیر ابن کثیر میں مومن کے سوال میں لکھا ہے ماتقول فی ھذا الرجل یعنی النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم فقال من قال محمّد۔ یعنی اس شخص کے حق میں تو کیا کہتا ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم۔ مردہ کہتا ہے۔ کون ؟ فرشتہ کہتا ہے۔ محمد!

فاجر یا کافر کے سوال میں لکھا ہے۔ ماتقول فی ھذا الرجل قال ای رجل قال محمد یعنی اس شخص کے حق میں تو کیا کہتا ہے۔ مردہ کہتا ہے کونسا شخص۔ فرشتہ کہتا ہے محمد۔ ملاحظہ ہو ص۲۹۔

ان مختلف الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا چہرہ مبارک مکشوف ہو کر سامنے ہوتا ہے تو بعض میّتیں تو صرف چہرہ ہی کو دیکھ کر معلوم کر لیتی ہیں کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اور بعض میّتوں کو اس میں تردّد رہتا ہے تو وہ امحمد یا ای رجل کہہ کر سوال کرتی ہیں۔ یعنی کیا یہ محمدؐ ہے یا یہ کونسا آدمی ہے۔ فرشتے اس کے جواب میں نعم کہتے ہیں یا محمد کہتے ہیں۔ یعنی ہاں یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔

بہرصورت یہ تمام الفاظ ہمارے مؤید ہیں۔ کیونکہ ان میں وہی ھذا کا لفظ ہے۔ اور میّت کا امحمد یا ای رجل کے ساتھ سوال کرنا یہ بھی ہمارا مؤید ہے۔ کیونکہ یہ پورا جملہ نہیں۔ اس کے آگے پیچھے کچھ عبارت مقدر ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہذا مقدر ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے منکر نکیر کے سوال میں ہذا ہے۔ اس بنا پر پہلے سوال کی عبارت یوں ہوئی اھذا محمد یا محمد ھذا۔ یعنی کیا یہ محمدؐ ہے یا کیا محمدؐ ہے یہ ؟ اور دوسرے سوال کی اصل عبارت یوں ہوئی۔ ای رجل ھذا۔ یعنی یہ رجل کونسا ہے۔ گویا ان سوالوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی میت کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کی طرف وہ اشارہ کر کے سوال کرتی ہے۔

ناظرین خیال فرمائیں کہ جن دلائل کو مولوی عبدالجلیل ہمارے مقابلہ میں پیش کر رہے ہیں وہ دراصل ہمیں مفید ہیں۔ مگر مولوی عبدالجلیل غلط فہمی سے اُسے اہلحدیث کا مسلک نہیں سمجھتے۔ خدا ایسی غلط فہمی سے بچائے اور عبارات میں غور و تدبر کی توفیق بخشے۔ آمین

(عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ مدیر تنظیم)

تعاقب

مولوی عبدالجلیل نے محدث روپڑی کے اس جواب پر حسب ذیل تعاقب کیا ہے۔

کہ اگر وفات کے بعد مکشوف کا مسئلہ صحیح ہے تو آن واحد میں بے حساب سے سوال ہوتا ہے تو آپ کی ذات کو تو اس حاضری سے فرصت نہ ملتی ہوگی۔

بخاری وغیرہ میں ہے کہ ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا۔ انی سائل ھذا عن ھذا الرجل۔ آپ
تو ہرقل کے پاس بھی مکشوف کئے ہوں گے۔ کیونکہ ھذا الرجل حاضر کے لئے ہوتا ہے۔
ابن مردویہ والی حدیث میں موجود ہے ماکنت تقول فی ھذا الرجل الذی کان بین اظہرکم
الذی یقال لہ محمد۔ بلکہ حاکم ص۳۸ جلد اکی روایت فیقال لہ ما تقول فی ھذا الرجل
الذی کان فیکم وماتشھد بہ علیہ فیقول ای رجل فیقولون الرجل الذی کان فیکم
قال فلا یھتدی لہ قال فیقولون محمد۔

لفظ حدیث ھذا الرجل" یہ شخص کے بعد ہی کہا جاتا ہے۔ وہ جو تم میں تھے۔ وہ جنہیں محمدؐ کہا
جاتا تھا۔ نیز دوسری میں ہے وہ جو تم میں تھے تیری گواہی ان کی بابت کیا ہے۔ پھر اس کا سوال کہ کون شخص
ملائکہ کا جواب وہ جو تم میں تھے۔ اتنا کہتے ہوئے بھی نہ سمجھا تو ملائکہ کہیں گے۔ محمد وہ محمد ہیں۔ کیا ان سوالات
جوابات میں صراحۃً ظاہر نہیں ہے کہ حضور موجود نہیں ہوتے۔ آپ کے پاس صرف ھذا لفظ کے اور کوئی
دلیل نہیں ہے۔ یہ مسلک اہلحدیث نہیں بلکہ کسی حنفی کا مذہب ہے۔ مثل عینی وغیرہ کے چنانچہ فاضل
قسطلانی نے لکھا ہے۔

قیل یکشف للمیت حتی یری النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھی بشری عظمۃ للمؤمن
ان صح ذالک ولا نعلم حدیثا مرویا فی ذالک والقائل بہ انما استند لمجرد ان
الاشارۃ لا تکون الا للحاضر لکن یحتمل ان تکون الاشارۃ لما فی الذھن
فیکون مجازا۔

کہا گیا ہے کہ میت کے لئے پردہ اُٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتی ہے اور
اگر یہ صحیح ہو جائے تو مومن کے لئے بڑی خوش خبری ہے۔ اور ہمیں کوئی صحیح حدیث اس بارہ میں معلوم
نہیں۔ اور جو اس کا قائل ہے۔ اس کی دلیل صرف یہی ہے کہ اشارہ حاضر کے لئے ہوتا ہے لیکن احتمال
ہے کہ اشارہ حاضر فی الذہن کی طرف ہو پس یہ مجاز ہوگا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتاویٰ ص۱۱ سوال ۸ کے جواب میں فرماتے ہیں۔ سوال یہ ہے۔

وھل یکشف لہ فی الحال حتی یری النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ویقول لہ ما
تقول فی ھذا الرجل فاجاب بقولہ لعدان اعاد السوال فقال

و ھو ھل یکشف لہ حتی یر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فالجواب ان ھذا لم یرد فی حدیث صحیح وانما ادعاہ من لا یحتج بہ بغیر مستند الا من جہۃ قولہ فی ھذا الرجل وان الاشارۃ بلفظۃ ھذا لا تکون الا للحاضر وھذا لا معنی لہ لانہ حاضر فی الذھن۔

بہر حال یہ سوال کہ میت کے لئے پردہ کھولا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتی ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں آیا۔ اس شخص نے بلا دلیل اس کا دعویٰ کیا ہے جو حجت نہیں۔ دلیل صرف یہ پیش کی ہے کہ ہذا کا اشارہ حاضر کے لئے ہوتا ہے۔ حالانکہ حاضر کے لئے ہونے سے کشف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذہن میں حاضر ہیں ۔

جواب تعاقب

محدث روپڑی نے مولوی عبدالجلیل کے تعاقب کا جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے۔

ہم نے تو بقول آپ کے صرف حدیث کے لفظ ھذا سے استدلال کیا ہے تو آپ نے اس کے مقابلہ میں کیا پیش کیا ہے۔ صرف ابن مردویہ یا حاکم کی روایت حالانکہ اس میں بھی یہی لفظ ھذا ہے۔ باقی الفاظ مثلاً الذی کان بین اظہرکم الذی یقال لہ محمد "وہ جو تم میں تھے وہ جنہیں محمد کہا جاتا تھا" وغیرہ یہ تو کسی طرح ہمارے خلاف نہیں۔ چنانچہ آپ کے پہلے تعاقب کے جواب میں اُوپر تفصیل ہو چکی ہے۔ لیکن دوسرے تعاقب میں آپ کا ان کو دہرانا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ضمیر غائب سے دھوکا لگا ہے آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ضمیر غائب اُسی کی طرف لوٹتی ہے جو کلام کے وقت مخاطب کے سامنے نہ ہو حالانکہ یہ ڈبل غلطی ہے اور یہی غلطی ایڈیٹر اہل سنت والجماعت کو لگی ہے۔ انہوں نے بھی ضمیر غائب ہی سے رسول کا عدم حضور ثابت کیا ہے۔

اس غلطی کی تفصیل سنیئے۔

ا۔ ضمیر کے لوٹانے میں کبھی لفظ کی رعایت ہوتی ہے کبھی معنی کی۔

قرآن مجید میں ہے۔

ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمومنین

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے۔ اور درحقیقت وہ ایمان والے نہیں۔
اِس آیت میں مَنْ کا لفظ مفرد ہے اور معنیٰ اس کا جمع ہے۔ لفظ کی رعایت کریں تو اس کی طرف مفرد کی ضمیر لوٹے گی۔ اگر معنی کی رعایت کریں تو جمع کی لوٹے گی۔ چنانچہ اس آیت میں یقول کی ضمیر مفرد کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور وما ھم بمومنین جمع کی۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے۔ کلّ نفس ذائقة الموت ہر نفس موت کے چکھنے والا ہے۔ عربی میں چونکہ نفس کا لفظ مونث ہے۔ اس لئے اس کی طرف ضمیر مونث لوٹتی ہے۔ خواہ مراد اس سے مرد ہو یا عورت۔ ہماری زبان میں اس کی مثال "ہستی" کا لفظ ہے۔ مراد اس سے خواہ مرد ہو۔ استعمال اس کا مؤنث ہی کی طرح ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اچھی ہستی ہے "اچھا ہستی" نہیں کہا جاتا۔ اس طرح قرآن مجید میں ہے۔

واذا رأوك ان يتخذ ونك الا ھزوا اھذا الذى يذكر الھتكم

اے محمد کفار جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں کیا یہ وہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کو (برائی سے) ذکر کرتا ہے۔

اِس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سامنے ہیں مگر ضمیر غائب لوٹ رہی ہے گویا الذی کے لفظ کی رعایت کی گئی ہے بلکہ ایسے مقام میں لفظ الذی کی رعایت زیادہ فصیح ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنا پتہ بتلاتے ہوئے کہے انا الذی یقال لہ زید تو یہ انا الذی یقال لی زید سے زیادہ فصیح ہے۔ چنانچہ قواعدِ عربیہ میں اس کی تصریح ہے۔ حالانکہ متکلم سامنے ہوتا ہے مگر الذی کے لفظ کی رعایت کی گئی ہے۔ مولوی عبد الجلیل اور ایڈیٹر اہلِ سنّت دونوں بچارے ضمیر غائب کی اُلجھن میں پھنس کر راجح بات سے غائب ہو گئے۔ انا للہ
علاوہ ازیں ان سے اور غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ نمبر وار سُنیئے۔

دوسری غلطی

مولوی عبد الجلیل نے بخاری وغیرہ کے حوالہ سے ہرقل کی حدیث کا یہ ٹکڑا نقل کیا ہے۔ انی سائل ھذا عن ھذا الرجل۔ اِس عبارت میں پہلے ھذا سے ابوسفیان کی طرف اشارہ ہے۔ اور دوسرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف یعنی ہرقل نے ابوسفیان کے ساتھیوں سے اپنے ترجمان کی معرفت کہا کہ میں ابوسفیان سے محمدؐ کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔ مولوی عبد الجلیل کا اس سے یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہرقل کی مجلس میں نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہذا کے استعمال میں سامنے ہونا شرط نہیں لیکن مولوی عبد الجلیل نے

یہاں ڈبل غلطی کی ہے کہ اُخروی معاملات پر قیاس کیا ہے حالانکہ آخرت کا معاملہ عموماً خرقِ عادت ہے ۔ مثلاً قبر کا فراخ ہونا یا تنگ ہونا یا قبر کا میت سے باتیں کرنا ۔ جنت اور دوزخ کی طرف سے کھڑکی کا کھلنا یا سانپ بچھو کا اس پر مسلط ہونا وغیرہ وغیرہ یہ تمام سلسلہ خرقِ عادت کی قسم سے ہے ۔ اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا مکشوف ہونا کوئی بعید امر نہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ جب لفظ کا حقیقی معنیٰ بن سکے تو مجازی جائز نہیں اس بناء پر ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو قبر میں مکشوف مانا جائے تاکہ حقیقی معنیٰ مراد ہو سکے برخلاف ہرقل کی حدیث کے کیونکہ یہ دنیوی معاملہ ہے ۔ اور دنیوی معاملہ میں خرقِ عادت کی صورت میں حقیقی معنیٰ متروک ہو سکتا ہے ۔ جیسے عرب کہتے ہیں " رَاَیْتُ اَسَدًا یَرْمِیْ " میں نے شیر کو دیکھا کہ وہ تیر اندازی کرتا ہے چونکہ شیر کا تیر اندازی کرنا خرقِ عادت ہے ۔ اس لئے شیر کا حقیقی معنیٰ چھوڑ کر اس سے بہادر آدمی مراد لیتے ہیں ۔ ٹھیک اسی طرح ہرقل کی حدیث میں ھٰذا کے لفظ کو سمجھ لینا چاہیئے ۔ کیونکہ ہرقل کی حدیث میں بھی یہی صورت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہرقل کو خط لکھا جس میں اس کو دعوتِ اسلام دی ۔ اس نے خط پڑھ کر دریافت کیا کہ محمدؐ کے رشتہ داروں سے یہاں کوئی موجود ہے ۔ پتہ چلا کہ ابوسفیان اور اُن کے ساتھی موجود ہیں ۔ اس نے ان کو بلا کر ابوسفیان کو سامنے بٹھایا ۔ اور ساتھیوں کو ابوسفیان کے پیچھے بٹھا کر مذکورہ بالا گفتگو شروع کر کے ابوسفیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حالات دریافت کئے ۔ اس سارے واقعہ سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سامنے نہ تھے ۔ اور مکشوف ماننا خرقِ عادت ہے ۔ اس لئے مجازی معنیٰ مراد ہوگا ۔

غرض آخرت کے معاملہ میں خرقِ عادت ایسا ہی ہے ۔ جیسے دنیوی معاملہ میں موافقِ عادت اور موافقِ عادت ہونے کی صورت میں حقیقی معنیٰ مجازی پر مقدم ہے ۔ جب حقیقی بن سکے تو مجازی جائز نہیں ۔ پس قبر میں سوال کی حدیث میں مکشوف ماننا چاہیئے ۔ تاکہ ھٰذا کا حقیقی معنیٰ قائم رہے ۔ ہاں اگر مجازی معنیٰ پر دلیل ہوتی جو حقیقی معنیٰ مراد لینے سے مانع ہوتی تو اس صورت میں حقیقی معنیٰ متروک ہو سکتا ۔ جیسے آیت کریمہ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ ۔ میں اُوپر گزر چکا ہے سا بہاں کوئی وجہ نہیں ۔

تیسری غلطی

مولوی عبدالجلیل نے لکھا ہے کہ ہرقل نے ترجمان سے کہا انی سائل ھذا عن ھذا حالانکہ ہرقل نے اپنے ترجمان کی وساطت سے ابوسفیان کے ساتھیوں سے یہ کہا ۔

چوتھی غلطی :۔ مولوی عبدالجلیل لکھتے ہیں ۔ حافظ صاحب روپڑی نے وہی ھٰذا کی ٹانگ اڑا رکھی

ہے۔ بات یہ ہے کہ حلق سے بات کیسے اُترے۔ آپ لوگ اصولِ مخترعہ کے پابند رہ کر کلام نبی کا اس پرموازنہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُصولِ مخترعہ سے مولوی عبدالجلیل کی مراد حقیقت مجاز کا مسئلہ ہے حالانکہ قسطلانیؒ نے آپ کی نقل کردہ عبارت میں تصریح کی ہے کہ حاضر فی الذین کی طرف اشارہ مجاز ہے اور کتب مبتدا عربیت میں ہذا کو اشارہ حسیہ کی قسم سے شمار کرنا اور ھذا کو قریب کے لئے اور ذاك اور ذالك کو بعید کے لئے یا ذاك کو متوسط کے لئے اور ذالك کو بعید کے لئے کہنا اور جب ھذا کا استعمال معقول (حاضر فی الذین) میں ہو تو اس وقت یہ کہنا کہ اس کو بمنزلہ محسوس کے قرار دے کر اس میں ھذا استعمال کیا گیا ہے یہ سب کچھ اسی نجر کی بنا پر ہے کہ حاضر فی الذھن ھذا کا حقیقی معنی نہیں۔ اور حاشیہ خضری شرح ابن عقیل کے ص۵۹ میں ہے۔

اِسْمُ الْاِشَارَةِ مَا وُضِعَ لِمُشَارٍ اِلَیْهِ اَیْ حِسًّا بِالْاِصْبَعِ وَنَحْوِهٖ فَلَا بُدَّ مِنْ کَوْنِهٖ حَاضِرًا مَحْسُوْسًا بِالْبَصَرِ فَاسْتِعْمَالُهٗ فِی الْمَعْقُوْلِ وَالْمَحْسُوْسِ بِغَیْرِهٖ مَجَازٌ

یعنی اسم اشارہ وہ اسم ہے جو مشار الیہ کے لئے موضوع ہو جس کی طرف انگشت وغیرہ سے حسی اشارہ ہو۔ پس ضروری ہے کہ وہ حاضر ہو۔ اور بصر کے ساتھ وہ محسوس ہو۔ پس معقول میں یا محسوس میں اس کا استعمال جس کی طرف انگشت وغیرہ سے اشارہ نہ ہوسکے مجاز ہے۔

تاج العروس شرح قاموس جلد ۱۰ ص۴۳۳ میں امام ابوالہیثم سے نقل کیا ہے۔

ذَا اِسْمٌ لِکُلِّ مشار الیه مُعَایَنٍ یَرَاهُ الْمُتَکَلِّمُ وَالْمُخَاطَبُ۔

یعنی ذا ہر مشار الیہ کا اسم ہے جس کا مشاہدہ ہو اور متکلم مخاطب اس کو دیکھتے ہوں۔

غرض اس قسم کی تصریحات ائمہ عربیت وغیرہ کی بہت ہیں جن کا اصل یہی ہے کہ حاضر فی الذین ھذا کا حقیقی معنی نہیں بلکہ مجازی ہے۔ پس حقیقت مجاز کے مسئلہ کو اُصولِ مخترعہ کہہ کر ھذا کے حقیقی مجازی معنی میں فرق نہ کرنا یہ ڈبل غلطی ہے۔ اگر الفاظ کے معانی میں حقیقت مجاز کا فرق نہ کیا جائے تو سب معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے۔ مثلاً آیت کریمہ نعبد الٰھك والٰه اٰبائك ابراھیم واسماعیل واسحٰق میں چچا کو بھی باپ کہا ہے۔ اس بنا پر کوئی کہے کہ آیت وراثت وَلِاَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ میں چچا بھی مُراد ہے۔ اگر باپ وغیرہ نہ ہو تو چچا اس کے قائم مقام ہوگا تو کیا یہ صحیح ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ چچا حقیقۃً باپ نہیں بلکہ اس کو مجازاً باپ کہا ہے۔ اس قسم کی بے شمار امثلہ ہیں جو مسئلہ حقیقت مجاز سے

تعلق رکھتی ہیں۔اس کو اصُولِ مختر معہ کہنا غلطی ہے۔

پانچویں غلطی

قسطلانی کی عبارت کو اس محل میں پیش کرنا غلطی ہے۔کیونکہ قسطلانی کے حاضر فی الذین کا احتمال ذکر کرکے اس کو مجاز کہہ دیا ہے۔گویا اس سے اس احتمال کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ حقیقت کے مقابلہ میں مجاز کا احتمال کمزور احتمال ہے۔جس کا ارتکاب بلا دلیل درست نہیں۔پس یہ عبارت درحقیقت ہماری مؤید ہے مگر مولوی عبدالجلیل غلطی سے اپنی موید سمجھ رہے ہیں۔اور اس سے معلوم ہوا کہ عینی رح کا خیال اس مسئلہ میں راجح ہے۔اگرچہ حافظ ابن حجر رح کی تحقیق عموماً بڑی ہوتی ہے مگر بحکم لکل جواد کبوۃ اس مسئلہ میں عینی کی رائے کو ترجیح ہے۔اور حافظ ابن حجر رح کا کہ یہ کہنا کہ آپ حاضر فی الذہن ہیں۔اس کی بابت عرض ہے کہ کیا یہ معنی حقیقی ہے یا مجازی۔اُوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مجازی ہے۔پس عینی کا خیال درست ہوا پس ان پر کوئی چوٹ نہیں اس کے علاوہ آپ کا حاضر فی الذہن ہونا ان لوگوں کی نسبت تو درست ہوسکتا ہے۔جنہوں نے آپ کو دیکھا ہے کیونکہ اُن کے ذہن میں آپ کی خاص شکل وصورت حاضر ہوسکتی ہے لیکن جنہوں نے آپ کو دیکھا نہیں۔ان کے ذہن میں تو آپ کے صفات ہیں جو کلیات ہیں جن میں تعین اور تشخص نہیں تو پھر آپ بعینہٖ حاضر کس طرح ہوئے۔اور جب آپ بعینہٖ حاضر نہ ہوئے اور صرف آپ کی صفات ہوئیں جو کلیات ہیں تو اُن کے نزدیک بھی حاضر فی الذہن ھذا کا حقیقی معنی نہ ہوا۔اس سے بھی معلوم ہوا کہ عینی کا خیال درست ہے اور اگر بالفرض مان لیا جائے کہ حاضر فی الذہن ہذا کا معنی حقیقی ہے تو حاضر فی الخارج بطریق اولیٰ ہذا کا حقیقی معنی ہوگا۔پس اس صورت میں عینی اور حافظ ابن حجر برابر ہونگے کیونکہ لفظ جب دو معنوں کے درمیان مشترک ہو تو بغیر دلیل کے کسی کو نہیں لے سکتے۔نہ حافظ ابن حجر رح کا مذہب ثابت ہوا نہ عینی کا۔ہاں عینی رح کے مذہب کو ایک اور طرح سے ترجیح ہوسکتی ہے وہ یہ کہ حاضر فی الذہن کو ھذا کا حقیقی معنی ماننے کی صورت میں لازم آتا ہے کہ ھذا دو معنوں میں مشترک ہو۔اور اگر حاضر فی الذہن کو مجازی معنی قرار دیں تو اس صورت میں ھذا حقیقت مجاز ہوگا۔اور عربیت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک لفظ اشتراک اور حقیقت مجاز کے درمیان دائر ہو تو اس کو حقیقت مجاز بنانا چاہیئے کیونکہ اشتراک سے حقیقت مجاز کی کثرت ہے پس کثرت پر حمل ہوگا۔ اس بنا پر عینی رح کے مذہب کو ترجیح ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکشوف ہونا ہی غالب رہا۔

چھٹی غلطی ۔مولوی عبدالجلیل نے ایک یہ اشکال پیدا کیا ہے کہ آنِ واحد میں بے حساب اموات سے

سوال ہوتا ہے تو آپ کی ذات کو تو اسی حاضری سے فرصت نہ ملتی ہوگی مگر یہ اشکال مولوی عبدالجلیل کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہماری عبارت یہ ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میت کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتا ہے۔ اور میت کو آپ کا وجود با جود قریب نظر آنے لگتا ہے۔ پھر ہذا کے ساتھ سوال ہوتا ہے"

اس عبارت میں قریب نظر آنے لگتا ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے ذوالقرنین کے قصہ میں قرآن مجید میں مذکور ہے۔ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ۔ یعنی ذوالقرنین نے سورج کو سمندر میں غروب ہوتے پایا۔ اس پر مفسرین نے لکھا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعہ میں سورج سمندر میں غروب ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کو اس طرح دکھائی دیا۔ ٹھیک اس طرح ہماری عبارت ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقعہ ہر ایک کی قبر میں حاضر ہوتے ہیں۔ سچ ہے ؎

وکم من عائب قولا صحیحا   وآفته من الفهم السقیم

مثل مشہور ہے ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہیئے۔ مولوی عبدالجلیل اعتراض تو ہم پر کرتے ہیں، کہ "ایڈیٹر تنظیم" کی عادت قدیمہ ایسی ویسی ہے مگر حقیقت امر یہ ہے کہ بے سوچے سمجھے "قلم برداشتہ اناپ شناپ" لکھتے چلے جاتے ہیں حالانکہ مسائل کا معاملہ بڑی ذمہ داری کا ہے۔ قلم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔ خدا ہدایت دے اور سمجھ دے۔

ساتویں غلطی

مولوی عبدالجلیل نے حافظ ابن حجر وغیرہ کی رائے لکھ کر کہا ہے کہ جو مولانا روپڑی نے طریقہ اختیار کیا ہے وہ اہلحدیثوں کا ہرگز نہیں۔ ناظرین خیال فرمائیں کہ یہ کتنی بڑی ڈبل غلطی ہے۔ اہلحدیث کا طریق تو قرآن و حدیث اور اتباع السلف ہے۔ مولوی عبدالجلیل نے کونسی آیت و حدیث پیش کی ہے جو ہمارے خلاف ہے یا کونسے اقوال سلف پیش کئے ہیں جن سے ہم علیحدہ ہو گئے۔ مولوی عبدالجلیل کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں محض بریلویوں کی ریس ہے کہ یہ وہابی ہیں۔ ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ حقیقت اس کی کچھ نہیں۔ مولوی عبدالجلیل صاحب آپ کی شان کے یہ لائق نہیں آئندہ احتیاط رکھیں۔ خدا آپ کی حفاظت کرے۔ آمین۔

تنبیہ۔ مولوی محمد صاحب ایڈیٹر محمدی نے بھی اس محل میں چند باتیں لکھی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی خدمت میں کچھ عرض کر دیں۔ مولوی محمد صاحب لکھتے ہیں۔

محترم مولانا حافظ صاحب! ذرا ایک بات تو بتلائیں ۔

۱۔ چودہ سو سال کے بعد کے آنے والے کے سامنے چودہ سو برس پہلے کا کوئی شخص جسے کبھی اس نے دیکھا نہ ہو کھڑا کر دیا جائے۔ اور اس سے پوچھا جائے کہ یہ کون ہے؟ تو کیا عقل کہتی ہے کہ وہ صحیح جواب دے سکے گا۔

۲۔ یہ مان لینے سے کہ حضورؐ قبر میں لائے جاتے ہیں۔ آپ کی تشبیہ پیش کی جاتی ہے۔ سوال وجواب میں وہ لطافت ہی باقی نہیں رہتی۔ جو شریعت نے رکھی ہے۔ ذوق سلیم اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔

۳۔ جناب من صرف لفظ ہذا کو جو اس موقعہ پر مثل تشابہ کے ہے۔ لے کر صراحت کو جو مَن نبیّک وغیرہ میں مثل محکمات وغیرہ کے ہے چھوڑ دینا تو شاید آپ اتباع سلف میں داخل نہ کر سکیں۔

۴۔ کیا جناب نے یہ بھی خیال کیا کہ بدعتی طبقہ کے ہاتھ میں جو پہلے ہی حضورؐ کو ہر جگہ حاضر ناظر مانتے ہیں۔ آپ کیسا کچھ ہتھیار دے رہے ہیں۔

۵۔ کیا اس قسم کے الفاظ ایسے مسائل کے استخراج کے لئے کافی ہیں؟ کیا قبرستان کے سلام کا خطاب مردوں کے حساس اور سننے والے مثل زندوں کے ہونے کے لئے بس ہے؟

۶۔ کیا ربی و ربّک اللہ کا خطاب چاند سے کرنا اس لئے بھی کوئی کمال قدرت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے؟ اگر نہیں۔

۷۔ تو کیا جناب کے پاس قرآن وحدیث سے مذہب سلف سے کوئی ایسی دلیل ہے۔ جس سے حضورؐ کا ہر گورے۔ کالے۔ مسلم۔ کافر۔ عربی عجمی کی قبر میں پھیرے کرنا اور موجود ہونا ثابت ہوتا ہو؟

۸۔ لفظ ھذا اگر موجود شے کی طرف اشارہ کے لئے ہی ہے تو پھر اوصاف بیان کرنے کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی۔ جو اتنا لمبا سوال ہو جائے۔

۹۔ لفظ ھذا پر اتنا اصرار کرنا صرف اس کے لفظی معنیٰ کی وجہ سے ہے کہ عقائد اسلام اور اجماع صحابہؓ اور ضروریات دین کے فوت ہونے پر بھی اس لفظ کو اس معنی سے نہ ہٹایا جائے تو پھر اس سوال کے جواب کے لفظ ھُوَ پر بھی ایسا ہی اعتماد کیوں نہیں کرتے؟ وہ تو غائب کی ضمیر ہے۔ پس مان

لیجئے کہ حضورؐ غائب ہو جاتے ہیں، موجود نہیں ہوتے۔

۱۰۔ آخری ایک اور چیز سُن لیجئے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں لفظ ھذا معنیٰ میں ذالك کے ہے یعنی اسم اشارہ قریب کے لئے نہیں بلکہ بعید کے لئے ہے۔ اور اسم اشارہ قریب کا بعید کے لئے اور بعید کا قریب کے لئے لغت عرب میں برابر مستعمل ہے۔ قرآن میں ہے ذالك الكتاب لاريب فيه۔ اس کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ذالك معنیٰ میں ھذا کے ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر محمدی ترجمہ ابن کثیر پارہ اول صد۱۲۔ پس جیسے ذالك معنیٰ میں ھذا کے آتا ہے۔ ویسے ہی ھذا معنیٰ میں ذالك کے بھی مستعمل ہے۔ پس یہاں دوسری حدیثوں کی تشریح کے مطابق لفظ ھذا معنیٰ میں ذالك کے ہے چنانچہ تفسیر محمدی ترجمہ ابن کثیر کے اسی صفحہ میں ہے۔ یہ دونوں لفظ قائم مقام عربی زبان میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ حضرت امام بخاریؒ نے ابو عبیدہؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ عربی کی تفسیر کے لفظ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ فيستعملون كلامنهما مكان الاخر وهذا معروف في كلامهم وقد حكاه البخارى من معمر المثنىٰ عن ابى عبيدة۔ جلد اول مصری صد۶۷۔ مولانا سارا مدار اس لفظ پر تھا اور یہ لفظ دور کے اشارہ کے لئے بھی آتا ہے۔ اب وہ نیو ہی نہ رہی جس پر کشف کی یا شبیہ کی یا حاضری کی عمارت کھڑی کی جائے۔

۱۱۔ قرآن میں ہے ذالكم الله ربكم تو کیا اس میں بھی اللہ میاں کا وجود سامنے موجود تھا۔ جس کی طرف اشارہ ہو۔

۱۲۔ حاشیہ تہذیب میں صراحت ہے کہ لفظ ھذا سے اشارہ کبھی غیر موجود غیر محسوس غیر مشاہد کی طرف بھی ہوتا ہے۔ اُمید ہے کہ ان درجن بھر دلیلوں کے ہوتے ہوئے مکرمی حافظ صاحب مزید غور فرمائیں گے۔

والسلام

محمد اخبار محمدی یکم مارچ ۳۶ء

جواب

۱۔ چودہ سو برس کے بعد آنے والے کا پہچاننا اس کا حل ہم نے پہلے ہی کر دیا تھا کہ جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ وہ بھی آپ کے وجود باجود کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ خدا کے رسول ہیں۔ کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن جب کہے گا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں تو منکر نکیر کہیں گے

تجھے کس طرح معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں؟ تو وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی۔ پس ان پر ایمان لایا۔ اور ان کی تصدیق کی یعنی اللہ کی کتاب میں جو ان کے اوصاف یا ان کا حلیہ بتایا گیا ہے اُسے دیکھ کر مومن فراست ایمانی سے اندازہ کرلے گا کہ یہ وہی رسول ہیں۔ جن پر میں ایمان لایا ہوں۔

(تنظیم ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء)

ہاں بعض میّتوں کو اس میں تردد رہتا ہے تو وہ اَمُحَمَّدٌ یا اَیُّ رَجُلٍ کہہ کر سوال کرتی ہیں چنانچہ ابھی اُوپر ابن مردویہ وغیرہ کی حدیث کے ذیل میں اس کی تفصیل ہوئی ہے۔

۲۔ حضورؐ قبر میں نہیں لائے جاتے بلکہ درمیان سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ جس سے آپ میت کے سامنے ہوجاتے ہیں۔

۳۔ اس سے پہلے تفصیل ہوچکی ہے کہ سوال کی چار صورتیں ہیں۔ ایک ھذا الرجل (معرفہ) کے ساتھ خواہ اس کے ساتھ آپ کا نام یا کوئی صفت ہو یا نہ دوم رجل نکرہ کے ساتھ اس میں نام یا صفت کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے رجل یُقَالُ لَہٗ مُحَمَّدٌ مَا ھُوَ سوم مَنْ کے ساتھ جیسے من نبیّك یا من الرسول الذی بعث الیکم چہارم شہادت کے ساتھ جیسے مَا تَشْھَادُ تِلْکَ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر جلد ۵ ص ۱۹۵۔ ۲۹۶۔ یہ چاروں صورتیں الگ الگ ہیں۔ اگر ان سے من نبیّك وغیرہ محکمات سے ہو تو اس سے یہ کس طرح ثابت ہوا کہ ھذا کی صورت میں کشف نہیں پھر ھذا کو متشابہ کہنا یہ بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ متشابہ وہ ہے جس کے معنی میں اشتباہ ہو۔ اور اس کی تعیین نہ ہو۔ اور ھذا کا معنی معلوم ہے اس میں کوئی اشتباہ نہیں چنانچہ اُوپر تفصیل ہوچکی ہے۔

۴۔ اس کا جواب نمبر ۲ میں آگیا کہ آپ قبر میں نہیں لائے جاتے۔ پس ہم نے بدعتیوں کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں دیا۔ آپ کو مولوی عبدالجلیل کی طرح غلطی لگی ہے۔ ورنہ ہماری کلام کا مطلب واضح ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالجلیل کے اغلاط نمبر ۶ میں تفصیل ہوچکی ہے۔

۵۔ ۶۔ ہمارا مُردوں کو یا چاند کو خطاب کرنا دنیوی معاملہ ہے۔ اور فرشتوں کا ھذا کے ساتھ میت سے سوال کرنا اخروی معاملہ ہے۔ اس لئے اس کا قیاس مُردوں کے یا چاند کے خطاب پر صحیح نہیں۔ چنانچہ مولوی عبدالجلیل کے اغلاط نمبر ۲ میں اس کی تفصیل ہوچکی ہے۔

۷۔ قبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھرنے کے ہم قائل ہی نہیں چنانچہ ابھی نمبر ۴ میں گزرا ہے۔

۸۔ بعض یقینوں کو آپ کے چہرہ مبارک پر نظر پڑنے سے کچھ تردد رہتا ہے تو اُن کے لئے اوصاف کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ابن مردویہ وغیرہ کی حدیث کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔

۹۔۱۰۔ ہمیں معلوم نہیں ہوا کہ **ھذا** کا لفظی معنی لینے میں کونسے عقائد اسلام اور اجماع صحابہؓ اور ضروریات دین فوت ہوتے ہیں۔ اور ضمیر غائب سے غائب سمجھنا یہ مولوی عبد الجلیل کی طرح آپ کی ڈبل غلطی ہے چنانچہ اُوپر گزر چکا ہے۔ اِسی طرح اشارہ بعید کے ہونے سے غائب سمجھنا ڈبل غلطی ہے۔ دیکھئے آفتاب کتنی دُور ہے مگر دن میں سامنے ہے غائب نہیں پھر ھذا کو ذالك کے معنیٰ میں لینا مجاز ہے۔ اس کے لئے آپ نے اس جگہ کوئی قرینہ بیان نہیں کیا۔ اگرچہ ہمارا یہ خیال نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں قریب ہوتے ہیں۔ ہاں یہ خیال ہے کہ میّت کو قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ہذا کو ذالک کے معنیٰ میں لینے پر کوئی قرینہ ہو تو ہم بعید کے قائل ہو جائیں گے۔ مگر اس سے غیب کا ثبوت کسی طرح نہیں ہوتا۔

۱۱۔ ذالکم اللہ ربکم کا جواب وہی ہے جو امن ھذا الذی ھو جند لکم کا ہے جس کا بیان اُوپر ہو چکا ہے۔

۱۲۔ تہذیب کے حاشیہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ مجازی معنیٰ ہے جس کے لئے قرینے کی ضرورت ہے حدیث میّت میں کوئی قرینہ نہیں پھر بلا قرینہ کیونکر مُراد ہو سکتا ہے۔ پس درجن بھر دلیلیں نام ہی کی ہیں کام کی نہیں۔ والسّلام

عبد اللہ امرتسری روپڑی

۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۵۵ھ ۔ ۵ جون ۱۹۳۶ء

قبر میں موذی جانوروں کے کھانے سے میّت کو ایذا کا نہ پہنچنا

سوال:۔ قبر میں میّت کو کرم وغیرہ کھا جاتے ہیں۔ بعض دفعہ کوئی بیرونی جانور نیولہ وغیرہ بھی قبر میں گھس کر مُردہ میت کو کھاتا ہے۔ آیا میت کو اس سے ایذا پہنچتی ہے؟

خاکسار محمد از کلس گاماں ڈاکخانہ کنگن پور ضلع لاہور

جواب:۔ مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت فصل ۳ میں ہے۔

عن عمرو بن حزم قال رانی النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم متکئًا علی قبر

فقال لاتوذ صاحب هذا القبر ولا توذه رواه احمد۔

عمرو بن حزم کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے ایک قبر پر ٹیک لگائے ہوئے دیکھا فرمایا اس قبر والے کو ایذا نہ دے۔

مشکوٰۃ کے اسی باب فصل ۲ میں ہے۔

عن عائشۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کسر عظم المیت ککسرہ حیا رواہ مالک وابوداؤد وابن ماجۃ۔

حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ میت کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔

اس قسم کی کئی ایک روایتیں آئی ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میت کو تکلیف ہوتی ہے مگر بعض روایتوں سے معلوم ہے کہ ظاہر اسباب کا اثر میت پر نہیں۔

عینی شرح بخاری میں ہے۔

مر عبداللہ بن عمر علی قبر عبدالرحمٰن بن ابی بکر اخی عائشۃ وعلیہ فسطاط مضروب فقال یاغلام انزعہ فانما یظلہ عملہ فقال الغلام تضربنی مولاتی قال کلا فنزعہ۔

عبداللہ بن عمر رضؓ عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضؓ حضرت عائشہ کے بھائی کی قبر پر گزرے۔ اس پر خیمہ لگا ہوا تھا فرمایا اے غلام! اس کو اکھاڑ دے۔ کیونکہ اس کو اس کا عمل سایہ کرے گا۔ غلام نے کہا۔ میری مالکہ مجھے مارے گی۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ پس اس کو اکھاڑ دیا۔

اس طرح ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے وفات کے وقت وصیت کی کہ میری قبر پر خیمہ نہ گاڑنا۔ ان دو روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کو دنیوی اشیاء کا فائدہ یا نقصان نہیں۔ نیز حدیث میں ہے۔ جب حضرت حمزہ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچے جنگ احد میں شہید ہوئے اور کفار نے ان کے کان۔ ناک وغیرہ کاٹ کر شکل بگاڑ دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیکھ کر فرمایا کہ میری پھوپھی صفیہ رضؓ (حمزہ کی بہن) برداشت کرے تو میں حمزہ رضؓ کو اسی حال میں چھوڑ دوں کہ کتے بلے کھا جائیں۔ اور قیامت کے دن ان کے پیٹوں سے جمع کیا جائے۔

اس کہنے سے مطلب آپ کا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں ذلت حقیقت میں ذلت نہیں لیکن عورتوں کے دل کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے دفن مناسب نہیں۔ یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ میت زندہ کی طرح نہیں ورنہ زندہ کو بھی اس طرح دکھ دینا درست ہوتا۔ پھر ظاہر پر غور کیا جائے تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میت کو دنیوی اسباب کی تکلیف نہیں۔ مثلاً زندہ کو قبر میں دبا دیں تو اس کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ تو کیا میّت کو بھی دبانے سے تکلیف ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ قبر جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنّم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ ہاں میت کا وقار اور اس کی حیات کی وضع کو قائم رکھنے کے لئے جتنا قدر حدیث میں آگیا۔ اتنا کرنا چاہیئے۔ مثلاً میت کو غسل عزت کے ساتھ دیا جائے۔ کفن اچھا پہنایا جائے۔ عزت کے ساتھ قبر میں اتارا جائے۔ اچھی طرح کی ہڈی توڑنے سے ممانعت بھی اسی وقار پر حمل کرنی چاہیئے۔ اور ایذار سے نہی کی حدیث کا مطلب بھی یہی لینا چاہیئے کہ اس کی توہین نہ کی جائے۔ پس اس صورت میں سب روایتوں میں موافقت ہو جائے گی۔ لیکن یہ جو کچھ ذکر ہوا ہے بدنی ایذاء سے متعلّق ہے۔ رہا سماع کا مسئلہ تو اس کی تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ سماع موتی ملاحظہ کریں۔ بلکہ اس میں بدنی ایذاء کے متعلق بھی کافی مواد موجود ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۲ ربیع الاول ۵۷ھ ۱۳ مئی ۳۸ء

شہید کی لاش کو مٹی کھاتی ہے

سوال:۔ شہید کی لاش کو قبر میں مٹی یا دیمک وغیرہ کھاتی ہے یا نہیں؟

جواب:۔ شہداء کے جسموں کے متعلق قرآن مجید وحدیث میں تشریح نہیں آئی کہ ان کو قبر میں مٹی کھاتی ہے یا نہیں۔ البتہ انبیاء کے اجساد کے متعلق حدیث میں تصریح آئی ہے۔ ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء (ابن ماجہ باب ذکر وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ودفنہ) یعنی اللہ تعالےٰ نے انبیاء کے جسموں کو زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ ان کو کھائے۔ ہاں بعض واقعات اس قسم کے پائے گئے ہیں کہ بزرگوں کی لاشوں کو مٹی نے نہیں کھایا جن سے بعض شہید ہیں اور بعض غیر شہید۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ۲۷ رمضان ۱۳۵۳ھ ۴ جنوری ۱۹۳۵ء

زکوٰۃ کا بیان

فی سبیل اللہ کی تفصیل

سوال :۔ زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے۔ کیا اس میں ہر کار خیر داخل ہے یا اس کا اطلاق صرف جہاد اور حج عمرہ پر ہی ہے؟

جواب :۔ قرآن مجید میں جو مصارف مذکور ہیں ان سے ایک فی سبیل اللہ بھی ہے۔ اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ جہاد کے داخل ہونے پر تو سب متفق ہیں۔ حج بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اس کی بابت ابوداؤد باب العمرۃ میں صریح حدیث موجود ہے۔ اور نیل الاوطار کتاب الزکوٰۃ باب الصرف فی سبیل اللہ میں بعض اور روایتوں کا بھی ذکر ہے جن میں تصریح ہے کہ حج فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اور بعض روایتوں میں عمرہ کی بابت بھی تصریح ہے۔ اگر عمرہ کی تصریح نہ ہوتی تو بھی عمرہ حج کے حکم میں تھا۔ لیکن بعض روایتوں میں تصریح آنے سے اور پختگی ہو گئی۔

بعض کا مذہب

بعض کہتے ہیں فی سبیل اللہ کا لفظ عام ہے۔ کوئی کار خیر ہو۔ اس میں خرچ کر سکتے ہیں۔

تفسیر فتح البیان جلد ۴ صفحہ ۱۴۲ میں ہے۔

وقیل ان اللفظ عام فلا یجوز قصرہ علی نوع خاص ویدخل فیہ جمیع وجوہ الخیر من تکفین الموتی وبناء الجسور والحصون وعمارۃ المسجد وغیر ذالک والاول اولی لاجماع الجمهور علیه۔

یعنی کہا گیا ہے کہ ”فی سبیل اللہ“ کا لفظ عام ہے۔ اس کو ایک قسم پر بند کرنا جائز نہیں۔ اور اس میں تمام کار خیر داخل ہیں۔ جیسے مُردوں کو کفن دینا۔ پُل بنانا۔ قلعے اور مسجدیں تعمیر کرنا وغیرہ وغیرہ اور پہلی صورت جہاد (مع حج) مراد ہونا بہتر ہے۔ کیونکہ اس پر جمہور کا اجماع ہے۔

تفسیر خازن جلد ۲ صفحہ ۲۴۵ میں ہے۔

وقال بعضهم ان اللفظ عام فلا یجوز قصره علی الغزاة ولهذا اجاز بعض الفقهاء صرف سهم سبیل الله الی جمیع وجوه الخیر من تکفین الموتی وبناء الجسور والحصون وعمارة المسجد وغیر ذالك قال لان قوله وفی سبیل الله عام فی الکل فلا یختص بصنف دون غیره والقول الاول هو الصحیح لاجماع الجمهور علیه۔

یعنی بعض نے کہا ہے کہ لفظ عام ہے اس کو صرف غازیوں پر بند کرنا جائز نہیں اس لئے بعض فقہاء نے فی سبیل اللہ کا حصہ ہر کار خیر میں صرف کرنا جائز قرار دیا ہے۔ مثلاً مردوں کو کفن دینا، پُل بنانا قلعے اور مسجدیں تعمیر کرنا وغیرہ۔ انہوں نے کہا ہے کہ فی سبیل اللہ کا لفظ عام ہے۔ ایک قسم کے ساتھ بند نہیں ہوگا۔ اور پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اس پر جمہور کا اجماع ہے۔

تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۴۱۴ میں ہے۔

واعلم ان ظاهر اللفظ فی قوله وفی سبیل الله لا یوجب القصر علی کل الغزاة فلهذا المعنی نقل القفال فی تفسیره عن بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الی جمیع وجوه الخیر من تکفین الموتی وبناء الحصون وعمارة المساجد لان قوله وفی سبیل الله عام

یعنی اس بات کو جان لے کہ لفظ فی سبیل اللہ کا ظاہر عام ہے۔ غازیوں پر بند کرنے کو واجب نہیں کرتا۔ اس وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہا سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے تمام اُمورِ خیر میں صدقات کا صرف کرنا جائز رکھا ہے۔ جیسے مُردوں کو کفنانا۔ قلعے، مسجدیں تعمیر کرنا۔

تبصرہ

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ لفظ فی سبیل اللہ عام ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض فقہاء اس طرف گئے ہیں۔ اگر اس پر کوئی عمل کرے تو اس پر اعتراض تو نہیں ہو سکتا مگر چونکہ زکوٰۃ فرضی صدقہ ہے۔ اس کو ایسی طرز پر ادا نہ کرنا چاہیئے۔ جس میں تردد رہے۔ دیکھئے نماز میں جب شک ہو جاتا ہے کہ ایک رکعت پڑھی ہے یا دو۔ تو حکم ہے کہ ایک اور رکعت پڑھے تاکہ شک سے نکل جائے۔ پس زکوٰۃ بھی قرآن میں نماز کے ساتھ ذکر ہوئی ہے۔ اس لئے اس میں بھی احتیاط چاہیئے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا

جائے یا حج عمرہ ۔کیونکہ جہاد تو بالاتفاق مراد ہے۔ اور حج عمرہ حدیث نے داخل کر دیا ہے ۔مگر جیسا عام ہے ویسا رکھا جائے تو پھر فقراء و مساکین وغیرہ کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔حالانکہ اس آیت میں فقراء و مساکین وغیرہ کا الگ ذکر کیا ہے ۔اس لئے ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد خاص ہے ۔اور خاص بغیر دلیل کے مراد نہیں ہو سکتا۔ دلیل یا تو آیت ہے یا اتفاق مفسرین ہے ۔جیسا جہاد کے مراد ہونے پر اتفاق ہے یا حدیث اور تفسیر صحابہؓ ہے ۔جیسا حج عمرہ مراد ہونے پر ہے ۔ باقی کی بابت کوئی دلیل نہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

تبلیغ ۔مدارس ۔امداد طلبا بذریعہ کتب ۔پارچات وخوراک مصارف زکوٰۃ ہیں؟

سوال ۔بیت المال میں زکوٰۃ جمع کر کے حسب ذیل مصارف پر خرچ کیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو سکتی ہے؟

۱۔ ماتحت تنظیم توحید و سنت کی اشاعت بذریعہ تقریر و تحریر۔

۲۔ خرید کتب و سامان انجمن جن کتابوں سے اشاعت اسلام و تدریس طلباء مطلوب ہے۔

۳۔ امداد طلباء مقامی بذریعہ کتب ۔پارچات و ضروریات خوراک وغیرہ۔

۴۔ مدارس اسلامیہ ۔

۵۔ تنظیم جماعت پر خرچ ۔

جواب ۔ جہاد جیسا تلوار سے ہوتا ہے ویسا ہی زبان سے بھی ہوتا ہے ۔حدیث میں ہے

من جاهدهم بيده فهو مومن ومن جاهدهم بلسانه فهو مومن ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن وليس وراء ذالك حبة خردل من الايمان رواه مسلم (مشكوة صـ۲۹)

یعنی جو ہاتھ سے ان کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے ۔اور جو زبان سے ان کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے ۔اور جو دل سے ان کے ساتھ جہاد کرے وہ مومن ہے ۔ اور اس کے ورے رائی برابر بھی ایمان نہیں۔

پس اس میں مناظرے ۔اشاعت اسلام پر خرچ کرنا داخل ہو گیا ۔لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل

ہے۔ وہ یہ کہ ایسی شے پر صرف نہ کرے جو وقف ہو۔ جیسے مدرسہ کی عمارت۔ خرید کتب وغیرہ۔ چونکہ اس سے پھر وہی صورت پیدا ہو جائے گی جس میں اختلاف ہے۔ جیسے مساجد اور قلعوں کا تعمیر کرنا حالانکہ قلعے دشمن سے جنگ کرنے کے لئے اور ان سے حفاظت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اور مسجدیں نماز اور تعلیم و تعلم کے لئے ہوتی ہیں۔ خاص کر قرآن و حدیث کا پڑھنا پڑھانا مسجدوں ہی کے لائق ہے اور قرآن و حدیث کا پڑھنا پڑھانا عین اشاعت اسلام ہے مگر پھر بھی جمہور مفسرین اس کے خلاف ہیں۔ اس لئے زکوٰۃ کا مال مدارس کی عمارت اور خرید و کتب وغیرہ پر صرف ہونے میں ذرا شبہ ہے اس میں احتیاط چاہیئے۔

طلباء کی امداد

ہاں! زکوٰۃ کی مد سے طلباء کی امداد کی جائے وہ اس سے کتب خریدیں یا کسی اور ضرورت میں خرچ کریں تو بہت اچھا ہے۔ اس طرح مدرسین کی تنخواہیں۔ مناظرین اور مبلغین کا کرایہ اور دیگر اخراجات زکوٰۃ سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر غنی ہو تو اس کو بچنا بہتر ہے۔ کیونکہ امام ابوحنیفہ رحہ اور دیگر ائمہ کا قول ہے کہ جنگ میں زکوٰۃ وہی شخص لے سکتا ہے جس کے پاس خرچ نہ ہو۔ پس جب جنگ میں غنی کی بابت اختلاف ہوا تو تعلیم و تعلم کا معاملہ تو اس سے نازک ہے کیونکہ فی سبیل اللہ سے اصل مراد تو جنگ ہے اور حدیث کی تصریح نے حج عمرہ کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے اور تعلیم و تعلم وغیرہ کی بابت تصریح نہیں آئی۔ صرف ایک قسم جہاد ہونے کی وجہ سے داخل کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں احتیاط برتنا چاہیئے۔ اور غنی کو پرہیز رکھنا چاہیئے۔

اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض (الایۃ) اس آیت سے پہلے صدقات کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا ہے یہ صدقات اُن فقیروں کے لئے ہیں جو اللہ تعالےٰ کے راستہ میں بند ہیں۔ زمین میں سفر نہیں کر سکتے۔ یعنی تجارت وغیرہ نہیں کر سکتے۔ (کیونکہ سفر کرنے سے دین کا کام بند ہو جاتا ہے)

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

زکوٰۃ کا جماعتی صورت میں خرچ کرنا

سوال:۔ جماعتی صورت میں زکوٰۃ کا خرچ کرنا بہتر ہے یا انفرادی صورت میں؟

جواب:۔ جو کام جماعت کی صورت میں ہو وہ بالاتفاق بہتر ہے۔ بلکہ اس کی بہت فضیلت ہے اور جماعتی صورت میں کام ہونا یہ کسی مستحق سائل کو دینے سے مانع نہیں۔ بیت المال میں سب زکوٰۃ جمع کی جائے۔ اور اس سے آئے گئے سائل کو بھی دے دیں۔ یہ بہت اچھی صورت ہے۔

عبداللہ امرتسری

دریوزہ گر کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ جو لوگ در بدر لقمہ لقمہ مانگتے پھرتے ہیں ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ جو لوگ دروازے دروازے لقمہ لقمہ مانگتے پھرتے ہیں اُن کو زکوٰۃ دینے سے بچنا چاہیئے کیونکہ ایسے سائل اکثر بے دین ہوتے ہیں۔ نیز اس طرح ادا کرنے سے ایک بڑی غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ سال بھر زکوٰۃ گھر میں بند رکھتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی آئے گئے کو دیتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر درمیان سال کے موت آگئی تو زکوٰۃ اپنی زندگی میں ادا نہ ہوئی۔ اور یہ فرض ذمے رہ گیا۔ اگر بیت المال میں دے دی جائے تو اس کی طرف سے ادا ہو گئی پھر خواہ آہستہ آہستہ ہی خرچ ہو۔ بہرصورت بیت المال والی صورت بہت بہتر ہے جس میں بے شمار فوائد ہیں اور شبہ سے خالی ہے۔

عبداللہ امرتسری

بے نماز۔ بدمعاش کو زکوٰۃ دینا

سوال:۔ بے نماز۔ بے روزہ۔ بدکردار غریب شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

جواب:۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے فقیروں کی ضروریات کے لئے ہے نہ بدمعاشوں کی بدمعاشی کے لئے۔ ایسوں کو کھلانے پلانے سے اُن کی بدمعاشی بڑھتی ہے۔

حدیث میں ہے۔

توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم۔

یعنی مسلمانوں کے غنیوں سے لے کر اُن کے فقیروں کو دی جائے۔

نیز زکوٰۃ ایک فرض ہے جو خود بخود ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ کوئی سوال کرے

تو دی جائے اور جو شے خود بخود دی جاتی ہے اس میں نیک تلاش کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

لا یاکل طعامك الا تقی ۔ مشکوۃ باب الانفاق

یعنی تیرا کھانا متقی کے سوا کوئی نہ کھائے۔

مشکوۃ باب الانفاق میں ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک شخص نے غلطی سے چور پر اور رنڈی پر اور غنی پر صدقہ کیا۔ بعد میں اس کو پتہ چلا تو افسوس کیا۔ خواب میں اس کو دکھائی دیا کہ تیرا صدقہ ضائع نہیں ہوا۔ شاید چور چوری سے اور رنڈی زنا سے باز آجائے اور غنی عبرت پکڑے

اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ زکوۃ بدمعاش کا حق نہیں ورنہ صدقہ کرنے والے کو اپنے صدقہ کے ضائع ہونے کا افسوس نہ ہوتا اور خواب میں تسلی کی ضرورت نہ پڑتی۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

زکوۃ کے علاوہ مال میں اللہ تعالےٰ کا حق ہے

زکوۃ کا یکمشت ادا کرنا

سوال :۔ مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی کوئی حق ہے اور زکوۃ سال بھر تھوڑی تھوڑی کر کے دینا جائز ہے یا نہیں۔؟

جواب :۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مال میں صرف زکوۃ اللہ تعالےٰ کا حق ہے اور نہیں ہے حالانکہ قرآن وحدیث سے اور حق بھی ثابت ہے۔

مشکوۃ میں ہے۔

عن فاطمة بنت قيس قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان فى المال لحقا سوى الزكوة ثم تلا ليس البر ان تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب الايه رواه الترمذى وابن ماجة والدارمى (مشكوة باب فضل الصدقة)

یعنی فاطمہ بنت قیس سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مال میں زکوۃ

کے سوا بھی حق ہے۔ پھر آیت کریمہ لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ الایۃ پڑھی۔ اس آیت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مسکینوں، محتاجوں کو دینے کا ذکر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔

نیز اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ تھوڑی تھوڑی ادا نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس آیت وحدیث میں زکوٰۃ کے علاوہ جس حق کا ذکر ہے یہ وہی ہے جو موقع بموقع آپڑتا ہے۔ جیسے کوئی سائل آگیا یا کسی مسافر کو دینا پڑ گیا۔ یا کسی پر ناگہانی مصیبت پڑ گئی تو اس کی امداد ضروری ہوگئی۔ یا کسی بھوکے کو کھانا کھلانا پڑ گیا۔ غرض اس قسم کے مصارف کے لئے شریعت نے زکوٰۃ کے سوا مال میں حق رکھا ہے کیونکہ معلوم نہیں کہ ایسی صورت کب آپڑے۔ اگر زکوٰۃ پاس رکھ کر سال میں تھوڑی تھوڑی دینی جائز ہو تو پھر زکوٰۃ کے سوا مال میں حق رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ فوراً دے دینی چاہیئے پاس نہ رکھنی چاہیئے ہاں بیت المال میں زکوٰۃ کا جمع رہنا اس حدیث کے خلاف نہیں کیونکہ بیت المال تو کسی خاص جگہ میں ہوتا ہے۔ اور ایسی صورتیں ہر جگہ پیش آتی رہتی ہیں جن کے لئے بیت المال میں جمع ہونا کفایت نہیں کرتا۔ پس ضروری ہوا کہ زکوٰۃ کے سوا بھی مال میں حق ہو تاکہ ان ضرورتوں کو متکفل ہو۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ

جس عورت کا خاوند صاحب زکوٰۃ ہو اُس عورت کو زکوٰۃ دینا

سوال :- چچا اپنی غریب عبالدار بھتیجی اور بیوہ بھتیجی کو ہمیشہ کچھ روپیہ زکوٰۃ میں سے دیا کرتا تھا مگر اب وہ ایک شخص صاحب نصاب کے نکاح میں آگئی۔ چچا نے سابق دستور اب پھر بھتیجی کو زکوٰۃ کا روپیہ بھیج دیا۔ اب دریافت طلب یہ بات ہے کہ کیا اس حالت میں جب کہ اس کا خاوند صاحب زکوٰۃ ہو اس کو زکوٰۃ کا روپیہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا یہ روپیہ چچا کو واپس کر دے؟ یا اپنے ہی بچوں میں تقسیم کر دے؟ یا سوتیلے لڑکے جو کہ طالب علم ہیں۔ ان کو دے دے؟ جواب قرآن و حدیث سے دیں۔

جواب :- جس کا نان نفقہ اور دیگر ضروریات دوسرے کے ذمہ ہو۔ اس کا حکم دوسرے کا ہے

مثلاً ماں باپ غنی ہوں تو اولاد بھی غنی کہلاتی ہے۔ کیونکہ وہ والدین کی پرورش میں ہیں اور والدین اُن کے نان و نفقہ اور دیگر ضروریات کے ذمہ وار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بیوی کے نان و نفقہ اور دیگر تمام ضروریات کا ذمہ وار خاوند ہے۔ پس خاوند کے غنی ہونے کے ساتھ بیوی بھی غنی کہلائے گی۔ اس لئے جیسے والدین اپنی اولاد کو جو ان کی پرورش میں ہیں۔ زکوۃ نہیں دے سکتے۔ خاوند بھی بیوی کو نہیں دے سکتا۔ پس جب بیوی غنی کے حکم میں ہوئی تو چچا کا اس بھتیجی کو زکوۃ دینا جس کا سوال میں ذکر ہے جائز نہ ہوا۔ جو نکاح کے بعد زکوۃ دی ہے وہ چچا واپس لے لے۔ ہاں اگر اس بھتیجی کی اولاد کے نان و نفقہ و دیگر ضروریات کا ذمہ بھتیجی کے خاوند نے نہیں لیا۔ اور وہ اپنے سر پر اپنا گذارہ کرتے ہیں اور غریب ہیں تو ان میں زکوۃ تقسیم ہوسکتی ہے۔ اسی طرح سوتیلے لڑکے کا اگر کوئی کفیل نہیں اور وہ غریب ہے تو اس پر بھی یہ زکوۃ خرچ ہوسکتی ہے

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۱۲ محرم سنہ ۱۳۵۲ھ

یتیم نابالغ سید عشر لے سکتا ہے؟

سوال:۔ یتیم نابالغ سید کو عشر کے دانے لینے جائز ہیں یا نہیں؟

جواب:۔ مشکوۃ باب من تحل الصدقۃ میں حدیث ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَخَذَ الْحُسَیْنُ بْنُ عَلِیٍّ تَمْرَةً مِنْ تَمْرِ الصَّدَقَاتِ فَجَعَلَهَا فِیْ فِیْهِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كِخْ كِخْ لِیَطْرَحَهَا ثُمَّ قَالَ اَمَا شَعَرْتَ اَنَّا لَا نَاْكُلُ الصَّدَقَةَ۔ متفق علیہ۔

وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِیْعَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّدَقَاتِ اِنَّمَا هِیَ اَوْسَاخُ النَّاسِ وَاِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ۔ رواہ مسلم۔

ابو ہریرہ رضہ فرماتے ہیں۔ حسین بن علی رضہ نے صدقہ کی ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تھوک تھوک یعنی اس کو تھوک دے۔ پھر فرمایا۔ تجھے معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے۔

عبد المطلب سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ صدقات، صرف لوگوں کی میل ہے۔ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے لئے حلال نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یتیم نابالغ سید کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں یہی حکم عشر کا ہے۔ اس لئے کہ عشر زکوٰۃ سے الگ نہیں بلکہ زکوٰۃ ہی کی قسم ہے۔ چونکہ دانوں اور کھجوروں وغیرہ میں دسواں حصہ ہوتا ہے۔ یا دسویں کا نصف ہوتا ہے اس لئے زکوٰۃ کی اس قسم کا نام عشر ہو گیا ہے۔

سیّد کو زکوٰۃ سے تنخواہ دینا

سوال ۔ اگر کسی مدرسہ میں کوئی معلم سیّد ہو۔ اور مدرسہ والے اس کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دیں تو یہ جائز ہے یا نہیں ؟ کیا دینے والے کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں ؟

جواب :۔ زکوٰۃ کی مد اہل مدرسہ کو الگ رکھنی چاہیئے تاکہ زکوٰۃ کی مد سے سیّد کو تنخواہ نہ ملے کیونکہ سیّد کے لئے زکوٰۃ کا عامل بننا درست نہیں۔ چنانچہ ابورافع کو جو آپ کا آزاد کردہ تھا۔ آپ نے منع فرمایا (مشکوٰۃ باب لاتحل لہ الصدقہ) درس و تدریس بھی قریباً اسی حکم میں ہے۔ اس لئے احتیاط چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۸ ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ ۔ ۲۴ جون ۱۹۶۰ء

باپ کی زکوٰۃ سے بیٹے کی تعلیم

سوال :۔ زید اپنے بیٹے کو علم دین سکھانا بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور وہ رمضان میں برابر زکوٰۃ نکالتا ہے۔ کیا زید کی بیوی اپنے بیٹے کو علم دین سکھانے کے لئے پوشیدہ طور پر زکوٰۃ کے پیسوں سے بیٹے کو تعلیم دلوا سکتی ہے۔

جواب :۔ ایک غریب شخص کا آپ نے کچھ قرض دینا ہے تو کیا زکوٰۃ سے آپ اس کا قرض اتار سکتے ہیں ؟ یہی مثال بیٹے کی تربیت میں زکوٰۃ صرف کرنے کی ہے۔ کیونکہ بیٹے کی ہر قسم کی تربیت کا حق باپ کے ذمہ ہے جو حق پہلے ہی باپ کے ذمہ ہے وہ زکوٰۃ سے کس طرح ادا ہو گا بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص زید کے بیٹے کی دینی تعلیم میں یا اور کسی قسم کی تربیت میں اپنی زکوٰۃ صرف کرنی چاہیئے یہ بھی

درست نہیں۔ کیونکہ اولاد اپنے والدین کے تابع ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے هم من ابائهم۔ یعنی اولاد اپنے آباء سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے جو چھوٹے بچے مرجاتے ہیں وہ جنّتی ہیں مگر ان کا جنازہ نہیں پڑھا جاتا ہے۔ اور مسلمانوں کے بچوں کا پڑھا جاتا ہے۔ پس جب اولاد والدین کے تابع ہے اور والدین صاحب زکوٰۃ ہیں جن کو زکوٰۃ نہیں لگ سکتی تو اولاد کو بھی نہیں لگ سکتی۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۲۴ محرم ۱۳۵۴ھ - ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء

اہلحدیث کانفرنس مصرف زکوٰۃ ہے؟

سوال :۔ اہلحدیث کانفرنس جو دہلی میں ہو رہی ہے اس پر زکوٰۃ لگ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب :۔ کانفرنس اہلحدیث میں زکوٰۃ لگ سکتی ہے۔ لیکن ان کو اطلاع کر دینا چاہیے کہ یہ زکوٰۃ ہے تاکہ ایسی مد میں صرف نہ کریں جو مصرف زکوٰۃ نہیں۔

عبداللہ امرتسری مقیم روپڑ ضلع انبالہ

۱۰ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ

مقروض کو قرض معاف کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

سوال :۔ اگر کسی مسکین یا مستحق زکوٰۃ سے قرض لینا ہو۔ اگر قرضخواہ زکوٰۃ میں قرض کو وضع کر لے اور اس کو قرض معاف کر دے تو اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب :۔ اگر قرض زکوٰۃ میں وضع کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ جب مسکین مستحق زکوٰۃ ہے تو قرض معاف کر دینا بعینہ دے دینا ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ وان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعلمون۔

یعنی اگر مقروض تنگدست ہو تو آسانی تک ڈھیل دینا چاہیئے اور صدقہ کر دینا یعنی قرض چھوڑ دینا

یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

قرض چھوڑنے کو صدقہ فرمایا ——— اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی صدقہ دینے کا ایک طریق ہے پس زکوٰۃ ادا ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہاں بعض دفعہ انسان کو قرض وصول ہونے کی اُمید نہیں ہوتی۔ یا ہوتی ہے لیکن جلدی نہیں ہوتی تو یہ خیال کرکے کہ قرض ملنا تو ہے نہیں۔ یا دیر سے ملے گا۔ زکوٰۃ میں وضع کرلو۔ پس وہ زکوٰۃ میں وضع کرلیتا ہے تو اس صورت میں کچھ شبہ رہتا ہے کہ شاید اپنی رقم کی خاطر ایسا کیا ہو۔ اگر وصولی کی اُمید ہوتی تو شاید اس کو زکوٰۃ نہ دیتا۔ اس سے نیت میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے غور کرلینا چاہیئے کہ کہیں یہ شبہ والی صورت تو پیدا نہیں ہوگئی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

حقیقی بہن بھائی مصرف زکوٰۃ ہیں؟

سوال ۔ اگر حقیقی بھائی یا بہن فقیر یا مسکین ہو تو ان کو زکوٰۃ دینی جائز ہے یا نہیں۔ نیز والدین اولاد سے الگ ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

محمد از کلس ڈاکخانہ کنگن پور ضلع لاہور

جواب :۔ حقیقی بھائی بہن اگر فقیر مسکین ہوں تو ان کو زکوٰۃ لگ سکتی ہے بلکہ بخاری نے باب باندھا ہے۔ محتاج ہونے کی صورت میں زکوٰۃ بیٹے کو بھی لگ سکتی ہے جبکہ بیٹا جوان ہو۔ اور اپنا الگ اس کا کاروبار ہو۔ اس مسئلہ کے متعلق انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک شخص نے صدقہ مسجد نبوی میں رکھا کہ کسی مسکین کو دے دیا جائے۔ اتفاقاً بیٹے نے آکر اٹھا لیا۔ باپ کو پتہ لگا کہا میں نے تجھے دینے کا ارادہ نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس معاملہ پہنچا۔ تو آپ نے باپ کو کہا کہ تیرا صدقہ قبول ہے۔

رہے والدین تو وہ تنگدست ہونے کی صورت میں انسان کے اہل وعیال میں داخل ہیں۔ اور ان کا نان ونفقہ اس کے ذمہ ہے۔ چنانچہ تین شخص کی غار والی حدیث سے واضح ہے۔ جو مشکوٰۃ باب البر والصلہ میں مذکور ہے اس لئے ان کو زکوٰۃ نہیں لگ سکتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

تبلیغ کے لئے لاؤڈ سپیکر زکوٰۃ فنڈ سے خریدا جا سکتا ہے؟

سوال :۔ زکوٰۃ کے روپیہ سے مسجد کے لئے یا تبلیغی جلسوں میں استعمال کرنے کے لئے لاؤڈ سپیکر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

عبدالقیوم ناظم جمعیت اہلحدیث دھرمپورہ لاہور

جواب ۔ تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں ایک حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف ہیں ۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی ۔ انما الصدقات الآیۃ (پ۱۰ رکوع ۱۴) اس آیت میں ایک مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے ۔ بعض اس کو عام لیتے ہیں ۔ جو تفسیر کبیر میں قفال سے منقول ہے ۔ لیکن اگر فی سبیل اللہ کا مفہوم عام مراد لیا جائے تو پھر باقی مصارف بھی اس میں داخل ہو جاتے ہیں ۔ پھر آٹھ کہنا ٹھیک نہیں ۔

اگرچہ اس حدیث میں ضعف ہے لیکن جمہور علماء کا یہی قول ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے جہاد تلوار کے ساتھ ہو یا زبان کے ساتھ یا دل کے ساتھ ۔ زبانی جہاد بھی تبلیغی شعبہ میں داخل ہے اور تبلیغی شعبہ میں لاؤڈ سپیکر کو بڑا دخل ہے ۔ اس لحاظ سے لاؤڈ سپیکر وقف کرنا بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن اصل جہاد کا لفظ تلوار کے جہاد کے لئے ہے اور تبلیغی شعبہ کو مجازاً جہاد کہا جاتا ہے ۔ اس بنا پر تبلیغ کے لئے لاؤڈ سپیکر میں شبہ رہتا ہے ۔ اور زکوٰۃ فرض ہے ۔ فرض کی ادائیگی ایسے طریق پر ہونی چاہیئے کہ شبہ نہ رہے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور

۲۹ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ ۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء

عشر میں سرکاری مالیہ کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے بیس بلاک زمین دس سال کی قسطوں پہ خریدی ہے اور سالانہ قسط مالکان بیس بلاک کی ۶۸۳۸ روپے ادا کرتا ہے ۔ یہ قسط اس کے خزانہ جائداد میں جمع ہوتی رہتی ہے کیونکہ جس قدر زمین کی قسط ادا کرے گا اس قدر زمین کا مالک ہو جائے گا ۔ کیونکہ یہ رقم اس کا خزانہ ہے ۔ اور قسط کی

تین دفعہ کی عدم ادائیگی کے بعد سب زمین ضبط ہو جاتی ہے۔ اور آبادزمین کا معاملہ سرکاری ۴۲ روپے سالانہ ہے۔ پٹواری قانونگو کی رشوت بھی تقریباً چھ روپے سالانہ ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قسط بلس بلاک کی اور معاملہ سرکاری اور رشوت وغیرہ خرچ زمین نکال کر عشر نکالا جائے گا یا پہلے۔

غلام محمد

معرفت حکیم فضل دین درزی جیمس آباد سندھ تھرپارکر

جواب:۔ حدیث میں ہے۔

عن جابر عن النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم قال فیما سقت الانہار والغیم العشر فیما سقی بالسانیۃ نصف العشور رواہ احمد ومسلم والنسائی وابوداؤد وقال الانہار العیون۔

وعن ابن عمران النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم قال فیما سقت السماء والعیون اوکان عثریا العشر وفیما سقی بالنضح نصف العشر رواہ الجماعۃ الا مسلما لکن لفظ النسائی وابی داؤد وابن ماجۃ بعلا بدل عثر۔

(منتقی باب زکوٰۃ الن ج ۴)

یعنی جابرؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو کھیتی نہروں یا بارش سے پرورش پائے۔ اس میں عشر ہے۔ اور ابوداؤد میں ہے۔ جو نہروں یا چشموں سے پرورش پائے اس میں عشر ہے۔ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے جو بارش یا چشموں سے پرورش پائے یا نہر کے کنارہ ہونے کی وجہ سے یا اس کی جڑیں زمین میں پانی تک پہنچنے کی وجہ سے یعنی بغیر پانی دینے کے خود پرورش پا رہا ہو۔ اس میں عشر ہے۔ اور جس کو اونٹ وغیرہ سے پانی دیا جائے۔ اس میں نصف عشر ہے۔ اس کو مسلم کے سوا باقی جماعت نے روایت کیا ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ پانی کے فرق سے کبھی دسواں حصہ ہو جاتا ہے کبھی بیسواں۔ اگر بارش وغیرہ کا پانی ہو تو دسواں۔ اگر اونٹ وغیرہ سے پلایا جائے تو بیسواں۔

اب سوال کی صورت میں جس معاملہ کا ذکر ہے۔ وہ کونسا ہے۔ پانی کا آبیانہ ہے یا زمین کا مالکانہ۔

اگر زمین کا ہے تو وضع کر لیا جائے۔ اور باقی غلہ کا عشر نکالا جائے۔ اگر پانی کا ہے تو یہ پانی مفت کا نہ ہوا جیسے بارش وغیرہ کا پانی ہے بلکہ اس پانی کے حکم میں ہوا۔ جو اونٹ وغیرہ سے پلایا جاتا ہے۔ یعنی کوئیں کے پانی کے حکم میں ہوا پس یہ معاملہ وضع نہ کیا جائے۔ ہاں عشر کی بجائے بیسواں حصہ ادا کرے اس طرح رشوت کا حکم ہے جو پانی کی خاطر ہے۔ وہ پانی کے معاملہ میں آگئی اور جو زمین کی وجہ سے ہے۔ وہ زمین کے معاملہ میں داخل ہے۔

اب قسطوں کا حال سُنئے۔

زمین اگر غیر کی ملکیت ہو اور آپ کے پاس بٹائی یا لگان پر ہو تو جتنا غلہ مالک کو جائے گا۔ اتنے کا عشر مالک پر ہوگا۔ اور جتنا غلہ آپ کو ملے گا اتنے کا عشر آپ دیں گے۔ اور اگر آپ مالک ہوں تو سارا غلہ آپ کو ملے گا اور سب کا عشر آپ کے ذمہ ہوگا۔

سوال میں جس زمین کا ذکر ہے۔ اُس سے جتنی آپ آباد کرتے ہیں اُس کی ساری آمد بظاہر آپ کو ملتی ہے۔ مگر اُس کی ملکیت کا روپیہ چونکہ آپ کے ذمہ ہے اس لئے حقیقت میں سارا غلہ آپ کو نہیں ملتا مگر آپ اس ملک کی بٹائی یا لگان کا اندازہ کر کے مالکانہ حق علیحدہ کر دیں اور باقی کا عشر نکالیں۔ پھر مالکانہ حق کو دیکھیں کہ سالانہ قسط سے کم ہے یا زیادہ اگر زیادہ ہے تو اُس کا عشر بھی ادا کرنا ضروری ہوگا۔ اگر کم ہے تو کمی اپنے پاس سے پُوری کر کے قسط ادا کر دیں اور اس کمی کا ہر سال حساب رکھیں۔ جب دس سال میں دس قسطیں پُوری ہو جائیں تو اس کا بعد مالکانہ حق میں سے بدستور اس کمی کا حساب مجریٰ لے لیں۔ جب آپ کی رقم پوری ہو جائے تو پھر سارے غلہ کا عشر ادا کریں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۴ جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ - ۱۳ ستمبر ۱۹۳۵ء

سب شرکاء کا عشر ادا کرنے کے لئے صاحب نصاب ہونا ضروری ہے

سوال: کھیت میں کئی شریک ہوں تو کیا عشر کے لئے ہر ایک کا حصہ نصاب کو پہنچنا ضروری ہے یا مشترکہ؟

محمد عفی عنہ مدرس مدرسہ نصرۃ الاسلام موضع کھیپیانوالی ڈاکخانہ مکتسر ضلع فیروزپور

جواب:۔ مختلف شخصوں کی اکٹھی شے کا حکم مسئلہ زکوٰۃ میں ایک شخص کی شے کا ہے چنانچہ بکریوں وغیرہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔ ہر ایک کی بکریاں نصاب تک نہیں پہنچتی مگر اکٹھی ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ پڑجاتی ہے خشیۃ للصدقۃ کو وجوب زکوٰۃ میں کوئی دخل نہیں بلکہ اکٹھی ہونے کو دخل ہے۔ اگر اکٹھی ہونے کو دخل نہ ہوتا تو صدقہ کے ڈر سے جدا کرنے کے کیا معنی۔ پس جب اکٹھی کو دخل ہوا تو صورت مسئولہ میں عشر پڑجائے گا خواہ ہر ایک کا حصہ نصاب کو پہنچے یا نہ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۵ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ ۲۴ مئی ۱۹۴۰ء

زکوٰۃ میں مضاربت

سوال:۔ صاحب زکوٰۃ کا مال زکوٰۃ سے بطور مضاربت (حصہ) کے تجارت کرنا درست ہے یا نہیں۔ ایسے ہی صاحب صدقہ اپنے صدقہ سے بطور مضاربت تجارت کرتا اور خود بھی اس کی کمائی کھاتا ہے۔ اور بطور حصہ رسدی فی سبیل اللہ بھی خرچ کرتا ہے۔ آیا ایسا کرنا اس کا درست ہے یا نہیں؟ پھر صاحب زکوٰۃ اس نفع اور اصل مال کو حسب خواہش کسی پختہ عمارت مدرسہ یا مسجد میں لگا دیتا ہے غرباء و مساکین پر خرچ نہیں کرتا۔ یہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

جواب:۔ مشکوٰۃ میں ہے۔

عن عمر بن الخطاب رضؓ قال حملت علی فرس فی سبیل اللہ فاضاعہ الذی کان عندہ فاردت ان اشتریہ فظننت انہ یبیعہ برخص فسالت النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لا تشترہ ولا تعد فی صدقتك وان اعطاکہ بدرھم فان العائد فی صدقتہ کالکلب یعود فی قیئہ وفی روایۃ ولا تعد فی صدقتك فان العائد فی صدقتہ کالعائد فی قیئہ متفق علیہ (باب من لا یعود فی الصدقۃ)

یعنی حضرت عمرؓ سے روایت ہے میں نے فی سبیل اللہ ایک شخص کو گھوڑے پر سوار کیا۔ جس شخص کو سوار کیا۔ اس نے اس کو ضائع کر دیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کو خرید لوں اور خیال تھا کہ

ود سستی وسے گا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو فرمایا نہ خرید اور اپنے صدقہ میں رجوع نہ کر کیونکہ صدقہ میں رجوع کرنے والے کی مثال کتے کی ہے جو قے کر کے اپنی قے کو چاٹتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اپنے صدقہ میں رجوع نہ کر۔ کیونکہ صدقہ میں رجوع کرنے والا اپنی قے میں رجوع کرنے والے کی طرح ہے۔

جب پیسوں سے اپنے صدقہ کا مال خرید نا جائز نہ ہوا تو محنت کر کے اس سے کھانا بھی ناجائز ہو گیا کیونکہ محنت بھی بمنزلہ پیسوں کے ہے۔ اور اگر محنت بمنزلہ پیسوں کے نہ ہو تو پھر بطریق اولیٰ منع ہے کیونکہ جب عوض کے ساتھ جائز نہیں تو بغیر عوض کس طرح جائز ہوگا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ لوٹا دے تو پھر جائز ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کے اسی باب میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے دریافت کیا کہ میں نے اپنی ماں پر ایک لونڈی صدقہ کی تھی۔ اور اب میری ماں مرگئی فرمایا تیرا اجر ثابت ہو گیا۔ اور میراث کی وجہ سے لونڈی تیری طرف لوٹ آئی۔

غرض اپنے طور پر ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیئے جس کی وجہ سے صدقہ اس کی طرف لوٹے یا اس سے فائدہ اٹھائے۔ خدا کی طرف سے مل جائے تو الگ شے ہے اور ظاہر ہے کہ مضاربت کے ساتھ کھانا یہ اپنی محنت ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ شے کا نفع بھی شے کے حکم میں ہے۔ جب پونجی خدا کی طرف سے ناجائز ہوئی تو نفع کھانا بھی ناجائز ہو گیا۔

ممانعت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ کا مال اپنے پاس رکھنا منع ہے۔ کیونکہ جب آیت آتوا الزکوٰۃ میں دینے کا حکم ہے تو اپنے پاس کس طرح رکھ سکتا ہے بلکہ تھوڑی مدت بھی رکھنے کی اجازت نہیں۔ جیسے بعض لوگ سال میں تھوڑی تھوڑی زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔

جب زکوٰۃ کا اپنے قبضہ میں رکھنا جائز نہ ہوا تو مضاربت کیسے؟

رہا زکوٰۃ کا یا اس کے نفع کا کسی پختہ عمارت مدرسہ و مسجد میں لگانا یہ بھی محل اشتباہ ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۸ جمادی الاول ۱۳۵۳ھ۔ ۳ اگست ۱۹۳۴ء

امام کو عشر لگ سکتا ہے؟

سوال ۔ عشر اور قربانی وغیرہ کے چمڑوں وغیرہ کا مصرف امام ہے یا نہیں؟

(میاں) باقر جھوک، داد و طور چک نمبر ۲۴۷ ڈاکخانہ منڈی ناندلیانوالہ ضلع لائل پور

جواب :۔ امام اگر مسکین ہو تو اس حیثیت سے چمڑہ قربانی عشر وغیرہ اس کو لگ سکتا ہے۔ اگر عوض سمجھ کر دیا جائے تو نہیں لگ سکتا۔ مثلاً دوسری جگہ دینے سے اس کے امامت چھوڑ دینے کا خطرہ ہو۔ اگر اس وجہ سے اس کو دیا جائے تو وہ امامت کا عوض ہے۔ پس اس امامت میں نہ دینا چاہیئے۔ خواہ مسکین ہی ہو۔ کیونکہ چمڑے قربانی کا فروخت کرنا یا کسی شے کا عوض دینا منع ہے۔ ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ من باع جلد اضحیتہ فلا اضحیۃ لہ رواہ البیہقی (رحمۃ المھداۃ) یعنی جو قربانی کا چمڑہ فروخت کرے اس کی قربانی نہیں ہوتی۔ پس اب امام کو چمڑے عشر وغیرہ دینے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ جیسے عام مسکینوں کو دئے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کو دے سکتے ہیں۔ سب کی کوئی خصوصیت نہیں ہونی چاہیئے مثلاً اگر وہ امام ہو تو اس کو دیا جائے۔ اگر امام نہ ہو تو نہ دیا جائے۔ اس قسم کا دینا عوض شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ خیال ہو کہ نہ دیا تو امامت چھوڑ دے یا ناراض ہو جائے تو اس حالت میں بھی دینا عوض ہے۔ غرض حتی الوسع اس معاملہ میں احتیاط برتنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ قربانی و عشر ہی ضائع ہو جائے۔

ہاں ایک صورت جواز کی نکل سکتی ہے۔ وہ یہ کہ امام بچے بھی پڑھائے۔ اور گاؤں میں بیت المال ہو جس میں عشر، زکوٰۃ چمڑے قربانی کے اور دیگر صدقات و خیرات جمع ہوتے ہوں۔ اور اس بیت المال سے تعلیم پر نہ کر امامت پر اس کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی جائے تو اس طریق سے لینا شرعاً درست ہے۔ کیونکہ یہ اُجرت تعلیم ہے نہ کہ اُجرتِ امامت۔

عبد اللہ امرتسری ازروپڑ ضلع انبالہ
۱۴ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ ۔ ۵ مئی ۱۹۳۹ء

سید کی بیوی جو غیر سیدہ ہے اس کو زکوٰۃ دینا

سوال :۔ میں سیدہ نہیں ہوں۔ لیکن سید کے گھر میں میری شادی ہوئی۔ بیس سال خاوند کے گھر آباد

رہتی ہوں۔ عرصہ نو سال کا ہوا کہ میرا خاوند وفات پا گیا۔ اور اس نے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا۔ گذر اوقات مشکل ہے۔ اگر کوئی امیر صدقہ یا زکوٰۃ دینا چاہے تو کیا میرے لئے اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

مریم زوجہ محمود شاہ مرحوم

جواب :۔ صدقہ۔ خیرات و زکوٰۃ وغیرہ غیر سیدہ کے لئے جائز ہے[1] خواہ منکوحہ سید ہو یا غیر سیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کے لئے صدقہ کی حرمت نہیں۔ مگر ازواج مطہرات کے لئے حلال تھا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۵ رمضان سنہ ۱۳۵۹ھ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

بیت المال کا قیام

سوال :۔ زکوٰۃ۔ عشر۔ صدقات۔ کھال قربانی و عقیقہ و فطر وغیرہ جمع کر کے بیت المال بنایا جائے تو جائز ہے یا نہیں؟

علی محمد نور جٹ چک نمبر ۲۸۱ رکھ برانچ
ڈاکخانہ ڈجکوٹ ضلع لائل پور

جواب ۔ بیت المال بنانا جائز ہے۔ مگر صدقہ فطر ذخیرہ کرنے میں شبہ ہے اور چرمہ ہائے قربانی اور عقیقہ گھر بھی رکھ سکتا ہے۔ اور مساکین کو بھی دے سکتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۔ انبالہ

۸ محرم سنہ ۱۳۶۰ھ ۔ ۵ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

زکوٰۃ سے مسافر خانہ تعمیر کرنا

سوال :۔ ایک شخص زکوٰۃ کے فنڈ سے مسافر خانہ تعمیر کرتا ہے تو کیا اس کی زکوٰۃ ادا ہو گی یا نہیں؟

---

[1] اگر خاوند غنی صاحب نصاب ہو تو اس صورت میں بیوی کے لئے صدقہ۔ زکوٰۃ لینا جائز نہیں خواہ وہ غیر سیدہ ہو۔ اس لئے کہ بیوی خاوند کے تابع ہے وہ غنی ہے تو بیوی بھی غنی کے حکم میں ہے اس لئے کہ بیوی کی تمام ضروریات کو پورا کرنا خاوند کے ذمہ ہے۔ یہی وجہ ہے۔ خاوند بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا البتہ بیوی خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے اگر وہ محتاج ہو (مرتب)

جواب :۔ مسافر خانہ بنانے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآن مجید میں جو مصارف زکوٰۃ ذکر ہیں۔ ان میں مسافر خانہ داخل نہیں۔ مسافر خانہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ملکیت ہے خواہ اس کو قائم رکھے یا فروخت کر دے یہ اس کو اختیار ہے اور زکوٰۃ نئے سرے سے ادا کرے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی
۲۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء

عشر جمع کر کے عشر دینے والوں کو قرض دینا

سوال :۔ عشر جمع کر کے عشر دینے والوں کو اس عشر سے قرض دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ جو لوگ اس نیت سے عشر جمع کریں کہ بوقت ضرورت ہم کو اس عشر جمع شدہ سے قرض ملے گا۔ اگر عشر اپنے ہاتھ سے مستحقین پر خرچ کر دیں تو بوقت ضرورت ہم کو قرض نہیں مل سکتا۔ اس نیت سے عشر جمع کرنا شرعاً عشر کہلائے گا۔

جواب :۔ بیت المال سے قرض جائز نہیں۔ خاص کر صرف ان کو قرض دینا جو عشر دیتے ہیں یہ اور برا ہے۔ ایسا بیت المال درحقیقت شرعی بیت المال نہیں۔ بلکہ گھر کی ایک سوسائٹی ہے۔ شرعی بیت المال میں کسی کی خصوصیت نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک مستحق کی امداد کی جاتی ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ میں ہے۔

توخذ من اغنیائهم وترد علی فقرائهم

یعنی مسلمانوں کے غنیوں سے صدقہ لیا جائے اور ان کے فقیروں کو دیا جائے۔

دیکھئے اس حدیث میں غنیوں سے لے کر فقیروں کو دینے کا ارشاد ہے۔ نہ یہ کہ دینے والے خود فائدہ اٹھائیں۔ ہاں اگر دینے والے فقیر ہو جائیں تو فقیر ہونے کی وجہ سے وہ بھی مستحق ہیں۔

خلاصہ یہ کہ بیت المال عام طور پر مسکینوں اور محتاجوں کی امداد کے لئے ہے۔ اس میں کسی کی خصوصیت نہیں۔ نہ اس میں قرض کا سلسلہ ہے۔

مؤطا میں حدیث ہے زید بن اسلم نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہ اور عبیداللہ عراق کی طرف فوج میں گئے۔ جب واپس ہوئے تو ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملے۔ اور وہ

اس وقت بصرہ میں امیر تھے۔ انہوں نے خوش آمدید کہا اور کہا کہ میں اگر تمہیں کسی قسم کا مالی فائدہ پہنچا سکتا تو دریغ نہ کرتا۔ پھر کہا کہ ہاں ایک صورت ہے۔ یہاں اللہ کا مال ہے۔ میں اس کو امیرالمومنین کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں قرض دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ عراق سے مال خرید کر مدینہ جا کر فروخت کرو۔ اصل مال امیرالمومنین کو ادا کرو۔ اور نفع تم لے لو۔ انہوں نے کہا کہ ہم دوست رکھتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ یہ سلوک کریں۔ ابوموسیٰ اشعری رضؓ نے یہ مال ان کے حوالہ کیا اور امیرالمومنین کو لکھ دیا کہ ان سے مال وصول کر لیں۔ جب یہ دونوں مدینہ آئے تو مال فروخت کیا اور ان کو نفع ہو گیا۔ جب حضرت عمرؓ کے پاس لے گئے تو فرمایا سب لشکر کو اس طرح قرض دیا ہے جیسے تمہیں دیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں فرمایا تم امیرالمومنین کے بیٹے تھے۔ اس لئے تمہارا لحاظ کیا۔ اور عبیداللہ نے کہا اے امیرالمومنین ایسا کرنا آپ کے لائق نہیں۔ اگر مال کم ہو جاتا یا بالکل ضائع ہو جاتا تو ہم سے بھرا جاتا تو اصل رقم بمعہ منافع آپ کے کس طرح حوالہ کریں۔ فرمایا حوالہ کرو عبداللہ پھر خاموش رہے۔ اور عبیداللہ نے سوال و جواب کیا۔ مجلسیوں میں سے ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو کہا اس کو مضاربت (منافع پر روپیہ دینا) کر دو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں نے اس کو مضاربت کر دیا۔ پس اصل پونجی اور نصف منافع حضرت عمرؓ نے لے لیا۔

اس روایت سے قرض دینے کی ممانعت نکلی۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ کیا سارے لشکر کو تمہاری طرح قرض دیا ہے؟ اس سے یہی مقصد تھا کہ سارے لشکر کو قرض دینا تو مشکل ہے۔ کیونکہ بیت المال کے اغراض مقاصد غریبوں مسکینوں کی حاجت روائی اور سیاسیات وغیرہ کا انتظام فوت ہوتے ہیں۔ پس جب سب کو قرض دینا مشکل ہے تو کسی کو بھی جائز نہ رہا۔ اس کے علاوہ اگر غربت کی وجہ سے قرض لینا ہے تو اس کو ویسے دینے کا حکم ہے۔ قرض کا بوجھ اس بچارے پر کیوں ڈالا جائے۔ اگر قرض لینے والا ویسے بیت المال سے امداد کا مستحق نہیں تو بیگانی شے لینے کا کس طرح حقدار ہو سکتا ہے

پھر ابوموسیٰ اشعریؓ نے جس صورت سے قرض دیا تھا اس میں بیت المال کا صرف اتنا حرج تھا کہ عبداللہ اور عبیداللہ کے مدینہ پہنچنے تک بیت المال سے یہ مال غائب رہے۔ سو یہ ہر صورت میں ہونا ہی تھا۔ کیونکہ اگر اور کسی کے ہاتھ بھیجتے تو بھی یہ مال اتنی مدت غائب رہتا بلکہ اس میں دو طرح سے نقصان تھا۔ ایک یہ کہ جس کے ہاتھ بھیجتے اس کو اُجرت دینی پڑتی۔ دوسرے وہ مال اس کے پاس امانت ہوتا جو ضائع ہونے کی صورت میں اس کو ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قرض دینے کی صورت میں نہ اُجرت دینی پڑی۔ نہ

ضائع ہونے کا خطرہ رہا مگر باوجود اس کے حضرت عمرؓ نے اس کو رد کر دیا۔ تو جو صورت سوال میں مذکور ہے وہ کس طرح جائز ہو سکتی ہے؟ اگر بالفرض مذکورہ بالا واقعہ سے جواز پر استدلال کیا جائے اور حضرت عمرؓ کے رد کرنے کو زیادت احتیاط پر محمول کیا جائے تو اس سے اس صورت میں جواز نکلے گا کہ دینا نہ دینے کی طرح ہو۔ مثلاً ایسے شخص کو دے جس سے واپسی فوراً ممکن ہو۔ اور کسی قسم کی رکاوٹ کا اندیشہ نہیں گویا روپیہ بیت المال میں پڑا ہے کسی کو نہیں دیا کیونکہ ابوموسیٰ رضہ والی صورت اسی قسم کی ہے یعنی اس میں دینا نہ دینے کی طرح ہے۔ اگر قرض نہ دیتے تو بھی مال مدینہ تک پہنچنے تک کسی کے ہاتھ میں رہتا۔ اور ظاہر ہے کہ سوال کی صورت ایسی نہیں، پس وہ کسی طرح جائز نہیں۔

اعتراض - اگر کہا جائے کہ بخاری شریف میں عمر رضہ کا بیت المال سے قرض لینا ثابت ہے تو اس کا

جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضہ کا بیت المال سے قرض لینا اس کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ حضرت عمر رضہ خلیفہ تھے، خلیفہ اپنی ضروریات بیت المال سے پوری کر سکتا ہے۔ انہوں نے تبرعاً (بہ نیت ثواب) اپنے ذمے قرض سمجھ لیا۔ یہ ان کا بیت المال پر اور مسلمانوں پر احسان تھا۔ ورنہ ان کے ذمے حقیقت میں کوئی ضروری قرض نہ تھا۔

حضرت ابوبکر رضہ جب خلیفہ ہوئے تو صاف کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میرا تجارت کا پیشہ میرے اہل کے گذارہ کے لئے کافی تھا۔ اب میں مسلمانوں کے کام میں لگ گیا ہوں جس سے اپنے کام کے لئے مجھے فراغت نہیں۔ اس لئے اب میں اپنی ضروریات بیت المال سے پوری کروں گا (مشکوٰۃ باب رزق الولاۃ)

حضرت عمر رضہ کا اپنی ضروریات میں خرچ کیا ہوا مال اُن کے ذمہ قرض کس طرح ہو سکتا ہے۔

یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ تبرعاً قرض تھا۔

فتح الباری جز ۱۴ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو وصیت کی کہ میرے دفن سے فارغ ہو کر اپنا سر دھونے سے پہلے آل عمرؓ کے مکانات سے اسّی ہزار درہم کی قیمت کے فروخت کر کے اُن کی قیمت بیت المال میں داخل کر دے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ اتنے درہم بیت المال سے کہاں خرچ کئے؟ حضرت عمر رضہ نے جواب دیا کہ حجوں میں اور جو حادثات مجھے پیش آتے رہے ان میں صرف کئے۔

حضرت عمرؓ کے اس جواب سے معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضہ نے یہ قرض لے کر کہاں خرچ کیا۔

ابن تینؒ کہتے ہیں۔ عمر رضہ جانتے تھے کہ اس قرض کی ادائیگی ان کے ذمہ ضروری نہ تھی۔ کیونکہ حج کے انتظام

کے لئے امیر کا یا اس کے نائب کا جانا ضروری ہے جس کا بوجھ بیت المال پر ہے۔ اس طرح امیر کی ضروریات کا متکفل بھی بیت المال ہے۔ اس لئے حضرت عمر رضؓ پر اس قرض کی ادائیگی ضروری نہ تھی مگر حضرت عمر رضؓ نے چاہا کہ اپنے عمل کا کوئی حصہ دنیا میں نہ لیں۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضؓ نے اس کو تبرعاً یعنی زیادہ ثواب کی خاطر قرض بنالیا تھا ورنہ حقیقتاً یہ قرض نہ تھا۔ جو لوگ اس طرح عشر جمع کرتے ہیں ان لوگوں کا عشر ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں ہے۔

انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی

یعنی اعمال نیّتوں کے ساتھ ہیں اور ہر ایک شخص کے لئے وہی شے ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ صدقات کی غرض تو غریبوں کی امداد کرنا ہے نہ کہ اپنا ذاتی فائدہ۔ اس لئے جو عشر ذاتی فائدہ کے لئے جمع ہوگا وہ شرعاً عشر نہیں ہوگا اور نہ بیت المال کو شرعی بیت المال کہا جائے گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۶ صفر سنہ ۱۳۵۴ھ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۳۵ء

ٹھیکہ کاٹ کر عشر ادا کیا جائے گا؟

سوال: زید نے کچھ زمین ٹھیکہ پر لی ہے۔ کیا عشر ٹھیکہ ادا کر کے دیا جائے یا قبل۔ نہر کا معاملہ یا مال کا معاملہ عشر کے ادا کرنے سے پہلے پیداوار سے وضع ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ٹھیکہ عشر ادا کرنے سے پہلے وضع کیا جائے اس کے بعد عشر نکالا جائے۔ اس طرح مال کا معاملہ نکال کر باقی غلہ سے عشر ادا کرے۔ نہر کا معاملہ الگ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ نہری زمین کو کنوئیں کے حکم میں سمجھنا چاہیئے یعنی عشر کی بجائے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ دے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۴ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۴ھ

مزدور کی مزدوری کاٹ کر عشر دیا جائیگا یا نہیں؟

سوال: اگر زمیندار کاشتکاری کے لئے کچھ مزدوروں کو زمین پر لگادے تو کیا ان کی مزدوری عشر سے وضع کر سکتا ہے اسی طرح باقی اخراجات وضع ہو سکتے ہیں؟

جواب :۔ مزدور دو طرح کے ہیں۔ایک وہ جو کھیتی کے لئے لازمی ہیں۔ جیسے لوہار۔ ترکھان۔ ان کے بغیر تو کھیتی کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔کیونکہ اکثر آلاتِ کشاورزی وغیرہ بنانے اور ان کے درست کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ان کی اُجرت کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسے ہل یا جوا وغیرہ اُجرت دے کر بنائے یا جیسے بیل وغیرہ خریدے۔ یہ اشیاء چونکہ کھیتی میں داخل ہیں۔عشر دینے کے وقت اُجرت نہ کاٹی جائے ان کے علاوہ دوسرے مزدوروں کی اُجرت کاٹی جاسکتی ہے دیگر اخراجات بھی جو کمین کو لازم ہیں نہ کاٹے جائیں۔ باقی کاٹ سکتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۴ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ

چاہی اور بارانی غلہ ملا کر عشر ادا کرنا

سوال :۔ اگر غلہ پچاس من ہو۔جس میں بارانی بتیس من گندم اور چاہی اٹھارہ من ہو تو اس پر عشر کس طرح ہوگا اور کتنا ہوگا۔ نیز اس کے پاس پچیس من چنے بھی ہیں۔

جواب :۔ ایک موسمی غلہ ملا لیا جائے خواہ چنے ہوں یا گندم یا جو چاہی ہوں یا بارانی۔ ہاں عشر نکالنے میں چاہی بارانی کا فرق ہے۔ بارانی کا دسواں اور چاہی کا بیسواں۔اسی طرح بھیڑیں۔بکریاں بھی نصاب میں ملائی جائیں گی۔کیونکہ نصاب کے لحاظ سے سب ایک جنس ہیں۔نیز حدیث میں غنم کا لفظ آیا ہے۔جو بھیڑ بکری دنبہ سب کو شامل ہے۔اس طرح غلہ کی نسبت حدیث میں تصریح آئی ہے۔

ماسقت السماء ففيه العشر الحديث

یعنی جو جنس کھیتی بارش یا چشموں وغیرہ سے پرورش پائے یا زمین سے اپنی جڑوں کے ساتھ پانی کھینچ لے اس میں عشر ہے اور چاہی وغیرہ میں نصف عشر ہے۔اس میں گندم۔جو۔چنے وغیرہ کو الگ الگ ذکر نہیں کیا بلکہ ما کے لفظ میں سب کو جمع کر دیا ہے۔اس طرح جس حدیث میں نصاب پانچ وسق (بیس من پختہ) آیا ہے۔اس میں بھی الگ نہیں کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نصاب کے لحاظ سے یہ سب جنسیں ایک ہیں۔سب کو ملا کر نصاب پورا ہو جائیگا تو عشر دینا پڑے گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

چکوتہ نکال کر عشر دیا جائیگا یا چکوتہ سمیت

سوال :۔ اگر زمین چکوتہ پر ہو اور اناج ۴۵ من ہو جائے تو چکوتہ نکال کر عشر ادا کیا جائے یا پوری جنس کا ادا ہوگا۔ اسی طرح کمینوں کا خرچ الگ کر کے عشر ادا ہوگا یا اس کے سمیت ادا ہوگا۔

جواب ۔ کمینوں کا خرچ الگ نہیں کیا جاتا جیسے نوکر یا آلاتِ زرعی یا بیج وغیرہ الگ نہیں کیا جاتا البتہ زمین کا چکوتہ اُس وقت کے حساب سے نکال لیا جائے کیونکہ وہ اس کی آمد میں شامل نہیں ہاں نصاب میں چکوتہ کے دانے شامل ہوں گے اور حسابِ عشر میں دانے الگ کر لئے جائیں گے۔ ان کا عشر ان کا مالک دے گا۔ بٹائی کا بھی یہی حکم ہے۔ حدیث میں چارپاؤں کی نسبت آیا ہے کہ ان سے مشترکہ طور پر زکوٰۃ وصول کرنی چاہیے اور شریک اپنا حساب ٹھیک کر لیں۔ سو غلہ کی نسبت بھی اس طرح ہونا چاہیئے خواہ چکوتہ ہو یا بٹائی مگر مالک زمین راضی نہ ہو تو یہ اپنے حصہ کا دے دے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۹ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ ۸ جولائی ۱۹۳۸ء

کیا غلّہ میں زائد عن الحاجت پر زکوٰۃ ہے

سوال ۔ دراہم دنانیر کی صورت میں شریعت نے زائد عن الحاجت پر زکوٰۃ رکھی ہے۔ اور ضرورت انسانی کا اس قدر لحاظ کیا ہے کہ زائد عن الحاجت پر تاوقتیکہ سال کامل نہ گذر جائے زکوٰۃ نہیں۔ اگر سال کے آخر میں بھی ضروریات میں صرف ہو کر نصاب شریعت سے کم ہو جائے تو کوئی زکوٰۃ نہیں اس طرح غنم بقر وغیرہ بھی سال کے اندر نصاب مقررہ سے کم ہو جائیں تو زکوٰۃ معاف ہے۔ اس طرح عشر بھی انسان اور ان کی ضروریات اہل وعیال کی خوراک سے زائد پر ہونا چاہیئے۔ ایک شخص کے ہاں دس نفوس کھانے والے ہیں۔ اور وہ زراعت کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر ان کا خرچ بیس سیر فی نفر لگایا جائے تو بھی سال بھر کے لئے ساٹھ من غلہ چاہیے اور اس کے مالکان اراضی کا حصہ دے کر و دیگر اخراجات مزارع ادا کرنے کے بعد پانچ دس غلہ بچا جو مذکورہ بالا حساب سے صرف دو آدمیوں کی خوراک ہے۔ اب وہ باقی نفوس کی روزی کا فکر کرے یا عشر دے۔ چند روز بعد وہ مستحق زکوٰۃ بن

جائے گا اور ہمسایہ قوم ہندو سے اناج سودی لے کر کھائے گا۔ کیا اس کو اس حال پر عشر فرض ہے؟

محمد از کلس گاماں ڈاکخانہ کنگن پور ضلع لاہور

جواب:۔ آپ کو معلوم ہے کہ بارانی کا دسواں حصہ ہے اور چاہی کا بیسواں حصہ ہے۔ اگر اس کے پاس ہے پانچ وسق (بیس من پختہ) غلہ ہو۔ تو آپ کے خیال میں یہ صرف دو آدمیوں کی خوراک ہے باقی نفوس کی خوراک اور دیگر ضروریات کا انتظام وہ دوسری جگہ سے کرے گا۔ اگر دسواں حصہ نصف وسق یا بیسواں حصہ ربع وسق الگ کر دے تو کیا یہ کمی دوسری جگہ سے پوری نہیں ہو سکتی۔ خدا نے اپنا حصہ رکھا ہی اتنا ہے کہ نہ اس کے نکالنے میں کوئی ایسی دقت ہے اور نہ اس کے رکھنے میں کوئی بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے۔ صرف ایک خیال ہے کہ عشر نہ دیا جائے تو ضرورت پوری ہو جائے گی۔ ورنہ نصف وسق (دو من پختہ) یا ربع وسق (ایک من پختہ) سال یا چھ ماہ بعد کس گنتی میں ہے۔ رہا آپ کا یہ کہنا کہ شریعت نے زائد عن الحاجت پر زکوٰۃ رکھی ہے تو یہ بے شک ٹھیک ہے مگر سب جگہ اس کی ایک صورت نہیں۔ دیکھئے! سونے اور چاندی بکریوں وغیرہ میں ہر سال زکوٰۃ ہے لیکن غلہ میں صرف زمین سے نکلنے کے وقت ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے وآتوحقه یوم حصاده۔ یعنی کاٹنے کے وقت اس کا حق ادا کرو۔ اس کے بعد خواہ کئی سال گذر جائیں غلہ پر زکوٰۃ نہیں۔ اصل میں آپ نے غور نہیں کیا کہ سونا چاندی خدا نے بیع شراء کا ذریعہ بنایا ہے اس سے دوسری شے کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اگر ہر وقت رقم ہاتھ میں آنے سے زکوٰۃ ضروری ہوتی تو تجارت کا سلسلہ ہی بند ہو جاتا۔ اس لئے شریعت نے سال کی میعاد رکھ دی۔ جس میں تجارت کے لئے چار فصل آتے ہیں۔ اور بکریاں وغیرہ بھی ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ ان میں بھی یہ صورت نہیں بنتی کہ جب ہاتھ میں آئیں زکوٰۃ دے دی جائے۔ اس لئے ان کے لئے بھی سال کی میعاد مقرر کر دی۔ جس میں ان کی نسل بڑھ کر منافع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور غلہ کی میعاد چونکہ قدرتی ہے یعنی وہ زمین سے نکلتا ہی سال یا چھ ماہ بعد ہے۔ بلکہ ہر قسم کے غلہ کا موسم سال بعد آتا ہے اس لئے اس کی کٹائی کا وقت دن رکھ دیا۔ اس کے بعد غلہ چونکہ براہ راست انسان کی غذا ہے۔ اور پڑا ہوا بڑھتا نہیں۔ اس لئے خواہ کئی سال گزر جائیں۔ دوبارہ اس پر کچھ نہیں۔ سونا چاندی چونکہ بیع شراء کے لئے ہے۔ رکھنے کی شے نہیں۔ اس لئے اگر کوئی رکھے تو اس کی رعایت نہیں کی گئی بلکہ دوبارہ اس پر زکوٰۃ لگا دی۔ باقی رہے حیوانات تو ان میں قدرتی طور پر زیادتی رہتی ہے۔ اس لئے ان پر بھی دوبارہ زکوٰۃ لگ جاتی ہے مگر یہ

تفصیل تجارتی مال کے غیر میں ہے۔ تجارتی مال خواہ غلہ ہی ہو۔ اس کا حکم غلہ کا نہیں ہوگا کیونکہ وہ کھانے کی غرض سے نہیں رکھا گیا بلکہ منافع کی غرض سے رکھا گیا ہے پس وہ تجارتی مال کے حکم میں ہے۔ جس پر اکثر سال کے بعد اور بعض دفعہ زیادہ مدت کے بعد زکوٰۃ پڑ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ احکام شرعیہ بڑے اسرار و حکم پر مبنی ہیں۔ اور ان کی اساس نہایت استوار اور مضبوط ہے اگر کسی کی رسائی وہاں تک تھوڑی بہت ہو جائے تو فضل الٰہی سمجھے ورنہ جاننے والے کی طرف سونپ دے اور خواہ مخواہ شبہات میں نہ پڑے۔ خدا اس سے بچائے اور ایمان کی پونجی کے ساتھ خاتمہ کرے۔ آمین۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ ۱۹ اگست ۱۹۴۰ء

کثیر العیال اور قلیل العیال کے لئے عشر کا نصاب ایک ہے

سوال:۔ بعض انسان دنیا میں کثیر العیال ہیں۔ اور بعض قلیل العیال شریعت نے سب کے لئے ایک ہی نصاب پانچ وسق مقرر کیا ہے یہ فرق کیوں ہے؟

جواب:۔ اس کا جواب قرآن مجید نے دے دیا ہے۔

وبلوناهم بالحسنات والسيئات لعلهم يرجعون

یعنی ہم ان کو نعمتوں اور مصیبتوں سے آزماتے ہیں تاکہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

مہر مؤجل میں زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:۔ مہر مؤجل جو ابھی ادا نہیں کیا گیا۔ اس میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو زکوٰۃ کس کے ذمہ

۱؎ تجارتی مال وہ ہے جس کی خرید و فروخت تجارت کی غرض سے ہو۔ اگر کھانے کی غرض سے غلہ خریدے یا گھر کی پیداوار ہو۔ اس کو کسی وقت بلا ضرورت یا ضرورت کی وجہ سے فروخت کر دے تو خواہ سال بعد میں فروخت کرے وہ تجارتی مال نہیں۔ نہ اس میں زکوٰۃ ہے۔

ہے۔ عورت کے ذمہ ہے یا مرد کے ذمہ ہے۔ مہر موجل دین ہے یا نہیں۔ دین کی تعریف میں قبضہ شرط ہے یا نہیں۔ اگر کسی شخص نے کسی سے کچھ مال کا وعدہ کر لیا تو صرف وعدہ کرنے سے وہ مال دین کے تحت داخل ہے یا نہیں؟

جواب:۔ وعدہ کسی شے کا دین نہیں۔ اگرچہ ایفاء اس کا ضروری ہے لیکن کوئی شے اس نے نہیں دی جس کی وجہ سے اس کا حق اس کے ذمہ ثابت ہو گیا ہو۔ اور دین میں لین دین شرط ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی اور مہر موجل بھی دین کے حکم میں ہے کیونکہ مہر بضعہ کے عوض ہے اور عقود کی قسم سے ہے اگر خاوند مہر دے سکتا ہے۔ عورت دیدہ و دانستہ مطالبہ نہیں کرتی تو عورت ہر سال اس کی زکوٰۃ دے کیونکہ یہ ایسا ہے گویا اس کے پاس ہے اگر وصول نہیں ہوتا۔ خواہ اس وجہ سے کہ خاوند تنگدست ہے یا اس وجہ سے کہ خاوند دیتا نہیں تو اس کی زکوٰۃ عورت اس وقت دے جب وصول ہو۔ اور اس صورت میں عورت ایک سال کی زکوٰۃ دے گی۔ کیونکہ عموماً بڑی رقم کے اُدھار میں ایک سال کی مہلت میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ چاروں فصل آجاتے ہیں۔ جن میں کوشش کرنے والے کے لئے کوئی نہ کوئی موقعہ ادھار اتارنے کا مل جاتا ہے۔ اور امام مالکؒ کہتے ہیں۔ جب وصول ہو اُس وقت ایک سال کی زکوٰۃ دیدے چنانچہ مؤطاء میں باب الزکوٰۃ فی الدین میں ہے۔ ظاہر ان کا قول عام معلوم ہوتا ہے کہ خواہ مل سکے یا نہ۔ دونوں صورتوں میں ایک ہی سال کی زکوٰۃ دے۔ مگر عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول ہے جو اس باب میں منقول ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ اور وہ قول یہ ہے۔

ان عمر بن عبد العزیز کتب فی مال قبضه بعض الولاة ظلما یامره برده الی اهله وتوخذ زکوته لما مضی من السنین ثم عقب بعد ذالك بكتاب الا توخذ منه الا زکوة واحدة فانه کان ضمارا۔

یعنی عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مال کی بابت لکھا جس کو بعض حکام نے ظلم سے چھین لیا تھا کہ مالکوں کو واپس دیا جائے۔ اور گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ وصول کی جائے پھر لکھا کہ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہ لی جائے مگر ایک ایک سال کی زکوٰۃ کیونکہ یہ مال ضمار تھا۔ یعنی اس کے ملنے کی اُمید نہ تھی۔

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مال مل سکتا ہے مگر اپنی مرضی سے چھوڑ رکھا ہے تو ہر سال کی زکوٰۃ دے ورنہ ایک سال کی۔ مد

اس کے علاوہ اسقاط زکوٰۃ کا لوگ بہانہ بنا لیتے ہیں۔ جیسے بیوی خاوند کو قرض دے دے یا خاوند بیوی کو دے دے یا کسی اور قابلِ اعتماد آدمی کو مثلاً چھ چھ ماہ اسی طرح کرتے رہے نہ اس کے ذمہ زکوٰۃ ہے خواہ اس طرح کئی سال گزر جائیں زکوٰۃ نہیں پڑے گی۔ سو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ زکوٰۃ کی غرض اس سے فوت ہو جاتی ہے۔

مقروض پر زکوٰۃ کا مسئلہ

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ مقروض پر زکوٰۃ نہیں پڑتی جس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ لینے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ مال ضمار ہے۔ اگر مقروض پر زکوٰۃ ہوتی تو یہ کہنا فضول تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ زکوٰۃ مالک پر ہوتی ہے اور مقروض قرض کا مالک نہیں۔ ہاں اس کے ذمہ قرضخواہ کے حق کی ادائیگی ہے سو اس کی سستی میں گنہ گار ہوگا۔ اور بے زکوٰتی مال زکوٰتی مال کو اسی وقت ہلاک کر سکتا ہے۔ جب مقروض کے پاس کی کوئی شئے قرضخواہ کا مال ہو سو یہ کسی کا مذہب نہیں کیونکہ قرض ذمہ ہوتا ہے۔ نہ اس مال پر جو مقروض کے پاس ہے۔ اگر بالفرض مقروض کے پاس کوئی شئے نہ ہو تو بھی قرض ذمہ رہے گا۔ اور اس کو حکم ہوگا کہ کمائی کر کے ادا کرے اور اگر مقروض کے پاس مال موجود ہے اور اس مال سے قرض ادا نہ کرے بلکہ کسی سے اُدھار لے کر دے دے یا نئی کمائی کر کے دیدے تو بھی قرض ادا ہو جائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث زکوٰتی مال بے زکوٰۃ مال کو ہلاک کر دیتا ہے۔ مقروض سے بالکل تعلق نہیں رکھتی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی
۱۷ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ

مزارع جو بٹائی پر زراعت کرتا ہے اُس پر بھی عشر ہے

سوال: عشر مالک زمین پر ہے یا جو بھی حصہ وغیرہ پر زراعت کرتا ہے وہ بھی عشر ادا کرنے کا مستحق ہے۔

جواب: عشر کے لئے مالک زمین کی شرط نہیں بلکہ ہر زراعت کرنے والے پر عشر ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

وما اخرجنا لکم من الارض ۔ یعنی جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اس سے خرچ کرو۔

اور حدیث میں ہے۔

فیما سقت السماء والعیون او کان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر۔

یعنی جس کھیتی کو آسمان یا چشمے پانی پلائیں یا خود زمین کی رگوں سے پانی پئے اس میں عشر ہے اور جس کو اونٹوں وغیرہ سے پانی پلایا جائے اس میں نصف عشر ہے۔

اِس آیت وحدیث میں زمین کی آمد پر عشر یا نصف عشر تبلایا ہے اور اسی سے خرچ کا حکم دیا ہے ملک یا غیر ملک کی کوئی شرط نہیں۔ اور نصاب کے اندازہ میں مالک زمین اور مزارع دونوں کے حصے شامل ہوں گے۔ اگر مجموعہ نصاب کو پہنچ جائے تو دونوں پر عشر ہو گا۔ خواہ اکیلے اکیلے کا حصہ نصاب سے کم ہو۔ چنانچہ حدیث میں بکریوں وغیرہ کی بابت تصریح آئی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

خراجی زمین میں عشر کا مسئلہ

سوال:۔ کیا خراجی زمین میں عشر ہے۔

جواب:۔ عشر اور خراج جمع ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خراج زمین کی ذات پر ہے اور عشر اُس کی پیداوار پر ہے۔ جب اُن کا محل الگ الگ ہے تو جمع ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ اور جمع نہ ہونے کی بابت جو روایت ذکر کی جاتی ہے وہ ثابت نہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی ؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس پر بہت بحث کی ہے مگر اس موقعہ پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جس خراج کی بابت بعض کا خیال ہے کہ وہ عشر کے ساتھ جمع نہیں ہوتا۔ وہ اسلامی خراج ہے جو حکومت اسلامی لیتی ہے۔ حکومتوں کے مروجہ معاملہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ انکم ٹیکس کے حکم میں ہے۔ جیسے اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی۔ ایسے ہی حکومتوں کے موجودہ معاملہ سے عشر ساقط نہیں ہوتا۔ اس پر بھی مولانا موصوف نے اپنے فتوے میں کافی بحث کی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

عشر کا سال کے بعد پڑتا یا ہر فصل پر

سوال :۔ عشر سال کے بعد پڑتا ہے یا ہر فصل پر۔

جواب :۔ عشر سال کے بعد نہیں بلکہ ہر فصل پر ہے۔ قرآن مجید میں ہے وآتوا حقه یوم حصادہ یعنی کھیتی کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

لوہار ترکھان کی آمدن پر بھی عشر ہے۔؟

سوال :۔ کیا لوہار ترکھان وغیرہم اگر اپنی آمدن سے نصاب کو پہنچ جائیں تو ان پر عشر ہے یا نہیں؟

جواب :۔ لوہار ترکھان وغیرہ کو جو دانے ملتے ہیں وہ ان کی زراعت کی آمدن نہیں خواہ نصاب کو پہنچے یا نہ، عشر زمین کی ہر پیداوار پر ہے، خضراوات (سبزی ترکاری) پر نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

دکان کے مال کی زکوٰۃ

سوال :۔ دکان میں جو مال اور ادویات رکھی جاتی ہیں۔ اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب :۔ مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

یا ایہا الذین امنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم۔

یعنی جو تم نے کمائی کی ہے اس پاکیزہ سے خرچ کرو کسب میں دستکاری۔ بیع شراء داخل ہے۔ اور اس مسئلہ پر اجماع ہے۔ خازن کی عبارت میں داؤد ظاہری کا جو کچھ خلاف ذکر کیا ہے وہ صرف اس بات میں ہے کہ سامان کے مالک ہونے کے وقت تجارت کی نیت نہ تھی۔ اس کے بعد اس میں تجارت کا ارادہ ہو گیا۔ اور اس کی فروخت شروع کر دی تو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ اور اگر مالک ہونے کے وقت تجارت کی نیت سے خریدا ہے۔ جیسے عام طور پر تاجر پیشہ یا دکاندار خریدتے ہیں تو اسی نیت سے خریدتے ہیں۔ تو اس میں وجوب زکوٰۃ سے داؤد ظاہری کو بھی انکار نہیں۔ پس اس میں

بالاجماع زکوٰۃ ہے۔ اس کے علاوہ جب حدیث میں آگیا کہ مال تجارت میں زکوٰۃ ہے خواہ مالک ہونے کے وقت نیت تجارت ہو یا نہ ہو تو پھر کسی کی مخالفت نقصان نہیں دیتی۔

مالِ تجارت سے زکوٰۃ ادا کرنے کا طریق

یہ ہے کہ سال کے بعد جتنا مال دکان میں ہے اس کی قیمت اور اس کے ساتھ موجودہ نقدی کو بھی شامل کر کے سب کا چالیسواں حصہ ادا کر دے مگر یہ اُس وقت ہے جب مال کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہے چنانچہ عموماً تجارت میں مال آتا رہتا ہے اور نکلتا رہتا ہے اور وہی پیسے بار بار مال کی خرید میں خرچ ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی شے ہو جو یک لخت خرید لی اور بدستور پڑی رہی اور مدت تک فروخت نہ ہوئی تو اس پر فروخت کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ پڑے گی خواہ کئی سالوں کے بعد فروخت ہو چنانچہ موطاء امام مالک وغیرہ میں اس کی تفصیل ہے۔

کارخانہ یا مشین پر زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال:۔ کارخانہ یا مشین پر زکوٰۃ ہے ؟

جواب:۔ کارخانہ یا مشین جس میں مال تیار ہو کر نکلتا ہے۔ اس کی قیمت مال تجارت میں نہیں لگائی جائے گی۔ کیونکہ یہ ذریعہ کسب ہے جیسے اوزار ہوتے ہیں۔ پس اس میں صرف مال تیار شدہ اور غیر تیار شدہ کی قیمت لگائی جائے گی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

مکان۔ لاریاں۔ ٹرک پر زکوٰۃ

سوال:۔ مکان۔ لاریاں اور ٹرک کرایہ پر چلتے ہیں۔ ان کی مالیت ہزارہا روپیہ ہوتی ہے۔ ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں۔
عبدالمجید از قصور

جواب۔ قرآن مجید میں ہے۔ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (پ ۱۶)

لہ ابوداؤد میں ہے عن سمرۃ کان یامرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نخرج الزکوٰۃ مما نعد للبیع۔

یعنی جس کشتی کو خضر علیہ السلام نے عیب دار کیا وہ ان مساکین کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے۔
کشتی کافی مالیت کی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کشتی کے مالکوں کو مساکین فرمایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی تھوڑی تھی جو گذر اوقات کے لئے کافی نہ تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کمائی کے ذرائع کارخانہ، مکان۔ لاریاں اور آلات وغیرہ کی مالیت خواہ کتنی بھی ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ ہاں ان کی آمدنی نصاب کو پہنچ کر اس پر سال گذر جائے تو اس آمدنی پر زکوٰۃ ہے۔
اور اگر ان آلات اور ذرائع کی تجارت کی جائے۔ مثلاً لاریوں۔ ٹرکوں اور کارخانوں کی خرید و فروخت کی جائے تو پھر یہ مالِ تجارت سمجھا جائے گا، اور اس کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور

۷ شعبان ۱۳۷۹ھ

زکوٰۃ کے روپیہ سے مذہبی اخبار خریدنا

سوال: زکوٰۃ کے روپے اخبار تنظیم اہلحدیث کے چندہ میں خرچ کئے جاسکتے ہیں۔

جواب: اگر اخبار تنظیم اہلحدیث اپنے نام جاری کرانا چاہتے ہیں تو زکوٰۃ سے جاری نہیں کراسکتے کیونکہ اس طرح زکوٰۃ گھر ہیں رہتی ہے۔ اگر دوسرے کے نام جاری کرانا چاہتے ہیں تو اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اس کی مرضی سے جاری ہو سکتا ہے۔ ابوداؤد کتاب الخراج میں ہے کہ معاذ نے کپاس کے عشر میں یمنی کپڑوں کے کچھ جوڑے لینے منظور کر لئے۔ اور فرمایا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور تمہیں ان کی ادائیگی میں سہولت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مستحق زکوٰۃ اپنے مناسب حال کوئی شئے منظور کرے تو اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ معاذ چونکہ نائب عام تھے۔ اس لئے ان کی منظوری مستحقین زکوٰۃ کی منظوری کے قائم مقام ہے اور اگر مال زکوٰۃ سے اخبار خرید کر وقف کرنا چاہتے ہیں تو یہ ایسا ہے جیسے مسجد وغیرہ پر مال زکوٰۃ صرف کریں۔ اس میں اختلاف ہے کہ زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہ۔ زکوٰۃ فرض ہے اس کو شبہ کے ساتھ ادا کرنا ٹھیک نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ ۲۴ جون ۱۹۳۸ء

اشاعت کتب پر زکوٰۃ صرف کرنا

سوال :- ایک مولوی صاحب لوگوں سے ہزاروں روپیہ زکوٰۃ لے کر ایک کتاب تالیف و طبع کرکے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ عام متمول لوگوں کو اور کچھ تھوڑی سی غرباء کو بھی۔ کیا امیر لوگ وہ کتاب مفت لے سکتے ہیں؟ اور کیا زکوٰۃ کا یہ مصرف صحیح ہے؟

جواب :- زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حج و عمرہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ صورت مسئولہ فی سبیل اللہ میں داخل نہیں کیونکہ اگر وہ کتاب بطور وقف اغنیاء کو دی جاتی ہے تو زکوٰۃ کا وقف کرنا ثابت نہیں اور اگر بطور ملک اغنیاء کو دی جاتی ہے تو غنی کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں۔ بہر حال صورت مسئولہ جائز نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور جامعہ اہلحدیث

سید کے لئے زکوٰۃ

سوال :- ایک سید جو نہایت ہی غریب اور مفلس ہے زکوٰۃ کی رقم سے اس کی امداد ہو سکتی ہے۔

جواب :- احادیث میں تو یہی آیا ہے کہ اہل بیت کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں۔ متاخرین علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ چونکہ خمس وغیرہ سے اہل بیت کے وظیفے مقرر تھے اس لئے ان کے لئے زکوٰۃ جائز نہ تھی۔ اب مجبوری کی وجہ سے جائز ہو سکتی ہے لیکن یہ فتویٰ ایک رائے ہے اس لئے تسلی نہیں۔ ہاں کوئی زیادہ ہی مجبور ہو جو اضطراری حالت تک پہنچ چکا ہے۔ خود کما نہیں سکتا۔ اور بچے چھوٹے ہیں یا کسی وجہ سے مجبور ہیں تو ایسے حال میں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت نہ ہو لیکن پھر بھی جہاں تک پرہیز ہو سکے اچھا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ اہلحدیث لاہور

۱۷ شعبان ۱۳۸۳ھ ـ ۳ جنوری ۱۹۶۴ء

حکومت کی طرف سے ضبط شدہ رقم جو کئی سال کے بعد وصول ہوئی اس پر زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال :- میرا تقریباً تین لاکھ روپیہ ایک بنک میں جمع ہے۔ قیام مارشل لاء تک میں باقاعدہ اس کی

زکوٰۃ ادا کرتا رہا لیکن جب پاکستان میں مارشل لا نافذ ہوا تو کسی نے میرے خلاف اس رقم کے متعلق درخواست دائر کر دی کہ اس نے میری اتنی رقم دھوکہ سے اپنے نام جمع کروالی ہے۔ اصل میں وہ اس رقم کا جائز مالک نہیں۔ یہ مقدمہ تین سال تک چلتا رہا۔ دوران مقدمہ زکوٰۃ ادا نہیں کی جولائی ۱۹۶۳ء میں میرے حق میں فیصلہ ہو گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ میرے ذمہ گذشتہ چار سال کی زکوٰۃ ہے یا صرف ایک سال کی جب سے اس کا مجھے جائز مالک قرار دیا گیا ہے۔

جواب :۔ اس قسم کے مال کو مال ضمار کہتے ہیں۔ جو انسان کی ملک میں ہو لیکن اس پر قبضہ نہ ہو۔ یعنی اس میں تصرف کی قدرت نہ ہو۔ جیسے صورت مسئولہ یا وہ قرض جو وصول نہیں ہوتا ہے۔ ایسے اموال کے متعلق عمر بن عبدالعزیز رحمہ وغیرہ کا فیصلہ یہ ہے کہ صرف ایک سال کی زکوٰۃ ہے جب کہ وصول ہو خواہ کئی سال گذر جائیں۔ موطا امام مالک مع زرقانی

عبداللہ امرتسری روپڑی حال جامعہ اہلحدیث لاہور

۷ شعبان ۱۳۸۳ھ ۔ ۳ جنوری ۱۹۶۴ء

مقروض پر زکوٰۃ

سوال :۔ جو شخص مقروض ہو۔ کیا اس پر زکوٰۃ ہے۔

جواب :۔ اگر اور جائداد ہو جس سے قرض ادا ہو سکتا ہے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی ورنہ نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

زیور میں زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال :۔ زیور کی زکوٰۃ کس طرح دی جائے۔ آیا زیور کی قیمت بہ شرح وقت معلوم کر کے اس کا چالیسواں حصہ ادا کیا جائے؟

جواب :۔ زیور کی زکوٰۃ جس طرح چاہے ادا کرے خواہ وزن کے لحاظ سے چالیسواں حصہ دے خواہ موجودہ نرخ پر اس کی قیمت کا چالیسواں حصہ دے دے شرعاً اس میں کوئی فرق نہیں۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

دو حصوں میں تقسیم شدہ سونے کی زکوٰۃ کا مسئلہ

سوال :۔ زید کے پاس گیارہ تولہ سونا تھا۔ اس سے زید نے سات تولہ اپنی بیوی کو بصورت زیور مہر میں دے دیا۔ اب چار تولہ زید کے پاس ہے۔ سوال یہ ہے کہ سات تولہ عورت کی ملکیت ہے اور چار تولہ زید کی۔ کیا اب یہ سونا ایک ہی عورت کے استعمال میں آنے کی وجہ سے گیارہ تولہ کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی یا ملکیت کا اعتبار ہوگا۔ محمد ابراہیم

جواب :۔ بیوی کی ملک۔ اور خاوند کی ملک میں جیسا سونا ہے وہ علیحدہ علیحدہ پورا نصاب نہیں۔ اس لئے کسی پر زکوٰۃ نہیں۔ ہاں اشتراک کی صورت مال تجارت یا بکریاں وغیرہ اکٹھی ہوتی ہیں۔ ایک چرواہا ہوتا ہے اکٹھی چرتی ہیں۔ اس صورت میں نصاب مشترکہ شریعت میں معتبر ہے۔ لیکن صورت مسئولہ میں سونا علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنی اپنی ملکیت ہے اس لئے زکوٰۃ نہیں۔ ہاں اگر صورت مسئولہ میں سونا آپس میں تقسیم نہیں کیا گیا تو پھر گیارہ تولہ کی زکوٰۃ دینی چاہیئے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۸ رجب ۱۳۸۳ھ ۶ دسمبر ۱۹۶۳ء

زیور کپڑے وغیرہ کی زکوٰۃ کا حکم

سوال :۔ ایک زیور غیر مستعملہ ہے۔ اور ایک مستعملہ یا ایک کبھی کبھی پہنا جاتا ہے اور ایک سال بھر پہنا جاتا ہے یا سال کا اکثر حصہ پہنا جاتا ہے اس میں زکوٰۃ ہے۔ نیز کپڑا بنا ہوا اور سوت پر زکوٰۃ ہے۔؟

جواب :۔ زکوٰۃ زیور کے متعلق چند احادیث آئی ہیں۔ لیکن ان میں کچھ کلام ہے۔ اس لئے زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ احتیاط دینے میں ہے تاکہ شک و شبہ نہ رہے۔ ہاں جو زیور اکثر رکھا جاتا ہے اور شاذ و نادر پہنا جاتا ہے تو ایسے زیور کی زکوٰۃ ضرور دینی چاہیئے کیونکہ وہ خزانہ کا حکم رکھتا ہے۔ ایسے پہننے کا اعتبار نہیں۔ اگر اکثر پہنا جاتا ہے یا پہننا اور نہ پہننا دونوں کا قریبًا برابر وقت ہے تو یہ پہننے میں شامل ہو سکتا ہے۔

مال تجارت سے زکوٰۃ نکالنے کی صورت :۔ سونا اور چاندی کے علاوہ باقی اسباب پر زکوٰۃ نہیں

ہاں تجارتی ہو تو اس پر زکوٰۃ ہے جس کی صورت یہ ہے کہ سال کے بعد دکان میں جتنا مال ہوگا اس کی قیمت لگا کر زکوٰۃ دے دے۔ اسی طرح ہر سال کرے۔ کیونکہ دکان میں ہر وقت مال آتا رہتا ہے اور نکلتا رہتا ہے تو اکیلی اکیلی شے پر الگ الگ سال کی صورت پیدا نہیں ہوتی اور اگر کوئی شے سال تک رہے تو اس کا الگ حساب مشکل ہے۔ اس لئے دکان کی مجموعی حالت کا لحاظ ہوگا۔ اور اگر تجارتی مال اس طرح کا ہے کہ اکٹھا خریدا ہے پھر وہ سال تک فروخت نہیں ہوا تو وہ جب فروخت ہوگا اس وقت اس پر زکوٰۃ پڑے گی۔ اور زکوٰۃ بھی ایک ہی سال کی پڑے گی۔ خواہ کئی سالوں کے بعد فروخت ہو کیونکہ تجارتی مال پر زکوٰۃ اس لئے پڑتی ہے کہ بوجہ بکری کے وہ سونے چاندی کے حکم میں ہو جاتا ہے یعنی ہر وقت اُس کے پیسے بنتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ پیسوں کے حکم میں ہو کر سال کے بعد اس پر زکوٰۃ پڑ جاتی ہے۔ اور جس شے کے کئی سالوں تک پیسے نہیں بنتے۔ اس کے درمیانے سالوں کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ صرف یہی سال لیا جائے گا جس میں یہ فروخت ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس قرضہ کے ملنے کی اُمید نہ ہو اگر وہ کئی سالوں کے بعد مل جائے تو اس پر بھی ایک ہی سال کی زکوٰۃ ہے کیونکہ جب اُس کو مایوسی ہو گئی تو گویا درمیانے سالوں میں وہ اس کے لئے روپے پیسے ہی نہیں رہا۔

بھولی ہوئی رقم پر زکوٰۃ

اسی طرح کسی جگہ روپے پیسے رکھ کر بھول گیا۔ اور کئی سالوں تک پتہ نہ چلا تو ان کا بھی یہی حکم ہے غرض اس قسم کے مال کو ضمار (غائب مال) کہتے ہیں جس کا ذکر موطاء امام مالک وغیرہ میں ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۰ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ ۲۹ جون ۱۹۴۰ء

کماد پر زکوٰۃ کا حکم

سوال:۔ پونڈا (پونا) کماد اکثر ایک ایک گنا فروخت ہوتا ہے۔ دوسرا کماد بھی زمیندار لوگ چارہ وغیرہ کے لئے کھیت میں فروخت کر دیتے ہیں۔ کچھ خود چارہ کی صورت میں استعمال کر لیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے۔ کماد کا نصاب کتنا ہے۔؟

جواب:۔ کماد کھیت میں چارہ کے لئے فروخت کر دیا جائے تو اس پر عشر نہیں۔ سبزی کے حکم میں ہے۔ اگر خود چرایا جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ وہ گڑ شکر بنانے کے

قابل نہ ہوا ہو۔ اگر کماد گڑ شکر بنانے کے قابل ہو چکا ہے تو اب خواہ فروخت کرے یا خود چرائے اس پر عشر پڑ جائے گا۔ اس صورت میں اندازہ لگایا جائے کہ اس سے کتنا گڑ شکر نکلے گا۔ اسی اندازہ سے عشر دیا جائے مثلاً اگر گڑ شکر کا اندازہ پانچ دستی (۲۰ من پختہ) ہے تو بیس من کی قیمت کا دسواں یا بیسواں حصہ دیا جائے پونڈا کماد میں یہ شرط نہیں۔ کیونکہ اس سے اصل مقصد گڑ شکر بنانا نہیں ہوتا وہ بہر حال سبزی کے حکم میں رہے گا۔ ہاں اگر اس کا کوئی شخص گڑ شکر بنالے تو پھر عشر پڑ جائے گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

عشر سے مستثنیٰ اجناس

سوال :۔ پیداوار اراضی زرعی سے کون کونسی چیزیں مستثنیٰ ہیں۔

جواب :۔ حدیث میں ہے لیس فی الخضروات صدقة۔ یعنی سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سبزیوں کے علاوہ باقی سب چیزوں میں زکوۃ ہے۔

کپاس

کپاس بھی سب چیزوں میں شامل ہے۔ کپاس کا حدیث میں الگ ذکر بھی آیا ہے۔ (ابوداؤد باب الخراج)
کپاس کا عشر دیا جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

وقف زمین میں عشر کا مسئلہ

سوال :۔ اراضی موقوفہ خصوصاً اراضی موقوفہ للمسجد میں عشر ہے یا نہیں؟

جواب :۔ عن ابی ھریرۃ رض قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر علی الصدقة فقیل منع ابن جمیل وخالد بن الولید والعباس فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ینقم ابن جمیل انہ کان فقیرا فاغناہ اللہ ورسولہ واما خالد فانکم تظلمون خالدا فقد احبس ادراعہ واعتدہ فی سبیل اللہ واما العباس فھی علی ومثلھا معھا ثم قال یاعمر اما شعرت

ان عم الرجل صنو ابیہ ۔ متفق علیہ ۔

یعنی حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو صدقہ پر عامل بنا کر بھیجا ۔ کہا گیا ابن جمیلؓ ۔ خالد بن ولیدؓ اور عباسؓ نے صدقہ ادا نہیں کیا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن جمیلؓ نے تو یہی عیب پکڑا ہے کہ خدا اور رسول نے اس کو غنیمتوں کے مال سے اغنی کر دیا ۔ اور خالد پر تم خواہ مخواہ ظلم کرتے ہو ۔ اس نے تو اپنی زرہیں اور سامان جنگ گھوڑے اونٹ وغیرہ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے اور عباس رضؓ کا اور اس کی مثل میرے ذمہ ہے (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ)

اس سے معلوم ہوا کہ وقف میں صدقہ نہیں ۔ اگرچہ یہاں سامان جنگ کا ذکر ہے مگر وجہ آپ نے یہ بتائی ہے کہ وہ وقف ہے پس معلوم ہوا کہ وقف مانع صدقہ ہے ۔ پس زمین بھی اس کے تحت آگئی ۔ نیز حضرت عمرؓ نے خیبر میں جو زمین وقف کی تھی اس کی آمد کے مصارف کی تفصیل میں انہوں نے عشر کا کوئی ذکر نہیں کیا (منتقی مع نیل) اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ وقف میں عشر نہیں نیز وقف خود ایک قسم صدقہ ہے ۔ پس صدقہ میں صدقہ کے کچھ معنی نہیں ۔ اس لئے عشر زکوٰۃ جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا صدقہ نہیں ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۱ محرم ۱۳۸۰ھ ۱۵ جولائی ۱۹۶۰ء

سونا چاندی کا نصاب

سوال :۔ سونا اور چاندی کس قدر ہو تو اس پر زکوٰۃ پڑتی ہے ۔ اگر سونا چاندی الگ نصاب تک نہ پہنچیں نہ دونوں کو ملا کر زکوٰۃ دی جا سکتی ہے ۔ ؟

جواب :۔ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ ہے ۔ اگر اس سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں اور چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولہ ہے اگر اس سے کم ہو تو اس میں بھی زکوٰۃ نہیں ۔ اگر دونوں مل کر نصاب کو پہنچ جائیں تو پھر اس میں زکوٰۃ پڑ جائے گی ۔ کیونکہ ان دونوں جنسوں کا تبادلہ آسانی سے ہو سکتا ہے تو گویا یہ دونوں ایک ہی ہیں ۔ اس بنا پر مثلاً کسی کے پاس پونے چار تولہ سونا ہو اور سوا چھبیس تولہ چاندی ہو تو زکوٰۃ دینی پڑیگی کتب فقہ میں اس میں اختلاف لکھا ہے کہ دونوں کو کس طرح ملایا جائے ۔ بعض تو اس طرح کہتے ہیں جس طرح میں نے لکھا ہے یعنی وزن کا لحاظ کیا جائے اور بعض کہتے ہیں کہ قیمت کا لحاظ کیا جائے ۔ مثلاً

صورتِ مذکورہ میں سونے کی قیمت لگائی جائے۔ اگر پونے چار تولہ سونا کی یا اس سے کم کی سوا چھبیس تولہ چاندی آسکے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی اگر کم آئے تو نہیں۔ مگر ایسے اختلاف کے موقعہ پر احتیاط والی جانب کو اختیار کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وزن کے لحاظ سے نصاب پورا ہو جائے قیمت کے لحاظ سے نہ ہو یا قیمت کے لحاظ سے پورا ہو جائے وزن کے لحاظ سے نہ ہو تو جس لحاظ سے پورا ہو اسی کو اختیار کر کے زکوٰۃ دے دینی چاہیئے۔ کیونکہ فرض کا معاملہ ہے۔ شبہ نہ رہے جب سونا اور چاندی کا اکیلے اکیلے یا ملا کر نصاب پورا ہو جائے اور سال بھر پڑا رہے تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دے۔ اگر زیور ہے تو اس میں اختیار ہے خواہ کوئی زیور دے دے یا قیمت لگا کر اتنے پیسے دے دے۔ دیگر چاندی سونے میں بھی قیمت لگا کر پیسے دے سکتا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۱ رجب ۱۳۵۴ھ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء

کھیتی باغات

سوال:۔ کھیتی باغات وغیرہ کی کن کن فصلوں میں عشر ہے۔

جواب:۔ سبزیاں وغیرہ جو ذخیرہ نہیں ہو سکتیں یا مشکل سے تھوڑے دن تک ذخیرہ ہو سکتی ہیں جیسے آلو۔ پیاز۔ لسن وغیرہ ان کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ ان میں زکوٰۃ نہیں باقی میں زکوٰۃ ہے۔ بیس من پختہ انگریزی وزن اس کا نصاب ہے اس سے کم ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں۔ اگر کئی اجناس مل کر نصاب پورا ہو جائے تو ان کو بھی ملا لینا چاہیئے مثلاً گیہوں۔ چنے۔ جو وغیرہ ایک موسم کی اشیاء ملانے سے نصاب پورا ہو جائے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ اگرچہ کسی روایت میں اس کی تصریح نہیں آئی۔ مگر غلہ ہونے کی وجہ سے ان میں قرب ہے جیسے بکریاں۔ بھیڑیں وغیرہ ایک ہیں۔ اور بہت دفعہ یہ اشیاء ملا کر بوئی جاتی ہیں اور بکریں بھیڑوں کی طرح ان کا نصاب بھی ایک ہی ہے۔ اس لئے احتیاطاً ملا لینا مناسب ہے۔ ہاں اگر زیادہ فرق ہو تو نہ ملانے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے کپاس اور گنا۔ کیونکہ گنا سے گڑ شکر تیار ہوتی ہے جو کھانے کے کام آتی ہے اور کپاس سے کپڑا بنتا ہے جو پہننے کے کام آتا ہے اگرچہ یہ دونوں ایک موسم کی اشیاء ہیں مگر زیادہ فرق کی وجہ سے ان کو الگ الگ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سرسوں۔ توریہ۔ تارامیرا ملتے جلتے ہیں مگر کپاس اور گنا کے ساتھ ان کو کوئی مناسبت نہیں۔ اس لئے توریہ۔ تارامیرا کو آپس میں ایک سمجھنا چاہیئے۔ کپاس

اور گنا الگ۔

جب ان اشیاء کا نصاب پورا ہو جائے تو بارانی زمین سے دسواں حصہ اور چاہی سے بیسواں حصہ زکوٰۃ دے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بکریاں۔ بھیڑیں۔ دنبے

سوال:۔ بکریوں، بھیڑوں، دنبوں کا نصاب زکوٰۃ کیا ہے؟

جواب:۔ بکریوں وغیرہ کا نصاب چالیس ہیں۔ ان کو الگ الگ اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ حدیث میں ان سب کو غنم کے لفظ سے ذکر کرکے ان کا نصاب چالیس تبلایا ہے۔ پس یہ سب ایک جنس ہے۔ جب اکیلے اکیلے یا سب ملا کر ان کا نصاب پورا ہو جائے تو سال کے بعد چالیس میں ایک ہے ایک سو بیس تک ایک ہی ہے۔ اگر اس سے زیادہ ہو جائیں تو دو سو تک دو ہیں، اگر اس سے زیادہ ہو جائیں تو تین سو تک تین ہیں۔ اس کے بعد ہر سینکڑے میں ایک ہے۔ چھوٹے بڑے ملا کر تعداد پوری کی جائے گی۔ اور درمیانہ بھار و لیا جائے گا۔ بوڑھی۔ دبلی زکوٰۃ میں نہیں لگتی، سانڈھ بھی نہیں لگتا۔ ہاں اگر عامل لینا چاہے تو زکوٰۃ میں لگ سکتا ہے۔ اگر دو شخصوں کی بکریاں بھیڑیں اکٹھی چرتی ہوں اور رات ایک جگہ رہتی ہوں تو وہ ایسی سمجھی جائیں گی جیسے ایک کی ہیں، یعنی دونوں کو ملا کر نصاب پورا کیا جائے گا اور زکوٰۃ لے لی جائے گی پھر وہ اپنا حساب آپس میں ٹھیک کر لیں گے۔

اونٹ کی زکوٰۃ

سوال:۔ اونٹ کتنے ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تفصیل فرمائیں۔

جواب:۔ اونٹ کا نصاب پانچ ہے۔ اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔ ہر پانچ میں ایک بکری چوبیس میں چار بکریاں۔ پچیس میں پورا ایک سالہ مادہ بچہ۔ اگر ایک سالہ نہ ہو تو دو سالہ نر بھی لگ سکتا ہے پینتیس تک یہی حکم ہے۔ اس کے بعد چھتیس سے پینتالیس تک پورا دو سالہ مادہ بچہ پھر چھیالیس سے ساٹھ تک پورا تین سالہ پھر اکسٹھ سے پچھتر تک پورے چار سال کی اونٹنی۔ اس کے بعد چھہتر سے نوے تک پورے دو سال

کے دو مادہ بچے۔ پھر ایک سو بیس تک پورے تین تین سال کے دو مادہ بچے جب اس سے زیادہ ہو جائیں تو پھر ہر چالیس پر دو سالہ مادہ بچہ اور ہر پچاس پر تین سالہ مادہ بچہ۔

مسئلہ۔ اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ جس عمر کا بچہ دینا لازم آتا ہے، اُس عمر کا نہ ہو۔ مثلاً چار سالہ دینا آتا ہے اور اس کے پاس تین سالہ ہے تو اس سے تین سالہ ہی قبول کر لیا جائے گا لیکن ساتھ دو بکریاں دے یا قریباً پانچ سوا پانچ روپیہ دے اگر اس کا الٹ ہو یعنی اس کے ذمہ تین سالہ لازم آتا ہے اور اس کے پاس چار سالہ ہے تو عامل چار سالہ لے لے اور مالک کو دو بکریاں یا قریباً پانچ سوا پانچ روپیہ دیدے اور اگر اس کے ذمہ دو سالہ بچہ لازم آتا ہے اور اس کے پاس ایک سالہ مادہ ہے تو ایک سالہ ہی قبول کر لیا جائے گا۔ لیکن ساتھ دو بکریاں دے دے یا قریباً پانچ سوا پانچ روپیہ دے اگر اس کا الٹ ہو تو عامل دو بکریاں یا قریباً پانچ سوا پانچ روپیہ دے دے۔ غرض جب فرق پڑ جائے تو اس طرح سے اپنا حساب ٹھیک کر لیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

گائے بھینس کی زکوٰۃ

سوال:۔ گائے بھینس کا نصاب کتنا ہے؟ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی کیا صورت ہے؟

جواب:۔ گائے کا نصاب تیس ہے۔ اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔ بھینس بھی گائے کے حکم میں ہے۔ تیس میں ایک سال کی بچھڑی یا بچھڑا۔ کٹڑی یا کٹڑا۔ اگر چالیس ہو جائیں تو دو سال کی بچھڑی یا بچھڑا یا کٹڑی یا کٹڑا۔ اِس طرح ہر تیس اور چالیس کا حساب چلایا جائے گا۔

گھوڑا۔ گدھا

گھوڑے۔ گدھے۔ غلام میں زکوٰۃ نہیں۔ ہاں اگر ان کی تجارت کرے تو پھر زکوٰۃ ہو گی۔ کیونکہ مال تجارت میں مطلقاً زکوٰۃ ہے۔ خواہ کسی قسم کا ہو۔

مسئلہ

بکریاں۔ بھیڑیں۔ اونٹ وغیرہ جن میں زکوٰۃ ہے اُن کے لئے شرط ہے کہ ان کا گذارہ اکثر باہر کے چارہ پر ہو۔ اور اگر قیمت کے چارہ پر گذارہ ہو تو پھر زکوٰۃ معاف ہے۔

شہد کی زکوٰۃ

سوال :۔ کیا شہد میں زکوٰۃ ہے اس کے نصاب سے آگاہ فرمائیں۔

جواب :۔ شہد کا نصاب دس مشکیں ہیں۔ اگر اس سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں۔ دس مشک میں ایک مشک ہے۔ گویا بارانی کھیتی کے حکم میں ہے یعنی جیسے اس کا دسواں حصہ ہے۔ اس طرح شہد کا بھی دسواں حصہ ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۱ رجب ۱۳۵۴ھ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مصارف زکوٰۃ

سوال :۔ قرآن مجید نے جو مصارف زکوٰۃ بیان فرمائے ہیں ان کی تفصیل فرمائی جائے۔

جواب :۔ قرآن مجید میں ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۔

یعنی سوائے اس کے نہیں خیرات فقراء اور مساکین کے لئے ہے۔ اور اُن کے لئے جو تحصیل زکوٰۃ پر عامل ہیں۔ اور ان نومسلموں کے لئے جن کی تالیف قلوب مطلوب ہے اور گردنوں کے آزاد کرنے میں اور مسافروں کے لئے یہ فرض ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اور اللہ تعالےٰ جاننے والا حکمت والا ہے

فقیر مسکین میں یہ فرق ہے کہ فقیر زیادہ تنگدست کو کہتے ہیں۔ اور مسکین کچھ کم کو۔ خضر علیہ السّلام نے جن کی کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تھا۔ قرآن مجید میں ان کو مسکین کہا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی کشتی بھی تھی جس کے ذریعہ وہ کچھ کماتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ

یعنی کشتی مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے

خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ کشتی مسکینوں کی تھی اس کا ظاہر اسی کو چاہتا ہے کہ کشتی ان کی ملک تھی اور کچھ کماتے بھی تھے ۔ اور باوجود اس کے ان کو مسکین کہا ——— اس سے معلوم ہوا کہ مسکین ہونے کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ بالکل نادار ہو بلکہ صرف معاش کا تنگ ہونا شرط ہے ۔ ہاں فقیر وہ ہے جو بالکل نادار ہو ۔ ابن عباسؓ ، حسنؒ ، مجاہدؒ ، قتادہ رح ، عکرمہؒ ، زہری رح فقیر کے لئے نہ ہونے کی شرط کرتے ہیں ۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں جو دربدر پھر کر ایک ایک درہم یا کھجور جمع کرے وہ فقیر نہیں بلکہ فقیر وہ ہے جو بدن کپڑا صاف رکھے اور سوال نہ کرے ۔ اس صفائی کی وجہ سے ناواقف اُس کو غنی سمجھتا ہے ۔ جیسے آیت کریمہ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ (۳۵) میں ہے) ملاحظہ ہو معالم التنزیل وغیرہ ۔ حدیث میں ہے مسکین وہ نہیں جو لقمہ دو لقمے اور کھجور دو کھجوریں دربدر مانگتا پھرے بلکہ مسکین وہ ہے کہ اس کے پاس اتنا نہیں کہ اس کو کفایت کرے اور نہ اس کی اطلاع پائی جاتی ہے کہ کوئی اس پر صدقہ کرے اور نہ وہ لوگوں سے سوال کرتا ہے (مشکوٰۃ من تحل لہ المسئلۃ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اپنے نفس کے لئے دربدر پھرنے سے نہ ہٹے اس کو زکوٰۃ نہ دینی چاہیئے جو اس میں احتیاط نہیں کرتے وہ غلط کرتے ہیں ۔

عامل

تحصیل زکوٰۃ پر عامل اگرچہ غنی ہو ۔ اس کو حق الخدمت دیا جاتا ہے ۔ حدیث میں ہے غنی کو پانچ حالتوں میں صدقہ حلال ہے (اول) جنگ کی حالت میں (دوم) تحصیل صدقات پر عامل ہونے کی حالت میں (سوم) جب وہ مقروض ہو جائے (چہارم) صدقہ کی شئے اپنے پیسے سے خریدنے کی حالت میں (پنجم) مسکین جس پر صدقہ ہوا ہے وہ اس اپنے صدقہ سے کسی غنی کو تحفہ دیدے (مشکوٰۃ باب من لا تحل لہ الصدقۃ)

اس حدیث میں صاف تصریح ہے کہ تحصیل صدقات پر عامل خواہ غنی ہو وہ حق الخدمت لے سکتا ہے ایک اور حدیث میں ہے ابن ساعدی کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے صدقہ پر مجھے عامل بنایا ۔ جب میں فارغ ہوا اور مال زکوٰۃ حضرت عمرؓ کے حوالہ کر دیا تو حضرت عمرؓ نے مجھے حق الخدمت دینا چاہا ۔ میں نے کہا میرا کام یہ للہ ہے ۔ میں نے اسی نیت سے کیا ہے میرا اجر خدا پر ہے ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جو کچھ تجھے دیا جاتا ہے لے لے ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تحصیل زکوٰۃ کا کام کیا تھا ۔ آپ مجھے حق الخدمت دینے لگے ۔ میں نے یہی کہا جو کچھ تو نے مجھے کہا ۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب تجھے بغیر مانگے کوئی شئے ملے تو اس کو کھا اور صدقہ کر ۔

نومسلم

اسی طرح نومسلم خواہ غنی ہو۔ اُس کے ساتھ بھی سلوک اس لئے کیا جاتا ہے کہ کسی وقت تھوڑی بہت تکلیف پہنچنے سے اسلام سے برگشتہ نہ ہو جائے۔ بخاری کتاب الایمان (باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں بعض لوگوں کو اس لئے دیتا ہوں کہ کہیں خدا ان کو جہنم میں نہ الٹا دے

گردنوں کا آزاد کرنا

اس سے مراد مکاتب ہے۔ جس کو اس کا مالک لکھ دیتا ہے کہ تو اتنے روپے ادا کر دے تو تو آزاد ہے قرآن مجید میں ہے۔ و آتوھم من مال اللہ الذی اتاکم (۱۸/۲۴) یعنی مکاتبوں کو خدا کے دئے ہوئے مال سے دو۔ اور گردنوں کے آزاد کرنے میں قیدیوں کا چھڑانا بھی داخل ہے۔ کیونکہ مکاتب سے بھی زیادہ تنگی میں ہیں۔ اور اگر گردن کے آزاد کرنے میں مطلق غلام کو داخل کر دیا جائے تو اس کا بھی کوئی حرج نہیں مثلاً مال زکوٰۃ سے کوئی غلام خرید کر آزاد کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ ہاں اپنا غلام آزاد کر دے اور اس کی قیمت مال زکوٰۃ سے وضع کر لے۔ تو اس میں شبہ ہے کیونکہ جب کوئی غلام ردی ہونے کی وجہ سے بکتا نہ ہو یا تھوڑی قیمت ملتی ہو تو وہ اُس کو آزاد کر کے اس کا حساب زکوٰۃ میں لگا لے اس لئے اپنے غلام کی بابت اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ اس کی بابت دوسرے لوگوں سے قیمت وغیرہ کا فیصلہ کرا لے تو اس صورت میں اجازت کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

قرضدار

قرضدار دو طرح کے ہیں۔ ایک جو کسی کا ضامن ہو جائے اور اُس کو ضمانت بھرنی پڑے یا کسی اور طرح دوسرے کی وجہ سے اس پر تاوان پڑ گیا۔ دوسرا وہ قرضدار ہے جو اپنے لین دین میں مقروض ہو جائے۔ جیسے تجارت میں خسارہ پڑ گیا۔ یا اور کوئی نقصان پہنچا۔ یہاں مُراد پہلی قسم ہے کیونکہ آیت میں الغارمین کا لفظ ہے جو غرامت سے نکلا ہے اور غرامت کا استعمال اگرچہ عام قرض میں بھی ہوتا ہے۔ جیسے قرض کی دعاؤں میں ہے مگر اصل معنیٰ اس کے تاوان کے ہیں۔ اور یہاں یہی مراد ہے کیونکہ اگر عام قرضدار مراد لیں تو اس میں اُمراء بھی آ سکتے ہیں جو اکثر تجارت میں اُدھار کا معاملہ کرتے ہیں۔ اور اگر وہ قرضدار مراد لیں جس کو قرض نے دبا لیا ہو اور اس کی جائداد قرض میں گھر گئی ہو تو وہ فقیر مسکین کے حکم میں ہیں۔ پھر اس کے الگ ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ عام محاورہ میں یہ فقیر مسکین نہیں کہلاتا اس لئے اس کا الگ ذکر کیا۔ تو اس

صورت میں فائدہ ہوسکتا ہے۔ بہرصورت قرضدار سے مراد مطلق قرضدار نہیں بلکہ یا تو اس کا قرض دوسرے کی خاطر ہو جو اس بچارے پر تاوان کے حکم میں ہے یا وہ جس کو قرض نے دبالیا ہے اور اس کی جائداد کو گھیر لیا ہے اگر ایسا مقروض نہ ہو تو اس کو زکوٰۃ نہیں لگتی بلکہ اگر اس کے پاس اتنا سونا چاندی ہو جس پر زکوٰۃ پڑسکتی ہے۔ یا اتنا غلہ وغیرہ ہو جو عشر کے قابل ہو یا کوئی اور جنس ہو جس میں زکوٰۃ فرض ہے تو اس کو زکوٰۃ یا عشر دینا پڑے گا صرف اس خیال سے کہ میرے ذمہ قرض ہے۔ زکوٰۃ عشر کی ادائیگی میں سستی نہ کرے بہت لوگ قرض کی وجہ سے زکوٰۃ عشر ادا نہیں کرتے حالانکہ ان کے پاس کافی جائداد مکان زمین وغیرہ ہوتی ہے جس کو فروخت کرکے ادا کرسکتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ قرض کو زکوٰۃ عشر پر ڈال کر اس فرض کی ادائیگی میں سستی کریں۔

فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے۔ اور حج عمرہ بھی اس میں داخل ہے۔ اور بعض عام مراد لیتے ہیں۔ کوئی کار خیر اس میں شامل ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ابن السبیل

اس سے مراد مسافر ہے خواہ گھر میں اس کے مال ہو مگر سفر میں اس کے پاس کچھ نہیں سو اس حالت میں مال زکوٰۃ سے اس کی امداد ہوسکتی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۱ رجب ۱۳۵۴ھ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء

عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ و خیرات دینا

سوال:۔ خاوند بخیل ہے اور عورت مسلمان نیک ہے۔ خاوند زکوٰۃ، عشر، صدقہ، خیرات نہ کرتا ہے نہ عورت کو اجازت دیتا ہے ایسی مجبور عورت کو جائز ہے کہ وہ اس سے چوری صدقہ فطر اپنا اور اولاد کا دے دے اور اپنے زیور کی زکوٰۃ نکال دے یا کسی مسافر مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اور عشر نکال دے۔

جواب:۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ زکوٰۃ کا تعلق عین مال سے ہے یا دین کی طرح ذمہ میں ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ)

دلائل دونوں طرف قوی ہیں۔ پہلے مذہب کی بنا پر عورت کو گنجائش ہے کہ وہ خاوند کے مال کی زکوٰۃ اور عشر ادا کرے۔ کیونکہ مال اس کے سپرد ہے۔ نیز اس مذہب والے کہتے ہیں کہ ولی کو چاہیئے کہ یتیم کے مال سے ہر سال کی زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ اگرچہ یتیم اس قابل نہیں کہ خدا کی طرف سے کسی حکم کا مکلف ہو مگر زکوٰۃ کا تعلق عین مال سے ہے اور وہ ولی کے سپرد ہے تو ولی کو چاہیے کہ جیسے یتیم کے مال میں کوئی شریک ہو تو اس کا حصہ بانٹ کر اس کو دیتا ہے اس طرح اس مال میں مسکین شریک ہیں ان کا حق زکوٰۃ نکال کر دے اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ یتیم کے مال کو بڑھانا چاہیئے تاکہ اس کو زکوٰۃ نہ کھا جائے یہ تو زکوٰۃ اور عشر کا حکم ہے۔ رہی اس کے اپنے زیور کی زکوٰۃ تو وہ خاوند کے مال سے ادا نہیں کر سکتی کیونکہ زیور اس کی ملک ہے تو زکوٰۃ اس کی اسی پر ہوگی۔ ہاں اگر خاوند کا زیور ہے جو اس کو عاریۃً دیا ہوا ہے تو اس کی زکوٰۃ پہلے مذہب پر دے سکتی ہے۔ باقی رہا اس کا صدقہ فطر اور اس کی اولاد کا صدقہ فطر تو یہ مرد کے ذمہ ان کا حق ہے۔ جس کی کارمختار عورت ہے۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ میرا خاوند بخیل ہے۔ کیا اس کے مال سے چوری کر لوں۔ فرمایا جتنا تجھے اور تیری اولاد کو کافی ہو لے لے۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب النفقات وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے۔ اس طرح عام صدقہ خیرات کی بھی عورت کو اجازت ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب "صدقۃ المراۃ من مال الزوج" میں حدیث ہے کہ جب عورت بغیر اجازت خاوند صدقہ کرتی ہے تو اس کو آدھ ثواب ملتا ہے لیکن دوسری حدیث میں شرط آئی ہے۔ غیر مفسدۃ یعنی خاوند کے مال کو بگاڑنے والی نہ ہو یعنی جیسے عام طور پر گھروں میں سوالی کو عورتیں دیتی ہیں یا کسی آئے گئے کو روٹی کھلا دیتی ہیں یا اس طرح کا کوئی اور عام رواج کے مطابق تصرف کرتی ہیں۔ اس کا کوئی حرج نہیں۔ عام رواج سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ جیسے غریب گھر ہو تو دس آدمیوں کو کھلا دے ایسا تصرف فساد میں داخل ہے کیونکہ یہ معروف کے خلاف ہے۔ ایک عورت نے ایک بکری بغیر اجازت خاوند فروخت کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناجائز قرار دے دیا۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب المعجزات۔ جب بغیر اجازت کے ایک بکری کی خرید و فروخت جائز نہ ہوئی تو زیادہ مقدار میں صدقہ خیرات کس طرح جائز ہوگا۔ اور جن احادیث میں منع آیا ہے کہ عورت خاوند کی اجازت کے بغیر طعام بھی دے جیسے مشکوٰۃ کے باب صدقۃ المراۃ من مال الزوج میں ہے تو اس سے بھی غیر معروف خرچ مراد ہے۔ یعنی عام دستور اور رواج سے زیادہ نہ دے امیر امیروں کا دستور اور غریب غریبوں کا دستور استعمال کریں۔ ہاں اگر عام نفلی خیرات میں خاوند ناراض ہو

اور بخل کرتا ہو تو اس صورت میں عورت کو خاوند کے مال میں عام نفلی خیرات سے بند رہنا مناسب ہے۔ کیونکہ اوپر جو حدیث ذکر ہوئی اس میں تصریح ہے کہ عورت کو آدھا ثواب ملتا ہے۔ اور جس حالت میں غیر مفسدہ کی شرط ہے اُس میں تصریح ہے کہ خاوند کو بھی ثواب ملتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خاوند ناراض ہو تو خاوند کو ثواب نہیں مل سکتا۔ پس عورت کو چاہیے کہ نفلی خیرات اِس صورت میں کرے جس میں دونوں ثواب کے مستحق ہوں تاکہ اس کی خیرات ان حدیثوں کے موافق ہو۔ ان باتوں کا عموماً خیال رکھنا چاہیئے۔ عورتیں اس معاملہ میں بہت کوتاہی کرتی ہیں۔ اور خاوند کے مال میں خیرات کے علاوہ پوشیدہ بہت تصرف کرتی ہیں۔ جو بڑی بے برکتی کا سبب ہے۔ خدا محفوظ رکھے۔ آمین۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

یکم ربیع الاول ۱۳۵۳ھ ۱۴ جون ۱۹۳۴ء

سیّد کی زکوٰۃ سے سیّد مدرس کو تنخواہ دینا

سوال:۔ دینی مدارس میں جو سیّد مدرس درس و تدریس کا کام کرتے ہیں۔ زکوٰۃ سے ان کو تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ اور کیا سیّد اپنی زکوٰۃ غریب سید کو دے سکتا ہے۔؟

حاجی شمس دین شاہکوٹ نوشیخاں والا ضلع لاہور

جواب:۔ صریح دلیل اس بارہ میں کوئی نہیں۔ البتہ اجتہادی دلیل ہے جو امام ابوحنیفہ وغیرہم سے منقول ہے وہ یہ کہ زکوٰۃ کے عوض بنوہاشم کو غنیمت کے مال سے خمس سے حصہ ملتا تھا۔ اور وہ اب نہیں رہا اس لئے جائز ہے۔ اور بعض مالکیہ بھی جواز کے قائل ہیں۔ اور امام شافعی کے مذہب میں بھی بعض شافعیہ نے ایک صورت جواز کی لکھی ہے۔ اور بہت سے علماء کہتے ہیں کہ بنو ہاشم کی آپس میں ایک دوسرے کو زکوٰۃ لگ سکتی ہے نہ غیر کی۔ اور اس کی دلیل میں ایک صریح حدیث ذکر کی ہے لیکن امام شوکانی رح اس حدیث پر لکھتے ہیں۔ قد اتھم بعض الرواۃ وقد اطال صاحب المیزان الکلام علی ذالك۔ یعنی اس حدیث کے بعض راوی متہم ہیں۔ اور امام ذہبی نے میزان میں اس پر بڑی لمبی بحث کی ہے۔

البتہ نفلی صدقہ بلاشک و شبہ جائز ہے کیونکہ زکوٰۃ کے متعلق منع کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگوں کی

میل ہے اور نفلی میں نہیں۔ ہاں صرف حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر نفلی صدقہ بھی حرام ہے جس کی وجہ آپ کا شرف اور بلندی شان ہے۔ اور احادیث میں آیا ہے کہ آپ ہدیہ اور ہبہ کو قبول کر لیتے تھے نہ صدقہ۔ ہدیہ۔ ہبہ اور صدقہ کے الفاظ بھی بتلا رہے ہیں کہ حضور پر فرضی۔ نفلی ہر قسم کا صدقہ حرام ہے اور اس پر قریب قریب اجماع ہے۔ البتہ اوقاف کا حکم علیحدہ ہے وہ سب کے لئے جائز ہے اور وہ ہدیہ اور ہبہ کے حکم میں ہے۔ زیادہ تفصیل نیل الاوطار میں ملاحظہ ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک

گندم، جو وغیرہ مجموعی غلّہ میں زکوٰۃ

سوال :۔ عشر کے لئے نصاب شرعی بیس من پختہ وزن ہے جو پانچ وسق ہے۔ اگر کسی کھیت میں پیداوار غلّہ کی مختلف اجناس سے ہو مثلاً گیہوں دس من۔ باجرہ پانچ من۔ جو پانچ من تو ان میں عشر ہر جنس غلّہ میں ہے جب کہ وہ مقدار نصاب کو پہنچے یا ان غلّہ جات کو جمع کر کے نصاب پورا ہو جائے تو پھر ان میں عشر ہے ——— اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل وغیرہ مجموعی غلّہ میں عشر کے قائل ہیں، خواہ وہ مختلف اجناس سے ہوں۔ احناف و شوافع وغیرہ ہر ایک جنس علیحدہ میں عشر کے قائل ہیں، گو احناف کے نزدیک تو مطلق پیداوار میں عشر ہے۔ آپ اپنی تحقیق فرمائیں۔ میرا خیال ہے کہ غلّہ جات خواہ مختلف اجناس سے ہوں اور ہر ایک نصابِ شرعی سے کم ہو۔ مگر مجموعی طور پر وہ نصابِ شرعی کو پہنچ جائیں تو ان میں عشر ہے کیونکہ علت طعم سب میں ہے اور فائدہ میں اتحاد ہے ——— پھر سوال یہ ہے کہ غلّہ کی جب مختلف اجناس ہوں تو عشر کس غلّہ سے دیا جائے۔ بعض غلّہ قیمتی ہوتا ہے۔ بعض قیمتی نہیں ہوتا۔

ابو محمد عبدالجبار مدرس مصباح العلوم کھنڈیلہ

جواب :۔ میری تحقیق آپ سے متفق ہے، کیونکہ حدیث میں ہے۔ فیما سقت السماء العشر الحدیث فرمایا ہے۔ جنسوں کو الگ نہیں کیا۔ پس ایک موسم کی سب اجناس ملا لینی چاہئیے۔ کیونکہ قرآن مجید میں وآتوا حقه یوم حصاده آیا ہے۔ البتہ کپاس کو باقی اجناس میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ کپاس کسی جنس سے نہیں ملتی۔ کیونکہ وہ چھ ماہ تھوڑی تھوڑی اُترتی ہے اس لئے اس کا حساب الگ ہوگا۔ اجناس ملانے کی تائید اس سے

بھی ہوتی ہے کہ بکریاں اور دُنبے ملائے جاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں الگ الگ جنسیں ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ حدیث میں دفی الغنم کا لفظ آیا ہے جو دونوں کو شامل ہے پس اس طرح فیما سقت السماء کو سمجھ لینا چاہیئے

زیرہ۔ دھنیا۔ پیاز میں عشر

سوال:۔ زیرہ۔ دھنیا۔ پیاز میں عشر ہے یا نہیں؟

جواب:۔ راجح مذہب یہی ہے کہ خضراوات میں عشر نہیں۔ کیونکہ اس حدیث کے طرق بہت ہیں سب مل کر حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ اور خضراوات وہ ہے جو ذخیرہ نہ ہو سکے۔ زیرہ اور روئی خضراوات میں داخل نہیں۔ کیونکہ ان کا ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح دھنیا وغیرہ ہے۔ البتہ۔ پیاز۔ لسن۔ آلو وغیرہ خضراوات میں داخل ہیں۔ اگرچہ کچھ مدت تک رکھے جا سکتے ہیں مگر بڑی تدبیر سے اور وہ بھی نصف۔ تہائی۔ چوتھائی رہ جاتے ہیں۔ ذخیرہ مطلب یہ ہے کہ آئندہ فصل تک آسانی سے محفوظ رہ سکے۔ سو یہ ایسے نہیں اس لئے یہ خضراوات ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹

۳۰ شوال ۱۳۷۲ھ ۱۲ جولائی ۱۹۵۳ء

روزہ کا بیان

رؤیت ہلال

سوال:۔ کتنے گواہ ہوں کہ روزہ کے بارہ میں ان کی رؤیت کا اعتبار ہو سکتا ہے۔

جواب:۔ حدیث میں ہے۔

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّی رَئَیْتُ الْھِلَالَ یَعْنِیْ ھِلَالَ رَمَضَانَ فَقَالَ اَتَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَتَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ قَالَ یَا بِلَالُ اَذِّنْ فِی النَّاسِ اَنْ یَّصُوْمُوْا غَدًا رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی (مشکوۃ)

یعنی ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ کہا میں نے چاند دیکھا ہے یعنی رمضان کا چاند آپ نے فرمایا کہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی پوجا کے لائق نہیں۔ اس نے کہا ہاں۔ کہا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ تعالےٰ کا رسول ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں آپ نے فرمایا اے بلال لوگوں میں اعلان کر دے کہ کل روزہ رکھیں۔

۲۔ عن ابن عمرؓ قال ترای الناس الهلال فاخبرت رسول الله صلی الله علیه وسلم انی رایته فصام وامر الناس بصیامه رواه ابو داؤد والدارمی (مشکوٰۃ)

عبداللہ بن عمرؓ نے کہا لوگ چاند دیکھنے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے بھی چاند دیکھا ہے میری خبر پر آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

۳۔ عن ربعی بن خراش عن رجل من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم قال اختلف الناس فی اخر یوم من رمضان فقدم اعرابیان فشهدا عند النبی صلی الله علیه وسلم بالله لاهلال امس عشیة فامر رسول الله صلی الله علیه وسلم الناس ان یفطروا رواه احمد وابوداؤد وزاد فی روایه وان یغدوا الی مصلاهم (منتقی الاخبار)

یعنی اخیر رمضان میں عید کے چاند میں لوگوں کا اختلاف ہوا۔ پس دو اعرابی آئے۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ افطار کریں اور صبح عیدگاہ کی طرف نکلیں۔

۴۔ عن عبدالرحمٰن بن زید بن الخطاب انه خطب فی الیوم الذی شك فیه فقال الا انی جالست اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وسألتهم وانهم حدثونی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال صوموا الرویته وافطروا الرویته وانسکوالها فان غم علیکم فاتموا ثلثین یوما فان شهد شاهدان مسلمان فصوموا وافطروا رواه احمد ورواه النسائی ولم یقل فیه مسلمان۔

عبدالرحمٰن بن زید نے اس دن خطبہ پڑھا جس میں لوگوں کو شک ہو گیا فرمایا میں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مجالس کی ہے اور ان سے سوال و جواب کیا ہے۔ اُنہوں نے مجھے حدیث سنائی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو اور اس کی روئیت
کے مطلع رہو۔ اگر چاند پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن کی گنتی پوری کرو۔ اگر دو مسلمان اس کی روئیت
کی گواہی دیں تو ان کی شہادت سے روزے رکھو اور افطار کرو۔ اس کو احمدؒ نے روایت کیا ہے اور
نسائی نے بھی روایت کیا ہے مگر اس میں مسلمان کا لفظ نہیں۔

۵- وعن امیر مکۃ الحارث بن حاطب قال عھد الینا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان ننسك للرؤیۃ فان لم نرہ وشھد شاھدا عدل نسکنا بشھادتھما رواہ ابوداؤد والدارقطنی وقال ھذا اسناد متصل صحیح (منتقی الاخبار)

یعنی امیر مکہ حارث بن حاطب سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں وصیت
کی کہ روئیت کے مطلع رہیں اگر چاند نظر آجائے تو دو عادل شخصوں کی گواہی پر عمل کریں۔

عیداور روزہ کے چاند میں فرق

اِن روایتوں سے کئی مسائل معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ رمضان کے چاند اور عید کے چاند میں فرق ہے
[عید] کے چاند کے لئے دو کی شہادت ہونی چاہیئے رمضان کے لئے ایک کی شہادت کافی ہے۔
نمبر چار کی حدیث میں اگرچہ دو کی شہادت کا ذکر ہے لیکن نمبر ا و نمبر ۲ کی احادیث میں چونکہ ایک کی
[شہاد]ت بھی آگئی ہے اس لئے ایک بھی کافی ہے۔ اگر عید کے چاند کے لئے بھی کسی روایت میں ایک کی
[شہ]ادت آجاتی تو اس پر بھی عمل جائز ہوتا مگر جہاں تک ہمیں علم ہے کوئی ایسی روایت نہیں آئی۔ نیز عبادت
[ای]ک بوجھ ہے۔ اس کی شہادت میں کوئی خوش نہیں کہ شُبہ کا احتمال ہو بخلاف عید کے چاند کے کہ عید
[ہو]نے کی وجہ سے اس میں شُبہ ہے اس لئے شہادت میں دو کا عدد مناسب ہے۔

مسلمان کی شہادت

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شہادت مسلمان کی معتبر ہے۔ غیر مسلم کی شہادت کا اعتبار نہیں۔ نیز
عادل ہونا شرط ہے۔

تار برقی اور ٹیلیفون

اور اسی سے تار برقی اور ٹیلیفون کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔ ٹیلیفون کے ذریعہ بات کرنے والا اگر مسلمان

ہے۔ شرع کا پابند ہے تو اس کی شہادت معتبر ہے ورنہ نہیں۔ اور تار برقی کی خبر میں چونکہ کئی واسطے پڑتے ہیں جن کا علم نہیں ہوتا کہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ اگر مسلمان ہے تو عادل (شرع کا پابند) ہے یا نہیں۔ اس لئے اس کا مطلقاً اعتبار نہیں۔ ہاں اگر تاروں کے ذریعہ سے خبر پہنچے جو حد تواتر کو پہنچ جائیں تو اس وقت واسطہ خواہ کیسا ہی ہو خبر معتبر ہوگی۔ کیونکہ تواتر میں واسطے کے حال کو نہیں دیکھا جاتا۔ چنانچہ اصولِ حدیث میں یہ ثابت ہوچکا ہے اور تواتر کے لئے کوئی عدد مقرر نہیں بلکہ جتنے عدد سے علم یقین ہوجائے وہی تواتر ہوگا۔ سو کسی جگہ زیادہ تعداد سے یقین ہوتا ہے کسی جگہ تھوڑی تعداد سے۔ سو جتنی تاروں کے ذریعہ سے علم یقینی ہوجائے اور شبہ اور احتمال کی گنجائش نہ رہے اتنی تعداد کا اندازہ کرلینا چاہیئے۔ اور تعداد سے مراد یہ ہے کہ متعدد جگہ سے متعدد شخص تار دیں۔ نہ یہ کہ ایک ہی شخص بار بار تار دے۔

ان احادیث سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر چاند نظر نہ آئے نہ کوئی شہادت ہو تو تیس کی تعداد پوری کرلینی چاہیئے۔ اگر کوئی ایسی شہادت گزرے جو شرعاً معتبر نہیں تو ایسے موقعہ پر شہادت دینے والا خواہ واقعہ میں سچا ہے اس کو اپنی رویت پر عمل نہ کرنا چاہیئے بلکہ باقی لوگوں سے موافقت کرے۔ جس دن وہ روزہ رکھیں اُس دن روزہ رکھے۔ جس دن افطار کریں اُس دن افطار کرے بلکہ عید الاضحیٰ کا بھی یہی حکم ہے۔ حدیث میں ہے۔

الصوم یوم تصومون والیوم یوم تفطرون والاضحی یوم تضحون (ترمذی)

یعنی روزہ کا دن وہی ہے جس دن تم روزہ رکھو۔ اور افطاری کا دن وہی ہے جس دن تم افطاری کرو۔ اور قربانی کا دن وہی ہے جس دن تم قربانی کرو۔

عید کی نماز دوسرے دن

ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر پہلے دن عید کا موقعہ نہ ہوا اور رویت ہلال کی خبر دیر سے ملی تو عید دوسرے روز بھی ہوسکتی ہے جیسے نمبر ۳ کی حدیث میں جملہ وان یغدوا الی مصلاھم سے ظاہر ہے یہ جملہ اگرچہ صریح نہیں مگر مسئلہ درست ہے کیونکہ اس کی بابت ایک صریح روایت بھی آئی ہے مشکوٰۃ میں ہے۔

ان رکبا جاؤا الی النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یشھدون انھم رأوا الھلال بالامس فامرھم ان یفطروا واذا اصبحوا ان یغدوا الی مصلاھم (رواہ

ابوداؤد والنسائی۔

یعنی کئی سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اُنہوں نے گواہی دی کہ انہوں نے کل چاند دیکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ روزہ افطار کریں۔ اور جب صبح کریں تو عیدگاہ کی طرف نکلیں۔

اس حدیث میں عید کا دوسرے دن پڑھنا صراحۃً مذکور ہے مگر یہ ذکر نہیں کہ وہ سوار کس وقت آئے تھے۔ نہ یہ تصریح ہے کہ یہ حکم سب لوگوں کو تھا یا صرف سواروں کو تھا۔ منتقیٰ میں ایک اور روایت آئی ہے اس میں ذکر ہے کہ سواروں کے اخیر حصہ میں آئے اور اس بات کی بھی تصریح ہے کہ لوگوں کو حکم دیا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ عمیر بن انس اپنے کئی چچوں سے روایت کرتے ہیں کہ عید کا چاند ہم پر مشتبہ ہوگیا۔ صبح کو ہم نے روزہ رکھا۔ پس آخر حصہ دن میں کئی سوار آئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گواہی دی کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افطار کا حکم دیا اور فرمایا کل عید کے لئے نکلیں۔

ایک ملک کی دوسرے ملک کے لئے رویت

سوال :۔ بمبئی میں چاند کی روئیت ہمارے اہلِ پنجاب کے لئے کافی ہے؟

جواب :۔ ایک روایت میں ہے۔

عن کریب ان ام الفضل بعثته الی معاویة بالشام فقال قدمت فقضیت حاجتها واستهل علی رمضان وانا بالشام فرایت الهلال لیلة الجمعة ثم قدمت المدینة فی اخر الشهر فسالنی عبد الله بن عباس ثم ذکر الهلال فقال متی رایتم الهلال فقلت رایناه لیلة الجمعة فقال انت رایته فقلت نعم وراه الناس وصاموا وصام معاویة فقال لکنا رایناه لیلة السبت فلانزال نصوم حتی نکمل ثلثین او نراه فقلت الا تکتفی برویة معاویة وصیامه فقال لا هکذا امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم رواه الجماعة الا البخاری وابن ماجة۔

یعنی کریبؒ سے روایت ہے کہ ام الفضل رضؓ نے مجھے معاویہ کی طرف ملک شام میں بھیجا۔ میں نے اُم الفضل کا کام کیا۔ رمضان کا چاند مجھے شام ہی میں چڑھ گیا۔ جمعرات کو میں نے خود دیکھا، پھر آخر رمضان مدینہ آیا۔ ابن عباسؓ نے مجھ سے (وہاں کا حال) پوچھا۔ پھر چاند کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ ہم نے چاند جمعرات کو دیکھا ہے فرمایا کہ تو نے خود دیکھا ہے؟ کہا میں نے بھی اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا ہے اور سب نے روزہ رکھا اور معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا۔ فرمایا ہم نے تو ہفتہ کی رات کو دیکھا ہے۔ ہم اسی طرح روزے رکھتے ہیں گے۔ یہاں تک کہ تیس کی گنتی پوری ہو جائے یا چاند اس سے پہلے دیکھ لیں۔ میں نے کہا آپ معاویہ رضؓ کی رویت اور ان کے روزہ کے ساتھ کفایت نہیں کرتے ہو کہا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں اسی طرح حکم دیا ہے۔

امام نووی رحؒ اس حدیث کی شرح میں ان لوگوں پر رد کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے کریب کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ ان کے نزدیک ایک شہادت معتبر نہیں۔ فرماتے ہیں۔

لکن ظاہر حدیثہ انہ یردہ لھذا وانما ردہ لان الروایۃ لا یثبت حکمھا فی حق البعید "

یعنی ابن عباسؓ کی حدیث کا ظاہر اس کو چاہتا ہے کہ ایک کی شہادت ہونے کی وجہ سے رد نہیں کیا بلکہ اس وجہ سے ردّ کیا کہ دُور والوں کے حق میں حکم رویت ثابت نہیں ہوتا۔

امام نووی رحؒ نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔ کیونکہ کریب نے جب کہا کہ آپ معاویہ کی رویت پر اعتبار نہیں کرتے تو ابن عباس رضؓ نے فرمایا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں اسی طرح فرمایا ہے معاویہؓ چونکہ شام میں تھے تو اس کا مطلب یہی بنا کہ دُور والے کی شہادت معتبر نہیں تو یوں کہئے کہ معاویہ کی شہادت تو معتبر ہے لیکن ذریعہ پہنچنے کا صرف ایک ہے۔ اس لئے معاویہؓ کی شہادت اور دیگر لوگوں کی شہادت درحقیقت تیری ہی شہادت ہے جو اکیلے کی شہادت ہے۔

نیز ہلال رمضان کے لئے ایک کی شہادت معتبر ہے اور خود ابن عباس رضؓ اس حدیث کے راوی ہیں۔ چنانچہ اُوپر جو اعرابی کی حدیث گذر چکی ہے جس میں اعرابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اتشہد ان لا الٰہ الا اللہ وہ ابن عباس ہی کی حدیث ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابن عباس رضؓ کے ردّ کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ایک کی شہادت تھی بلکہ دُور کی شہادت تھی۔ اس لئے رد کر دی پھر اس کی نسبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی۔ پس یہ مسئلہ پختہ ہوگیا کہ دُور کی روایت کافی نہیں۔

دُور کی حد

رہی یہ بات کہ دُور کی حد کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ اختلاف مطلع کا اعتبار ہے۔ مگر امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ شام اور مدینہ کے مطلع میں اختلاف نہیں تو اختلاف مطلع کا قول ٹھیک نہیں۔ بعض نے کچھ اور کہا ہے۔ مگر راجح یہ ہے کہ ایک ملک کی شہادت دوسرے ملک کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ شام دوسرا ملک ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ ابن عباسؓ نے دوسرا ملک ہونے کی وجہ سے اعتبار نہیں کیا۔ نیز اُوپر جو حدیث گذر چکی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سواروں کے آنے کا ذکر ہے۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ جس دن سواروں نے چاند دیکھا اُس سے اگلے دن آخر حصہ میں آئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے معاملہ میں عموماً تاخیر نہیں کی جاتی بلکہ خبر پہنچانے میں جلدی کی جاتی ہے اور اہلِ عوالی (جو مدینہ سے اُوپر کی طرف آباد تھے) اکثر جمعہ عید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھا کرتے تھے۔ اور کئی ان سے مدینہ سے آٹھ آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھے۔ اگر اس حد میں یا اس کے قریب ارد گرد چاند دیکھا جاتا تو ان کے آنے میں اتنی تاخیر نہ ہوتی کہ چاند دیکھنے کے دُوسرے دن اخیر حصہ دن میں پہنچے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی دُور سے آتے تھے۔ پھر ان کا سوار ہونا بھی اس کا مؤید ہے۔ پس جب باوجود خاصی دُور سے آنے کے اُن کی شہادت مان لی تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ دُور والے کی شہادت مطلقاً معتبر نہیں۔ خواہ تھوڑی دُور ہو یا زیادہ دُور ہو تو آخر یہی بات ٹھہری کہ ایک ملک کی شہادت دوسرے ملک والوں کے لئے معتبر نہیں۔ جیسے شام دوسرا ملک تھا۔ ابن عباسؓ نے ان کی روایت مدینہ والوں کے لئے کافی نہ سمجھی۔ رہا سرحدوں کا معاملہ تو بسبب قرب کے وہ ایک ہی ہیں؟ جب ایک جگہ دوسری جگہ سے اتنی دُور ہو کہ رویت ہلال میں فرق پڑھ سکتا ہو تو اس صورت میں ایک جگہ کی رؤیت کا دوسری جگہ اعتبار نہیں ہوگا۔ بمبئی سے یہاں کے مطلع کا کافی فرق ہے اور بمبئی کا علاقہ ملک بھی دوسرا ہے۔ اس لئے بمبئی کی رؤیت سے ہم پر روزہ ضروری نہیں بلکہ مناسب بھی نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

دن میں چاند نظر آجائے تو روزہ کا حکم

سوال:۔ اگر چاند ۲۹ رمضان کو نظر نہ آئے اور کسی کو ۳۰ رمضان کو آفتاب کے غروب ہونے سے

پہلے نظر آجائے تو کیا اُسی وقت روزہ افطار کر سکتا ہے۔

(ابو محمد اسماعیل لدھیانہ)

جواب:۔ قرآن مجید میں ہے۔

فمحونا آیة الليل وجعلنا آية النهار مبصرة

یعنی ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا

رات کی نشانی سے مراد چاند ہے اور دن کی نشانی سے مراد آفتاب ہے۔ اللہ تعالے نے چاند کی روشنی گم کر دی ہے اور اس میں سیاہی ڈال دی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا ہے۔ پس جب چاند رات کی نشانی ہے تو اس کا دن میں دیکھنا معتبر نہیں بلکہ رات میں غروب آفتاب کے بعد دیکھنا معتبر ہے۔ اس وقت سے ماہ اول کا ختم ہونا اور ماہ ثانی کی ابتدا نہیں ہوتی۔ تو مہینہ ختم ہونے کے بغیر افطار کس طرح جائز ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔ جو ماہ رمضان میں حاضر ہو یعنی سفر میں نہ ہو وہ اس ماہ کے روزے رکھے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ سارے رمضان کے روزے رکھے۔ کیونکہ رمضان ابھی ختم نہیں ہوا اس نے پہلے ہی افطار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تیس شعبان کو دن میں رمضان کا چاند نظر آجائے تو دیکھنے کے وقت سے روزہ شروع نہیں ہو جاتا۔ اگر دن میں دیکھنے کا اعتبار ہوتا تو چاہیے تھا کہ جب سے دیکھا ہے اُس وقت سے مغرب تک روزہ ہوتا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ پہلے مہینہ کا ختم ہونا اور دوسرے کی ابتداء رات کے وقت چاند دیکھنے سے ہے نہ دن کے وقت۔ اس لئے حدیث میں ہے

الشهر تسع وعشرون ليلة فلا تصوموا حتى تروه فان غم عليكم فاكملوا العدة (متفق عليه) مشكوة باب رؤية الهلال)

مہینہ ۲۹ کا بھی ہوتا ہے چاند دیکھے بغیر نہ روزہ رکھو۔ اگر ۲۹ کو چاند نظر نہ آئے تو تیس کی گنتی پوری کرو۔

مشکوۃ کے اسی باب میں ہے ابوالبختری کہتے ہیں کہ ہم عمرہ کے لئے نکلے جب موضع نخلہ میں پہنچے تو چاند دیکھا۔ بعض نے کہا کہ تیسری تاریخ کا ہے۔ بعض نے کہا دوسری تاریخ کا ہے۔ ہم ابن عباسؓ کو ملے تو فرمایا کہ تم نے کس رات کو دیکھا ہے؟ ہم نے جواب دیا فلاں رات کو۔ فرمایا رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی مدت اس کی رویت ہے۔ اور ایک روایت میں ہے ابوالبختری کہتے ہیں ہم نے موضع ذات عرق میں (جو بطن نخلہ کے قریب ہے) رمضان کا چاند دیکھا۔ ہم نے پوچھنے کے لئے ابن عباس کے پاس آدمی بھیجا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خدا نے اس کی مدت اس کی رویت مقرر کی ہے۔ اگر ۲۹ کو نظر نہ آئے تو تیس کی گنتی پوری کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے جو مسلم وغیرہ میں ہے۔ کریب کہتے ہیں۔ ام الفضل نے مجھے معاویہ کی طرف ملک شام میں بھیجا۔ میں نے ام الفضلؓ کا کام کیا۔ رمضان کا چاند مجھے شام ہی میں چڑھ گیا۔ جمعرات کو میں نے خود دیکھا۔ پھر اخیر رمضان میں مدینہ آیا۔ ابن عباس نے مجھے وہاں کا حال پوچھا۔ پھر چاند کا ذکر کیا۔ میں نے کہا ہم نے جمعرات کو دیکھا ہے فرمایا تو نے خود دیکھا ہے۔ کہا ہاں۔ میں نے بھی اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا ہے۔ اور سب لوگوں نے روزہ رکھا۔ اور معاویہ نے بھی روزہ رکھا۔ فرمایا ہم نے ہفتہ کی رات کو دیکھا ہے ہم اسی طرح روزے رکھتے رہیں گے یہاں تک کہ تیس کی گنتی پوری ہو جائے۔ یا چاند اس سے پہلے دیکھ لیں۔ میں نے کہا آپ معاویہؓ کی رویت اور ان کے روزہ رکھنے کے ساتھ کفایت نہیں کرتے؟ فرمایا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح حکم دیا ہے کہ ایک ملک کے لئے دوسرے ملک کی شہادت معتبر نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ چاند کا اعتبار رات سے ہے۔ اگر ۲۹ کو نظر نہ آئے تو تیس کی گنتی پوری کرنی پڑتی ہے۔ دن کے دیکھنے کا اعتبار نہیں۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ

۲۰ صفر ۱۳۵۲ھ ۱۵ جون ۱۹۳۳ء

مشکوک دن کا روزہ رکھنے کے بعد چاند دیکھنے کی یقینی شہادت کا ملنا

سوال:۔ مشکوک دن کا روزہ رکھنے کے بعد چاند دیکھنے کی یقینی شہادت مل جائے تو پھر رکھے ہوئے روزہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب:۔ مشکوۃ کتاب العلم میں ہے۔

عن جندب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال فی القرآن

برأيه فاصاب فاخطأ رواه الترمذی وابوداؤد ۔

یعنی جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کہتا ہے پس وہ صواب کو پہنچا تو یقیناً اس نے خطا کی ہے ۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا جب ابتداءً چیز کی جرم ہو تو صحیح ہونے سے وہ معاف نہیں ہوتا ۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت کے پاس گیا ۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ غیر ہے اُس سے صحبت کر لی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کی بیوی ہے تو وہ قصور سے بری نہیں ہو سکتا ۔ ایسے ہی اس کے برعکس اپنے دل میں یہ سمجھ کر کہ یہ میری بیوی ہے اگر صحبت کر لے اور وہ غیر عورت نکل آئے تو اس سے وہ مجرم قرار دیا نہیں جا سکتا ایسا ایک واقعہ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں ہوا ۔ دو بہنوں کی شادی دو بھائیوں سے ہوئی ۔ رخصتی کے وقت غلطی سے ہر ایک کی منکوحہ دوسرے کے گھر میں بھیج دی گئی تو اس سے وہ مجرم نہیں قرار دیئے گئے کیونکہ اُن کی نیت بخیر تھی ۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں اُن میں نیت کا اثر بھی عمل پر پڑتا ہے ۔ یعنی نیکی گناہ ہو جاتی ہے اور گناہ نیکی بن جاتا ہے ۔ صورت مسئولہ میں روزہ صحیح ہو جائے گا جیسے حدیث مذکور میں تفسیر غلط نہیں ہوگی ۔ تفسیر کرنے والا گنہ گار رہو گا ۔ ایسے ہی یہ روزہ صحیح ہو جائے گا لیکن ایسا روزہ رکھنے والا گنہ گار رہو گا ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی یکم رمضان ۱۳۸۰ھ

رویت چاند کے متعلق دو متضاد فتوے اور ان پر محاکمہ

سوال :۔ مطلع بالکل صاف تھا ۔ چاند دیکھنے کی ہر چند کوشش کی گئی مگر ملک کے کسی گوشہ میں چاند نہیں دیکھا گیا ۔ اور حکومت کی طرف سے بھی اعلان ہو گیا کہ چاند نظر نہیں آیا ۔ لاہور کے دو مذہبی اداروں کی طرف سے روزنامہ کوہستان لاہور میں دو متضاد قسم کے فتاوی شائع ہوئے ہیں جو حسب ذیل ہیں ۔

بریلوی مرکز کا فتوی

جمعیت حزب الاحناف کے صدر مولانا ابوالبرکات نے رویت ہلال کا اعلان کر دیا اور بتایا کہ چار افراد نے جن میں دو مرد اور دو عورتیں شامل ہیں ۔ رویت ہلال کی شہادت دی ۔ جس بناء پر مولانا ابوالبرکات کے فیصلہ کا اعلان شہر کے بیشتر محلوں میں منادی کے ذریعہ کرایا گیا ۔ اس پر بہت سے

لوگوں نے نماز تراویح پڑھی۔

دیوبندی فتوی

جامعہ اشرفیہ لاہور کی طرف سے اس سلسلہ میں بتایا گیا کہ آج مطلع بالکل صاف تھا اس لئے دو تین آدمیوں کی گواہی پر فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ اس ضمن میں رویت ہلال کے مسئلہ پر مولانا اشرف علی تھانوی کا حسب ذیل فتوی پیش کیا گیا جو بہشتی زیور جلد ۳ صلے پر درج ہے۔

اگر آسمان بالکل صاف ہو تو دو چار آدمیوں کے کہنے اور گواہی دینے سے چاند ثابت نہ ہوگا۔ چاند رمضان المبارک کا ہو چاہے عید کا۔ البتہ اتنی کثرت سے لوگ اپنا چاند دیکھنا بیان کریں کہ دل گواہی دینے لگے کہ سب کے سب بات بنا کر نہیں آئے اور اتنے لوگوں کا چاند دیکھنا غلط نہیں ہوسکتا۔ تب چاند دیکھنا ثابت ہوگا ورنہ نہیں۔

ان ہر دو فتاوی پر تبصرہ فرمائیں کہ ان میں سے کونسا فتوی صحیح ہے؟

محاکمہ

جواب:۔ یہ مسئلہ ایک مشہور حدیث سے حل ہو جاتا ہے جو صحاح ستہ وغیرہ میں موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

صوموا لرویته وافطروا لرویته

یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنے بند کر دو۔

اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

فان غم علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلثین (مشکوۃ)

اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے۔ یعنی بادل یا غبار کی وجہ سے چاند نظر نہ آئے تو پھر ماہ شعبان کے تیس دن پورے کرو۔

اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں کہ تمام مسلمان چاند دیکھیں تو روزہ رکھنا ضروری ہوگا ورنہ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض کا چاند دیکھنا بھی روزہ کے لئے کافی ہوگا۔ چنانچہ دوسری حدیث میں صراحت ہے۔ یعنی ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روزہ رکھنے کا ارشاد فرمایا۔

اِس حدیث سے ثابت ہوا کہ رمضان کے چاند کے لئے ایک شخص کی رویت بھی کافی ہے اور یہ بھی شرط نہیں کہ مقامی لوگوں سے کوئی شخص چاند دیکھے بلکہ باہر کی رویت کافی ہے۔ اس حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ اس دن مطلع صاف تھا یا نہیں۔ لیکن بظاہر یہ امر بہت بعید ہے کہ مطلع صاف ہونے کے باوجود اہلِ مدینہ سے کوئی چاند نہ دیکھ سکے اور صرف باہر کا اعرابی دیکھ لے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اعرابی نے چاند دیکھنے کی شہادت دی، مطلع صاف نہیں تھا۔ اس بنا پر بعض شارحین (مصنف تحفۃ الاحوذی) وغیرہ نے وَكَانَ غَيْمًا بھی لکھا ہے، یعنی بادل کی وجہ سے اہلِ مدینہ چاند نہ دیکھ سکے۔ اور اس کی تائید ابوداؤد کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عن الحسن فی رجل کان بمصر من الامصار فصام یوم الاثنین وشهد رجلان انهما رأیا الهلال لیلة الاحد فقال لا یقضی ذالك الیوم الرجل ولا اهل مصر الا ان یعلموا ان اهل مصر من امصار المسلمین قد صاموا یوم الاحد فیقضونه۔

حسن بصری سے ایک ایسے شخص کی بابت روایت ہے جو کسی شہر میں رہتا تھا۔ اس نے سوموار کو روزہ رکھا۔ اور دو آدمیوں نے شہادت دی کہ انہوں نے ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب کو چاند دیکھا ہے۔ حسن بصری نے اس کے متعلق فرمایا کہ اس شخص پر یا شہر کے کسی دوسرے آدمی پر اتوار کے روزہ کی قضا نہیں ہے ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی دوسرے شہر کے باشندوں نے بھی اتوار کے دن ہی روزہ رکھا تو اس صورت میں قضا دینی پڑے گی۔

حسن بصریؒ کا یہ فرمان اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ مطلع صاف ہو ورنہ اعرابی والی مذکورہ حدیث کی مخالفت لازم آئے گی۔ کیونکہ اس میں صاف ذکر ہے کہ رمضان کے چاند کے لئے ایک شخص کی رویت کافی ہے۔ لیکن یہاں دو آدمیوں نے رویت چاند کی شہادت دی۔ باوجود اس کے حسن بصریؒ نے اس کو معتبر نہیں سمجھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں ایک یا دو کی رویت کافی نہیں بلکہ اتنی تعداد ضروری ہے جس سے دل مطمئن ہو جائے کہ اتنے آدمی غلطی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جامعہ اشرفیہ والوں کا پیش کردہ فتویٰ صحیح اور درست ہے۔ اور صدر انجمن حزب الاحناف کا فتویٰ حدیث اور فقہ کے خلاف ہے۔

جب رویت چاند کی صحیح شہادت نہ ملے تو ایسے مشکوک دن کا روزہ رکھنا حدیث میں منع آیا ہے۔

شکی روزہ

اس قسم کا روزہ رکھنے والے بجائے ثواب حاصل کرنے کے اُلٹے مجرم اور گنہگار ہوں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

عن عمار بن یاسر قال من صام الیوم الذی یشك فیه فقد عصی ابا القاسم صلی اللہ علیه وسلّم (مشکوۃ)

یعنی عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں جس شخص نے مشکوک دن کا روزہ رکھا اُس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی کی۔

دوسری حدیث میں ہے۔

عن ابی هریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لا یتقدمن احدکم رمضان بصوم یوم او یومین (مشکوۃ)

یعنی تم میں سے کوئی شخص رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ نہ رکھے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی لاہور

۳ رمضان ۱۳۸۱ھ ۹ فروری ۱۹۶۲ء

روزہ کی نیّت

سوال: آپ نے لکھا ہے کہ روزہ کی نیّت جو آج کل رائج ہے وہ بدعت ہے بِصَوْمِ غَدٍ نَوَیْتُ۔ جو نیّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے وہ تحریر فرمائیں۔

(فضل دین محمد یعقوب چیچاوطنی)

جواب: یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ دل کی نیت کے ساتھ زبان کا اقرار بھی ضروری ہے جہاں جہاں آیا ہے وہیں اقرار کرنا چاہیئے۔ بصوم غد نویت یہ لفظ حدیث اور کلام سلف میں نہیں آئے اور افطاری کے وقت یہ لفظ آئے ہیں۔ اللّٰھم لك صمت وعلی رزقك افطرت۔

روزہ رکھنے کے وقت صرف سحری کھالینی روزہ کی نیت کے لئے کافی ہے زبان سے کچھ کہنا اس

کی ضرورت نہیں۔ اس طرح بعض اور احکام ہیں مثلاً قربانی کرنے کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر عنی وعن فلان کہدے تو یہ ثابت ہے جس کی طرف سے قربانی کرنی ہو اس کا نام لے دے ایسے ہی حج کسی کی طرف سے کرنا ہو تو کہہ سکتا ہے لبیك عن فلان خلاصہ یہ کہ شریعت کے دائرے کے اندر رہنا چاہیئے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا اس میں خیر ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۵ رمضان ۱۳۸۳ھ ۷ فروری ۱۹۶۴ء

شب برات کا روزہ

سوال ۔ ماہ شعبان کی چودھویں یا پندرہویں روزہ رکھنا یا تین روزے تیرھویں۔ چودھویں۔ پندرھویں تاریخ میں رکھنے جائز ہیں، یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ بدعت ہے۔ اور لفظ بدعت کی اصل تحقیق کیا ہے؟

جواب :۔ شبرات کا روزہ رکھنا افضل ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ وغیرہ میں حدیث موجود ہے۔ اگرچہ حدیث ضعیف ہے لیکن فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل درست ہے۔ ہر ماہ کی تیرھویں چودھویں پندرھویں کا روزہ بھی حدیث میں آیا ہے۔ بدعت کی تعریف رسالہ رد بدعات میں کی گئی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۶ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

حاملہ اور مرضعہ کو روزے کا حکم

سوال :۔ اگر حاملہ عورت روزہ نہ رکھ سکے تو وہ فدیہ دے یا قضائی کرے۔؟

محمد اسماعیل گڑھ شنکر

جواب :۔ حاملہ اگر بعد وضع حمل بچہ کو دودھ پلانے کے دنوں میں روزہ رکھ سکے تو بہتر ہے۔ ورنہ فدیہ دے۔ حدیث میں ہے۔ خدا تعالیٰ نے مرضعہ اور حاملہ سے روزہ اٹھالیا ہے (مشکوٰۃ)

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۹ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ

کٹائی گندم و دیگر ایسے کاروبار کی وجہ سے روزہ کا افطار کرنا

سوال :۔ ماہ رمضان کے روزے چھوڑ کر فصل کی کٹائی یا اور سخت کام کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس صورت میں تارک الصیام کو کافر کہہ سکتے ہیں یا وہ مومن ہی رہتا ہے؟

جواب :۔ مسافر، بیمار، حاملہ، مرضعہ جو روزہ نہ رکھ سکے اور شیخ فانی وغیرہ کے سوا کسی کو افطار کی اجازت نہیں۔ اگر کٹائی گندم وغیرہ کی وجہ سے افطار جائز ہو تو امیروں کو گھر بیٹھے پہلے جائز ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان کو طبیعت کے نازک ہونے کی وجہ سے گھر بیٹھے بھوک پیاس کا برداشت کرنا بہ نسبت زمینداروں کے زیادہ مشکل ہے۔ اگرچہ زمیندار کاروباری ہی ہوں، نیز مزدوری کا پیشہ زمیندارہ سے کم نہیں۔ ان کو بھی افطار کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اس کے اندر لوہار، سنار، معمار وغیرہ آسکتے ہیں۔ اب بتلائیے روزہ کون رکھے؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس سے کہیں زیادہ سخت کام ہوتے تھے۔ کیونکہ غریب لوگ تھے، محنت مشقت سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ زمیندارہ بھی آپ کے زمانہ میں تھا۔ خیر قرون میں بھی یہ معاملات پیش آتے رہے مگر کسی سے زمیندارہ کی وجہ سے افطار ثابت نہیں۔ پھر اگر ٹھنڈے ٹھنڈے کٹائی کر کے کٹی ہوئی فصل جمع کر لی جائے تو چنداں تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ صرف اتنی بات ہے کہ چار روز زیادہ لگ جائیں گے لیکن اس کا کوئی حرج نہیں۔ دنیوی عذروں کی وجہ سے بھی تو کام آگے پیچھے ہو جاتے ہیں۔ اگر دین کے لئے چار روز بعد میں کام ہو گیا تو برداشت کرنا چاہیئے۔ اصل میں پہلے ہی دلوں میں دین کی محبت نہیں۔ لوگ حیلوں، بہانوں سے اللہ تعالیٰ کے فرض کو ٹال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ واقعی کفر کی حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں اگر کسی مولوی کے مسئلہ بتانے میں غلطی لگ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۱۱ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

دلی کے ذمہ روزہ کی قضا

سوال :۔ مسماۃ ہندہ مدت سے مرض دق میں مبتلا تھی۔ اس نے بمشکل تمام رمضان کا ایک روزہ رکھا۔ بقیہ رمضان المبارک میں اس نے روزہ نہیں رکھا۔ اور مرض روز بروز بڑھتا گیا حتی کہ اوائل صفر

میں اس کا انتقال ہوگیا۔ مرضیہ کے جو روزے چھوٹ گئے ہیں۔ اُن کے بدلے میں اولیاء کو روزہ رکھنا یا فدیہ دینا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب نمبرا

جو روزے چھوٹ گئے ہوں اُن کے عوض میں اولیاء کو روزہ رکھنا یا فدیہ دینا ضروری نہیں۔

قال اللہ تعالی فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدۃ من ایام اخر

یعنی مریض پر رمضان کا روزہ ضروری نہیں بلکہ جب مرض سے شفاء ہو جائے تو قضاء واجب ہے۔

ہدایہ میں ہے۔

واذا مات المریض او المسافر وھما علی حالھما لم یلزمھما القضاء لانھما لم یدرکا عدۃ من ایام اخر الخ

یعنی جب مریض یا مسافر اپنی مرض اور سفر کی حالت میں ہوں اور وہ مر جائیں تو ان کو قضا لازم نہیں اس لئے کہ انہوں نے ایام اخر نہیں پائے۔

عون المعبود جلد ۲ صـ۲۷۹ میں ہے۔

واتفق اھل العلم علی انہ اذا افطر فی المرض والسفر ثم لم یفرط فی القضاء حتی مات فانہ لاشئ علیہ ولا یجب الاطعام عنہ الخ۔

یعنی اہل علم کا اتفاق ہے کہ جب کوئی مریض اپنی مرض میں اور مسافر سفر میں روزہ نہ رکھے۔ پھر اپنی طرف سے قضائی دینے میں کمی نہیں کی حتی کہ وہ مر گیا تو اس پر کوئی شئے نہیں اور نہ ہی اس کے ذمہ فدیہ ہے۔

منہاج الطالبین للنووی میں ہے۔

من فاتہ شئ من رمضان فمات قبل رمضان القضاء فلاتدارک لہ ولا اثم

شرح منہاج میں ہے۔

فلاتدارک بالفدیۃ ولا بالقضاء

چونکہ مرضیہ نے زمانہ صحت یا قدرت علی الصیام نہیں پایا۔ اس لئے اس کے ذمہ قضاء واجب نہیں۔ تو دوسروں پر کیسے واجب ہوگی۔ ملاحظہ ہو سراج الوہاج شرح صحیح مسلم وسنن کبری للبیہقی وسنن ابن ماجہ وغیرھا من الکتب۔ فقط واللہ تعالے اعلم

جواب نمبر ۲

صورتِ مسئولہ میں اولیا پر قضا واجب ہے۔ صحیحین کی روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمن مات وعلیہ صوم صام عنہ ولیہ۔ (مشکوٰۃ)

اور اسی طرح حسامی مع ترمذی میں ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے۔

قال جاءت امرأۃ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ان امی ماتت وعلیہا صیام شہرین متتابعین قال ارأیت لوکان علی اختک اکنت تقضیہ قالت نعم قال فحق اللہ احق۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے۔

من مات وعلیہ صیام شہر فلیطعم عنہ مکان کل یوم مسکینا۔

ان مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت کی طرف سے اس کے اولیاء پر قضاء یا فدیہ ضروری ہے۔ رہی آیت جس سے مفتی نے عدم قضاء پر دلیل پیش کی ہے وہ مریض اور مسافر کی قضاء پر دلیل ہے نہ میت کے لئے ہے۔ اسی طرح صاحب ہدایہ وغیرہ کی عبارت جو کہ عدم قضا پر پیش کی گئی ہے وہ سب بلا دلیل باتیں ہیں، میت کی طرف سے اس کے اولیاء پر قضا کرنا حکم شرع ہے۔ فقط۔

محاکمہ از محدث روپڑی

فریق اول کا جواب صحیح ہے۔ فریق ثانی غلطی پر ہے۔ فریق ثانی نے جو احادیث بیان کی ہیں۔ ان میں تصریح ہے کہ میت پر روزے ہوں تو اس کے ولی پر قضا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب بیمار اسی بیماری میں گزر گیا جس میں اس نے روزے افطار کئے تو اس پر روزے لازم نہ ہوئے۔ کیونکہ اس پر روزے لازم ہونے کے لئے شرط ہے کہ اس کو تندرستی کے دن مل جائیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے فعدۃ من ایام اخر۔ یعنی اور دنوں سے گنتی پوری کرے۔ جب بیمار نے اور دن پائے ہی نہیں جن میں یہ گنتی پوری کرتا تو اس پر یہ حکم نہ لگا۔ پس حدیث کے مطابق اس کے ولی پر قضا نہ ہوئی۔ ہاں اگر اس بیماری سے تندرست ہو جاتا اور جتنے روزے اس کے چھوٹے تھے اتنے دن یا اس سے کم دن تندرست رہ کر کسی اور

عارضہ سے مرجاتا تو پھر ولی پر اتنے دنوں کی قضا آسکتی تھی۔ جتنے دن تندرست رہتا۔ مگر سوال کی صورت میں تو وہ تندرست ہوا ہی نہیں تو پھر ولی پر قضا کی کوئی وجہ نہیں؟

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲ جمادی الاول ۱۳۵۸ھ ۲۱ جون ۱۹۳۹ء

روزہ میں مباشرت

سوال :۔ ایک شخص ماہ رمضان میں اپنی بیوی سے مباشرت کرتا ہے۔ اگرچہ دخول تک نوبت نہیں پہنچتی لیکن اُسی حالت میں ہی اُس کی منی خارج ہو جاتی ہے۔ کیا اس سے روزہ میں کوئی نقص واقع ہو جاتا ہے۔؟

محمد عبداللہ بی۔اے

سیکنڈ ماسٹر ڈی۔بی سکول جلال آباد غربی ضلع فیروزپور

جواب :۔ اپنی بیوی سے ماہ رمضان میں مباشرت کرنے سے انزال ہو جائے تو کفارہ پڑجاتا ہے خواہ دخول تک نوبت پہنچے یا نہ۔ کیونکہ خواہش پوری ہوگئی۔ کفارہ پے درپے دوماہ کے روزے ہیں۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلادے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۶ شوال ۱۳۵۶ھ

کفّارہ اور اُس کی صورت

سوال :۔ رمضان میں روزہ توڑنے پر کفارہ کیا ہے۔ اور اس کی صورت و اندازہ کیا ہے؟

محمد عبداللہ امام مسجد چک ۱۱ نہر فتح ڈاکخانہ چک ۱۴/۱۱ ٹوبہ جمال جیوا

ریاست بہاول پور

جواب :۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آیا۔ اُس نے کہا هلكت یا رسول اللہ۔ اے اللہ تعالےٰ کے رسول میں ہلاک ہوگیا ہوں۔ فرمایا تجھے کس چیز نے ہلاک کیا۔ کہا وقعت علی امرأتی فی رمضان۔ یعنی رمضان میں اپنی عورت سے ہمبستری کرلی۔ فرمایا تو ایک گردن آزاد کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ اُس نے کہا نہیں۔ فرمایا دو ماہ کے روزے پے درپے رکھ سکتا ہے؟ اُس

نے کہا نہیں۔ فرمایا کیا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے۔ کہا نہیں۔ پھر بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ٹوکرا لایا گیا جس میں پندرہ صاع کھجوریں تھیں۔ آپ نے فرمایا یہ لے جا اور اپنی طرف سے صدقہ کر دے۔ کہنے لگا یا رسول اللہ! کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر صدقہ کروں۔ مدینہ کے احاطہ میں مجھ سے زیادہ کوئی محتاج نہیں۔ اس پر آپ بہت ہنسے اور فرمایا اچھا اپنے اہل کو کھلا دے۔ اور ایک میں ہے کُلْہُ وَاَطْعِمْہُ اَھْلَکَ۔ یعنی خود کھا اور اپنے اہل کو کھلا۔

اس حدیث پر نیل الاوطار میں ھلکت کے لفظ پر لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ھَلَکْتُ (میں ہلاک ہوگیا) کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اُس نے دیدہ دانستہ کیا ہے کیونکہ ہلاک ہونے سے مراد یہ ہے کہ مجھ سے نافرمانی ہوگئی ہے۔ اور بھول چوک نافرمانی نہیں۔ پس بھول چوک سے ہمبستری کرنے والے پر کفارہ نہیں۔ اور جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ امام احمد رح اور بعض مالکیہ کہتے ہیں کہ بھولنے والے پر کفارہ ہے اور یہ دلیل وہی ہے کہ آپ نے اُس سے یہ دریافت نہیں کیا کہ بھول کر کیا یا دیدہ دانستہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صورت میں کفارہ ہے خواہ دیدہ دانستہ کرے یا بھول کر۔

حافظ ابن حجر رح فتح الباری میں لکھتے ہیں۔ ھَلَکْتُ کے لفظ سے معلوم ہوگیا کہ اُس نے یہ کام دیدہ دانستہ کیا ہے تو پھر دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہ نیز نہ دریافت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رمضان میں دن کے وقت جماع بھول چوک سے ہونا بہت بعید بات ہے۔

جماع اور کھانے کا حکم ایک ہے یا نہیں

بعض روایتوں میں وقعت علی امرأتی کی جگہ ان رجلا افطر فی رمضان آیا ہے۔ یعنی ایک شخص نے رمضان میں روزہ افطار کر لیا تو اس کو آپ نے کفارہ کا حکم دیا۔

نیل الاوطار میں ہے۔

وبھذا استدلت المالکیۃ علیٰ وجوب الکفارۃ علی من افطر فی رمضان بجماع اوغیرہ والجمھور حملوا المطلق علی المقید وقالوا لاکفارۃ الا فی الجماع

اس سے مالکیہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ رمضان میں خواہ کوئی جماع سے افطار کرے خواہ کھانے پینے سے اس پر کفارہ ہے۔ جمہور کہتے ہیں۔ پہلی روایت میں چونکہ جماع کی تصریح ہے اس

لئے دوسری روایت میں بھی افطار سے مراد جماع کے ساتھ افطار ہو نا نہ کہ مطلق اور جمہور کہتے ہیں۔ کفارہ صرف جماع میں ہے نہ کہ کھانے پینے میں۔

کفارہ کی صورت

یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں غلام آزاد کرنے کی صورت ممکن نہیں۔ اب پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ رہا یہ کہ ایک ہی دفعہ کھلائے یا متفرق تو اس کے متعلق نیل الاوطار میں ہے۔ ابن دقیق العید نے کہا کہ اس حدیث میں اطعام کی نسبت ساٹھ مسکین کی طرف کی ہے جس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ یک لخت کھلائے پس اگر چھ کو مثلاً دس دن کھلائے یا ایک کو ساٹھ دن کھلائے تو یہ ساٹھ کا کھلانا نہیں۔ اور جمہور اسی کے قائل ہیں۔ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ساٹھ مسکینوں کا تمام کھانا ساٹھ دن میں ایک مسکین کو کھلا دے تو کافی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو فرمانا فاطعمه اهلك یعنی اپنے اہل کو کھلا دے اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ شخص مذکورہ کو ادائیگی کفارہ کی صورت آپ نے یہ بتائی ہے کہ اپنے اہل کو کھلا دے۔ حالانکہ اہل ساٹھ افراد نہ تھے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ یک لخت ساٹھ کو کھلانا شرط نہیں۔

یہ دلیل صاحب نیل الاوطار نے حنفیہ کی طرف سے پیش کی ہے۔ لیکن یہ دلیل دو وجہ سے کمزور ہے ایک یہ کہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں کله و اطعمه اهلك یعنی خود کھا اور اپنے اہل کو کھلا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اپنے نفس پر کفارہ صرف نہیں ہو سکتا۔ دوم یہ کہ اپنے اہل پر صرف کرنے کے حنفیہ وغیرہ قائل نہیں۔ علاوہ اس کے اس پر کیا دلیل ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ اپنے اہل کو کھلا دے یہ ادائیگی کفارہ کی صورت ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ تنگی کی وجہ سے اس کو کفارہ معاف ہو یا آئندہ اس کے ذمہ ہو۔ اور ظاہر یہی ہے کیونکہ یہ ایک قسم کا قرض ہے۔ اور قرض میں اصل یہ ہے کہ وہ تنگی میں ساقط نہیں ہوا کرتا بلکہ ذمہ باقی رہتا ہے۔ جب توفیق ہو ادا کرے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شخص مذکور سے آپ نے یہ نہیں کہا کہ آئندہ تیرے ذمہ ہے۔ کیونکہ قرض کا معاملہ واضح ہے کہ ذمہ ہو جاتا ہے۔ اور جمہور اسی کے قائل ہیں۔ صرف عیسیٰ بن دینار رح مالکی کہتے ہیں کہ تنگی کے وقت کفارہ معاف ہے۔ اور امام شافعی رح کا ایک قول ہے کہ کفارہ معاف ہے۔ اور ایک قول جمہور کے مطابق ہے

کفارہ کا اندازہ: نیل الاوطار میں ہے یعنی دار قطنی میں حضرت علی رض کی حدیث ہے کہ ساٹھ مسکینوں

کو کھلائے ، ہر مسکین کو ایک مُد یعنی چوتھائی صاع دے ۔ اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ۱۵ صاع کھجوریں لائی گئیں ۔ اسی طرح دار قطنی میں ابو ہریرہ رضہ کی حدیث ہے ۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ جس راوی نے ۲۰ صاع کہا ہے اُس کی مُراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کل بیس صاع کھجوریں لائی گئیں اور جس نے پندرہ صاع کہا ہے اُس کی مراد کفارہ کا اندازہ ہے ۔

روزہ کی قضاء ۔ منتقی میں ہے ۔

ولابن ماجة وابی داؤد فی روایة وصم یوما مکانه

یعنی ابن ماجہ اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شخص مذکور کو فرمایا کفارہ کے علاوہ اس کی جگہ ایک دن روزہ رکھنا ۔

عورت پر کفارہ ہے یا نہیں

نیل الاوطار میں ہے ۔ جمہورؒ کہتے ہیں کہ عورت مرد کے حکم میں ہے اس پر بھی کفارہ ہے امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ عورت پر کفارہ نہیں ۔ اور امام شافعیؒ کے دو قول ہیں ۔ ایک جمہور کے موافق ہے اور ایک اوزاعیؒ کے موافق ہے یہ قول[1] اصح ہے ۔ دلیل اس کی یہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارہ کا حکم مرد کو دیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پر کفارہ نہیں ۔ اس کے جواب میں صاحب نیل الاوطار نے لکھا ہے ۔

و بانه لم تعترف ولم تسأل فلاحاجة ولاسیما مع احتمال ان تکون مکرهة کما یرشد الی ذالك قوله فی روایة الدار قطنی هلکت واهلکت ۔

یعنی عورت نے نہ اقرار کیا نہ سوال کیا پس اس کو تبلانے کی ضرورت نہ تھی خاص کر جب اس پر جبر ہوا ہو جیسے هلکت واهلکت سے معلوم ہوتا ہے یعنی میں ہلاک ہو گیا اور ہلاک کر دیا ۔

اس لئے ہلاک ہونے اور ہلاک کرنے کی نسبت اپنی طرف کر دی ہے ۔ اگر عورت بھی راضی ہوتی تو کہتا هلکت وهلکت یعنی میں ہلاک ہو گیا اور میری بیوی بھی ہلاک ہو گئی ۔

---

[1] یعنی یہ قول امام شافعیؒ سے زیادہ صحت کے ساتھ ثابت ہے اور جو قول جمہور کے موافق ہے اس کا ثبوت امام شافعیؒ سے کچھ کمزور ہے ۱۲

یہ صاحب نیل الاوطار کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ صاحب منتقیٰ نے بھی دارقطنی کے یہ الفاظ ھلکت واھلکت نقل کرکے لکھا ہے کہ شخص مذکور کا کہنا کہ میں نے ہلاک کر دیا۔ عورت پر جبر ہونے کی صورت میں ٹھیک نہیں۔ ہلاک کرنے سے مراد یہ ہے کہ میں نے اس کو گنہگار کر دیا حالانکہ جبر کی صورت میں وہ گنہ گار نہیں ——— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے تحریک ہوئی۔ اور وہ راضی ہوگئی اس لئے ہلاک کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہاں اگر اھلکت کا لفظ ھلکت کی مشاکلت سے استعمال کیا ہو۔ اور مراد اس سے جبر ہو تو پھر یہ جواب صحیح ہے۔ رہا پہلا جواب کہ عورت نے نہ اقرار کیا نہ پوچھا اور عورتوں کا حکم عموماً مردوں کا ہوتا ہے۔ اس لئے عورت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ سو یہ جواب بلا شبہ صحیح ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۸ شعبان ۱۳۵۹ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۰ء

سحری کی اذان

اس کا بیان اذان کے باب ۹ میں گذر چکا ہے۔

جانور سے وطی کا روزہ پر اثر

سوال ۔ ماہ رمضان المبارک میں بحالت صیام جو شخص چارپایہ کے ساتھ جماع کرکے روزہ فاسد کرے اس کا کیا حکم ہے۔ جیسا حنفیہ کا مذہب ہے ویسا حکم ہے یا کوئی دوسرا۔

محمد حسین چک نمبر ۲۷۸ ضلع لائل پور

جواب ۔ روزہ کے فاسد ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ جیسا کھانے سے بالاتفاق روزہ ٹوٹ جاتا ہے خواہ وہ شے خوراک ہو یا نہ جیسے مٹی ایسے ہی جماع سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے خواہ کسی شے سے جماع ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۷ رجون ۱۹۳۲ء

روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا

سوال :۔ کیا روزہ کی حالت میں حج کے لئے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے ٹیکہ لگوانا جائز ہے ۔؟

جواب :۔ روزہ میں ٹیکہ کی بابت پاکستان بننے سے پہلے امرتسر میں دیوبندی اور بریلوی حضرات میں اشتہار بازی ہو چکی ہے ۔ دیوبندی جواز کے قائل تھے اور بریلوی علماء عدم جواز کے بناء اختلاف یہ تھی کہ ٹیکہ کھانے پینے میں شامل ہے یا نہیں ۔ دیوبندی علماء کا خیال تھا کہ ٹیکہ کی صورت میں دوا خون میں ملا دی جاتی ہے معدہ میں نہیں جاتی ۔ اور بریلوی کہتے تھے کہ کھانے پینے کے حکم میں ہے کیونکہ غیر طبعی طور پر معدہ میں چلی جاتی ہے ۔ ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کھانے پینے سے عرفی کھانا پینا تو مراد نہیں ۔ چنانچہ حدیث میں بحالتِ روزہ وضو کے وقت ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرنا منع ہے جس کی وجہ ہے کہ خطرہ ہے کہ ناک کے راستہ حلق میں اتر جائے حالانکہ عرفاً یہ پینا نہیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی طرح کوئی چیز معدہ میں پہنچ جائے اس سے روزہ کو نقصان پہنچ جاتا ہے ۔ ٹیکہ میں دوا کے لطیف اجزاء کے متعلق خطرہ ہے کہ وہ مسامات کے راستہ معدہ میں آجائیں اور روزہ خطرہ میں پڑ جائے اس لئے ٹیکہ روزہ میں نہ لگوانا چاہیئے ۔ احتیاط اسی میں ہے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی تنظیم اہلحدیث جلد ۱۷ نمبر ۲۷

روزہ کی حالت میں حیض کا آنا

سوال :۔ ایک عورت نے روزہ رکھا ہوا ہے ۔ صرف دن غروب ہونے میں دس منٹ باقی ہیں یا اس سے بھی کم وقت ہے اور اس کو حیض آجاتا ہے ۔ کیا وہ اس وقت اپنا روزہ افطار کر دے ۔ یا دس منٹ یا کم و بیش انتظار کر کے بعد کھولے ۔ اور یہ روزہ اس عورت کا شمار ہوگا یا نہیں ۔

جواب :۔ اس کا روزہ ٹوٹ چکا ہے ۔ باقی اب کھانے پینے میں اس کو اختیار ہے ۔ جس طرح چاہے کرے ۔ جب روزہ ٹوٹ چکا ہے تو قضا ضروری ہے ۔ یہاں منٹوں کا کوئی حساب نہیں ۔ حیض روزے کی ضد ہے دونوں جمع نہیں ہو سکتے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

حیض کے روزوں کی قضائی کا وقت

سوال :۔ نیز ایام حیض کے قضا شدہ روزے کی قضائی کیا عید کے بعد متصل دے یا سال بھر کے اندر اندر جب چاہے قضائی دے سکتی ہے ؟

جواب :۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ماہ شعبان میں قضائی دیا کرتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت دیر سے بھی قضائی دے سکتی ہے ۔ اور جتنی جلدی دی جائے۔ بہتر ہے کیونکہ خطرہ ہے موت آجائے اور روزے ذمہ رہ جائیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

حاملہ و مرضعہ کے روزوں کی قضائی کا وقت

سوال ۔ حاملہ یا مرضعہ کے عورت کے روزے قضا ہو چکے ہیں ۔ اور وہ بوجہ غفلت اپنے قضا شدہ روزے نہ رکھ سکی ہو تو کیا وہ اب جو تین سال کے روزے یعنی تین سال گزر جانے کے بعد اب وہ اپنے قضا شدہ روزوں کے دانے یا ایک ماہ کا حساب کرکے پیسے دے دے یا کہ وہ روزے ہی رکھے

جواب :۔ قرآن مجید میں فدیۃ طعام مسکین کا لفظ ہے یعنی فدیہ ایک مسکین کا ہے ہر روزے کے بدلے میں اکٹھا دے یا روزانہ دے اس کی تشریح نہیں ۔ دونوں صورتیں درست ہیں ۔ اور جب اکٹھے دے خواہ دانے دے یا پیسے دے اس کا کوئی حرج نہیں ۔ یہ آیت مرضعہ اور حاملہ کو اس صورت میں شامل ہے جب علی الذین یطیقون کے معنی یطوقونہ کے کئے جائیں ۔ یعنی جن کے لئے روزہ رکھنا گلے کا طوق اور مصیبت ہے ۔ اور احادیث سے بھی حاملہ اور مرضعہ کے لئے فدیہ ثابت ہوتا ہے اگر تھوڑے تھوڑے کرکے روزے رکھ سکتی ہے تو بہتر روزے ہی ہیں ۔ ورنہ فدیہ بھی کافی ہو جائے گا ۔ کیونکہ زیادہ تعداد روزوں کی اکٹھی ہو جائے تو یہ عام طور پر اتنے روزوں کی قضائی مشکل ہے ۔ لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

بحالت روزہ رفیقہ حیات کا بوسہ

سوال :۔ کیا بیوی سے بوس وکنار ہونے سے روزہ میں نقص پڑ جاتا ہے۔

جواب :۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحالت روزہ بوسہ لے لیا کرتے تھے اس حدیث سے ظاہر ہے کہ بیوی سے بوس وکنار ہونے سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر جوان آدمی کو اس سے احتیاط کرنی چاہیئے۔

قضا شدہ روزے نابالغ سے رکھوانا

سوال :۔ ایک مرد یا عورت کے روزے کسی مجبوری کی وجہ سے رہ چکے ہیں تو کیا وہ نابالغ لڑکی یا لڑکے سے قضا شدہ روزے رکھوا سکتے ہیں۔

جواب :۔ روزے قضا شدہ نہیں رکھوا سکتے کیونکہ نابالغ کا روزہ نفل ہے نفل بعینہٖ فرض نہیں ہوتا مثلاً ماہ رمضان میں کوئی عمرہ کرے تو اس کو حج کا ثواب ملتا ہے لیکن حج فرض کے قائم مقام عمرہ نہیں ہو سکتا۔ حج اس کو علیحدہ کرنا پڑے گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

سحری اور افطاری کے لئے نقارہ بجانا

سوال :۔ سحری کے وقت جگانے کے لئے اور روزہ کی افطاری کے لئے نقارہ بجانا جائز ہے۔ یا نہیں۔ نیز الارم کے متعلق کیا حکم ہے۔

عبدالرحیم خطیب چک نمبر ۲۵۱ ڈاکخانہ بیریانوالہ ضلع لائل پور

جواب :۔ جہاں اذان شروع ہے وہاں اذان پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔ ورنہ اذان بے کار ہو گی اس لئے حکم ہے کہ ہر محلہ میں مسجد بناؤ۔ اور اذان وہ دے جس کی آواز بلند ہو۔ اس اہتمام کو چھوڑ کر دوسرا اہتمام کرنا شریعت کی توہین ہے۔ ناقوس نصاریٰ سے مشابہت ہے۔ نیز نقارہ ڈھول کی قسم ہے جو منع ہے رہا الارم تو کلاک کی آواز اور الارم ایک ہی ہے۔ نہ تو یہ اذان کے وقت ہے نہ یہ اذان کی طرح جماعتی اعلان

ہے بلکہ غذا میں طور پر پاک شے کا استعمال ہے تو یہ ایسا ہے جیسے عام طور پر گھڑی رکھتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹

۱۲ ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ - ۱۳ مئی ۱۹۵۷ء

سحری کھائے بغیر روزہ

سوال:۔ اگر سحری نہ کھائی جائے تو روزہ ہوگا یا نہیں ہوگا۔

عبداللہ شاہ منڈے پنڈ چک نمبر ۹۴ ڈاکخانہ خاص ضلع لائل پور

جواب:۔ سحری نہ کھانے سے روزہ ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں آئے۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ! ہمیں حیس (کھجوریں، پنیر، گھی ملا کر تیار کیا ہوا کھانا) تحفہ دیا گیا۔ آپ نے فرمایا مجھے دکھلاؤ میں نے صبح روزہ کی حالت میں کی پھر آپ نے کھانا کھا لیا (مشکوٰۃ) اس سے معلوم ہوا کہ سحری کھائے بغیر روزہ ہو جاتا ہے ورنہ آپ روزہ نہ رکھتے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نفلی روزہ توڑ سکتے ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی از بھوئیہ آصل ڈاکخانہ خاص ضلع لاہور

جنبی اور سحری

سوال:۔ ایک شخص کی آنکھ دیر سے کھلی۔ ابھی اس نے غسل جنابت کرنا ہے۔ سحری کا تھوڑا وقت باقی ہے۔ کیا وہ سحری کھا کر غسل جنابت کر سکتا ہے؟

جواب:۔ ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنبی ہوتے اور بلال رضی اللہ عنہ آپ کو نماز کے لئے بلاتے تو آپ اٹھتے اور غسل کرتے پھر نماز پڑھاتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی ضرورت سے اگر وقت غسل کا قبل سحری نہیں ملتا تو باوضو ہو کر سحری کھا لے اور پھر بعد صبح صادق غسل کر کے نماز پڑھ لے روزے میں کوئی خرابی نہیں آتی۔

قے اور روزہ

سوال:۔ کیا قے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

جواب :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس کو خود بخود قے آگئی ۔ اور وہ روزہ دار تھا اس پر قضا نہیں ۔ ہاں جو عمداً قے کرے اُس پر قضا ہے (ترمذی ابوداؤد) ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ میری موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی اور افطار کیا ۔ اور میں نے پانی ڈالا ——— یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ عمداً قے کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور خود بخود قے آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ۔ کیونکہ یہ بے اختیاری امر ہے ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۶ رمضان ۱۳۵۰ھ

مروّجہ شبینہ

سوال :۔ آج کل رواج ہے ۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ایک حافظ یا چند حافظ قرآن مجید یکے بعد دیگرے نماز عشاء سے سحری تک ایک ہی رات میں پورا سناتے ہیں چونکہ سحری تک قرآن مجید ختم کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ قدرے تیز پڑھتے ہیں کہ عام حالات میں سمجھ میں نہیں آتے ۔ بعض مساجد میں اس کا خاص اہتمام ہوتا ہے لوگ اس کو شبینہ کہتے ہیں ۔ شریعت میں اس کا کیا حکم ہے ۔؟

جواب :۔ شبینہ مروجہ منع ہے ۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص تین دن سے کم میں قرآن مجید پڑھے ۔ اُس نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا ۔ قیام اللیل مروزی وغیرہ میں عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ اُن کے شاگرد نے رات کی نماز میں قرآن مجید کچھ زیادہ پڑھنے کا ذکر کیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ڈانٹا اور فرمایا ھذّا کھذّ الشعر یعنی اشعار کی طرح جلدی جلدی پڑھنا ہے ۔ اور حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں ۔

لا اعلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأ القران فی لیلۃ ولا قام لیلۃ حتی اصبح

یعنی مجھے علم نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایک رات میں کمل قرآن مجید پڑھا ہو یا ساری رات تک طلوع فجر تک قیام فرمایا ہو ۔

جب ایک رات میں قرآن مجید کا ختم کرنا منع ہو تو اس کا اہتمام کرنا تو اس سے بھی بُرا ہوا ۔ پس مسنون طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اور بدعی طریقوں سے پرہیز رکھنا چاہیئے ۔ کیونکہ مقصد اللہ تعالےٰ کی رضامندی ہے اور بدعی طریقوں میں بجائے رضامندی کے اللہ تعالےٰ کی ناراضگی ہے ۔ تکلیف بھی اٹھانا اور خواہ مخواہ

گنہگار بھی ہونا یہ مسلمان کا کام نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ رمضان ۱۳۸۳ھ

مسئلہ قضاء عمری

سوال :- آخری جمعہ ماہ رمضان میں قبل نماز ظہر بارشادِ امام ہر نمازی اپنی سنت فجر مع فرض کے قضاء پڑھے۔ پھر چار رکعت ظہر پھر فرض عصر پھر فرض مغرب پھر فرض عشاء مع تین وتر قضا کر کے پڑھے۔ پھر چار رکعت قضاء عمری جماعت ہونے کے بعد نماز ظہر لوری پڑھے یہ قضاء عمری شرعاً کیا حکم رکھتی ہے؟

(سائل ولی محمد زرگر)

جواب :- یہ صورت مندرجہ صدر کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ کالعدم ثبوت بدعت ہے۔

حررہ عبدالرحمن ۲۸ رمضان ۱۳۴۵ھ

جواب محدث روپڑی

مروجہ قضاء عمری نہ صحابہؓ سے ثابت ہے نہ تابعینؒ سے نہ تبع تابعینؒ سے۔ نہ چار اماموں سے پھر ایسی بات کے بدعت ہونے میں کیا شبہ باقی ہے۔ جنگ خندق میں چار نمازوں کی قضاء کی بابت جو حدیث ذکر کی ہے اس میں چار نمازوں کی قضا دی ہے۔ قضا عمری سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قضا عمری میں خاص دن خاص وقت میں آٹھ رکعت یا بارہ رکعت یا سترہ رکعت پڑھی جاتی ہیں جن میں فاتحہ وآیت الکرسی وغیرہ پڑھی جاتی ہے۔ اِس طرح اس حدیث کو جس میں دو رکعت پڑھ کر استغفار کا ذکر ہے اس کو بھی قضاء عمری سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس حدیث میں نہ آٹھ رکعت کا نہ بارہ رکعت کا نہ سترہ رکعت کا ذکر ہے نہ رمضان کے آخری جمعہ کا ذکر ہے نہ ظہر عصر کے درمیان ہونا ذکر ہے۔ نہ آیت الکرسی اور سورۃ اخلاص وغیرہ کی شرط ہے نہ کسی خاص گناہ سے توبہ کا ذکر ہے۔ پس اس کو قضاء عمری کی دلیل میں پیش کرنا ایسا ہوا جیسے مرزا کہتا ہے کہ میں مسیح موعود ہوں۔ دلیل یہ کہ عیسٰی علیہ السّلام فوت ہو گئے۔ حالانکہ عیسٰی علیہ السّلام کے فوت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مرزا مسیح موعود ہو جائے خاص کر جب مرزا میں جھوٹے ہونے کی علامات بھی موجود ہوں۔ بھلا اس صورت میں وہ مسیح موعود کیسے بن سکتا ہے۔ ٹھیک اِسی طرح قضاء عمری میں باتیں اپنی طرف سے بدعت ملائی گئی ہیں جو بمنزلہ جھوٹی علامات کے ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں۔ جیسے

رمضان کے آخری جمعہ میں ہونا، ظہر عصر کے درمیان ہونا، ۱۲ یا ۸ رکعت کا ہونا ان میں آیت الکرسی، اور سورہ اخلاص وغیرہ کا پڑھنا یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ حدیث میں اس طرح کی نماز کا کوئی ثبوت نہیں پس یہ مردود ہے۔ حدیث میں ہے، من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھو رد۔ یعنی جو دین میں نئی بات پیدا کرے وہ مردود ہے۔

عبد اللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ
۲۷ جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ۔ ۲ اگست ۱۹۴۰ء

کھانا پینا اور جماع

سوال:۔ کھانا پینا اور جماع دونوں روزہ توڑنے کے لحاظ سے ایک حکم رکھتے ہیں یا ان میں فرق ہے۔؟

جواب:۔ بخاری مسلم وغیرہ میں حدیث ہے من نسی وھو صائم فاکل وشرب فلیتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه۔ یعنی جو روزہ دار بھول کر کھا پی لے وہ اپنا روزہ پورا کرے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے ——— اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ولا قضاء علیه۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے (منتقی مع نیل الاوطار جلد ۴) یعنی بھول کر کھانے پینے والے پر قضا نہیں ——— اس حدیث سے واضح ہوا کہ بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اور نہ ہی اس صورت میں قضا ہے۔ روزہ کے تین رکن ہیں۔ (۱) کھانا (۲) پینا (۳) جماع سے پرہیز ——— ان میں سے کوئی رکن فوت ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا مگر کھانے پینے میں بھول چوک کی صورت میں معاف ہے جیسے حدیث بالا میں ذکر ہے اور جمہور علماء کا یہ مذہب ہے ——— جماع کی بابت دیدہ دانستہ اور بھول چوک میں فرق کے متعلق صراحۃً کوئی روایت نہیں آئی۔ اس لئے اس میں اختلاف ہے کہ بھول چوک کی صورت معاف ہے یا نہیں۔ بعض علماء اس کو کھانے پینے پر قیاس کرتے ہیں۔ مگر نیل الاوطار جلد ۴ میں ہے۔ وقوع النسیان فی الجماع فی نھار رمضان فی غایة البعد۔ یعنی رمضان شریف میں دن کے وقت جماع بھول چوک ہونا بہت بعید ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اول تو جماع دن میں ویسے کم ہوتا ہے۔ دوسرے جماع کھانے پینے کی عام شے نہیں ہے تو ایسی قلیل الوقوع شے جس میں کئی طرح کا اہتمام ہوتا ہے اس میں نسیان کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ تیسرے جماع کا تعلق ایک اور وجود یعنی بیوی کے ساتھ ہے۔ اور

کھانے کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے ـــــ اس لئے جماع کو کھانے پر قیاس کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے ـــــ جماع کے متعلق حدیث میں کفارہ کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارہ کا حکم فرماتے وقت یہ دریافت نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کام دیدہ دانستہ کیا تھا یا بھول کر۔

امام احمدؒ اور بعض مالکیہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اگر عمداً اور بھول چوک میں کفارہ کا فرق ہوتا تو نبی علیہ السلام اس سے دریافت فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں صورتوں میں کفارہ ہے ـــــ مگر یہ استدلال کمزور ہے۔ کیونکہ حدیث میں ھلکت واحترقت کا لفظ آیا ہے یعنی جس شخص نے رمضان میں جماع کیا تھا۔ اس نے کہا اے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ! میں ہلاک ہو گیا اور جل گیا۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے نافرمانی اور گناہ ہو گیا۔ نافرمانی اور گناہ دیدہ دانستہ میں ہوتا ہے۔ بھول چوک میں نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس نے یہ کام دیدہ دانستہ کیا تھا۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ نیز جماع میں بھول چوک ہونا بعید امر ہے۔ اس لئے آنحضرتؐ کو پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی

بہر صورت امام احمدؒ اور بعض مالکیہ کا اس حدیث سے جماع کے متعلق عام استدلال کرنا صحیح نہیں خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جماع میں بھول چوک کی صورت ہو جائے تو اس پر کفارہ ہے۔ ہاں یوں استدلال ہو سکتا ہے کہ کھانے پینے میں بھول چوک اور دیدہ دانستہ کا فرق کرنا اور جماع میں سکوت فرمانا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جماع میں بھول چوک اور دیدہ دانستہ دونوں صورتیں ایک ہی حکم میں ہیں۔ پہلی ہر دو صورت میں کفارہ ہے کیونکہ اس میں بھول چوک بعید اور نادر الوقوع ہے۔ اس لئے اس کی معافی نہیں دی گئی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے نماز میں خواہ کلام دیدہ دانستہ کرے یا بھول کر نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ نماز میں بھول کر کلام کرنا بعید امر ہے۔ فقہا نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ نماز کی ہیئت اور صورت کلام کے منافی ہے۔ یعنی نماز کی ہیئت اور شکل کلام سے روکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزے کی حالت میں جماع کرنے پر بہر صورت کفارہ ہے۔

عبد اللہ امرتسری روپڑی

۲۹ رمضان ۱۳۸۰ھ

اعتکاف

معتکف کا ممنوع اوقات میں نوافل پڑھنا

سوال:۔ کیا معتکف نمازِ فجر کے بعد تا طلوعِ آفتاب اور اسی طرح بعد از عصر تا مغرب سنتیں یا نفل ادا کر سکتا ہے؟

جواب:۔ ان دونوں وقتوں میں نماز منع ہے معتکف اور غیر معتکف اس میں برابر ہیں لیکن سببی نمازیں اختلاف ہے کہ جائز ہے یا نہیں، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس پر زور دیا ہے کہ سببی نماز جائز ہے۔ جیسے تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضوء وغیرہ اور ممانعت صرف غیر سببی نمازیں ہے یعنی جس کا کوئی سبب نہ ہو جیسے عام نفل نماز استخارہ اور نمازِ حاجت بھی سببی میں داخل ہے[1]۔ کیونکہ سببی سے مراد جو فی الفور ہوتی ہے۔ البتہ فجر کی سنتوں کے متعلق ابوداؤد وغیرہ میں خاص حدیث آگئی ہے کہ نماز فجر کے بعد اور طلوعِ آفتاب سے قبل درست ہیں۔ البتہ مسجد حرام میں کوئی وقت مکروہ نہیں جب چاہے پڑھے (مشکوٰۃ باب اوقات النہی)

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ

معتکف کی بیوی کا اس کو کھانا پکڑانا

سوال:۔ کیا معتکف کی بیوی اس کو کھانا وغیرہ پکڑا سکتی ہے؟

جواب:۔ ہاں کھانا وغیرہ پکڑا سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں تھے آپ کی بیوی حضرت صفیہ رضؓ کسی کام کے لئے آپ کے پاس آئی اور حضرت عائشہ رضؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک میں کنگھی کرتی تھی۔ مشکوٰۃ۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۹ رمضان ۱۳۸۳ھ

نو آدمی مسجد میں اعتکاف بیٹھ سکتے ہیں

سوال:۔ ایک مسجد میں نو آدمی کا اعتکاف بیٹھنا ممنوع ہے؟ رحیم بخش زمیندارہ ایجنسی سرگودھا

---

[1] اگر نماز استخارہ اور نماز حاجت کا وقت تنگ ہو جیسے سفر کرنے کے وقت فی الفور استخارہ کرنا ہو یا ایسے ہی فوری طور پر نماز حاجت پڑھنی ہو تو اس صورت میں یہ سببی نمازیں داخل ہو سکتی ہے۔

جواب: ایک سے زیادہ مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کا ذکر حدیث میں آگیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بعض بیویاں اعتکاف بیٹھا کرتی تھیں۔ جب تعداد ثابت ہوگئی تو نو کو کیا رکاوٹ ہے۔ جس نے نو کو منع کیا ہے شاید اُس نے اس حدیث کی بنا پر کیا ہو جس میں بیویوں کا ایک دوسری کی ضد سے خیمے لگانے کا ذکر ہے۔ آپ نے وہ خیمے اکھڑوا دیے اور بیویاں نو تھیں۔ اُس نے سمجھ لیا ہو کہ نو کا اعتکاف منع ہے لیکن یہ غلطی ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں منع کی وجہ عدد نہیں بلکہ اُن کی آپس میں ضد ہونے کی وجہ سے ممانعت ہے۔ چنانچہ حدیث میں آلْبِرَّ یُرِدْنَ کے لفظ سے ظاہر ہے۔ یعنی کیا یہ نیکی کا ارادہ کرتی ہیں۔ گویا ان کے ارادہ میں خلل بتایا ہے عدد کو کوئی دخل نہیں پھر کیا پتہ ہے نو نے خیمے لگائے تھے یا نو سے کم نے خیمے لگائے تھے۔ کیونکہ حدیث میں نو کے خیمے لگانے کا ذکر نہیں پس نو کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی حال لاہور ماڈل ٹاؤن سی بلاک کوٹھی نمبر ۱۱۹

یکم ذی قعدہ ۱۳۷۲ھ ۱۲ جولائی ۱۹۵۲ء

لیلۃ القدر کی راتوں میں وعظ کا اہتمام

سوال: کیا رمضان المبارک کی شب ہائے لیلۃ القدر میں عہد نبوی یا صحابہ کرام اور زمانہ خیر قرون میں جلسے مواعظ ہوتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص شب ہائے لیلۃ القدر میں وعظ و تذکیر کرے تو اس پر کیا حکم ہوگا؟ (سراج دین جودھ پوری)

جواب: شب قدر کے وعظ اور رمضان کی تیس دن کی وعظ کے جواز عدم جواز سے پہلے تھوڑی سی تمہید سُن لیں ——— جس حیثیت سے کوئی شئے شریعت میں وارد ہوئی ہے اگر اسی سے لی جائے تو جائز ہے۔ اس کا شمار بدعت میں نہیں ہوگا مثلاً ——— ایک شخص کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (ترجمہ) یعنی اگر تمہیں علم نہ ہو تو علم والوں سے پُوچھ لو ——— نیز حدیث شریف میں ہے اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِیِّ السُّؤَالُ۔ یعنی جہالت کی شفا پوچھنا ہے۔

لیکن اگر کوئی اس میں اتنی بات بڑھا لے کہ باوجود اور علماء کے ایک عالم کا مذہب اپنے ذمے لازم کر لے اور جب پُوچھے اُسی سے پُوچھے تو یہ بدعت اور برا ہوگا اور یہی تقلید ہے جو متنازعہ فیہ ہے۔ اسی بنا پر

عبداللہ بن مسعود رضہ فرماتے ہیں۔

لَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِنْ صَلٰوتِهٖ يَرٰى اَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ يَّمِيْنِهٖ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَّسَارِهٖ ۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ باب الدعاء فی التشہد ص۸۷)

یعنی کوئی تمہارا اپنی نماز سے شیطان کا کچھ حصہ نہ کرے کہ اپنے اوپر لازم سمجھے کر (سلام پھیر کر) داہنی طرف ہی پھروں گا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ بہت دفعہ بائیں طرف بھی پھرتے تھے

امام جب نماز سے سلام پھیرتا ہے تو اپنے دائیں طرف یا بائیں طرف منہ کرکے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی بابت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک طرف کو معین کر لینا شیطان کا حصہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت دفعہ دوسری طرف بھی پھرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس حیثیت سے کوئی فعل شرع میں وارد ہو اس سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ذرا اِدھر اُدھر ہوگا تو وہ بدعت اور شیطان کا حصہ ہو جائے گا۔ کیونکہ بندہ کو شرع میں کوئی دخل نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی شئے معین کرے یا معین کو عام کرے یا کسی اور طرح سے کمی بیشی کرے بلکہ اس کو لازم ہے کہ ہر حکم اپنے انداز پر رہنے دے اور جس طرح وارد ہوا اس کو بجا لا ادا کرے۔

اس تفصیل سے شب قدر اور رمضان المبارک کے تیس دنوں کے وعظ کی حقیقت بھی واضح ہو گئی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وعظ اور تبلیغ کے لئے کسی رات یا کسی دن کو ہمیشہ کے لئے خاص اور معین نہیں کرنا چاہیئے۔ قرآن و حدیث اور خیر قرون میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ خاص کر جب ایک محل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کام ثابت ہو۔ جیسے رمضان المبارک کی عام راتوں میں عموماً اور لیلۃ القدر میں خصوصاً قیام وغیرہ ثابت ہے تو پھر کسی غیر ثابت شدہ کام کے لئے خاص کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ غور کیجئے عبداللہ بن مسعودؓ تو ثابت شدہ کاموں سے بھی ایک کی تخصیص کرنے کو شیطانی فعل فرماتے ہیں تو غیر ثابت شدہ کی تخصیص کس طرح درست ہو گی؟ اگر اگر کسی خاص رات یا وقت کی ہمیشہ کے لئے تخصیص نہ ہو بلکہ حسب ضرورت نماز تراویح سے پہلے یا بعد وعظ کیا جائے تو یہ بدعت نہیں ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ثابت ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ آپ نے مسائل اعتکاف وغیرہ کی بابت خطبہ ارشاد فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ بلا تخصیص حسب ضرورت وعظ کرنا جائز ہے۔ جیسے رمضان المبارک میں جس رات

قرآن مجید ختم ہو۔ لوگ دعا میں شرکت اور حصولِ برکت وغیرہ کی نیت سے بکثرت جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ تبلیغ کا عام موقع ہے۔ اگر ایسے موقع پر وعظ و تبلیغ ہو جائے تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ کمی بیشی یا تغیر و تبدل دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک خارج میں، ایک نفسِ حکم میں۔ نفسِ حکم میں تغیر آنے سے بے شک وہ حکم بدعت ہو جائے گا۔ جیسے اوپر تقلید کی مثال اور عبداللہ بن مسعودؓ کے قول سے ظاہر ہے۔ خارج میں تغیر آنے سے وہ حکم بدعت نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک جگہ معین تاریخ کو سال بسال عرس ہوتا ہے یا میلہ لگتا ہے۔ اب کوئی مبلّغ یا وعظ کی بھی تاریخ معین ہوگی مگر یہ بدعت نہیں کیونکہ یہ تعین خارج سے ہے نفسِ حکم میں نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص جمعہ جمعہ طالب علموں کو کھانا کھلائے تاکہ طالب علموں کے مطالعہ اور سبقوں کا حرج نہ ہو تو یہ بھی نفسِ حکم میں تغیر نہیں۔ اسی طرح ایک ملازم پیشہ شخص کو اتوار کے دن فراغت ہوتی ہے وہ اس دن کو وعظ یا تبلیغ کے لئے مقرر کرے یا اس دن میں قرآن مجید کی منزل زیادہ کرے یا نفل نوافل زیادہ پڑھے تو یہ بھی نفسِ حکم میں تغیر نہیں بلکہ خارج میں تغیر ہے کیونکہ انسان ہمیشہ حسبِ ضرورت اور حسبِ فرصت ہی ایسے کاموں میں زیادہ حصہ لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے یا ترغیب دے کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔ حالانکہ ان کے لئے سب دن یکساں ہیں۔ تو یہ نفسِ حکم میں تغیر ہے۔ پس یہ بُرا اور بدعت ہوگا۔ کیونکہ جو کام حسبِ موقع یا حسبِ ضرورت یا حسبِ فرصت ہوتا ہے، وہ سب کے لئے یکساں نہیں رہتا۔ کیونکہ مواقع بدلتے رہتے ہیں۔ ضرورتیں الگ الگ ہوتی ہیں فرصت کا وقت ایک نہیں ہوتا مثلاً لوگ وعظ کے لئے جلسہ کرتے ہیں تو جیسا جیسا اپنا موقع دیکھتے ہیں تاریخیں مقرر کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ جو ایک شہر یا گاؤں والوں نے تاریخ مقرر کی ہے وہی دوسرے لوگ کریں بلکہ خود ایک شہر یا ایک گاؤں والے کسی سال کوئی تاریخ رکھ دیتے ہیں اور کسی سال کوئی۔ پھر بعض کچھ کم و بیش مدت میں کر لیتے ہیں کیونکہ جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا کر لیتے ہیں، سب کے لئے ایک صورت معین نہیں ہو سکتی دیکھئے! ابن عباس فرماتے ہیں ہر جمعہ میں ایک مرتبہ لوگوں کو حدیثیں سنایا کر۔ اگر تیرا زیادہ خیال ہو، تو دو مرتبہ۔ اگر اس سے بھی زیادہ خیال ہو تو تین مرتبہ اور اس قرآن سے لوگوں کو سست نہ کر۔ اور کوئی قوم اپنی ضروری بات چیت میں ہو تو اُن کی بات کاٹ کر وعظ شروع نہ کر۔ اس سے وہ سست ہو جائیں گے۔ لیکن چپ رہ۔ جب وہ تجھے کہیں اُس وقت ان کو حدیثیں سُنا۔ اس وقت تیرا اُن کو حدیثیں سُنانا ان کے شوق کی حالت میں ہوگا۔ دُعا کے وقت وزن دار کلمات بنا کر دُعا مانگنے سے بچ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ روایت کیا اس کو بخاریؒ نے (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ۳) نیز مشکوٰۃ میں

ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ جمعرات جمعرات وعظ کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب العلم فصل ۳ صفحہ ۲۵) اور حضرت ابوہریرہؓ ہر جمعہ کو منبر کے پاس کھڑے ہو کر حدیثیں سناتے۔ جب امام نکلتا تو بیٹھ جاتے۔ ملاحظہ ہو مستدرک حاکم جلد اول صفحہ ۱۰۸ اور ابن عباسؓ جمعہ کے بعد اپنی خالہ میمونہؓ کی وفات کے موقعہ پر ان کے گھر میں لوگوں کو مسائل بتلانے کے لئے بیٹھے، ملاحظہ ہو مسند احمد جلد اول صفحہ ۲۶۴۔ سو اس طریق سے جیسا کوئی اپنا موقعہ دیکھتا۔ کام کرتا۔ اہلِ بدعت کی طرح نہیں کہ ہمیشہ میت کے تیسرے، ساتویں، دسویں، دن کو روٹی کے لئے مقرر کر لیں یا چالیس دن روٹی دیں یا ششماہی سالانہ حساب رکھیں یا اس قسم کا کوئی اور تعین کریں جو تقلید کی طرح سب کے لئے یکساں قرار دیا جائے۔ یہ سراسر دین میں تصرف اور حکم میں تغیر ہے اور اس کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو بدعت سے محفوظ رکھے (آمین) عبداللہ امرتسری روپڑی

حج کا بیان

حج سے حقوق العباد کی معافی

سوال :۔ آپ نے حرم میں وعظ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں باری تعالیٰ سے عرض کی تھی کہ جو اشخاص حج کے لئے آتے ہیں یا اللہ ان سب کو بخش دے مولا کریم نے فرمایا کہ اے حبیب میں نے سب کو بخش دیا ما سوائے ناحق قاتل، خائن اور کسی کا ناحق مال کھانے والا ــــــ ان تینوں کے لئے مزدلفہ میں دعا کی ہے کہ مولیٰ کریم! تیرے دربار میں کس چیز کی کمی ہے تو ایسے گنہگاروں کو بھی بخش دے تو حضورؐ کو یہ جواب ملا کہ اے حبیب میں نے ان کو بخش دیا۔ مزید آپ نے یہ فرمایا تھا کہ یہ پورے طور پر کہنا واضح کرنا باقی ہے کہ یہ بخشش صرف ان حاجیوں کے لئے ہی تھی یا تاقیامت حج پر جانے والوں کے لئے بھی ہے پھر آپ نے فرمایا تھا کہ یہ امر فیصلہ شدہ ہے کہ قیامت تک کے حاجیوں کے لئے بھی یہی بخشش ہے۔

آپ کا یہ وعظ واپس آکر ایک دو جگہ کیا۔ مگر ایک مولوی صاحب نے اس کا انکار کر دیا ہے کیا ان کا انکار صحیح ہے یا نہیں۔ (فتح علی خاں از فیروزپور)

جواب :۔ عرفات کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا حقوق العباد میں قبول نہ ہونا اور مزدلفہ میں قبول ہونا یہ مفصل حدیث مشکوۃ باب الوقوف بعرفہ اور ترغیب و ترہیب باب الوقوف بعرفہ والمزدلفہ وفضل یوم عرفہ میں موجود ہے۔ حقوق العباد عام ہیں۔ خواہ ناحق خون کی قسم سے ہوں یا خیانت کی قسم سے ہوں یا ناحق مال کھانے کی قسم سے ہوں۔ ترغیب ترہیب کے اسی صفحہ میں ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ امام ابو حنیفہؒ صاحب کے شاگرد سفیان ثوریؒ سے وہ زبیر بن عدی سے وہ انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ صرف ہمارے لئے ہے؟ فرمایا تمہارے لئے بھی ہے اور تمہارے بعد جو قیامت تک آئے اس کے لئے بھی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان حقوق العباد سے وہ مراد ہیں جن کی ادائیگی وسعتِ انسان سے باہر ہوگئی ہو۔ اگر ادا کرنے کی جلدی یا دیر سے تاعمر طاقت رکھتا ہو تو اس صورت میں معافی نہیں ہوگی۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ، ۲۷ اگست ۱۹۳۷ء۔

حج کے لئے استطاعت کا اندازہ

سوال :۔ ایسا قرضائی جو دو سو بیگہ زمین پختہ انگریزی کا مالک ہے اس پر حج فرض ہے یا نہیں؟

جواب :۔ قرآن مجید میں حج کے لئے من استطاع الیہ سبیلا کی شرط ہے اور حدیث میں اس کی تفسیر زاد اور راحلہ کے ساتھ کی ہے یعنی خوراک و سواری کا انتظام ہو سکے تو اس پر حج فرض ہے خواہ زمین کی آمد سے ہو یا زمین کی فروخت سے یا کسی اور طریق سے۔ ہاں مروجہ گرد جائز نہیں۔ اور زمین کی آمد کم ہو جس سے گزارہ نہیں چل سکتا بلکہ تنگی رہتی ہے تو اس صورت میں زمین کے ٹکڑے فروخت کرنے کا بھی حکم نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی، محرم ۱۳۵۷ھ ۹ مارچ ۱۹۳۹ء

حج سے پہلے مرنے والے کے حج کا حکم

سوال :۔ ایک شخص بشیر ادائے فریضہ حج مکہ معظمہ میں وفات پا گئے۔ اب اس کے حج کا کیا حکم ہے؟

(عبدالخالق بٹالہ ضلع گورداسپور)

جواب :۔ حاجی حج کرنے سے پہلے مر گیا ہے۔ اس لئے دریافت کرنا چاہیئے کہ حج کی طاقت اس کو

اسی سال ہوتی ہے یا پہلے ہی سے تھی۔ اگر اسی سال ہوئی ہے تو خواہ وہ حج سے مر گیا۔ اس کی طرف سے حج ادا ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی اور اگر پہلے سے اس کو طاقت تھی مگر سُستی کی وجہ سے حج کو نہیں گیا تو فریضہ حج اس کے ذمہ باقی رہ گیا۔ اس کی جائداد کی تہائی سے اُور حج ہونا چاہیئے۔ یہ سب بوجہ حاجی کے لڑکے کے ذمہ ہے اگر لڑکا بے پرواہی کرے تو اس کی مرضی۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ ۱۲ اگست ۱۹۳۸ء

باپ نے حج نہیں کیا بیٹا اس کی زندگی میں حج کر سکتا ہے؟

سوال:۔ باپ زندہ ہو اور اُس نے حج نہ کیا ہو تو کیا ایسی صورت میں بیٹا حج کر سکتا ہے۔

شیخ حشمت اللہ

جواب:۔ اگر بیٹا باپ سے علیحدہ ہو تو اس کی کمائی الگ ہو تو وہ اپنے روپے سے حج کر سکتا ہے اس کا حج صحیح ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (پ)

یعنی اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایسے لوگوں پر حج (فرض) ہے جو بیت اللہ شریف کی طرف پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

بیٹا اپنے مال سے بیت اللہ شریف کی طرف پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس آیت کی رُو سے اس کے ذمہ حج ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ بیٹے کی کمائی باپ کی ہے سو وہ اس صورت میں ہے کہ باپ محتاج ہو جائے اور اپنا خرچ نہ اٹھا سکے تو بیٹے کے مال سے بقدرِ ضرورت لینے کا حقدار ہے نہ یہ کہ بیٹے کے مال کا باپ حقیقتاً مالک ہے۔ اور حدیث میں جو الفاظ اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ آئے ہیں ان کا یہی معنیٰ ہے کہ باپ بیٹے کے مال سے اپنی ضرورت پُوری کر سکتا ہے۔ اگر مالک ہوتا تو وراثت میں چھٹا حصہ کیوں لیتا؟ اگر سائل کا یہ مطلب ہے کہ کمائی باپ کی ہے اور مالک باپ ہے اور بیٹا ویسے ہی بطور اولاد ہونے کے باپ کے تحت کام کرتا ہے۔ ایسی صورت میں باپ بیٹے کو حج کرائے اس نے اپنا حج نہ کیا ہو تو بیٹے کا حج ہو جائے گا۔ لیکن باپ کے ذمہ رہے گا۔ اگر زندگی میں حج کر لیا تو اس کے ذمہ سے اُتر گیا۔ ورنہ جو وعید تارک حج کے لئے ہے۔ یعنی یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر اس کا مستحق ہوگا۔

حج میں تاخیر

اس میں اختلاف ہے کہ استطاعت کے بعد حج میں تاخیر جائز ہے یا نہیں ؟ بعض ائمہ کا مذہب ہے کہ تاخیر میں مجرم ہوگا۔ اگر زندگی میں ادا حج کر لیا تو جرم معاف ہو جائے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تاخیر جائز ہے۔ مجرم نہیں ہوتا۔ صرف زندگی میں کسی وقت حج ادا کرنا ضروری ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب حج کرے گا وہ ادا ہی ہوگا نہ قضا خواہ تاخیر کرے یا نہ ؟

اس بنا پر احتیاط اسی میں ہے کہ باپ پہلے اپنا حج کرے پھر کسی دوسرے کو کرائے اور یہ مسئلہ باپ بیٹے کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ کوئی شخص جب حج کے لائق ہو جائے تو پہلے اپنا حج کرے پھر کسی دوسرے کو کرائے کیونکہ خطرہ ہے کہ کہیں اپنا حج نہ رہ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ موت آجائے یا بعد میں حج کرنے کی استطاعت نہ رہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ اہلحدیث لاہور

خاوند نے حج نہیں کیا اس کی بیوی حج کر سکتی ہے ؟

سوال :۔ خاوند نے حج نہ کیا ہو تو کیا اس کی موجودگی میں بیوی حج کر سکتی ہے۔ ؟

جواب :۔ بیوی کا اگر اپنا مال ہے تو وہ حج کر سکتی ہے۔ مثلاً مہر اس کا ذاتی مال ہے اور ماں باپ نے جو کچھ جہیز میں دیا ہے وہ بھی اس کا ذاتی مال ہے۔ خاوند نے اگر زیور بنا کر بیوی کی ملک کر دیا ہے وہ بھی اس کا ذاتی مال ہے۔ ایسے ہی اپنے والدین اور اپنی اولاد سے جو کچھ اُس کو وراثت میں ملے گا وہ بھی اس کا ذاتی مال ہے اسی طرح سینے پرونے وغیرہ کے ذریعہ اگر وہ الگ کمائی ہو تو وہ بھی اُس کا ذاتی مال ہے۔ اس قسم کے مال سے حج فرض ہے۔ بشرطیکہ سفر کے لئے خاوند یا کوئی محرم ساتھ ہو۔ امام شافعیؒ کے مذہب پر عورتوں کے قافلہ میں یا نیک لوگوں کے جماعت میں سفر کر سکتی ہے۔ لیکن حدیث کے بظاہر الفاظ پہلی صورت کے موید ہیں۔ یعنی خاوند یا کوئی محرم ساتھ ہو۔ اور احتیاط بھی اسی میں ہے۔ ہم نے اپنے رسالہ "حج مسنون" میں اس کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اگر کمائی خاوند کی ہے۔ اور مالک خاوند ہے۔ بیوی ماتحتی میں کام کرتی ہے۔ ایسی صورت میں خاوند بیوی کو حج کرائے اور اُس نے اپنا حج نہ کیا ہو تو بیوی کا حج ہو جائے گا لیکن خاوند کے ذمہ فرض رہے گا۔ اگر زندگی میں حج کر لیا تو حج کا فرض اس کے ذمہ اُتر گیا۔ ورنہ جو وعید تارک حج کے لئے ہے وہی اس کے لئے ہے

اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ خاوند پہلے اپنا حج کرے پھر کسی دوسرے کو کرائے۔ یہ مسئلہ خاوند بیوی کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ کوئی شخص جب حج کے لائق ہو جائے تو پہلے اپنا حج کرے پھر کسی دوسرے کو کرائے۔ ہو سکتا ہے موت آجائے یا بعد میں غریب ہو جائے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ قدس لاہور

۱۴ شوال سنہ ۱۳۸۳ھ - ۲۸ فروری سنہ ۱۹۶۴ء

عید کے دن صفا مروہ کی سعی

سوال:۔ عید کے دن منی سے آکر حاجی لوگ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، یہ طواف بیشک ضروری ہے۔ لیکن کیا عید کے دن صفا مروہ کی سعی بھی ضروری ہے۔؟

مولوی عبدالرحمٰن چک نمبر ۳۰ ڈاکخانہ جمیس آباد ضلع تھرپارکر سندھ

جواب:۔ عید کے دن طواف بیت اللہ کرنا ضروری ہے ؛ اگر صفا مروہ کے درمیان سعی طواف قدوم کے ساتھ کر چکا ہے۔ تو عید کے دن طواف کے ساتھ سعی ضروری نہیں۔ اور اگر پہلے سعی نہیں کی تو پھر عید کے دن سعی ضروری ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۴ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۳ھ   ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۶۴ء

حج بدل کرنے والے کو حج کا ثواب

سوال:۔ حج بدل کرنے والے کو حج کا ثواب ملتا ہے یا نہیں؟

بشیر احمد سوداگر پور سیالکوٹ

جواب:۔ حج کے متعلق الگ تو تصریح نہیں آئی۔ مگر دوسرے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کسی کی طرف سے کوئی نیک کام کرے۔ اس کو اللہ تعالیٰ پورا اجر دیتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کوئی روزہ افطار کرائے تو افطار کرانے والے کو بھی پورا اجر ملتا ہے۔ اور روزے دار کے ثواب میں سے بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کتاب الصیام میں یہ حدیث موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی کی طرف سے حج بدل کرتا ہے اللہ تعالیٰ دونوں کو پورا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ عبداللہ امرتسری روپڑ ۳۰ رجب سنہ ۱۳۸۲ھ

عورت کا محرم کے بغیر حج کرنا

سوال :- زید کے دلائل۔

زید کہتا ہے۔ عورتوں کو محرم کے سوا حج کے لئے جانا جائز نہیں ہے وہ عموم سفر والی احادیث پیش کرتا ہے۔ ایک وہ حدیث جو صحابی نے دربارِ نبوی میں عرض کیا تھا۔

کہ میرا نام فلاں جنگ میں لکھا گیا ہے۔ اور میری بیوی حج کے لئے تیار ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کو جاؤ۔ تمہاری جگہ کسی اور کو بھرتی کر لیا جائے گا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حج کا سفر غیر محرم کے ساتھ جائز نہیں۔

عمرو کے دلائل

عمرو کہتا ہے عورت اکیلی یا عورتوں کے ہمراہ حج کو جا سکتی ہے۔ اس کے دلائل یہ ہیں۔

دلیل اوّل بخاری مسلم میں حدیث ہے۔ خشعم قبیلہ کی ایک عورت نے عرض کی۔ اے اللہ کے رسولؐ! میرا باپ بہت بوڑھا ہے میں اس کی طرف سے حج کروں تو کیا حج ہو جائے گا؟ فرمایا۔ ہو جائیگا اس حدیث کے تحت امام نوویؒ نے لکھا ہے۔

عورت محرم کے سوا حج کو جا سکتی ہے۔

دلیل دوم :- بخاری شریف میں حدیث ہے۔

ایک عورت نے خدمتِ نبویؐ میں عرض کی کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی لیکن وہ نذر پوری کرنے سے پہلے فوت ہو گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے نذر پوری کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہاں پوری کرو۔

دلیل سوم :- بخاری مسلم کے حوالہ سے مشکوٰۃ میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کے ہمراہ ابن عباسؓ کو روانہ کیا کہ تم منیٰ میں پہنچ جاؤ۔

دلیل چہارم :- بخاری باب حج النساء میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی اجازت سے عثمان بن عفانؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے ہمراہ حرم مبارک حج کو گئے۔

دلیل پنجم - مسلم شریف میں حدیث ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہ رضہ کو غلام کے ہمراہ منٰی روانہ فرمایا۔
ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت سفر حج کر سکتی ہے اکیلی ہو یا عورتوں کی جماعت کے ساتھ۔
امام نوویؒ لکھتے ہیں۔
عطاءؒ۔ سعید بن جبیر۔ امام اوزاعی رحہ۔ امام شافعی رحؒ اور دیگر بہت ائمہؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کی جماعت ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ ایک دوسری کے ساتھ مل جل کر عورتیں محرم ہو جاتی ہیں۔ اور دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور امام مالکؒ نے تو باب ہی باندھا ہے۔ حج المراۃ بغیر ذی محرم۔ یعنی امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ جس عورت کا خاوند نہیں۔ اور اس نے حج نہیں کیا۔ اگر ان کا کوئی مرد نہ ہو یا ہو مگر ساتھ نہ جا سکے تو وہ عورت فریضہ حج ترک نہ کرے۔ بلکہ دوسری عورتوں کے ساتھ جائے (موطا امام مالکؒ) کیونکہ عورتیں عام ہوں تو قائم مقام محرم کے ہو جاتی ہیں۔ اور ایک دوسری کی محرم بن جاتی ہیں۔
سوال یہ ہے کہ زید اور عمرو دونوں میں سے حق بجانب کون ہیں؟ مدلل جواب فرمائیں۔
تحقیق مسائل میں آپ کی ہتی پر جماعت کو بحمد اللہ فخر ہے (عطاء اللہ مولوی فاضل)

جواب: اصول کا قاعدہ ہے۔ ووقائع الاعیان لا یحتج بھا علی العموم (نیل الاوطار ج ۳)
یعنی خاص واقعات سے عام استدلال صحیح نہیں ——— اس بنا پر عمرو کی پہلی دلیل اور دوسری دلیل قابل استدلال نہیں رہتیں۔ کیونکہ خاص عورت کا واقعہ ہے۔ محرم کے عدم ذکر سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہاں فی الواقعہ محرم نہ ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔
حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد ۷ صد ۲۲۲ میں پہلی حدیث پر لکھا ہے۔ کہ
"اس عورت کا باپ ساتھ تھا اور اس کا یہ کہنا کہ میرا باپ شیخ فانی ہے اس سے مراد اس کا دادا ہے۔
حافظ ابن حجرؒ نے قوی سند کے ساتھ ابو یعلیٰ کی ایک روایت ذکر کی ہے جس میں تصریح ہے کہ اس عورت کا باپ ساتھ تھا۔
تیسری حدیث بھی دلیل نہیں۔ کیونکہ ابن عباسؓ اس وقت نابالغ تھے اور مزدلفہ سے روانہ فرمایا تھا۔ مزدلفہ سے منٰی تقریباً دو میل ہے یہ مسافت سفر کے لئے کافی نہیں۔ پانچویں دلیل بھی اسی قسم

نہ قسطلانی میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے آپ کے ساتھ دیگر عورتیں بھی تھیں عام عورتیں محرم کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔

کی ہے۔ نیز اپنے غلام سے پردہ نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضؓ مطلقاً غلام سے پردہ کی قائل نہیں پس یہ محرم کے حکم میں ہو گیا۔

چوتھی حدیث میں بھی وہی شبہ ہے جو اول اور دوم میں ہے۔ اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے ساتھ اجازت دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سال حج کے امیر تھے۔

زید کے دلائل بھی کمزور ہیں۔ زید نے پہلی دلیل سفر کی عام احادیث پیش کی ہیں۔ اور دوسری دلیل حج کی خاص بیان کی ہے۔ اس دوسری دلیل کے الفاظ یہ ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یخلون رجل بامرأۃ ولا تسافرن امرأۃ الا ومعها محرم فقال رجل یارسول اللہ اکتتبت فی غزوۃ کذا وکذا وخرجت امرأتی حاجۃ قال اذھب فاحجج مع امرأتك متفق علیہ۔

(مشکوۃ کتاب المناسك)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہا نہ ہو۔ اور نہ کوئی عورت سفر کرے مگر اس حال میں کہ اس کے ساتھ اس کا محرم ہو۔ ایک شخص نے کہا یارسول اللہ! میں فلاں جنگ میں لکھا گیا ہوں، اور میری عورت حج کے لئے نکلی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جا اپنی بیوی کے ساتھ حج کر۔

اس سے شخص مذکور نے محرم کی خصوصیت نہیں سمجھی کہ ضرور محرم ہی ساتھ ہو بلکہ یہ سمجھا کہ عورت کے تنہا جانے میں فتنہ ہے اس لئے اپنا ذکر کیا کہ میں فلاں جنگ میں لکھا گیا ہوں۔ اگر محرم کی خصوصیت سمجھتا تو خود کو ذکر نہ کرتا۔ کیونکہ خود تو خاوند ہے محرم نہیں۔ کیونکہ محرم وہ ہے جس سے ہمیشہ نکاح حرام[1] ہو۔ پس جب مقصد اس سے عورت کے فتنہ میں پڑنے کی روک ہے تو جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ عورت سفر کر سکتی ہے مثلاً قابل اعتماد عورتوں کی جماعت ہو یا اس قسم کے مرد ہوں تو اس کو سفر کی اجازت ہونی چاہیئے۔ پس زید کی دلیل زید پر اُلٹ گئی۔ ہاں اگر خاوند کو محرم میں داخل کیا جائے جیسے بعض نے کہا ہے۔ چنانچہ مغنی مع الشرح الکبیر جلد ۳ صفحہ ۱۹۲ میں ہے۔

---

[1] اگر کسی قصور کے باعث حرمت ابدی پیدا ہو گئی ہو تو یہ اس سے یہ محرم مستثنیٰ ہے جیسے لعان کرنے والے ہمیشہ ایک دوسرے پر حرام ہیں مگر محرم نہیں۔

والمحرم زوجها او من تحرم عليه على التابيد بنسب او سبب مباح كابنها وابيها واخيها من نسب او رضاع وربيها و رابها۔

یعنی محرم خاوند ہے یا جس پر عورت حرام ہو۔ حرمت کی وجہ نسب ہو یا کوئی سبب مباح ہو۔ جیسے اس کا بیٹا۔ باپ۔ بھائی۔ نسبی یا رضاعی یا اس کا پچھلگ یا جس کی یہ پچھلگ ہے تو اس صورت میں زید کی دلیل زید پر نہیں اُلٹے گی مگر خاوند کو محرم میں داخل کرنا کمزور ہے۔ پس زید کی دلیل کی کمزوری بحال رہی۔

جو لوگ محرم کی شرط کے قائل نہیں وہ مندرجہ ذیل دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

اوّل :۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (پ)

یعنی لوگوں پر حج بیت اللہ فرض ہے جو اس کی طرف راستہ کی طاقت رکھے۔

راستہ کی طاقت کی تفسیر دوسری حدیث میں زاد راہ اور راحلہ (سواری) کے ساتھ کی ہے۔ پس اس حکم میں عورت بھی آگئی۔

دوم :۔ عدی بن حاتم رض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یوشك ان تخرج الضعینة لحج البیت لا جوار معها لا تخاف الا الله

عنقریب عورت حج بیت اللہ کے لئے نکلے گی۔ اُس کے ساتھ کوئی نہیں ہوگا۔ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گی۔ یعنی ایسا امن ہو جائے گا کہ عورت اکیلی بے کھٹکا سفر کرے گی۔

سوم۔ اگر کوئی عورت کفّار کے قبضہ میں آجائے۔ پھر وہ رہائی حاصل کر لے تو وہ بالاتفاق اکیلی سفر کر سکتی ہے —— پس معلوم ہوا کہ محرم شرط نہیں ہے۔

یہ تین دلائل وہ مزید پیش کرتے ہیں مگر یہ بھی کمزور ہیں۔

اوّل اس لئے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ نہ محرم کی ضرورت ہے اور نہ قابلِ اعتماد جماعت حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں۔ دوم اس لئے کہ اس میں امن کی پیشگوئی ہے۔ جائز ناجائز بتلانا مقصود نہیں۔ سوم اس لئے کہ یہ مجبوری کا سفر ہے۔ کیونکہ دار الکفر میں تو وہ رہ نہیں سکتی۔ ورنہ پھر کفار قید کر لیں گے اور حج کا سفر تو وہ اپنے اختیار سے کرتی ہے اس میں کوئی مجبوری نہیں پس اس کا قیاس اس پر صحیح نہیں۔

یہ تینوں دلائل اور ان پر جرح مغنی ابن قدامہ مع الشرح الکبیر جلد ۳ میں مذکور ہے —— اور جو محرم

کی شرط کرتے ہیں۔ ان کی ایک دلیل مغنی مع الشرح الکبیر میں ابن عباسؓ کی یہ حدیث بھی لکھی ہے جو دارقطنی میں ہے۔ لا تحجن امرأۃ الا معہا ذو محرم ——— یعنی کوئی عورت محرم کے بغیر سفر حج نہ کرے۔

لیکن اُوپر معلوم ہو چکا ہے کہ جب مقصود اس سے عورت کے فتنہ میں پڑنے کی روک تھام ہے تو قابلِ اعتماد جماعت کے ساتھ ہونے کے وقت اجازت ہونی چاہیئے۔ ہاں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ صرف فتنہ کی روک تھام مقصود نہیں بلکہ یہ بھی مقصود ہے کہ عورت کمزور جنس ہے۔ سواری پر اُترنے چڑھنے کے وقت اکثر سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ خاص کر بیمار ہو جائے جو عموماً لمبے سفر کا لازمہ ہے۔ تو پھر اٹھانا بٹھانا۔ کپڑا لینا دینا حاجت روائی وغیرہ محرم یا خاوند ہی کا کام ہے۔ بے گانہ مرد کے لئے مشکل ہے۔ اور ہر وقت ایسی ہمدرد عورتیں بیسر آنا مشکل ہے۔ بسا اوقات اپنی اپنی ضرورتوں کے تحت قافلے آپس میں جدا ہو جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے مردوں کے تابع ہوتی ہیں۔ اس لئے کون ٹھہر سکتا ہے اور کون اس کی حفاظت و نگرانی کر سکتا ہے اس لئے اپنا خاص محرم یا خاوند ساتھ ہونا چاہیئے۔ مگر یہ وجہ کچھ کمزور ہے۔ کیونکہ ایسا اتفاق بہت کم پڑتا ہے کہ قابلِ اعتماد جماعت گھر سے ساتھ چلے۔ پھر بیماری کے وقت کوئی مناسب انتظام نہ کرے۔ پس اصل مقصد حدیث کا فتنہ کی روک ہے۔ اور اگر بالفرض اس کمزور درجہ کا کچھ لحاظ کیا جائے تو بوجہ کمزور ہونے کے زیادہ سے زیادہ اس سے احتیاط ثابت ہو سکتا ہے۔ نہ کہ وجوب۔ یعنی احتیاط اول نمبر خاوند یا محرم کا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو پھر قابلِ اعتماد جماعت ہونی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ خاوند یا محرم نہ ہو تو عورت حج ہی سے محروم ہو جائے۔

خلاصہ۔ یہ کہ ایک لحاظ سے زید کے خیال کو کچھ قوت ملتی ہے وہ یہ کہ جب خاوند یا محرم ہو تو وہی ساتھ جائے تاکہ ظاہر حدیث پر عمل ہو جائے اور کسی قسم کا کھٹکا نہ رہے کیونکہ مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ لا یحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الاخر ان تسافر سفرا یکون ثلاثۃ ایام فصاعدا الا ومعہا ابوھا او ابنہا او زوجہا او ذو محرم منہا۔

یعنی کوئی عورت جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے تین دن یا زیادہ سفر حلال نہیں تاوقتیکہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بیٹا یا خاوند یا محرم نہ ہو۔

اس حدیث کا ظاہر زید کے مذہب کو تو تقویت دیتا ہے کیونکہ اس میں خاوند کا بھی ذکر ہے۔ اور خاوند یا محرم نہ ہوں یا کسی شرعی عذر کی وجہ سے اس کا جانا مشکل ہو جیسے بیماری وغیرہ تو پھر اصل مقصد حدیث پر نظر رکھتے ہوئے عمرو کے خیال پر عمل کرنا چاہیئے۔ یعنی بعض قابلِ اعتماد جماعت کے ساتھ جائے اگر قابلِ اعتماد

جماعت نہ ملے تو پھر عورت بالکل نہ جائے نہ اس پر حج فرض ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سراسر حدیث کی مخالفت لازم آتی ہے نہ تو ظاہر حدیث پر عمل ہوا، نہ اس کے اصل مقصد کی پرواہ ہوئی۔ پس زید کا مطلق یہ کہنا کہ خاوند یا محرم کے بغیر عورت حج کر ہی نہیں سکتی یا بالکل نہ کرے یہ بھی ٹھیک نہیں۔ اور عمرو کا اکیلی کا فتویٰ دینا، یہ بھی ٹھیک نہیں بلکہ ہر ایک کے قول کا کچھ حصہ ٹھیک ہے اور کچھ ٹھیک نہیں ——— مسلم کی حدیث مذکور کا ظاہر تو یہ چاہتا ہے۔ خاوند یا محرم ساتھ ہو پس جب یہ موجود ہوں اور ساتھ جا سکیں تو انہی کو ساتھ لے جائے اور متفق علیہ حدیث جو مشکوٰۃ کے حوالے سے گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد فتنہ کی روک ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں خاوند کا ذکر نہیں۔ صرف محرم کا ذکر ہے مگر باوجود اس کے صحابی رضہ نے اس سے محرم کی خصوصیت نہیں سمجھی۔ اس لئے خود کو پیش کیا حالانکہ خود خاوند تھا تو گویا اصل مقصد فتنہ کی روک ہوا پس اس کا لحاظ کرتے ہوئے جب خاوند یا محرم نہ ہوں تو قابلِ اعتماد جماعت کافی ہے۔ بہر صورت اِن دو حالتوں میں عورت کو حج کرنا چاہیئے۔ ان کے علاوہ تیسری حالت میں یعنی اکیلی حج نہ کرے۔

رہی یہ بات کہ اس تیسری حالت میں اگر عورت حج کر لے تو اس کا فرض ادا ہوگا یا نہیں ؟ تو جہاں تک مجھے علم ہے سب متفق ہیں کہ اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا اس پر اور حج فرض نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ قدس لاہور

۱۶ شعبان ۱۳۸۰ھ ۳ فروری ۱۹۶۱ء

ایک شخص کی بابت نذر مان کر دوسرے کو حج پر لے جانا

سوال :۔ ایک شخص کا لڑکا بیمار ہو گیا۔ اس نے نذر مانی کہ خدا تعالیٰ اس کو صحت بخشے تو میں اس کو حج کے لئے ہمراہ لے جاؤں گا۔ لڑکے کی عمر دس بارہ برس کی ہے کیا اسی کو حج کے لئے ہمراہ لے جائے یا اس کے بدل دوسرے کو بھی لے جا سکتے ہیں۔

منظور ڈرائیور ایرپورٹ لاہور

جواب :۔ نذر جس طرح مانی ہے اسی طرح پوری کرنی چاہیئے۔ لڑکے کو ساتھ لے جائے۔ اگر وہ بالغ ہوتا تو اس کا فرض ادا ہو جاتا اب اس کا نفل حج ہو گا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

حج تمتع کرنے والے پر نحر کے روز طواف کے بعد سعی ضروری ہے یا نہیں

سوال :۔ حج تمتع کرنے والے پر نحر کے روز یعنی دسویں ذی الحجہ کو بعد طواف بیت اللہ صفا مروہ کی سعی ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حج تمتع کرنے والے پر نحر کے روز صرف طواف ہے۔ سعی نہیں ہے دلیل یہ پیش کرتے ہیں جو دار قطنی میں ہے۔

عن ابن عباسؓ عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم فیمن تمتع بالعمرۃ الی الحج قال یطوف بالبیت سبعاً ویسعی بین الصفا والمروۃ فاذا کان یوم النحر طاف بالبیت وحدہ ولا یسعی بین الصفا والمروۃ۔

یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں اور متمتع کو یوم النحر میں سعی بین الصفا والمروہ معاف ہے یا نہیں؟

جواب :۔ اس حدیث میں تمتع سے قران مراد ہے۔ قرآن پر بھی کبھی تمتع کا لفظ بول دیا جاتا ہے (مشکوۃ باب الاحرام والتلبیۃ)

اس حدیث میں عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کو تمتع کہا ہے۔ حالانکہ آپ قارن تھے اور قارن کے لئے ایک ہی سعی کافی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ قدس لاہور

۲۳ شوال ۱۳۸۱ھ ۳۰ مارچ ۱۹۶۲ء

حج سے پہلے مدینہ منورہ کی زیارت

سوال :۔ اگر ایام حج میں دیر ہو تو قبل حج براہ راست مدینہ منورہ جانا کیسا ہے، مکہ مکرمہ بعد میں آ کر رہے اور پھر حج کرے تو کیا حرج ہے، اس طرح کرنے سے حج میں کوئی خرابی آتی ہے یا نہیں؟

جواب :۔ حج سے پہلے مدینہ منورہ جانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ جب حج کا وقت ہی نہیں آیا تو وہ آزاد ہے جہاں چاہے جائے آئے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ زیارت حج کے بعد ہونی چاہیئے۔ کیونکہ جن روایتوں میں حضورؐ کی قبر مبارک کی زیارت کا ذکر ہے۔ ان سے بعض روایت میں ثم یا فاء کا لفظ ہے جو ترتیب کے لئے ہے یعنی پہلے حج ہو پھر زیارت قبر نبوی مگر ان احادیث میں سے کوئی ایک حدیث صحت

کو نہیں پہنچی بلکہ قریب موضوع ہے۔ چنانچہ رسالہ "زیارت قبر نبوی" میں میں نے ان پر مفصّل بحث کی ہے بلکہ اس میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ قبر کی زیارت کی نیّت سے سفر جائز ہی نہیں۔ مسجد نبوی کی نیّت سے سفر ہونا چاہیئے، وہاں پہنچ کر پھر قبر نبوی کی بھی زیارت کرلے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ قدس اہل حدیث لاہور

عمرہ کے اوقات، دو عمرہ کے درمیان فاصلہ

سوال:- عمرہ کے اوقات کیا ہیں۔ اور دو عمروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیئے؟ تعامل صحابہؓ اس مسئلہ میں کیا ہے؟

کیا دو عمروں کے درمیان اتنا فاصلہ ضروری ہے کہ سر کے بال اُگ آئیں۔

کیا دو عمروں کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیئے کہ وطن واپس آکر دوبارہ شل حج سفر کرکے جائے؟ یا قیام مکہ میں بھی متعدد عمرے کئے جا سکتے ہیں؟

عمرہ کے کیا کیا شرائط ہیں؟ جن کے فقدان سے عمرہ نہیں ہوتا۔ اور ان کی موجودگی ضروری ہے۔

جواب:- عمرہ کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ بارہ ماہ درست ہے۔ دو عمروں کے درمیان کے فاصلہ کا کسی روایت میں ذکر نہیں۔ سر کے بال اُگلنے کی بھی کوئی شرط نہیں۔ یہ صرف اس غرض سے ہے کہ عمرہ کے بعد حجامت کے ساتھ احرام سے نکلے مگر احرام سے نکلنے کے لئے اور بہت سی باتیں ہیں۔ خوشبو کا استعمال۔ بیوی کے پاس جانا احرام کے کپڑے اُتار کر دُوسرے کپڑے پہن لینا وغیرہ وغیرہ۔ پس احرام سے نکلنے کی خاطر دوسرا عمرہ اتنی دیر سے کرنا کہ بال اُگ آئیں، اس کی کوئی وجہ نہیں۔ باقی شرائط میں حج عمرہ قریب قریب ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ قدس لاہور

۲۳ شعبان ۱۳۸۰ھ ۱۰ فروری ۱۹۶۱ء

حج کی وصیّت

سوال:- میرا بھائی فوت ہونے لگا۔ اس نے تین صد روپیہ مجھے دیا کہ میری طرف سے تم نے حج

کرنا۔ وہ روپیہ میں نے اپنے پاس رکھ لیا کہ وقت پر جا کر حج کر آؤں گا۔ اسی اثناء میں ایک شخص دو ہزار روپیہ مجھ سے ٹھگ کر لے گیا۔ بھائی کا دیا ہوا روپیہ بھی اس میں شامل تھا۔ اب میرے پاس سوائے سات ایکڑ زمین کے اور کوئی جائداد نہیں ہے۔ اس میں سرکاری معاملہ واخراجات خانہ داری میرے ذمہ ہے۔ اب غرض یہ ہے کہ اگر کسی حاجی کو کچھ روپے دے دیئے جائیں کہ وہ میرے بھائی کی طرف سے حج کر آئے۔ کہ وہ وہاں جا کر میرے بھائی کا حج کرا دیں تو اس طرح ادا ہو سکتا ہے یا نہیں؟ باقی روپیہ میرے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا یا میں خود جا کر اپنے بھائی کا حج کروں۔ مالی حالت تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ بدنی حالت یہ ہے کہ عمر رسیدہ ہوں۔ چلنے کی طاقت نہیں ہے بلکہ جہاز کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔

مولوی عبدالحق چک نمبر ۲۳ بہاولپور

جواب: سوال کی صورت میں اگر بھائی نے حج کے علاوہ بطور قرض روپیہ برتنے کی اجازت دی تھی تو پھر یہ قرض ہو گیا۔ اور قرض دینا پڑتا ہے۔ خواہ اپنے گھر کی اشیاء فروخت کر کے دے۔ کیونکہ وہ ذمہ ہے۔ اگر بھائی کی اجازت کے بغیر برت لیا ہے تو یہ غصب ہے اور غصب کی صورت میں بھی شے دینی پڑتی ہے۔ غرض ٹھگ کے ہاتھ روپیہ تبھی گیا جب برتنے کا قصد ہوا۔ ورنہ ٹھگ کے ہاتھ میں نہ جاتا۔ بس یہ روپیہ ہر صورت میں بھرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ایک قسم کی امانت ہے۔ اور امانت کے ادا کرنے کی تاکید ہے جیسے آیت کریمہ ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات میں تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے۔ غرض اس بوجھ سے حتی الوسع بہت جلد سبکدوش ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ رہا حج کا مسئلہ سو وہ معلوم ہے جب انسان کے ذمہ حج فرض ہو جاتا ہے تو اس کو حکم ہے کہ خود کرے اگر خود نہیں کر سکتا تو اس کی طرف سے دوسرا کرے مشکوٰۃ کتاب المناسک میں حدیث ہے کہ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ میرے باپ کو فریضہ حج نے بڑھاپے کی حالت میں پایا ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ فرمایا ہاں۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ کہا میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی وہ مر گئی فرمایا اگر اس کے ذمہ قرض ہوتا تو ادا کرتا؟ کہا ہاں۔ فرمایا اللہ تعالے کا قرض اس کے زیادہ لائق ہے۔ مرنے والے بھائی کی طرف سے حج فرض ہو گیا۔ اگر زندہ بھائی ایسا کمزور ہے کہ اگر اُسے اپنا حج کرنا پڑتا تو اس کی بھی طاقت نہ رکھتا تو اس صورت میں کسی دوسرے کو روپیہ دے دے تا کہ وہ حج کر آئے۔ مگر وہ شخص ایسا ہونا چاہیئے جس نے پہلے اپنا حج کیا ہو۔ کیونکہ دوسرے کی طرف سے وہی حج کر سکتا ہے جو اپنے فرض سے

فارغ ہو چکا ہو۔

آج کل تین سو روپیہ میں حج تو ہو جاتا ہے لیکن ذرا تکلیف ہوتی ہے اگر کوئی باعتبار آدمی جو پہلے حج کر چکا ہو، تین سو روپیہ میں حج کو جانا منظور نہ کرے تو پھر یہ روپے جہاد میں صرف کئے جائیں۔ کیونکہ حج کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد فرمایا ہے جیسے مشکوٰۃ کتاب المناسک میں ہے کہ عورتوں پر جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں۔ حج اور عمرہ۔ اس لئے کوئی شے جہاد میں وقف کی جائے تو وہ حج میں صرف ہو سکتی ہے جیسے ابوداؤد میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کو کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرائیے۔ خاوند نے کہا کہ میرے پاس سواری نہیں جس پر تجھے سواری کراؤں۔ عورت نے کہا اپنے فلاں اونٹ پر حج کرا۔ خاوند نے جواب دیا کہ وہ فی سبیل اللہ (جہاد) میں وقف ہے پھر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج سے فارغ ہونے کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور یہ قصہ سنایا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تو اس اونٹ پر حج کراتا تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہوتا سوا اب عورت رمضان میں عمرہ کر لے یہ میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج اور جہاد کو آپس میں بڑی مناسبت ہے۔ پس حج کا روپیہ جہاد میں صرف ہو سکتا ہے۔ اگر جہاد کا بھی موقعہ نہ ہو تو پھر کسی درس میں دیئے جائیں۔ کیونکہ درس و تدریس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بمنزلہ جہاد کے فرمایا ہے۔ جیسے مشکوٰۃ باب المساجد میں حدیث ہے کہ جو میری اس مسجد میں صرف خیر سیکھنے سکھانے کے لئے آئے وہ بمنزلہ مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے ہے۔ درس کے بعد زیادہ عبادت کرنے والے بھی اس روپیہ کا مصرف ہو سکتے ہیں جو رات کو قیام کرتے ہیں اور دن کو روزہ رکھتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہد کو ان کے مثل بتایا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب الجہاد میں ہے۔

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله المهاجر من هجر الخطايا والذنوب

(مشکوٰۃ کتاب الایمان)

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو خطا اور گناہ ترک کردے۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۸ جمادی الاول سنہ ۱۳۵۱ھ۔ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

حجِّ بدل

سوال :- ایک شخص حج کے لئے گیا تو اس نے اپنے فوت شدہ والد بکر اور اپنی فوت شدہ زوجہ کلثوم کی طرف سے مکہ شریف کے باشندہ معلم کو کچھ روپیہ دیا کہ ان کی طرف سے حج کرے جب کہ وہ دونوں اس وقت فوت ہو گئے تھے کہ وہ حج کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ بکر اور کلثوم کی طرف سے حج ہُوا ہے یا نہیں؟

(اے۔ ای۔ پٹیل ملک افریقہ)

جواب :- قرآن مجید پارہ ۴ رکوع اول میں ارشاد ہے۔

وللہ علی النّاس حجّ البیت من استطاع الیہ سبیلا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں پر حج فرض ہے جو بیت اللہ کی طرف راستہ کی طاقت رکھتے ہیں۔
اس آیت سے معلوم ہوا کہ غریب اور نادار شخص پر حج فرض نہیں۔ چونکہ والد بکر اور اس کی بیوی کلثوم اپنی زندگی میں غریب تھے، اور سفر خرچ میسّر نہ ہوا تھا۔ اس لئے ان پر حج فرض نہیں ہوا۔ اور اس کے مالدار ہونے سے بھی باپ یا بیوی پر حج فرض نہیں ہوگا۔ چاہے اُن کی زندگی ہو چاہے بعد میں۔ کیونکہ ہر انسان اپنے نفس کا مکلّف اور ذمہ دار ہے، دوسرے کا نہیں۔ ہاں اگر اپنی خوشی سے کرنا یا کرانا چاہے تو جائز ہے ان کو ثواب مل جائے گا۔ ورنہ جب ان پر فرض نہیں ہوا۔ تو اس کو ان کی طرف سے حج کرنا یا کرانا کیسے ضروری ہوگا۔ —— دوسرے کی طرف سے حج وہ کر سکتا ہے، جس نے پہلے اپنی طرف سے فریضہ حج ادا کر لیا ہو۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کتاب المناسک میں حدیث ہے کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک شخص کو حج کرتے ہوئے سنا وہ کہتا تھا یا اللہ! میں شبرمہ کی طرف سے تیرے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا شبرمہ کون ہے؟ کہا میرا بھائی ہے یا میرا قریبی۔ فرمایا کیا تو نے اپنی طرف سے حج کر لیا۔ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا پہلے اپنی طرف سے حج کر پھر شبرمہ کی طرف سے کر۔
نیز جس شخص سے حج بدل کرایا جائے۔ اگر وہ اس حج کرنے کا یعنی اپنی محنت وغیرہ کا عوض لیتا ہے تو پھر حج ادا نہیں ہوگا۔ کیونکہ عبادات کا عوض جائز نہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ باب الاذان میں حدیث ہے کہ عثمان بن ابی العاص نے عرض کی یا رسول اللہ آپ مجھے میری قوم کا امام مقرر کریں۔ فرمایا۔

انت امامھم واقتد باضعفھم واتخذ موذنا لا یاخذ علی اذانہ اجرا۔ رواہ ابوداؤد والنسائی۔

کہ تو ان کا امام ہے اور اُن کے ضعیف کی رعایت رکھ اور موذن ایسا مقرر کر جو اذان دینے پر اجرت نہ لے اذان ایک عبادت ہے جب اذان پر اُجرت منع ہوگئی تو حج پر بطریق اولیٰ منع ہوگئی۔

نوٹ:۔ حج کے لئے معلّین کو روپیہ دینے میں احتیاط چاہیئے، کیونکہ اکثر یہ لوگ روپیہ لے کر حج نہیں کرتے، اگر کرتے بھی ہیں تو تسلی بخش نہیں۔ عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ ۲۷ رمضان ۱۳۵۳ھ ۴ جنوری ۱۹۳۵ء

عورتوں کا بار بار حج کرنا

سوال:۔ زید کہتا ہے عورتوں کا بار بار حج کرنا جائز نہیں۔ عمرو کہتا ہے جائز ہے۔ کیونکہ بخاری میں ہے کہ حرم مبارک حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حج کو گئے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عورت بار بار حج کر سکتی ہے

جواب:۔ زید کا یہ خیال غلط ہے جانا جائز ہے دلیل وہی ہے جو عمرو نے پیش کی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ۱۲ شوال ۱۳۵۸ھ ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ء

بیت اللہ کی چھت کی طرف دیکھنا

سوال:۔ زید کہتا ہے کہ بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہو کر چھت کی طرف دیکھنا منع ہے عمرو کہتا ہے جائز ہے کیونکہ منع کی کوئی دلیل نہیں، زید درست کہتا ہے یا عمرو؟

جواب:۔ چھت کی طرف دیکھنے کی ممانعت میری نظر سے نہیں گذری۔ ہاں یہ روایت آئی ہے کہ بیت اللہ کی طرف دیکھنے والے کے لئے بیس نیکیاں ہیں۔ اس میں چھت بھی آجاتی ہے کیونکہ بیت اللہ کی چھت تو سارا دکھائی نہیں دیتا۔ اکثر اس کے کسی حصہ کو دیکھے گا۔ عبداللہ امرتسری روپڑ

رمل اور اضطباع

سوال:۔ رمل اور اضطباع کسے کہتے ہیں اور یہ کب اور کس طرح کیا جاتا ہے۔

جواب:۔ رمل کندھے ہلا کر پہلوان کی طرح تیز چلنے کا نام ہے۔ یہ طواف کرتے وقت پہلے تین چکروں

میں کیا جاتا ہے اور باقی چار چکر میں رمل نہیں ہے۔ بدستور اپنی آہستہ رفتار سے چلیں، حدیث میں ایسا ہی آیا ہے۔ احرام کی اُوپر کی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے کر کے اس کی دونوں طرف بائیں کندھے پر ڈال لیں، طواف کے وقت ایسا کرنا مسنون ہے۔ اس کو اضطباع کہتے ہیں، لیکن عورت کے لئے نہ رمل ہے اور نہ اضطباع ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی ۶ ذی قعدہ سنہ ۱۳۸۰ھ

مسئلہ ارسال الیدین

یہ مسئلہ نماز کے متعلق ہے جو اپنے مقام پر درج نہیں ہو سکا۔

سوال :۔ نماز میں رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ باندھے یا چھوڑے جائیں؟

جواب :۔ رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ چھوڑے جائیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ فصل رابع میں ہے۔

عن جرير الطبري قال كَانَ عَلِيٌّ إِذَا اَمَّ الصَّلٰوةَ وَضَعَ يَمِيْنَهٗ عَلٰى رُسْغِهٖ فَلَا يَزَالُ كَذَالِكَ حَتّٰى يَرْكَعَ اِلَّا اَنْ يُّصْلِحَ ثَوْبَهٗ اَوْ يَحُكَّ جَسَدَهٗ (رواہ صفة الصلوٰة)

یعنی جریر طبری سے روایت ہے کہ جب حضرت علیؓ نماز پڑھاتے تو دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھتے اور اس حالت میں رہتے یہاں تک کہ رکوع کریں مگر یہ کہ اپنا کپڑا ٹھیک کریں یا اپنا بدن کھجلائیں۔

اِس روایت میں کلمہ حتیٰ کے ساتھ ہاتھ باندھنے کی حد رکوع بتلایا ہے اور دو حالتوں کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے ایک کپڑا ٹھیک کرنے کی حالت دوسرے بدن کھجلانے کی حالت، اگر رکوع سے اُٹھ کر بھی ہاتھ باندھے ہوں تو عبارت یوں ہونی چاہیئے۔ فلا يزال كذالك حتى يهوى الى السجود الا ان يركع او يصلح ثوبه او يحك جسده یعنی دو حالتوں کی جیسے استثناء کی ہے اس طرح رکوع کی حالت کی بھی استثناء کرتے اور ہاتھ باندھنے کی حد سجدہ کے لئے جھکنا بتاتے ——— یہ صاف دلیل ہے کہ قیام اور قومہ کا حکم ایک نہیں۔ اور تعامل اُمت بھی اس کا مؤید ہے والحمد للہ علیٰ ذالک ——— تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ ارسال الیدین ملاحظہ ہو۔ (عبداللہ امرتسری روپڑی)

جلد دوم ——— تمت بالخیر

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَعْمَالَنَا كُلَّهَا صَالِحَةً وَّاجْعَلْهَا لِوَجْهِكَ خَالِصَةً وَّلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِيْهَا شَيْئًا (آمین)

ترتیب و تدوین تلمیذ محدث روپڑی ——— محمد صدیق بن عبد العزیز

۷ ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ
یکم جنوری ۷۴ء

زیرِ اہتمام

اِدارہ اِحیاء السُّنۃ النبویۃ
ڈی بلاک سٹیلائٹ ٹاؤن سرگودھا

